نئی لائبریری ۵۰

ٹیڑھی لکیر

ناول

عصمت چغتائی

نیا ادارہ

36.00

ٹیڑھی لکیر

ناول

یہ ناول صرف عصمت کا ہی نہیں سارے اردو ادب کا لاثانی سرمایہ ہے۔ اردو ناول کے لق و دق صحرا میں "ٹیڑھی لکیر" ایک نخلستان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ناول میں تعلیمِ نسواں، تہذیبِ فرنگ، قحط، جنگ اور ادبی زرگری، جنسی الجھنوں، غرض موجودہ دور کے ہر اہم موضوع کو ژرف نگاہی سے دیکھا بھالا گیا ہے۔

عصمت کو سماج یا شخصیتوں سے نہیں بلکہ افراد سے دلچسپی ہے۔ وہ کھل کر ان کے جوش و ہوس کا، ان کی تھرتھراہٹ اور کپکپی کا، ان کی باہمی کشمکش، عداوت اور فریب کاری کا ذکر کرتی ہے۔ عصمت کے فن میں خاموش آسودگی یا ارفع مسرت نہیں ملتی بلکہ یہاں تو انسانی خون کا دور دورہ ہے جو زندگیوں، تاریخوں اور حادثوں کو معنویت عطا کرتا چلا جاتا ہے۔

اگر عصمت اور کچھ نہ لکھتی تو بھی یہ ناول اردو ادب کی تاریخ میں اس کا نام روشن رکھنے کے لیے کافی ہوتا۔

عصمت چغتائی

- معصومہ (ناول)
- سودائی (ناول)
- انسان اور فرشتے (ناول)
- ایک بات (افسانے)
- زہر (افسانے)
- شیطان (ڈرامہ)

عصمت چغتائی

ٹیڑھی لکیر

(ناول)

نیا ادارہ
۱۵ - سرکلر روڈ - لاہور

جملہ حقوق محفوظ

بار اوّل (پاکستان) ۱۹۶۷ء
ناشر: ریاض احمد چودھری
مطبع: حمایت اسلام پریس لاہور

ان یتیم بچّوں کے نام ——

جن کے والدین
بقیدِ حیات ہیں

•

پہلی منزل

(۱)

وہ پیدا ہی بہت بے موقع ہوئی۔ بڑی آپا کی چہیتی سہیلی سلمہ کی شادی تھی اور وہ بیٹھی چھپا چھپ سروئی کریپ کے دوپٹے پر لچکا ٹانک رہی تھیں۔ امّاں اتنے بچے جننے کے بعد بھی ننھی ہی بنی ہوئی تھیں۔ بیٹھی جھانوے سے ایڑیوں کی مردہ کھال گھس گھس کر اتار رہی تھیں کہ ایکا ایکی گھٹا جھوم کر گھر آئی اور وہ دہائی ڈالی کہ حکیم کو بلانے کا ارمان دل کا دل ہی میں رہا اور وہ آن دھمکی۔ دنیا میں آتے ہی بغیر گلے میں گھانٹی کیے ایسا دہاڑی کہ توبہ بھلی۔

نو بچوں کے بعد ایک کا اضافہ، جیسے گھڑی کی سوئی ایک دم آگے بڑھ گئی اور دس بج گئے۔ کیسی شادی اور کس کا بیاہ! حکم ملا: ننھی سی بہن کے نہلانے کے لیے گرم پانی تیار کرو۔ پانی سے زیادہ کھولتے آنسو بہاتی آپا نے کوستے ہوئے چولھے پر پتیلی چڑھا دی۔ پانی بھی مذاق میں ذرا سا چھلک گیا اور سارا ہاتھ اُبل کر رہ گیا۔

"خدا غارت کرے اس مُنّی سی بہن کو۔ اماں کی کوکھ کیوں نہیں بند ہو جاتی" حد ہو گئی تھی! بہن بھائی اور پھر بہن بھائی۔ بس معلوم ہوتا تھا، بھیک منگوں نے گھر دیکھ لیا ہے، اُمڈے چلے آتے ہیں۔ ویسے ہی کیا کم موجود تھے جو اور پہ در پے آ رہے تھے، کُتّے بلّیوں کی طرح! ازل کے مربھکّے۔ اناج کے گھُن ٹوٹے پڑتے ہیں، دو بھینسوں کا دودھ تبرّک ہو جاتا پھر بھی اُن کے تندور ٹھنڈے ہی پڑے رہتے۔

اور یہ سب ابّا کا قصور تھا۔ کیا مجال جو امّاں دودھ پلا جائیں۔ اِدھر بچّہ پیدا

ہُوا۔ اُدھر آگرے سے کولھو بلوا لی۔ وہ دودھ پلائے اور بیگم کی پٹّی سے پٹّی جُڑی رہے۔ پھر بھلا بچّے کیوں سانس لیتے؟ گھر کیا تھا، جیسے کاٹنے بیلوں کا باڑہ؛ کھانا ہے تو پتیلیوں؛ پینا ہے تو گھڑوں، سونا ہے تو گھر کا کونا کونا زندگی سے لبریز، چھلکنے کو تیار!

اور یہ پیٹ کی کھرچن کالی بیلی، دھنیا سی ناک، چیاں سی آنکھیں، پر چیل سے زیادہ تیز؛ بڑی آپا اور منجھو دونوں نے کئی دفعہ اُس کے چوہے کے بچے جیسے منہ کو مسکراتے ہوئے دیکھا، گویا وہ انہیں چھیڑنے کو مسکرا رہی ہے۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ یہ اُس کی زرخرید لونڈیوں کی طرح خدمت کریں گی؛ امّاں کو کیا کم فکر ہو رہی ہوگی؛ آخر یہ اتنی ڈھیر سی لڑکیوں کا نصیبہ کہاں کھلے گا! مانا کہ روپیہ بھی ہے اور لڑکی دکھانے کا فیشن نہیں، پھر بھی کہاں تک تالے ڈالے جائیں گے، کیا ہوگا؟

نہ اُس کا پیٹ پھُولا، نہ بیمار ہوئی اور روز بروز پھول کر کپّا ہوتی گئی۔ وہ ایک بھائی بہنوں تک تو ذرا چاؤ چونچلے کیے، پر اب بڑی آپا کا بھی جی بھر چکا تھا اور وہ بیزار تھی۔ خیر انّا موجود تھی اور وہ پل رہی تھی۔

انّا بالکل جوان تھی، سولہ سترہ برس کی۔ کبھی تو راتوں کو وہ گھنٹوں غلاظت میں لتھڑی پڑی رہتی اور اُس کی آنکھ بھی نہ کھلتی۔ انّا کو جگانا گو آسان کام نہ تھا مگر دودھ خوب ہوتا تھا۔ دوسرے انّا کا عاشق جب اُسے کندھے پر بٹھا کر گھوڑے کی طرح دوڑتا تو وہ سب دُکھ درد بھول کر کلکاریاں مارنے لگتی۔ وہ تینوں گھر والوں کی آنکھ بچا کر بھینسوں کے بھُوسے والی کوٹھڑی میں دبک رہتے۔ انّا بھُوسے پر لوٹیں لگاتی اور اُس کا عاشق اُس کے پیچھے پیچھے لپکتا۔ تب یہ بھی تالیاں بجا کر گھٹنیوں دوڑتی، مگر جب وہ انّا سے لڑنا شروع کرتا تو وہ بسُور کر اپنا نچلا ہونٹ آگے پھیلا دیتی۔ اُسے لڑائی سے سخت پریشانی ہوتی تھی۔ جب وہ کمبخت آپس میں بھاؤں بھاؤں کر کے لپٹ جاتے تو اُس کا سارا جسم خوف

سے لرزنے لگتا اور وہ بے طرح بلبلانے لگتی، یہاں تک کہ کتے بھی پریشان ہو کر علیحدہ ہو جاتے۔ جب تک وہ جاگتی رہتی انّا کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ یونہی اگر اُسے چھیڑنے کو آپا کا عاشق اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہتا: "انّا ہماری ہے"، تو وہ فوراً صدائے احتجاج بلند کرتی اور اُسے چھوڑنا پڑتا۔

مگر اُسے اپنی اس سینہ زوری کا جلد ہی خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ایک دن جب وہ تینوں حسبِ معمول خشک پیال پر لوٹیں لگا رہے تھے تو نجانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی اور وہ اپنی ننھی سی دنیا کے معصوم خوابوں میں کھو گئی: آگے، پیچھے، دائیں، بائیں، انّائیں ہی انّائیں بکھری ہوئی تھیں۔ خوشی سے دیوانی ہو کر ایک گود سے دوسری گود میں جھک جھک کر لپکنے لگی۔ مگر پھر اُس نے دیکھا یکایک ساری انّائیں کہیں غائب ہو گئیں۔ اُس کا جی کملا گیا۔ ندیدی کتیا کی طرح سونگھ سونگھ کر وہ ڈھونڈنے لگی۔ اُس نے پالیا۔ پیال کے ایک کونے میں اُس کی نرم گرم انّا پکے آم کی طرح گول مول سو رہی تھی۔ گوں گوں کر کے وہ اُس میں گھسنے لگی۔ اُس کے ہونٹ ہلنے لگے اور حلق کی رگیں پھڑک اٹھیں، گویا دودھ کے گھونٹ کے گھونٹ حلق میں ہوتے ہوئے پیٹ میں جا رہے ہوں۔ اُسے اچھو سا لگ گیا۔ کچھ پکڑنے کے لیے اُس نے اپنے موٹے موٹے ہاتھ بڑھائے مگر ایک بھیانک بلا نے اُسے دور جھٹک کر انّا کو دبوچ لیا اور بھنبھوڑنا شروع کیا۔ حلق پھاڑ کر وہ دھاڑی، جیسے اُسے سانپوں نے ڈس لیا ہو۔ اُس کی معصوم آنکھیں اس کریہہ منظر کو دیکھ کر پتھرا گئیں۔ اس کی گھگی بندھی چیخیں سن کر باہر سے بہشتی، بھنگی اور باورچی دوڑ پڑے اور ملزم گرفتار ہو گئے۔

بسور بسور کر وہ انّا کے پیارے مکھڑے کو تکتی گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھ رہی ہو "چوٹ تو نہیں لگی؟ میں نے تمہیں بچا لیا نا؟" مگر انّا آج کچھ بے مزہ سی تھی اور اُس کی شرارتوں پر بجائے پیار سے ہنسنے کے ڈھٹائی سے جھٹک رہی تھی۔ اپنے تمام معصوم اور کمزور حربے اُس نے انّا کو منانے کے لیے استعمال کر

ڈالے مگر وہ اُسے جتا نہ سکی۔ کاش وہ پوچھ سکتی کہ وہ کیوں روٹھی ہوئی تھی۔ مگر آج تو انّا نے اس کی آنکھوں کی زبان سمجھنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

اسی دن شام کی گاڑی سے اُس کی انّا کو آگرے سے واپس بھیج دیا گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ یتیم ہو گئی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ کئی دن اور رات روتی رہی۔ سارا گھر اُس کے چاروں طرف جمع ہو گیا مگر اسے چین نہ پڑا۔ وہ گرم گرم انّا، جس کے سینے سے چمٹ کر بالکل ماں کے پیٹ میں سونے کا مزہ آتا تھا، بھلا اب وہ کہاں مل سکتی تھی! اُسے وہ بوتل دیکھ کر ہی صدمے کا دورہ پڑ جاتا جس سے اُسے دودھ پلانے کی کوشش کی گئی۔ بھلا کہاں وہ سانولی سلونی گدگدی انّا اور کہاں شیشے کی ذلیل بوتل۔ مگر پیٹ کی آگ نے اُسے سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور کر دیا۔ منجھو بی نے جب اسے گود میں لے کر بوتل پلائی اور چند قطرے بھولے سے اس کے حلق میں چلے گئے تو وہ خاموش ہو گئی، پھر بھی ایک دم سے وہ بوتل کو چھوڑ کر جلدی سے منجھو سے چمٹ جاتی اور پلّے کی طرح اُس کے کپڑوں میں اپنی انّا کو ڈھونڈنے لگتی۔ منجھو گھبرا کر اُسے دُور ہٹا دیتی اور بڑی آپا سے شکایت کرتی کہ وہ اُس کے بے طرح گدگدیاں کرتی ہے۔

تجربے نے اُسے بہت کچھ سکھا دیا اور وہ بالکل جیسے گائے بیل چارہ کھاتے ہیں دودھ زہر مار کر لیتی مگر اُس کے ہاتھ بھٹکتے ہی رہتے۔ بوتل کی چکنی چکنی سطح پر وہ پیار سے اپنی ہتھیلیاں چپکا کر اُسے کلیجے سے بھینچ لیتی۔ شروع شروع میں تو دودھ پیتے پیتے ایک دم اُسے انّا کی آنکھیں، اس کی ناک کی ننھی سی بالی، اور کان کی لونگیں یاد آ جاتیں، اُس کا دل بھر آتا اور وہ تھوڑی دیر کو چسنی چھوڑ کر دردناک آواز رونے لگتی مگر پھر پیٹ کی پکار اُسے ٹوکا کرتی اور وہ خاموش ہو جاتی۔

جب سے انّا چھن گئی تھی منجھو نے اُسے لے لیا تھا۔ پتا نہیں منجھو کو اُس پر کیوں پیار آ گیا۔ شاید جس دن اُس نے پہلے کپڑوں میں انّا کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی اسی دن سے منجھو کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔ بوتل سے دودھ پلا کر منجھو بی

اسے سینے سے چپکا لیتی اور پنگڑی پر لیٹ جاتی ورنہ اُسے نیند ہی نہ آتی۔ منجھو کے پہلو میں اسے کچھ کچھ اناکی گرمی مل جاتی اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے منجھو کی گردن اور گال سہلایا کرتی، جس کا منجھو بالکل برا نہ مانتی۔

پھر ایک دن جب منجھو نہا رہی تھی تو وہ اندر گھسی چلی گئی۔ "ارے آپا! اسے پکڑ لو" منجھو بی لرز کر چلائی۔

"اُوئی وہ کیا سمجھے۔ اتنی ذرا سی تو ہے۔" مگر اس نے منجھو کو ایسی بری طرح گھورا کہ وہ شرما گئی۔ وہ سکتے کے عالم میں اُسے گھورتی رہی۔ "چل یہاں سے" منجھو نے لوٹے کی آڑ لے کر اسے ڈانٹا، مگر وہ تو جیسے مقناطیسی طاقت سے اُس کی طرف کھنچنے لگی۔ منجھو نے خوفزدہ ہو کر اُسے پھر دھتکارا اور جب وہ چمکتی ہوئی آنکھوں سے مسکرا مسکرا کر اُسے معنی خیز نظروں سے تاکتی بڑھے ہی چلی گئی تو اُس نے چلّو بھر پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹا مارا۔

پانی کی مار سے ٹھٹک کر زور سے رو پڑی اور سسکیاں بھرتی ہوئی باہر رینگ آئی۔ اس دن اُس نے نہ ہی جی بھر کے دودھ پیا اور نہ ہی ہنسی بولی۔ وہ منجھو کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھتی گویا اُس نے اس کے ساتھ کوئی زبردست بے ایمانی کی ہے اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی۔

جب منجھو نے اُسے پہلو میں لٹا کر رضائی اوڑھ لی تو وہ خلافِ معمول خاموش اُسے گھورنے لگی۔

"کیا ہے رے" منجھو نے پیار سے پوچھا اور وہ حسرت سے مسکرا پڑی۔ آہستہ سے اس نے اس کی گردن پر اپنی انگلیوں سے کھجانا شروع کیا اور آنکھیں گڑو دئیے اس کے تل کو دیکھتی رہی جو بائیں گال پر چمک رہا تھا۔

"نہیں، بری بات" منجھو نے اُس کا بھٹکتا ہوا ہاتھ اٹھا کر پہلو میں رکھ دیا۔ وہ بسورنے لگی اور ایسی التجا بھری نظروں سے دیکھا کہ منجھو پسیج گئی، اُس کا ہاتھ اٹھا کر گردن میں ڈال لیا اور سینے سے لگا کر سو گئی۔

منجھو نے اس کے لیے پھول جیسی فراکیں اور ٹوپیاں سئیں۔ گھڑی گھڑی نہلایا جا رہا ہے، سرمہ کاجل اور مٹی سے لیس۔ وہ اپنی ساری گتیں خاموش بنوالیا کرتی۔ مگر کیا مجال کہ کوئی اور اُسے ہاتھ بھی لگا جائے۔ منجھو سے تو آنکھوں میں صابن بھی لگ جاتا تب بھی وہ کچھ یونہی سا بسور کر چُپ ہو جاتی۔ منجھو آخر کو منجھو ہی تھی۔

مگر جُوں جُوں بڑھتی گئی وہ منجھو کی صفائی سے عاجز آ گئی۔ وہ اُسے بچا بنا کر نادر شاہی حکم صادر کر دیتی کہ ایک بال بھی اِدھر سے اُدھر ہوا اور موت آئی۔ پر یہ اُس کے بس کی بات نہ تھی چلتی ہوئی ٹانگوں اور ہاتھوں کو روکنا اس کے قابو میں نہ تھا تھوڑی دیر تو وہ کلیجے پر صبر کی سل رکھے بیٹھی رہتی مگر جونہی منجھو کی آنکھ بچتی وہ باہر کھسک جاتی۔ اور پھر شام کو جو وہ قدم رکھتی تو یہ معلوم ہوتا کوئی دیوانی کتیا کیچڑ کی کونڈی میں لوٹ کر آئی ہے۔ غبارہ جیسی فراک جانو ہڑے ہوئے چوہے کی کھال، اور اُس پر باریک باریک دھول کی افشاں چھڑکی ہوئی۔ سر، بال اور آنکھیں دھول میں اَٹی ہوئی سوجی نتھنے غلاظت سے ایسے ٹھسا ٹھس جیسے سیمنٹ سے دروازے چنے ہوئے ہوں جامنوں، امرودوں، بیروں اور آموں کا یا حسبِ موسم جو پھل موجود ہوتے اُن کا پلستر کیا ہوا اور اُوپر سے طاعونی چوہے جیسی بُو!

سب سے پہلا کام منجھو بی یہ کرتیں کہ گھونسوں، تھپڑوں اور چانٹوں سے جتنی دھول جھڑ سکتی جھاڑ دیتیں۔ وہ زور زور سے بھینس کے پڈے کی طرح ڈکراتی۔ پلکوں کی ریت آنسوؤں سے دُھل جاتی اور ڈکار کی وجہ سے دونوں نتھنے سٹ سے یکایک کھل جاتے، جیسے اَٹی ہوئی نالی میں تیزاب ڈال دیا ہو۔ پھر گھونسوں اور گرج دار دھموکوں کے شادیانوں کے ساتھ غسلِ میت شروع ہوتا۔ پھر صاف ستھرا فراک پہن کر وہ اپنی غلطی کو بڑی تیزی سے محسوس کرتی اور پچھلے گناہوں سے تائب ہو کر آئندہ نیک چلنی کا ارادہ باندھتی۔ وہ پختہ فیصلہ کر لیتی کہ اب کیچڑ اور مٹی سے کوئی واسطہ نہ رکھے گی، دھول میں لوٹنا قطعی بند۔ اس وقت اُس کے چہرے پر تارک الدنیا سادھو کا سا استقلال چھا جاتا جو اپنے جسم کے کسی عضو کو مردہ کر لینے کا قصد کر

چٹا ہو، چیل جیسی چوکنی آنکھیں کبوتر کی طرح معصوم ہو کر اونگھنے لگتیں۔
مگر زمانہ سازگار نہ تھا۔ دوسرے دن جب عین اُسی وقت، اسی عبرتناک حالت میں ایک بدمست شرابی کی طرح جھومتی دھول کی افشاں میں جگمگاتی نظر آتی تو دیکھنے والوں کو سخت حیرت ہوتی، اور جب دھول جھڑ جاتی تو زمین و آسمان کانپ اُٹھتے۔

وہ پھر توبہ کرتی، حلف اُٹھاتی۔ مگر سب بھول جانے کے لیے۔ شیطان اُسے پھر ورغلاتا۔ جونہی وہ بیچ و [illegible?] کر باہر نکلتی جملہ عناصر کو اس کے صاف کپڑوں سے بیر ہو جاتا۔ کھیتوں کی سانولی سانولی پگڈنڈیاں، تال کے کنارے کی سرگوشیاں کرتی ہوئی ریت، اُسے بہکاتیں۔ اصطبل کی بھیگی بھیگی مہکتی ہوئی گھاس آغوش پھیلا کر اُس کے پیچھے دوڑتی۔ مرغیوں کا متعفن اور غلیظ ڈربہ اُسے پھولوں سے لدی بیل کی طرح اپنی طرف کھینچتا۔ وہ سب کچھ بھول جاتی۔ اپنے ضمیر سے وہ قسم جو بارہا کھائی تھی۔ شدّت سے وعدہ اور خود اُس کی اپنی خودداری جیسے روز روز کی دھول جھڑائی چکنا چور کیے دیتی تھی۔ وہ ان بے شمار شیطانی رعنائیوں سے بچنے کے لیے بہت متحمل ہو جاتی مگر جب وہ پکار پکار کر بلاتیں تو وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح اس ابدی اور گندگی کے غار میں جا گرتی جس کی پاداش میں وہ روز دکھ جھیلا کرتی تھی۔

تھوڑی سی دیر میں وہ لہو و لعب میں غرق نظر آتی۔ کیچڑ کے ریشمی لڈو، بھُوری بھُوری بھُنی ہوئی سوجی جیسی ریت کی ننھی ننھی ڈھیریاں، گھوڑے کی گھاس سے بنائی ہوئی چھوٹی سی جھاڑو، مرغی کی دم کے جھڑے ہوئے پر، اور گُڑیا۔ اُس کی عزیز ترین سہیلی، بھنگن کی لڑکی، مجھو کے بعد دُنیا میں یہی گڑیا تھی۔ وہ دونوں بھینس کے تھان کے پیچھے جا کر ایک دوسرے کے گلوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلا کرتیں، پھر ریت میں بیلنوں کی طرح گول گول لوٹیں لگاتیں، مٹھیاں بھر بھر کے ریت پانی کے پیوں کی طرح اُچھالتیں، یہاں تک کہ وہ بالکل مٹی کی بدہیئت مورتیاں معلوم ہونے لگتیں، اُن کی رگ رگ میں ریت رینگنے لگتی، پھر بھی اُن کے جی مٹی سے نہ بھرتے اور وہ گھٹے

ہوئے پتوں کے پیچھے بنا کر ریت پینا شروع کرتیں؛ خستہ بھُربھُری ریت وہ مزے دار پنجیری کی طرح کھا جاتیں۔ پیٹ والیوں کی طرح اُنہیں سوندھی مٹی بہت ہی بھاتی تھی۔ نہ جانے اُن کے پھُولے ہوئے کپڑوں جیسے پیٹوں میں کون سے سپوت پروان چڑھ رہے تھے۔

ان کی حالت بھی کچھ حاملہ عورتوں جیسی۔ چکنی سرمئی رنگتیں پیلی پڑ گئی تھیں اور زبانوں پر سفید سفید پھپھوندی سی لگ گئی تھی۔ آنکھوں میں بھبھوڑ سے بھبھوڑ سے ڈورے پڑ گئے تھے۔ بنیا کا ازار بند اتنا چھوٹا ہو گیا تھا کہ اُس کی گھگریا میں آگے طاقچہ کھلا رہتا تھا۔ روز بروز سستی بڑھتی جا رہی تھی۔ منہ کا مزہ خراب رہتا تھا۔ لڑائی میں انہوں نے دانتوں اور ناخنوں کا استعمال ضرورت سے زیادہ کر دیا تھا۔ چنیں چنیں وہ ہر وقت منمناتی ہی رہتیں، جیسے کسی نے مکھیوں کو ڈبے میں قید کر دیا ہو۔ اس لیے سب نے اُس کا نام "بھتنی" رکھ دیا۔

جب سب اُسے چھیڑنے کے لیے "بھتنی، بھتنی" کہتے تو وہ واقعی چڑیلوں کی طرح آنکھیں نکال کر غرّاتی۔ بلّی کی طرح وہ دشمن پر جھپٹا مارتی اور جہاں جہاں اُس کا ناخن لگتا کھال اُتری چلی آتی۔ جب وہ دانتوں سے کسی کی بوٹی چباتی تو اُوپر نیچے کے دانت گوشت میں آر پار ہو کر آپس میں بج اُٹھتے۔

وہ سپوت جو اُس کے پیٹ میں پل رہا تھا۔ اس کے سوندھی مٹی کے شوق کو بھانا ہی گیا۔ اس کی زبان پر نمک چھڑکا گیا، پھر کونین لگائی گئی مگر کسی طرح بھی مٹی کی چاٹ نہ گئی۔ کسی نے رائے دی: "چڑیل کی زبان جلا دو۔" کسی نے ترکیب بتائی: "سوئیاں چبھو دو کمبخت کے۔" مگر کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ جب وہ مٹی کھاتی پکڑی جاتی تو سمجھو اُس کے منہ پر طمانچے مارتی کہ ہونٹ کٹ کر خون نکل آتا مگر وہ پھر بھی تو کونے ہی چبا جاتی؛ دیوار پر سے چونا ناخنوں سے کھرچ کر کھا لیتی۔

ایک دن جب وہ اور بنیاں رفعِ حاجت کی غرض سے پاس پاس بیٹھی گپیں ہانک رہی تھیں کہ وہ سپوت وارد ہو گیا۔ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ وہ منجھو کے

پاس رہتی۔

"سانپ!" اُس نے منجھو کی ٹانگوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔ منجھو نے اسے پرے دھکیل دیا۔ تحقیقات کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ اُس کے پیٹ میں کینچوے پڑ گئے ہیں، لیکن اُسے یقین نہ آیا اور رات بھر وہ "سانپ، سانپ" چلاتی رہی۔ پورے وقت اسے پیٹ میں سانپ لہراتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ سانپوں کے بچے کے بچے، جیسے سپیرے کی ٹوکری میں کلبلاتے ہیں، اُس کے پیٹ میں اُدھم مچا رہے تھے۔ ایک کے پیچھے دوسرا اور دوسرے کے پیچھے تیسرا، ہزاروں سانپ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔

اس دن سے اُس نے پنیا کے ساتھ سوکھے ہوئے پتوں کے چھجوں میں بھر بھر کر مٹی کھانی چھوڑ دی۔ للچائی ہوئی نظروں سے وہ ریت کے ذروں کو گھورتی اور ایک دم وہ بڑھ بڑھ کر سانپوں کے پھن بن جاتے جو لپ لپ اپنی زبانیں نکال کر آنکھیں مٹکانے لگتے۔ مٹھی میں لے کر وہ ریت کو پیار سے سہلاتی۔ جی چاہتا بھر بھر مٹھیاں کھانا شروع کر دے اور ساری دنیا کی مٹی کو اپنی زبان کے نیچے تھوک میں رول ڈالے اور پھر یہ لیس دار کھویا سا اُس کے حلق کے نیچے پھسلتا چلا جائے، مگر فوراً ہی اُس کے پیٹ میں سانپ انگڑائیاں لینے لگتے۔ ایک دم دیوانوں کی طرح وہ ریت اُچھالنا شروع کر دیتی، زمین پر لوٹ جاتی اور ٹھنڈی ٹھنڈی مٹی پر اپنا گال رکھتی۔ اُس کے جسم کی رگیں ایک شکنجے کی طرح تن جاتیں اور وہ چاہتی کہ زمین کے کلیجے میں گھس جائے۔ جب ذرا جوش ٹھنڈا ہوتا تو آہستہ آہستہ وہ اپنا ماتھا زمین سے کھٹ کھٹ ٹکراتی۔

"دروازہ کھولو!" اس کا ماتھا التجا کرتا مگر زمین اُسی طرح ڈھیٹ بنی پڑی رہتی۔ اُسے زمین سے کیوں اتنا پیار تھا؟ وہ اس میں سما جانا چاہتی۔ پھر اگر کوئی دیکھ لیتا تو وہ ساری ریت جھاڑ دی جاتی، مگر جہاں موقع ملتا وہ مٹی میں جذب ہونے کی کوشش کرتی۔ "یہ خاک میں ملے کم بخت، جتنی دفعہ نہلاؤ اتنی دفعہ گندی!" منجھو کہتی۔

اور وہ سوچتی کاش کوئی جانتا کہ خاک میں ملنا اُس کے لیئے تو سزا نہیں بلکہ دُعا تھی، یہی تو اُس کی آرزو تھی۔

(۲)

لوگوں کو شادی بیاہ کا ارمان ہوتا ہے، مگر شمن کو کچھ دن سے کسی کو مارنے کا ارمان ہو گیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اُس کا جی پھڑ پھڑانے لگتا کہ وہ کسی کو مارے اپنے موٹے موٹے گھونسوں سے گھما گھما کر کسی کو کچل کر رکھ دے۔ بارہا ایسا ہوا جہاں سوکھی ہوئی بیٹ کا ننھا سا قمقمہ اُس کی ہر جنبش پر لرزنے لگتا ہے یا اس ننھی سی چوہیا کی طرف جو صبح سے تین بار سہمی ہوئی نظروں سے صندوق کے پیچھے سے جھانک چکی ہے، یا کسی اور چیز کو گھور رہی ہے، کہ ایک دم اُسے مارنے کا شوق چرّاتا۔ کبھی ایسا دیا لو کون، منّا جو اس سے پٹ لیتا۔ منجھو کیا مری سے جب چاہتی دھم سے اُس کی کمر پر گھونسا جما دیتی۔ اس کا بھی دل چاہتا کہ ایک دن وہ بھی منجھو بی کی اُدون کمر پر ایک تگڑا سا گھونسہ جمائے۔ پھر تخیل میں ہی وہ منجھو کو پیٹنے لگتی۔ وہ تھپڑ گال پر مار کر اُس کے کپڑے ست اُتار ڈالتی اور نہلانے لگتی۔ اس وقت اُسے کہیں سے اپنی بھولی بسری انّا کا دھندلا سا خاکہ یاد آجاتا اور اس کا جی بھر آتا اور غصّہ چڑھتا اور وہ منجھو کے سر پر بیسن ڈال کر خوب گھِستے لگاتی زور زور سے جھانوے سے اُس کی کہنیاں اور گھٹنے چھیلنے لگتی، پھر کھردرا سا تولیہ لے کر اتنا رگڑتی کہ منجھو کی کھال اُتر جاتی اور ناک لال چقندر ہو جاتی ایک کان کی لو لوٹ کر تولیہ ہی میں اُلجھ آتی، پھر وہ اُسے ایک عمدہ سی فراک پہنا کر کہتی "خبردار جو ہلی، ٹانگیں توڑ دوں گی!"

مگر جب وہ تخیل کی دنیا سے جاگ کر واپس آتی تو دیکھتی کہ کچھ بھی نہیں، اس کے دونوں ہاتھ پتھّر کی مورتی کی طرح گود میں اکڑے ہوئے ہیں، گردن کی رگیں تنے تنے دُکھ گئی ہیں۔ وہ ایک انتقام بھرا لمبا سانس کھینچ کر جسم کو اور تان لیتی اور ایک دم پاگلوں کی طرح زور زور سے بستر پر گھونسوں کی بارش کر دیتی۔ جب وہ جی بھر کر کوٹ چکتی تو تھک جاتی، جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتی اور بڑا ہی [illegible]۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے اُسے اپنی گڑیا کو مارنے کا دورہ اُٹھا۔ پہلے تو اُس نے اُس کے ہولے ہولے دو ننھے ننھے طمانچے مارے پھر ایک دم اُس پر بھوت سوار ہو گیا: دھڑا دھڑ اُس نے گھونسوں اور لاتوں کی بوچھار کر دی، دانتوں اور ناخنوں سے اُس کے پرزے پرزے کر دیے گویا وہ اپنے کسی خوفناک دشمن سے لڑ رہی ہو۔

گڑیا کا چورا چورا ہو گیا، اس کے جسم میں بھرا ہوا برادہ بکھر گیا اور کچھ شمن کی زبان پر چپک گیا۔ اس کے بعد اُس کا پیٹ بھر گیا اور وہ اطمینان کا سانس لے کر ہانپتی ہوئی چت پڑ گئی۔ برادے کا مزہ بڑی دیر تک اُس کی زبان پر باسی خون کی طرح جما رہا۔

پھر ایک دم اس پر خوف طاری ہو گیا، جیسے اُس نے سچ مچ کسی کو قتل کر ڈالا ہو۔ ڈر کر وہ کھکھیانے لگی اور جلدی جلدی گڑیا کے پرزے مسند دق کے نیچے چھپا دیے۔ وہ منجھو بی کی پناہ کی طرف بھاگی۔ منجھو بے خبر بیٹھی، اپنا کرتا سی رہی تھی، اُس کی ران سے لگ کر لیٹ گئی اور اُس کی گردن پر اپنی سہمی ہوئی انگلیاں پھیرنے لگی۔

منجھو بی فراکیں سینا ہی نہیں جانتی تھی بلکہ ایک دن اُس نے ایک الف بے کا قاعدہ منگا کر مشین سے سی ڈالا۔ شمن پاس بیٹھی مشین کے دانتوں کو کٹ کٹ کاغذ چباتے دیکھتی رہی۔ دانتوں میں ہلکی سی لطیف کھجلی ہونے لگی۔ اُس نے دانتوں پر انگلی پھیر کر عجیب سی لہر اپنے جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ قاعدہ سی کر منجھو نے اُسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔

"آج سے تم پڑھنا شروع کرو گی، اچھا؟"

"اچھا!" شمن نے مان لیا اور قاعدہ دیکھنے کے لیے اُچکنے لگی۔ یہ پہلی یا شاید دوسری کتاب اُس کی زندگی میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک تو وہ جسے پڑھتے میں پریشان کرنے پر منجھو بی اُسے مار دیا کرتی تھی۔ ویسے گھر میں پڑھنے لکھنے کا سارا دلچسپ سامان اس کی پہنچ سے دور رکھا جاتا تھا۔ مارنے کے کام کا تو تھا نہیں یہ قاعدہ اس سے بہتر تو وہ اخبار ہوتا تھا جس سے ابا لفافہ سا بنا کر پیار میں اُس کے سر پر مارا کرتے تھے۔

"دیکھیں، دیکھیں منجھو بی!" اُس نے کتاب لے کر دیکھنا شروع کی پھر فراک میں اُس کی نکلی سی بنا کر منجھو کے سینے پر ماری۔

"اے گدھی، تمام موڑ کر رکھ دی۔" منجھو نے اُس سے قاعدہ لے لیا۔
"دیکھو یہ الف ہے، الف۔"
"کاں؟" اُسے بالکل یقین نہ آتا۔
"یہ ۔۔۔ یہ الف سے انار۔"
"ایں ہیں، الف سے انار کہاں ہوتا ہے۔ انار تو آتشبازی میں چھوٹتا ہے ڈرڑ۔
ہیں نا؟"
"ہٹ، یہ دیکھ۔ یہ الف ہے۔ الف سے انار ۔ ۔ ۔ کہو، الف"
"کہو، الف۔"
"یوں کہو ۔ ۔ ۔ الف ؛"
"نہیں، ہم نہیں کہتے۔ پہلے یہ بتاؤ یہ کیا ہے ۔ ۔ ۔ یہ۔ یہ۔"
"یہ جیم ہے۔"
"اور یہ؟"
"یہ ص، ض۔"
"اونہوں۔ ص ض نہیں ہیں، یہ تو چاٹنے دانیاں ہیں۔"
"چل پگلی۔ یہ دیکھو، الف سے انار، کہو۔"
"کہو۔" وہ بے وقوفوں کی طرح منجھو کا منہ تکنے لگی۔
"ارے میں کہتی ہوں الف کہو۔" صبر کا پیمانہ چھلکا۔
"الف کہو۔"
"اونھ چڑیل۔" منجھو نے دھکا دے کر اُسے اپنی گود سے انڈیل دیا اور اُٹھ کر برآمدے میں چلی گئی۔ شمن نے قاعدہ اُٹھا لیا۔ بالکل سوڑ کمبخت، سوڑ تھا قاعدہ۔ کالی کالی ٹیڑھی تصویریں! سوائے لوٹے کی شکل کے؛ ص ض کے اسے کچھ نہ بھایا اور جیم کو تو وہ دیکھ کر تپ ہی گئی۔ کس قدر اترائی ہوئی چھترانی کی شکل کی تھی! توبہ! الف سے انار! ہنہ، بھلا کیسے؟ یہ مٹکے کی شکل کا انار، نہ لال لال چنگاریاں نہ

کچھ۔ بالکل ردّی۔ خیر الف تو وہ پڑھ لے گی مگر "جیم"، تو مر جائے جب بھی نہیں پڑھے گی۔ بہت ہو گا منجھو گھونسے مارے گی، مگر برزخ ہی کیا ہے! مار نے دو، اپنا کیا جاتا ہے! گھم سے، جیسے محرم میں ڈھول بجا! اس پر پھر کسی کو محرم کے ڈھول کی طرح پیٹ ڈالنے کا جنون سوار ہوا مگر وہ ضبط کر گئی۔ اُس نے دھیان بٹانے کے لیے قاعدہ اُٹھا لیا۔ کت مشین کے دانتوں کے نشان دیکھ کر اُس کے اپنے مسوڑھوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ یوں ہی جو سرے پر لٹکتا ہوا ڈورا پکڑ کر کھینچا تو کچے زخم کی طرح ٹانکے ٹوٹتے چلے آئے۔ بڑا مزا آیا، جیسے وہ جلدی جلدی چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں پر سے اتر رہی ہو۔ قاعدے کے ورق بکھر گئے۔

ارے! منجھو شرطیہ بُرا مانے گی، اور کیا عجب جو مار بھی بیٹھے! اُس نے جلدی سے قاعدے کے ورق سمیٹ کر مشین کے دانتوں کے نیچے رکھ دیے اور ہینڈل گھماتی رہی۔ کت کت، کت کت۔ وہ ادھر سے اُدھر بڑی مشاقی سے چلا رہی، یہاں تک کہ قاعدہ سوزنی کی طرح ٹانکوں سے بھر گیا۔ خیر اچھا ہوا، "ص ض" کمبخت چائے دانی کی شکل کے غارت ہو گئے اور "جیم" بھی مٹ گیا۔

مگر جب منجھو نے قاعدے کی صورت دیکھی تو تمام گزشتہ گھونسوں سے زیادہ وزنی گھونسا جمایا، اس کے بعد تھپڑ اور چانٹے۔ وہ دیر تک بیٹھی بے آنسوؤں کی سوکھی سوکھی سسکیاں بھرتی رہی۔ اگر ہر بار مار پڑنے پر آنسو گرانا لازمی ہوتا تو یقیناً مصیبت ہو جاتی اور اس کی آنکھوں کے ڈھیلے کبھی کے بہ گئے ہوتے۔ اُدھر منجھو کے تھپڑوں کا خزانہ کم ہوتا نظر آتا، اور جو وہ ہر تھپڑ پر ایک آنسو بھی بہاتی تو سات سمندر کا پانی ہوتا سو بھی خشک ہو جاتا۔ اس لیے وہ اب بس گلے سے رو لیا کرتی تھی، دماغ بالکل پرسکون اور غیر متاثر رہتا۔

یہ دوسری کتاب تھی جس سے اُسے دلی بغض ہو گیا۔ ایک تو وہ ناول ہی کیا کم تھی جسے پڑھتے وقت منجھو بی اس کی کسی آہ و زاری پر کان نہیں دھرتی تھی، اب دوسری یہ جس کی آمد ہی منحوس ثابت ہوئی۔

مگر یہ کتاب تو اس کی جان کو چمٹ گئی، ایسی کہ چھٹنا دشوار ہو گیا۔ الف تو خیر دل پر پتھر رکھ کر پڑھ لیا مگر جیم، حتیٰ کہ ص ض کمبخت بھی پڑھنا پڑے۔ حیرت تو اسے جب ہوئی جب اسے معلوم ہوا کہ۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا؟ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

بات یوں ہوئی اس نے ایک دن منجھو سے پوچھا:

"منجھو بی، جب قاعدہ ختم ہو جائے گا تو مٹھائی بٹے گی نا؟"

"ہاں، اور پھر دوسری کتاب شروع ہو گی۔"

"دوسری؟...... پھر؟"

"پھر پڑھے بھائی جیسی موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرنا۔" منجھو نے نہایت معصومیت سے بتایا۔ کس سادگی سے وہ اسے آنے والی بلاؤں سے دوچار کر رہی تھی!

خاموش۔ اپنی گود میں ہاتھ سمیٹے وہ بیٹھی رہی اور ایسا محسوس ہوا کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک موٹی سی بھیانک کتاب اس کے سر پر پتھر کی سل کی طرح گرتی ہے جس میں ص ض اور ج سے بھی زیادہ کمینے اور غیر دلچسپ الفاظ موجود ہیں۔

بہت سے بہن بھائیوں اور بھرے پُرے خاندان میں زندگی کے دن ماضی کی تاریکی میں ڈوبتے چلے گئے، جیسے کوئی بہت سے کنکروں کو سوپ میں ڈال کر پھٹک رہا ہے اور ہر کنکر سوپ کے دندانوں میں پہنچ کر گارڈ سے جدا ہوا ہے۔ سائیں سائیں، لمبے لمبے پینگوں کی طرح زندگی گزرنے لگی۔

(۳)

منجھو بی مارتی تھی تو کیا تھا، دُلار بھی تو کرتی تھی۔ پیٹ کوٹ کر جب اسے خوب رُلا چکتی تو سینے کی گرمی سے اس کے سارے زخم سینک دیتی۔ پر اب اس کی زبان چل نکلی تھی۔ جب منجھو مارتی تو وہ کوسنے دینے لگتی جو اس نے نوکرانیوں سے سیکھ

سیلے تھے،

"مرجائیے! اللہ کرے منجھو بھی مرجائے!" امّاں اپنی لاڈلی کو کوستے دیکھ کر خوب بگڑیں۔

"کھود کے گاڑ دوں گی جو میری بچّی کو کوسا، کلموہی کہیں کی" وہ خود تو امّاں کی بچّی تھی نہیں، اس کی بدمعاش انّا کے جانے کے بعد سے منجھو ہی اس کی ماں تھی۔

"یوں کہو کہ اللہ میاں منجھو کا بیاہ ہو جائے۔" امّاں نے سکھایا۔ اور اس نے یوں ہی کہنا شروع کیا۔

"اللہ میاں منجھو کا بیاہ ہو جائے۔ منجھو بی کا بیاہ ہو جائے۔" اس کوسنے کا کافی اثر ہوتا۔ پہلے تو منجھو بگڑتی اور زور سے دھموکے مارتی مگر پھر اُس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ جاتے اور وہ مسکرا مسکرا کر شرمانے لگتی۔

دعا نہ جانے کیسے بُرے وقت منہ سے نکلی تھی کہ جھٹ قبول ہو گئی۔ کچھ ایسی گڑبڑ تھی کہ اُس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ گھر اُتھل پتھل ہو گیا۔ منجھو گھبرا گھبرا کر ایک کمرے میں بٹھا دی گئی اور خوب غل مچایا گیا۔ الٹی سیدھی مٹھایاں اور زرق برق کپڑے چاروں طرف پھیل گئے، اچھا خاصہ گھر ہاٹ بن گیا۔ دنیا بھر کی عورتیں، لال ہرے کپڑوں میں لپٹ کر دوڑ پڑیں۔ دھوا دھوں باجے بجنے لگے۔ جب عورتیں منجھو کا دولہا دیکھنے دوڑیں تو وہ بھی بلک گئی۔ کسی نے اُسے گود میں لے کر دولہا دکھانا چاہا مگر وہ نہ دیکھ سکی۔ "یہ تو آدمی ہے، دولھا۔" وہ چلائی اور مچل گئی۔ پھر کسی نے اُسے دُولہا دکھانا ضروری نہ سمجھا۔ وہ بھی اکتا کر اُبٹنے میں لسی ہوئی منجھو سے لپٹ کر سو گئی۔

رسموں کے وقت لوگوں نے چاہا وہ دولہا کے مہندی لگا دے، مگر وہ اس پر بھی بگڑ کھڑی ہوئی کہ اول تو وہ دولہا نہیں سیدھا سادہ آدمی ہے اور آدمی مہندی نہیں لگاتے۔ اس پر اُسے دیوانی کہہ کر دور ڈھکیل دیا گیا۔

منجھو تو دلہن بنی بیٹھی تھی اس لیے وہ بے نتھے بیل کی طرح گھومتی رہی۔ پہلے

تو اُس نے بری کی شکر پڑے جا کر خوب غسل خانے کے مٹکوں میں گھولی جس سے بیویاں استنجہ کر کے بدحواس ہو ہو گئیں۔ اس کے بعد باورچی خانے کی طرف متوجہ ہوئی اور وہاں خوب ہانڈیوں میں نمک، کوئلے اور راکھ جھونکی۔ باورچی کسی دوسری طرف لگے ہوئے تھے وہ کھیر کے پیالے گننے لگی۔۔ چاندی کے ورق اور پستوں کی ہوائیاں لگے ہوئے پیالے کا مدار شطرنجی کی طرح بچھے ہوئے تھے۔ بڑے ہی بھلے معلوم ہوئے۔ بے اختیار اُس کا جی چاہا ان کے بیچ میں جو خالی جگہ ہے وہاں پیر رکھ رکھ کر چلے۔ وہ تول تول کر قدم اُٹھانے لگی۔ ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔ کسی نے دیکھ لیا اور وہ گڑبڑا کر جو بھاگی تو دھڑام سے کھیر کی کیچڑ میں سر سے پیر تک لت پت۔

نہ جانے کس نے اُسے نہلانے کی کوشش کی مگر وہ تو منجھو کے نہلانے کی عادی ہو چکی تھی۔ یوں رساں رساں نہلانے سے وہ چڑ گئی اور خوب ضدیں کیں، پانی کے چھینٹے اُڑائے۔۔ وہ عورت تو کمر بند کی لکڑی ڈھونڈنے لگی ادھر اس نے تولیہ باندھ کر ٹہلنا شروع کیا۔ منجھو بی کے بھاری بھاری جہیز کے جوڑے دکھانے کے لیے ایک کمرے میں سجا دیے گئے تھے۔ اُس نے ستارے نوچ نوچ کر تھوک سے ماتھے پر چپکا لیے، سلمہ کے تار کھینچ کر اُن کے چھلے بنا لیے، ڈبیوں کی تہیں کھول کر خوب پھیلا دیے۔ اتنے میں اس کی نظر گوٹہ لگی ہوئی چولیوں پر پڑی جھلمل کرتی زرکار ڈوریاں! اُسے انہیں پہننے کا کتنا ارمان تھا مگر اسے تو دیکھنے کو بھی نہیں ملتی تھیں۔ اماں تو غسل خانے میں ایسے چھپ کر پہنتی جیسے موٹی سی گالی ہو، اور میلے کپڑوں کے ڈبے میں اس کا ہاتھ بھی تو نہ جاتا تھا۔ جلدی جلدی اُس نے چاروں طرف دیکھ کر اُلٹے سیدھے سوراخوں میں ہاتھ ڈال کر ڈوریاں گلے میں کس لیں، پھر اُس نے بھاری کریب کا ڈوپٹہ نکال کر اوڑھا اور اطلس کا پاجامہ دیکھ کر تو اُس کے دل میں دُکھن سی اُٹھنے لگیں۔ جانگیے پہنتے پہنتے اُس کا جی متلا گیا تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ پھولوں کا ڈھیر اُس نے گھسیٹ کر ٹانگوں میں پھنسا لیا۔ پھر کریپ کے ڈوپٹے کا گھونگٹ نکال کر وہ چاروں طرف فرضی مہمانوں کو جھک جھک کر سلام کرنے لگی۔

"جیتی رہو بیٹی، دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو" اُس نے انہیں کہتے سُنا۔ اور پھر ٹھوڑی اپنی ہتھیلی پر ٹکا کر گھر والیوں کی طرح:

"اری رسولن، او، رسولن! کہاں مر گئی ماری ادی! جا علی بخش سے کہہ کہ سودا نہیں لائے! ہاں جلدی سے لائیں مونگ کی دال اور۔۔۔ اور بھُنی ہوئی گرم گرم مونگ پھلیاں۔ ہاں، شمن بی کے لیے شکر کی گولیاں بھی"

وہ خیالی ماما کو ڈانٹنے لگی۔ باتیں کرتے کرتے اُسے یاد آیا ارے، ننھّا تو گھٹنے پر سو رہا ہے! جاگ گیا۔ اُس نے پھرتی سے گھٹنا ہلانا شروع کیا جیسے بچّے کو ہلکورے دے رہی ہے:

"نائیں میرا چاند، میرا کلیجے کا ٹکڑا۔ سے بھوکا ہے دُدو پیئے گا! اُوں اُوں"

کرتا سر کا کر وہ نقل میں گھٹنے کو دبوچنے لگی، مگر فوراً ہی کسی آوارہ مچھر کے کاٹے ہوئے نشان نے اُس کی ساری توجہ کھینچ لی۔ بچّہ وچہ بھول کر وہ ہونٹ لٹکا کر ددوڑا دیکھنے لگی:

"کاٹ کھایا مُری پلیٹے نے!" وہ اپنے گھٹنے پر چپتیں لگانے لگی۔ اور پھر اسے کسی کو مارنے کا دورہ پڑ گیا۔ دھما دھم اُس نے جہیز کی چیزوں کو دونوں ہاتھوں سے کوٹنا شروع کیا۔ ذرا سی دیر میں کھیت کا کھلیان کر کے رکھ دیا۔ لوگ آ گئے اور اُسے یونہی گھسیٹ کر باہر نکال دیا گیا۔ اتنی فرصت کسے تھی جو اُس کا پاجامہ ڈھونڈ کر پہناتا! لہٰذا شام تک وہ تولیہ لپیٹے اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔

مگر اُسے ایک تجربہ ضرور ہوا کہ تولیہ پاجامے سے کہیں زیادہ آرام دہ اور مفید ہوتا ہے: ایک تو گھڑی گھڑی کمربند ڈھیلا تنگ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، دوسرے اس عجیب و غریب ہیئت میں دیکھ کر بہت سے بچّے تو آتشِ رشک سے بُھنے جا رہے تھے۔ دو چار اس تاک میں لگے تھے کہ تولیہ ہٹ جائے تو اُسے ننگا دیکھ لیں، مگر وہ اُنہیں جوتیوں سے مار مار کر بھگا رہی تھی۔ اسے اس کھیل میں بڑا مزا آ رہا تھا۔

"ہم سو رہے ہیں، ہمیں جگانا مت!" وہ بن کر سو جاتی اور بدذات بچے اس کا تولیہ چھیننے لگتے۔ پھر وہ جاگ جاتی اور خوب ناخونوں اور دانتوں سے ان کی تواضع کرتی۔

جدھر وہ نکل جاتی سب اسے ڈانٹتے۔ بہنیں چپتیں لگا کر دھتکار دیتیں مگر کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ تالہ کھول کر اس کا پجامہ نکال دے۔ خدا خدا کر کے شام کو جب دولھا کے آنچل یا کسی دوسری ضروری رسم کا وقت آیا تو اس کی تلاش ہوئی اور وہ پچھلے دالان میں عجیب و غریب کھیل کھیلتی ہوئی پکڑ کر ماری گئی۔

دولھا آیا، غل مچا، کسی نے اسے جوتا چھپانے کو دیا۔ بڑی دیر تک تو وہ اس جوتے سے کھیلتی رہی، پھر سو گئی۔ رات کو جب دولھا جانے لگا تو جوتے کی ڈھنڈیا پڑی، لوگوں نے اسے جگایا تو وہ بوکھلا کر ان سے لپٹ گئی۔ کوئی خواب دیکھ رہی تھی، بے تحاشہ چلائی: "دولی . . . ارے میری دولی!"

کہتے ہیں دولھا تھوڑا ننگے پیر گیا۔ صبح کو جوتا پینے کے پانی میں لاش کی طرح پھولا ہوا ملا۔ خوب سمدھنوں نے اس کا شربت پیا۔ لاکھ لوگوں نے چاہا کہ وہ بتا دے کہ اس نے جوتا مٹکے میں کس غرض سے ڈالا تھا، مگر وہ کچھ بھی نہ بتا سکی۔

"جوتا؟ مٹکا" وہ یہی پوچھتی رہی، مگر پھولا ہوا جوتا دیکھ کر اس کے دل میں گدگدی ہونے لگی اور وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

(۴)

جب مجھو بیاہ کر جانے لگی تو شمن ذرا بھی نہ روئی بلکہ چپکے سے پالکی میں جا کر بیٹھ گئی۔ مجھو جانے سے پہلے اسے یاد کرتی رہی مگر وہ نہ ملی۔ جب دلہن اور اس کی ساتھ والیاں پالکی میں بیٹھیں تو ان میں سے سب سے موٹی عورت شمن کی گود میں چڑھ بیٹھی۔ وہ زور سے چلاتی مگر موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ضبط کر گئی اور موٹی عورت کے کولھوں میں کچکچا کر دانت گاڑ دیے۔ ایک غدر مچ گیا، پالکی لوٹتے لوٹتے بچی، مگر شمن پکڑی ہی گئی۔ لوگوں نے اسے گھسیٹ کر اتارا۔ ہزار لاتیں جمائی گئیں

کوسا، گالیاں بکیں مگر کوئی سنوائی نہیں ہوئی۔

منجھو بی چلی گئیں، گھر میں جیسے موت ہو گئی! سارا گھر سو گیا مگر شمن کے حصے کی نیند غائب تھی۔ کئی دفعہ وہ منجھو کو پکار پکار روئی، ہچکیاں لیتے لیتے حلق دکھ گیا، آواز پڑ گئی، مگر کون سنتا ہے؟

"منجھو بی.... منجھو بی... ہائے منجھو بی؟" وہ رات بھر سسکیوں سے پکارتی رہی۔ شادی کے تھکے ہارے مہمان اور میزبان دنیا سے بے خبر سو رہے تھے اور وہ اکیلی اِدھر اُدھر بھٹکتی پھر رہی تھی۔

منجھو کے جاتے ہی اس کی گت بن گئی۔ کئی دن تک تو کسی کو یاد ہی نہیں آیا کہ وہ بھی گھر میں ہے یا نہیں، نہلانے اور کنگھی کرنے کی ضرورت بھی ہے۔ جب بہت ہی اس میں سے بساند پھوٹنے لگی تو سڑتی ہوئی نالی کی طرح لوگ اس سے دور دور رہنے لگے۔ میل اور کھجلی سے بے قرار ہو کر وہ راتوں کو چلاتی اور دن بھر کونوں کھدروں میں بھٹکتی پھرتی۔ تب اماں کو نہلا دینے کا خیال آیا۔

سر کے بال چپک کر چٹائی بن گئے تھے اور بدن پر میل کی پپڑیاں بندھ بندھ کر اکھڑ رہی تھیں۔ نائن کے بس کی کہاں تھی! جب اس نے نہلانا چاہا تو اسے مارنے لگی۔ بال نچے تو اسے پچھاڑ کر ننگی بوچی بھاگی۔ دونوں میں بڑی دیر تک برآمدے میں ریس ہوتی رہی۔ شمن آگے آگے اور نائن پیچھے پیچھے۔ آخر کو موری کے پاس پھسل کر گر پڑی۔ نائن نے پکڑ دھکڑ کر نہلا تو دیا، مگر کیسا! یہ وہ خود ہی جانتی تھی! الجھے بال ویسے ہی میل اور چیکٹ کا جو نا بنے رہے۔ میل ذرا پانی ڈالنے سے پھول گیا اور میلے کپڑے کی رگڑ سے نمی دور ہو گئی، البتہ ویسا ہی جما رہا اور اس نے کپڑے پہن لیے۔ پھر تو یہ حال ہو گیا کہ جس دن وہ نہاتی اماں موٹی سی قمچی لے کر بیٹھ جاتیں اور بیچ بچ کی لاش نہلائی جاتی، کیونکہ ایسی ویسی مار کو وہ خاطر ہی میں کب لاتی تھی۔

دن بھر وہ منجھو کو بھولے رہتی مگر رات کو وہی منجھو بی کی رٹ لگاتی۔ تنگ آکر

امّاں نے بوڑھی دوا سے کہا کہ "لو! تم ہی سُلا لو اللہ ماری کو۔" مگر شمن نے سوتے میں انہیں اپنے پاس لیٹا دیکھ کر اُن کے بال کھسوٹ ڈالے اور ڈھکیل دیا۔ اکیلی پڑی اپنی ہتھیلیوں کو چبایا کی۔ جب سب سو جاتے وہ جاگا کرتی، اُس کے ہاتھ منجھو کی گردن کی تلاش میں کھری پٹیوں پر رینگا کرتے۔ اُس کا جی چاہتا بس ایک دفعہ وہ نرم نرم گردن اس کی گرفت میں آ جائے، پھر تو وہ مر جائے گی پر نہیں چھوڑے گی۔ پڑی پڑی وہ منجھو کے کمینے دولہا کو کوسا کرتی جو اُسے چیل کی طرح جھپٹا مار کر چھین لے گیا۔ وہ منجھو کے اس نابکار دولہا کو کوسنا بھی شاید خدا نے سن لیا اور ایک دن تار آیا اور گھر میں ماتم ہونے لگا۔

"تمہارے دولہا بھائی مر گئے، تم روتی نہیں؟" تحصیلدارنی کے لڑکے نے اس سے کہا۔

"کون، منجھو بی کا دولہا؟" وہ خوشی سے چونکی۔

"نہیں، بڑی آپا کے دولہا۔" ٹھاک پر سے بڑی آپا کے دولہا کے مرنے کا کیسے ارمان تھا! بدمزاج کہیں کے۔ پچھلی دفعہ گنے لائے تو سارے امّاں کو بھجوا دیئے، ایک پوری بھی نہ چوسنے دی۔ اسے سخت ناامیدی ہوئی اور وہ رو پڑی۔ سب سمجھے وہ غم میں شریک ہو رہی ہے۔ اس لیے اور بچوں کے ساتھ بہلانے کو اُسے تحصیلدارنی کے یہاں بھجوا دیا گیا جہاں اُسے بھنے ہوئے میٹھے انڈے کھلائے گئے۔

"جب منجھو بی کا دولہا مرے گا تو اس سے بھی مزیدار انڈے ملیں گے!" وہ انڈوں کا مزہ دیر تک منہ میں قائم کرنے کی کوشش کر کے سوچتی رہی۔

بڑی آپا بیوہ ہو کر میکے میں آن رہی۔ اُس کے دونوں بچے بھی آ گئے جنہیں چھونے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ کبوتری کے گھونسلے میں ہاتھ ڈالو تو کیسی زور کی ٹھونگ مارتی ہے، ویسے ہی جب بڑی آپا کے بچوں کو کوئی چھیڑتا تو چنگھاڑتی ہوئی لپکتی۔

جب خدا خدا کرکے منجھو سسرال سے آئی تو شمن کا مارے غصّہ کے بڑا حال ہو گیا۔ وہ تو سمجھی تھی جیسے وہ اُس کے بغیر دیوانی کتیا بن گئی ہے منجھو بھی میلی کچیلی چوہیا روتی بسورتی اُترے گی، مگر اُسے پہلے سے بھی موٹا اور زیادہ لال دیکھ کر اُسے اپنی سخت ہتک محسوس ہوئی۔ جھوٹی کہیں کی! اماں کو لکھا کرتی تھی: "مجھے اپنی شمن بہت یاد آتی ہے۔" خاک یاد آتی ہوتی تو لیوں طباق سا چہرہ نہ ہوتا۔ سر سے پیر تک ریشمی کپڑوں میں غرق۔ بجتے زیور، کانوں میں لمبے لمبے جھمکے، جنھیں بات کرتے میں وہ قصداً جھلاتی، اور ناک میں جھلکتی ہوئی کیل۔ شرما کر بات کرتے میں وہ ہمیشہ اس کیل کو نزاکت سے آنکھ نیچی کرکے دیکھنے کا انداز، اور وہ باریک ریشم کی جالی کا کرتا جس کے اندر سے گوٹے کی چولی بادلوں میں چھپے چاند کی طرح جھلملا اُٹھتی۔ آتے ہی وہ پاگلوں کی طرح سب کے گلوں سے لٹکنے لگی مگر اُس نے شمن کو دیکھا بھی نہیں۔ وہ بدل بھی تو بہت گئی تھی۔ ساری پھول جیسی فراکیں مرجھا گئی تھیں اور جانگیوں کے بجائے اُو ٹنگے بدوضع پاجامے پہننے لگی تھی۔ بڑی دیر بعد نہ جانے کیسے وہ اسے یاد آ ہی گئی:

"شمن کہاں ہے؟" اُس نے پوچھا اور اُس کے دل کو بُری طرح ٹھیس لگی۔ اُدھر تو اب بی منجھو اُسے پہچانیں گی بھی نہیں۔ یہ گھنٹہ بھر سے دروازے سے لگا کون ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھے جا رہا ہے؟ کس نے کئی بار اُس کا ریشمی دوپٹہ چھو کر متوجہ کرنے کی ناکام کوششیں کیں؟ اور یہ کون صبر کیے دیوار سے خاموش لگا کھڑا ہے! شمن نہیں تو پھر اور کون ہو سکتا ہے؟ مگر اُسے ماں، بہنوں کے گلے سے فرصت ملے تو کسی اور کا بھی دھڑکتا ہوا دل ذرا سکون پائے۔ آپا کی لڑکی نوری کو تو آتے ہی کلیجے سے لگا لیا اور شمن جیسے چھل پیری چڑیل تھی کہ لوگوں کو نظر بھی نہ آئی!

مگر پھر بھی جب منجھو نے اُسے اپنے مہکتے ہوئے سینے سے لگا لیا تو اُس کے دل میں ہزاروں سوتے پھوٹ نکلے اور سوکھی ہچکیاں لیتی وہ اُس کے شانے

سے ٹک گئی۔

"جوئیں، جوئیں، اے ہے منجھو، موئی کے ہزاروں جوئیں بھری پڑی ہیں۔" آپا اور اماں چلائیں اور منجھو نے ڈر کر اسے دور دھکیل دیا۔

"گندی ہیں، یہ بھنگن کی لونڈیا۔" نوری اترائی اور منجھو کی گود میں چڑھ بیٹھی۔ منجھو پھر باتوں کے ریلے میں بہہ گئی اور کسی نے نہ دیکھا کہ شمن دھکا کھا کر باہر چل دی اور چپکے سے سرک کر میلے کپڑوں کے گٹھڑ میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج وہ دل اور دماغ دونوں سے رو رہی تھی۔ کھارے کھارے آنسو میلے بدبودار کپڑوں میں جذب ہو رہے تھے۔ نہ جانے کب تک وہ پڑی روتی رہی، کسی کو یاد بھی نہ آئی۔ بچے دوڑ دوڑ کر منجھو کی لائی ہوئی مٹھائی کھا رہے تھے۔ نوری اب بھی اس کی گود میں ڈٹی اس کی چمپا کلی سے کھیل رہی تھی۔ منجھو نے گڑیا نکال کر اسے دی اور دوسری نکال کر شمن کو پکارا۔

"نہیں ہم دونوں لیں گے!" نوری مچل گئی۔ ویسے شمن اتنی ذلیل نہ تھی جو منجھو کی گڑیا پر اس کی نیت بھٹکتی مگر جب دونوں گڑیاں نوری داب بیٹھی تو وہ ضبط نہ کر سکی، اس نے منہ پھیر لیا اور چھت میں لٹکے ہوئے جالوں کو دیکھتی رہی جس میں نیم مردہ مکھیاں جھول رہی تھیں۔ اس پر پھر دورہ سا پڑ گیا، وہ دانتوں سے میلے کپڑے کھسوٹنے لگی۔ بدبودار پاجامے، سڑی ہوئی بنیانیں اور لبساندے کرتے۔ وہ غصے میں ان سب کو نگل جانا چاہتی تھی۔

تھک کر وہ باہر برآمدے میں آکر کونے میں بیٹھ گئی۔ آج اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نظروں سے غائب ہو جانے والی ٹوپی پہنے ہے۔ آزمانے کے لئے وہ کئی بار سامنے سے گزری مگر نہ منجھو نے اسے دیکھا اور نہ نوری نے، جو دونوں گڑیا سمیٹے منجھو کے پلنگ پر بیٹھی تھی۔

منجھو کے پلنگ میں ابھی تک دلہناپے کے دھندلے سے نشانات موجود تھے تکیے نہی سرخ ساٹن کے جن پر جمائے جیسے کڑھے ہوئے غلاف چڑھے

تھے اور وہی کارچوبی گوٹ کی رضائی۔ نوری اُس کے تکیوں پر سر اوندھائے
قلابازیاں کھا رہی تھی۔ شمن کا کتنا جی چاہا کہ جا کر نوری کو اتنی زور سے دھکیلے کہ
وہ اندھے کنوئیں میں جا گرے اور پھر دونوں گڑیاں چھین لے۔

دیر تک بلبلی منجھو کے مہندی لگے پیروں کو پلنگ کے نیچے سے جھانک کر
دیکھتی رہی۔ لال لال پیر جس میں گھنگرو دار پازیب! اُس کا گلا رقت سے بھنچ گیا۔
کاش وہ سب کی آنکھ بچا کر کسی طرح پلنگ کے نیچے رینگ کر پہنچ جاتی اور اُن دو
گھنگروؤں کو آہستہ سے اُنگلی سے بجا کر دیکھتی جو اُس کی حنا آلودہ ایڑی پر ہلکی ہلکی
جنبشوں سے ناچ اُٹھتے تھے۔ اتنے میں اُسے نوری نے دیکھ لیا۔

"خالہ جان شمن مہترانی کی لڑکی ہیں۔" انہیں نانی نے بھنگن سے دو پیسے
کو لیا تھا۔" وہ تملا کر بولی اور بڑی آپا نے پیار سے اُس کے تھپڑ لگایا۔ منجھو نے
مڑ کر اُسے دیکھ لیا مگر وہ وہاں سے بھاگ آئی۔ پھر منجھو کا دولہا بھی گھر میں آگیا۔
منجھو کچھ شرمائی کچھ اترائی باتیں کرتی رہی۔ دولہا کی آنکھیں شاید تیز تھیں، اُس نے
شمن کا بھوت دیکھ لیا:

"ارے بھئی یہ تمہاری بہن شمن کیوں الگ کھڑی ہے؟"

"ان کے جوئیں ہیں۔" نوری نے جلدی سے اطلاع دی۔

"ارے ہے جوئیں! یہ تو بڑی بات ہے، چہ چہ۔" شمن اور جل گئی، یہ
کمبخت کون ہوتا ہے چہ چہ کرنے والا۔

"بھئی یہاں آؤ۔" اُس نے پھر بلایا۔

"انہیں مت بلائیے۔ یہ بُری ہیں، ان سے کوئی بھی نہیں بولتا۔" نوری دولہا
کی گود میں بھی چڑھ گئی اور پھر دولہا نے منجھو سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا۔
اُس نے چونک کر شمن کی طرف دیکھا، شمن سمجھ گئی اور پھر گرتی پڑتی بھاگی کہ اب
اُس کے ساتھ ہمدردی جتانے کی سازش ہو رہی ہے۔

پھر اندھیری کوٹھڑی میں جا کر اُس نے "منجھو بی، منجھو بی" پکارنا شروع کیا

مگر بیکار، جیسے وہ کسی مردے کو قبر سے کھینچ بلانے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ منہ اوندھائے وہ پڑی تھی کہ کسی نے زور سے ہاتھ جھٹک کر اُسے چونکا دیا۔

"خبردار جو لیویں میلی کچیلی منجھو کے کمرے میں گئی، مُردار کہیں کی" بڑی آپا نے بے رحمی سے اُسے جھنجھوڑیاں دیں۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا تو وہ کچکچا کر لپٹ ہی جاتی اور اُن کی بوٹیاں اُڑا دیتی مگر اس وقت تو کسی نے اُس کے سارے احساسات پر چوٹیں مار مار کر سُن کر دیا تھا۔ وہ سہم کر دوسری طرف جانے لگی، اتنے میں منجھو باہر نکل آئی۔

"شمن" اُس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ شمن کو بڑی بہادری سے کام لینا پڑا ورنہ اُس کے جسم کا رواں رواں کھینچ کر منجھو میں جذب ہو جانے کے لئے تڑپ اُٹھا۔

"چل ادھر کمبخت، کیا گت بنا لی ہے، ذرا سے دنوں میں" منجھو نے کس کس کے دو گھونسے جمائے۔ شمن پھوٹ پڑی۔ دُکھ سے نہیں، اُن توجہ بھرے گھونسوں کی لذت سے اُس کا جی دکھ اٹھا۔ گھسیٹتی ہوئی اُسے غسل خانہ میں لے گئی۔ شمن کا دل زور سے دھڑکنے لگا، آنسو بے تاب ہو کر نکلے، گھٹے ہوئے بخار اُمڈ پڑے۔ منجھو کے گھونسے کی شیرینی، جس کے لیے وہ ترس گئی تھی، اُس کی رگ رگ میں تیر گئی اور پھر گھسوں، تھپڑوں اور چانٹوں نے نہ صرف اُس کے جسم پر سے بلکہ روح پر سے بھی میل کا غلاف اُتار دیا اور اُس لاش کو دوبارہ جگا دیا جو بالکل اس کے اندر سڑ گل چلی تھی۔ خون سُرعت سے دوڑنے لگا، مچھلیاں پھڑکنے لگیں اور ذرا سی دیر میں وہ پُرانی شمن کی طرح واویلا مچانے لگی۔

منجھو کو بھی جیسے بہت دن کی چھوٹی شراب ہاتھ آئی، بس ٹوٹ ہی تو پڑی۔ پھر بال نوچ نوچ کر کنگھی کی اور سارا دن کھانا پینا چھوڑ کر اُس کی جوئیں نکالیں۔ سب نے بہتیرا منع کیا مگر اُسے تو جیسے گرتے ہوئے مکان کی مرمت کرنا تھی ــــ وہ بھی برسات سے پہلے پہلے۔ شام کو شمن کے پیر زمین پر نہ پڑتے تھے۔ بدن تو ہلکا ہوا

ہی تھا، جی ایسا ہلکا ہو گیا کہ وہ دھما دھم منجھو کے پلنگ پر قلابازیاں کھانے لگی، دھواں دھواں تکیوں کو پیٹ ڈالا اور رضائی کا تنبو تان کر لاتیں چلانے لگی۔

"ہیں، ہیں، پھٹ جائے گی رضائی!" آپا چلائیں۔ "بس ذرا ڈھیل دو، اور اترانے لگیں۔ کمبخت بات کرنے کے لائق نہیں۔ نوری بھی تو ہے، مگر یہ دیوانی حرکتیں نہیں کرتی۔"

شمن نے دیکھا نوری منجھو کے دولہا کی گود میں بیٹھی مینا کی طرح چہک رہی ہے۔ اُس کا جی سلگ اٹھا۔ بس چلتا تو وہ نوری کی بوٹی بوٹی کر کے پھینک دیتی۔ کمینی کہیں کی! ہر بات میں اماں بٹیاں ذلیل کرنے آن مرتی ہیں۔ نوری گوری ہے وہ کالی، نوری نازک، وہ بھدی، نوری ہنس مکھ شرمیلی، باتمیز اور پڑھنے میں تیز وہ بدمزاج، بدتمیز اور پھوہڑ، پڑھنے سے دم چراتی، نوری روز کا سبق قرآن شریف کا، جھٹ پٹ یاد کر، سنا دیتی۔ شمن کو اس بات پر ہزاروں پھٹکاریں پڑتیں، وہ اپنا پچھلا سبق بھی بھول جاتی، نوری ننھی سی بدھنی سے چوکی پر بیٹھ کر وضو کرتی اور جائے نماز پر ماں کے برابر کھڑی ہو کر نماز پڑھتی۔ لوگ واہ واہ کرتے مگر شمن خوب جانتی تھی کہ اُسے نماز خاک بھی نہیں آتی کھڑی بُد بُد ہونٹ ہلایا کرتی ہے۔ اُسے نماز کچھ زیادہ اچھی نہ لگتی تھی، ویسے گھر میں پڑھتا بھی کوئی نہ تھا بڑی آپا نے تو بیوہ ہونے کے بعد زوروں شوروں سے نماز پکڑی، دوسرے وہ عموماً نجس رہا کرتی تھی اس لئے کوئی نماز سکھاتا بھی تو نہ تھا۔

اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا اس واپس پائی ہوئی منجھو کا کیا کرے! اُس سے لپٹتے لپٹتے تو وہ تھک گئی تھی، چھوتے چھوتے دل اکتا گیا تھا مگر پھر بھی بھوک باقی تھی۔

رات کو کھانے پر وہ ٹھنک ٹھنک کر منجھو ہی سے سب کچھ مانگتی رہی:

"ٹھنک، بوٹی۔ سالن۔ گردہ۔ مینگ کی ہڈی لیں گے۔ نہیں مٹھائی، ہمارے مرچیں لگ رہی ہیں پیچھے سے کھائیں گے۔" منجھو باتوں میں مشغول اُس کی

فرمائش ٹھیک طرح پوری نہیں کر رہی تھی اور جب شمن نے سالن کا ڈونگا اُجلے دسترخوان پر اوندھا دیا تو اماں اور آپا میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ باتیں ہوئیں۔

"چلو اُٹھو" منجھو روکتی ہی رہی مگر بڑی آپا اُسے گھسیٹ کر برآمدے میں کھینچ آئیں۔

"آواز نکالی تو دم گھونٹ دوں گی" اگر کوئی اور ہوتا تو شمن اُس سے لپٹ کر گھسوٹنے لگتی، مگر آپا سے وہ ڈرتی تھی کیونکہ انہوں نے ایک دن ایسی بید دردی سے مارا تھا کہ اماں تک کے آنسو نکل آئے تھے۔ اس بے رحمی میں شمن کو ایسی کریہہ نفرت پوشیدہ نظر آئی تھی کہ وہ سہم گئی تھی۔ اس دن سے بڑی آپا کو بڑا فخر تھا کہ گھر بھر میں کسی کی نہیں سنتی مگر ان کی گھُرکی سے شمن کانپ اُٹھتی ہے اور فوراً کہنا مان لیتی ہے۔ مگر انہوں نے یہ کبھی نہ دیکھا کہ یوں کہنا مانتے وقت شمن کی آنکھیں کسی خوفناک نفرت سے دہک اُٹھتی ہیں، ایسے ہی جیسے پنجرے میں بند شیر سدھانے والے کے چابک سے ڈرتا ہے لیکن اُس کی آنکھوں میں جو خونی نفرت نظر آتی ہے اُسے کچھ سدھانے والے کا جی ہی جانتا ہے۔ ایک ذرا دیر کو جو یہ ہنٹر ہاتھ سے چھوٹ پڑے تو کیا ہو! جب وہ اُسے ڈانٹتی تو شمن خاموشی سے اُنہیں ایسے دیکھتی کہ اُس کا غصّہ چوگنا ہو جاتا اور وہ اُسے چبا ڈالنا چاہتیں۔

شمن کھانے پر سے تو ہٹا دی گئی تھی مگر منجھو کے پلنگ پر لیٹنے کا تو پورا پورا حق رکھتی تھی۔ وہ خاموش ضبط کیے لیٹی رہی کہ کہیں آپا کوئی بہانا بنا کر اس کی جگہ نوری کو منجھو کے پلنگ پر نہ سلا دے۔ اس کی یہ عادت تھی کہ ہر جگہ اپنی بچی کو ٹھونسے جاتی تھی۔ لیکن جب اس سے کہا گیا کہ جا کر اپنے پلنگ پر سو رہے تو وہ بگڑ گئی: "نہیں ہم تو منجھو کے پاس سوئیں گے۔"

"رہنے دو آپا، یہیں سو رہنے دو، کیا ہے" منجھو بڑبڑا کر اپنی کیل دیکھنے لگی۔ شمن نے سوچا کوئی اُٹھا نہ دے، وہ جلدی سے سوتی بن گئی، مگر واقعی اُسے نیند آ گئی اور وہ منجھو کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے سوتی رہی۔

رات کو جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے جلدی جلدی منجھو کی گردن ٹٹولنے کے لیے ہاتھ پھیلائے مگر ایک دم وہ دہشت سے رو پڑی کیونکہ اُس کا ہاتھ بجائے منجھو کی گرم گرم گردن کے پٹی پر بیکسی سے پڑا ہوا تھا۔ یہ تو اُس کا اپنا پلنگ تھا جس سے اسے قبر سے زیادہ نفرت تھی۔ وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھی اور گھٹی گھٹی آواز میں منجھو کو پکارنے لگی۔

"چپ چڑیل، خبردار جو آواز نکالی۔" پاس کے پلنگ سے بڑی آپا غرائی۔
اوہ، اب وہ سمجھ گئی! سوتے میں ظالموں نے اُسے منجھو کے پاس سے اُٹھا کر یہاں پھینک دیا۔ وہ جلدی سے منجھو کے کمرے کے پاس گئی، دروازے بند تھے اور اندھیرا گھُپ تھا مگر منجھو کے ہنسنے اور دولہا کی کھسر پھسر کی آوازیں آرہی تھیں۔
"منجھو، منجھو بی میں ہوں، تمہاری شمن۔ ۔ ۔ دروازہ کھولو" منجھو بی کی ہنسی ایک دم رُک گئی مگر دروازہ نہ کھلا۔

"منجھو بی، شمن ہوں۔ ۔ دروازہ کھولو" وہ التجائیں کرنے لگی۔
"ہائے ہے چڑیل جان کو آگئی ہے اُس کی، ادھر چل۔ اگر اب کے پلنگ سے اُٹھی تو پولیس کالی کوٹھڑی میں بند کر دوں گی۔" بڑی آپا نے گھسیٹ کر اُس کی باہنہ پکڑی اور بھگاتی ہوئی لاکر پلنگ پر پٹخ گئی۔

شمن کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ خوف کی وجہ سے وہ دم گھوٹے سسکیوں سے روتی رہی سب سو رہے تھے مگر اُسے نیند نہ آئی۔ بڑی دیر تک رونے کے بعد چُپ ہو گئی مگر سسکیاں نہ رُکیں۔ اُسے پلنگ پر لیٹنا دوبھر ہو گیا اور اُٹھ کر صحن میں چلی آئی۔ جاڑے خاصے اچھے تھے مگر اُسے بالکل سردی نہ لگی۔ آنگن میں نیم کا درخت بھوت کی طرح پر پھیلائے کھڑا تھا، وہ تھوڑی دیر اُس کے کھُردرے تنے سے لگی اپنی ہتھیلیاں رگڑتی رہی۔ پھر بغیر کسی ارادے کے مرغیوں کے ڈربے پر بیٹھ گئی۔ یہاں پھر آنسوؤں نے حملہ کر دیا اور وہ گہری گہری سانسوں سے نہ جانے کتنی دیر تک روتی رہی سنسان راتوں میں جب ہر چیز سُونی پڑی تھی اور سوائے مرغیوں کی کُڑکُڑ کے بالکل

سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اپنا کیا کرے۔ اتنے میں ایک بلّی دیوار پر سے کودی، ڈربے میں مرغیاں چونکنّی ہو کر کڑکڑائیں، وہ اُٹھ کر برآمدے میں واپس بھاگی۔ راستے میں ایک دم اس کی نظر کیاریوں پر پڑی جہاں دھنیہ اور ساگ بویا ہوا تھا، اندھیرے میں بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کالا کالا اُون اُلجھا ہوا پڑا ہے۔

بڑی آپا کی کیاریاں!

آناً فاناً میں وہ بھوکی شیرنی کی طرح ہری بھری کیاریوں پر پل پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے اُس نے کھسوٹنا شروع کیا جیسے وہ اپنے کسی دشمن کی آنتیں نکال رہی ہو، اور پھر مٹھیوں میں لے کر اُس نے زمین پر رگڑ ڈالا۔ مرچوں کے پیڑ، لوکی کی بیل، چنبیلی اور موگرہ کے پودے جن میں سے روز پھول توڑ کر آپا جوڑے میں لگایا کرتی تھیں توڑ موڑ کر پیروں سے مسل ڈالے۔ اب اُسے ہنسی آنے لگی، جیسے کسی نے پچکاریوں سے تازہ تازہ خون اُس کے جسم میں بھر دیا۔ آنسو بھری پھٹی پھٹی آنکھیں وحشت سے بھینگی ہو گئیں، گھنے بال ہوا میں سنپولیوں کی طرح لہرا رہے تھے اور وہ بالکل ایک چھوٹی سی مرگھٹ کی ڈائن معلوم ہوتی تھی جو قبر کھود کر مُردے کے کلیجے میں ناخون گڑا کر اُسے دانتوں سے چبانا شروع کر دیتی ہے۔ وہ تھک کر شل ہو گئی اور اُس کا جی بھر گیا اُسے اب بھی بڑی طرح ہنسی آ رہی تھی: سوکھے سوکھے پاگل کتیا کے سے بھیانک قہقہے لگا رہی تھی۔

"بس، بس، اب ٹھیک ہوئیں؟" اُس نے تخیّل میں کسی پر دانت پیسے اور پھر وہیں زمین پر لوٹ گئی۔ منجھو نے آج اُسے نہلایا تھا، بال سنوارے تھے تو بس اب اُس کی یہی سزا ہے! اُس نے بھر بھر مٹھیاں ریت کی اپنے بالوں میں ڈالیں، خوب کیاری کی کیچڑ میں قلابازیاں لگائیں، زمین پر تھوک کر ہتھیلیوں سے رگڑا اور پھر وہی ہتھیلیاں اپنے منہ اور گردن پر پھیر لیں۔ اُس کا بس نہ تھا جو اپنے جسم کو آگ لگا کر بھسم کر دیتی؛ تب تو منجھو کو پتہ چلتا! تھوڑی دیر میں اُس کا جی ٹھہر گیا! لہ
تھکن اور غصّے کا آیا ہوا پسینہ خشک ہو رہا تھا اور ہوا اُس کے جسم میں سوئیاں

طرح چبھو رہی تھی۔

صبح جب نوکروں نے اُسے کیچڑ میں لتھڑا ہُوا کیاریوں کے پاس بیہوش پایا تو خوف سے اُن کی چیخ نکل گئی۔ ماما سمجھی اُسے کسی نے قتل کر دیا کیونکہ اُس کے سارے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور ناک سے نکسیر پھوٹ کر ساری ٹھوڑی اور گردن پر خون جما ہُوا تھا۔

چار پانچ روز تک اُسے بخار کی وجہ سے ہوش نہ آیا۔ جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو اُس کے سینے پر پلاسٹر جکڑا ہوا تھا اور منجھو بڑی پریشان بیٹھی تھی۔ اُس کا جی خوش ہو گیا۔ بڑی آپا تک فکرمند نظر آ رہی تھی اور رات رات بھر اُس کے سرہانے بیٹھی رہتی تھی۔

پھر تو اُسے ایسا معلوم ہُوا دوبارہ کسی کے یہاں اکلوتی پیدا ہو گئی۔ خوب خوب ضدیں کرتی اور منجھو تو اسے اچھا ہونے پر اپنے ساتھ سلانے کا پکا قول دے چکی تھی۔ اُس کا دولھا چلا گیا تھا اور وہ اس کے قریب ہی سوتی تھی۔ بیماری میں خوب لاڈ ہوئے مگر وائے قسمت وہ بڑی تیزی سے اچھی ہونے لگی۔ بخار بالکل غائب اور کمزوری نام کو نہیں۔ بڑی آپا نے پھر نظر ٹیڑھی کر لی۔ انار اور انگور ملنے بند اور ساگودانہ بھی ختم۔ مگر اُسے تندرست ہو کر سخت غصّہ آیا۔ پڑوس میں چُلّو کی ماں رہتی تھی، کیا مزے سے ہمیشہ بیمار رہتی تھی۔ کیا اللہ میاں کو اُسے مرض دیتے بھی کنجوسی سوجھتی تھی! اُسے اچھا ہونا پڑا۔

(۵)

جب منجھو سسرال جانے لگی تو شمن کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس وقت نوری کی خوب کِرکِری ہوئی، بڑی طرح بلکی اور پچھاڑیں کھائیں۔ سب نے اُسے مزے دار دھوکا دے دیا۔ پہلے تو سب نے کہا کہ ہاں بھئی نوری بھی جائے گی، مگر منجھو نے چپکے سے اُسے بتایا کہ نوری کو پھسلا رہے ہیں۔ شمن کو بڑا ہی مزا آیا۔ منجھو جانے لگی تو نوری پہلے ہی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ ڈری کہ بہلانے کے بجائے سچ مچ لے

جا رہے ہیں۔ مگر گاڑی چلنے سے ذرا پہلے بڑے چچا نے نوری سے کہا:

"آؤ بیٹی نوری، تمہیں مٹھائی دلائیں۔"

"نہیں، نہیں، ہم مٹھائی نہیں لیتے۔" نوری ایسے بہت چکمے سہہ چکی تھی۔

"بیٹی ہمارے لیے سے آؤ، سنگ سے چلیں گے۔" منجھو بی بولی۔

"نوکری ہیں لے چلو گی خالہ جان؟" نوری جھکی اور شمن مسکرائی کہ آئی اب کمبختی بیچاری کی۔ جونہی نوری چچا کی گود میں گئی گاڑی نے سیٹی دے دی، نوری دھاڑیں مارتی رہ گئی، شمن کا ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا، مگر تھوڑی دیر بعد اُسے بے اختیار نوری یاد آنے لگی۔ بیچاری نوری! دونوں چلتیں تو مزہ آتا۔

منجھو کا گھر اسے بالکل پسند نہ آیا۔ دو تین چھوٹے چھوٹے کمرے اور چھوٹا سا صحن۔ منجھو کا دولہا اور منجھو کی ساس، جسے دیکھتے ہی شمن نے بھانپ لیا! یہ ہے دشمن کا مورچہ، بڑھیا اُسے شروع ہی سے بری لگی۔ اس کے علاوہ منجھو کی ساس کا پوتا کدن بھی اُسے قطعی پسند نہ آیا۔ لال چقندر رنگ اور نیلی نیلی بلے جیسی آنکھیں، کپا گال! ایک کمرے میں منجھو اور اُس کا دولہا، دوسرے میں منجھو کی ساس اور کدن سوتے تھے۔ وہیں شمن کا پلنگ بچھا دیا گیا۔ وہ اب کچھ کچھ سمجھ چلی تھی کہ منجھو کے دولہا کی موجودگی میں تو وہ کمرے میں سو نہیں سکتی۔ کبھی کبھی اُسے تشویش ہوتی کہ آخر کیوں؟ مگر کبھی کسی نے اُسے اطمینان بخش جواب نہ دیا:

"نہیں منجھو کے پاس نہیں سوتے!"

"کیوں؟" وہ پوچھتی۔

"بس بک بک نہ کرو۔" جواب ملتا، اور وہ بک بک نہ کرتی۔

منجھو سے پوچھنے کی کبھی ہمت نہ پڑی۔ وہ کچھ بدل سی گئی تھی، اگر پاس بھی آتی تو پہلے ہی سے کہہ دیتی:

"دیکھو شمن ہٹ کے لیٹو۔ ہاں بھئی مجھے گرمی لگتی ہے۔" وہ ویسے یونہی کبھی دکھاوے سے کو چمٹا بھی لیتی مگر وہاں اب اُسے گرمی نہ ملتی تھی جس کی کبھی وہ عادی تھی اس لیے

منجھو سے کبھی لاڈ نہ کرتی، کچھ کھنچی کھنچی سی رہتی مگر منجھو نے کبھی دھیان نہ دیا۔

منجھو کو قادر عرف کدن سے بھی اس لیے نفرت تھی کہ اس سے بڑا ہو کر پٹ لیتا تھا کیونکہ اُسے لڑائی جھگڑے سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ کبھی مذاق ہی میں شمن اُس سے کشتی لڑنے کو کہتی تو دبک جاتا۔ بس ہر وقت دادی بیوی کے پاس بیٹھا پان چبایا کرتا، کبھی سروتے سے کھیل لیتا اور دوڑ دوڑ کر کام کرتا۔

بڑھیا کو تو شمن نے شروع ہی سے ڈھیل نہ دی۔ باوجود منجھو کی دھمکیوں کے اُس نے اُنھیں دادی بھی نہ کہا بلکہ ہمیشہ "منجھو کی ساس" ہی کہتی رہی جس پر بڑھیا جل اُٹھتی اور منجھو سے اُس پر ڈانٹ پڑواتی۔ پھر تو وہ اور ضد باندھنے لگی اور سوائے "اسے" یا "وہ" کے کچھ نہ کہہ کر مخاطب کرتی۔

کدن دادی کے ساتھ ساتھ چولھے کے پاس بھی گھستا۔ یہاں تک کہ وہ رفع حاجت کو جاتی تو باہر کھڑا جلدی نکلنے کے تقاضے کرتا رہتا۔ شمن سے تو وہ پہلے ہی دن ڈر گیا تھا جب اُس نے اُس کی چھوٹی سی صراحی چھوئی تو وہ خونخوار بلی کی طرح جھپٹی اور گھونسوں اور تھپڑوں کی بارش کر دی۔ وہ ایک دم جھجک کر بھاگ گیا تھا اور دادی بی کے کندھے سے لگ کر خوب رویا تھا۔

کدن کی بھی ایک کیاری تھی جس میں اُس نے پودینہ اور کپاس بو رکھی تھی اور شمن کی کیاری میں سیمیں بوئی ہوئی تھیں۔ کدن کی کیاری پر بڑھیا دولت کا سانپ بن کر پہرا دیتی، کیا مجال جو کوئی چھو بھی جائے۔ ایک دن بڑھیا نے جان بوجھ کر شمن کی کیاری سے دھنیہ توڑ لینا چاہا۔

"کدن کی کیاری میں سے توڑو، ہماری کیاری میں سے نہیں۔" وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر کیاری کے آگے کھڑی ہو گئی۔

"اے بیٹی ذرا سا لوں گی، کدن تو روئے گا۔"

"کدن تو روئے گا!" شمن کے آگ ہی تو لگ گئی۔

"نہیں۔" اُس نے ایسے زور سے بڑھیا کو ڈانٹا کہ وہ ڈر کے بڑبڑاتی ہوئی

چلی گئی۔

کچھ ہی دن میں وہ منجھو کے گھر سے تھک گئی۔ اُسے رہ رہ کے اپنا گھر یاد آتا: نوری، بڑے بھائی اور منجھلے بھائی۔ وہ تو اسے اتنا مارتے بھی نہ تھے پر اس کے موٹے موٹے گال خوب نوچتے تھے۔ بڑی آپا البتہ ٹیڑھی کھیر تھیں، لیکن اُن سے ناطہ رکھنے کی ایسی ضرورت ہی کیا تھی! مگر یہاں تو بڑھیا اور کدن، دو جانیں، جن سے اُسے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔

منجھو تو دوپہر کو کمرہ بند کر کے سو جاتی اور اس کی ساس دالان میں بیٹھی دالیں وغیرہ چُنا کرتی۔ شمن پاگلوں کی طرح کیاریوں کے پاس ٹہلتی یا مرغیوں کو آنگن میں دوڑاتی، کبھی باورچی خانے میں جا کر آلو بھوننے لگتی، پھر ان سب باتوں سے بھی دل گھبرا جاتا تو وہ خاموش منڈیر پر پیر لٹکا کر بیٹھ جاتی اور سنسان سڑک پر سُوکھے ہوئے پتوں کو ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑتے دیکھا کرتی۔ پاس ہی درختوں پر بندر اُچھل کود میں مشغول ہوتے، اس ڈال سے پینگ لے کر اُس ڈال پر، جیسے سرکس میں نٹ جھولتے ہیں۔ ایک دم سے کسی بندر کا ہاتھ چوک جاتا اور وہ بھد سے دیوار پر آن گرتا تو شمن ہنستے ہنستے دُہری ہو جاتی۔ کاش وہ بھی بندر ہوتی! اُن میں منجھو کی ساس اور کدن سے تو زیادہ انسانیت ہوگی، یہ نہیں کہ ہر وقت بس دال میں لگے ہیں یا گیہوں پھٹک رہے ہیں اور وقت ملا تو لال پیلے چیتھڑوں کو جوڑ کر جھاڑ جھنکاڑ بلائیں سی جا رہی ہیں۔

ایک دن کدن نے اپنی رنگین شیشے کی گولیوں کا ڈبہ نکالا اور بولا: "آؤ شمن کھیلیں۔"

شمن اُسے منہ تو نہ لگاتی مگر لال ہری گولیوں کو دیکھ کر اُتر آئی۔ بڑی دیر تک وہ ایک ایک گولی آنکھ سے لگا کر اس میں دوڑتے ہوئے رنگ دیکھتی رہی، جیسے قوس قزح کی جھاڑو سے اُن کے اندر کسی نے دائرے کھینچ دیے ہوں۔ ایک تو بالکل ایسی تھی جیسے ریشم کا پھندنا شیشے میں بند کر دیا ہو، اور دیکھتے دیکھتے وہ پھندنا

زندہ کیڑے کی طرح رینگنے لگتا۔

"کدّن آؤ اِن گولیوں کو کیاری میں بوئیں۔"

"کیاری میں؟"

"ہاں، پھر پیڑ اُگیں گے تو ہزاروں گولیاں بیروں کی طرح لگیں گی، اور جناب بس پھر اپّن توڑ توڑ کر جمع کر لیں گے، ہاں۔"

"پردادی بی ماریں گی ہم!"

"ہونہہ، دادی بی کو کیا پتا چلے گا! مگر ہاں جب پیڑ اُگیں گے تو بس خوشی کے مارے وہ مر جائیں گی، دیکھ لینا، ہاں۔"

"تو چلو۔" کدّن آج بنا دادی بی کے ہی کچھ کرنے کو تیار ہو گیا۔ شمّن کو اُس پر کچھ یونہی سا پیار آنے لگا۔ گولیاں بو کر انہوں نے خوب سا پانی ڈالا اور گھٹنیوں پر کہنیاں رکھ کر انتظار میں بیٹھ گئے۔

شمّن کو گولیاں اُگتے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب اُس نے دھنیا بویا تھا تو صبح صبح کیاریوں کو دیکھنے گئی تھی مگر کلّا ابھی نہ پھوٹا تھا، اُسے ڈر لگا کہ کہیں دھنیہ خراب تو نہیں تھا، لیکن تیسرے چوتھے دن اُس نے دیکھا باریک باریک کپاسی رنگ کے ٹانکے زمین پر اُٹھے ہوئے تھے؛ ننھے ننھے کنڈے زمین کا سینہ چیر کر باہر نکل آئے تھے؛ اُن میں سے دو چار تو بالکل جھکے ہوئے تھے جیسے کوئی ان کی گردنیں پھنسائے ہوئے کھینچ رہا ہو۔ اُن کی گردن پر بڑا زور پڑ رہا تھا۔ شمّن نے چاہا تنکے سے اُنہیں سہارا دے کر اُن کے سر چھڑا دے مگر وہ کُٹ سے بیچ میں سے ٹوٹ گئے۔ اُس کا دل اُس روز کسی کام میں نہ لگا اور وہ کیاریوں کے پاس بیٹھی اُن کلّوں کے زمین سے اُبھرنے کی کشمکش دیکھتی رہی۔ کچھ تو جب وہ ناشتہ کرنے گئی نکل آئے اور کچھ ابھی کُشتی لڑ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک تو بالکل زندہ کیڑے کی طرح باہر کو اپنا نازک جسم کھینچ رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے بل میں سے سنپولیے کی طرح نکل آیا۔ شمّن نے ٹھنڈی سانس لی، جیسے کلّے کا سارا زور وہی لگا رہی تھی۔ کلّے کی ناک میں دھنیے کے چھلکے کا بلاق

ٹھنک رہا تھا جو تھوڑی دیر میں اُس نے جھٹک کر پھینک دیا اور دوپہر تک تن کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ فتح مند سپاہی کی طرح پھیلا دیے۔

آج وہ گولیوں کے گملوں کو پھوٹتا دیکھے گی۔ چکنے چکنے کانچ کے سے پھڑنگے حلقے جیسے چوڑی موڑ کر کنڈا بنا دیا ہو۔ وہ ان کنڈوں کو پرو کر ہار بنائے گی۔ نہیں نہیں، پھر پیڑ کیسے بڑھیں گے! اور پھر جامنوں کی طرح رنگ برنگی گولیوں کے گچھے اس کی آنکھوں کے سامنے جھومنے لگے۔

تیسرے پہر تک تو کلّے پھوٹے نہیں، پھر اُسے نیند آگئی۔ جب شام کو وہ اُٹھی تو اُس کا کلیجہ پھٹ گیا۔ منجھو کی ساس مصالحہ پیسنے کے پیالے میں میٹھی گولیاں دھو رہی تھی۔ ہیں! شاید چڑیل انہیں گوشت میں بگھارنے جا رہی ہے! شمن اُس پر پل پڑی۔

اس کے بعد نہایت ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ اُس نے منجھو کی ساس کی کلائی چبا ڈالی اور منجھو نے اُس کا منہ چانٹوں سے توڑ کر رکھ دیا۔

آج اس کا دل و دماغ سب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ہونہہ، گولیاں نہیں بوئی جاتیں! اُس کا بس چلے تو منجھو کی ساس کو اُٹھا کر بو دے۔ اور پھر وہ سوچنے لگی: اُس نے گڑھا کھود کر منجھو کی ساس کو بو دیا ہے۔ دوسرے دن کلّا پھوٹ رہا ہے، بھورا بھورا چتیوں دار۔ سپیرے ٹوکری میں اژدہا لیے پھرتے ہیں نا، بالکل ویسا۔ شمن خوشی سے دیوانی، دیکھ دیکھ کر مری جا رہی ہے۔ پھر وہ بڑھتا بڑھتا نیم کے پیڑ سے بھی اونچا ہو گیا اور نمکولیوں کی طرح گچھے کے گچھے مرگھلی مڑی ہوئی کبڑی بڑھیوں کے ٹکنے لگے۔ ایک لمبا سا سانس لے کر وہ انہیں جھاڑنے لگی جیسے پکی پکی املیاں۔ سارا آنگن بڑھیوں سے پٹ گیا۔ ہزاروں، لاکھوں کھانستی چھینکتی بڑھیاں۔ کوئی پاندان کھولے جلدی جلدی پان لگا رہی ہے، کوئی چوکی پہ بیٹھی چھالیا کتر رہی ہے، آٹھ دس باورچی خانے میں گھسی ہنڈیوں کا ناس مار رہی ہیں، دو چار اچار کی مٹکیوں کے پاس پھدک رہی ہیں، ننھی منی ملڑیوں کے برابر بڑھیاں سارے گھر میں اُدھم جوت رہی ہیں اور وہ ایک دم ان بڑھیوں

سے گھبرا اُٹھی اور دونوں ہاتھوں سے انہیں دور دور کرنے لگی۔

شکر ہے جو اس نے بڑھیا کو لوٹنے کا خیال جلدی پرے کر دیا ورنہ غضب ہو گیا تھا۔ ایک ہی بڑھیا نے اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ ایسے کدن پر بھی بہت غصّہ آیا کہ اس نے اپنی چہیتی کو بتا کیوں دیا۔ جی چاہا ناخنوں سے اس کی کنچے بلوٹے جیسی آنکھیں نکال کر گولیوں کی جگہ لو دے۔

(۶)

اسے آہستہ آہستہ منجھو سے اور نفرت ہونی شروع ہوئی، یہاں تک کہ اس کا کھانا پلنا! اُٹھنا بیٹھنا سب اسے قابل اعتراض لگنے لگا۔ وہ روز بروز موٹی اور کاہل ہوتی جاتی۔ بڑھیا ساس ماما کی طرح اس کے آگے پیچھے لگی رہتی مگر اس کا منہ کسی وقت سیدھا نہ ہوتا۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ منجھو پیلی پیلی مٹی کا ٹکڑا چبا رہی ہے۔ شمن کا دل ہل گیا۔ اسے یاد تھا کہ جب وہ خود مٹی کھایا کرتی تھی تو سانپ پیدا ہو گیا تھا اور اب منجھو مٹی کھا رہی تھی۔

"منجھو بی مٹی کھاتی ہے" اس نے چپکے سے کدن سے کہا۔

"کون، میری چچی ؟"

"ہاں، اور جبھی تو اس کا پیٹ پھول گیا ہے، دیکھ لینا اس کے پیٹ میں سے ایک دن یہ بڑا سا را سانپ نکلے گا" کدن نے دادی بی سے جڑ دیا۔

"دادی بی، شمن کہتی ہے چچی کے پیٹ میں سے سانپ نکلے گا"

"خاک پڑے شمن کے منہ پر۔ کیوں رے، منع کیا کہ اس دیوانی سے مت بولا کرے مگر سنتا نہیں تو نے۔ لو بھلا بہن کے لیے مردانن ایسی باتیں منہ سے نکالتی ہے" بڑھیا گھنٹوں بیٹھی بڑبڑاتی رہی مگر شمن کی فکر نہ گئی۔ وہ چھپ چھپ کر منجھو کا پیلا اُترا ہوا چہرہ اور مریل جسم دیکھا کرتی۔ اسے اس کے پیٹ میں موٹے موٹے پھنکاریں مارتے ہوئے سانپ بل کھاتے نظر آتے۔ پھر اسے منجھو سے اور

بھی نفرت ہو گئی مگر کسی کو اس کے متعلق فکر نہ تھی، بلکہ بڑھیا تو اور خوش نظر آتی تھی کہ مزے سے سارے گھر میں اسی کا راج ہے۔ وہ جان بوجھ کر اس کے لئے بڑی بڑی مرچوں دار نقصان دہ چیزیں پکاتی اور خود بھی شکر چرا کر کھاتی ہو گی۔

اس کی اماں آئیں اور منجھو ایک دن بہت زور سے بیمار پڑی۔

"کل ان آج دیکھ لینا تمہاری دادی بی سچ کہتی تھی یا ہم۔ اتنا بڑا سانپ ہے کہ کیا بتایئے۔ جبھی تو منجھو بی رو رہی ہے بچاری۔"

"چچا تو دورے پر گئے ہیں، کون مارے گا سانپ کو؟"

"تھانے میں سپاہی جو موجود ہیں جناب۔" اس نے نہایت اطمینان سے کہا اور وہ سپاہیوں سے نہایت راز دارانہ انداز میں بولی: "تم اپنی بندوقیں لے چلنا، اچھا۔"

"کیوں؟" داروغہ جی نے اس سے پوچھا۔

"سانپ مارنے کے لیے۔ ہماری بہن جو ہیں نا، منجھو بی، ان کے پیٹ میں سانپ ہے، اب نکلنے ہی والا ہے۔"

داروغہ جی نے سوئر کی طرح تھوتھنی اٹھا کر کھوں کھوں ہنسنا شروع کر دیا۔ دو چار سپاہی بھی ہنسنے لگے۔

رات کو ایک دم جو شمن کی آنکھ کھلی تو گھنٹیوں کے بجنے کی آواز آرہی تھی اور منجھو کے کمرے میں غدر مچا ہوا تھا۔ وہ چیخیں مارتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف بھاگی، دو چار عورتوں نے اسے پکڑ کر دبوچ لیا، مگر وہ "منجھو بی" کی رٹ لگائے رہی۔ معلوم ہوتا تھا باہر بھی سارے سپاہی ایک دم جاگ اٹھے اور ٹھائیں ٹھائیں بندوقیں چلنے لگیں۔ وہ سہم کر چپ ہو گئی۔

"کیا مر گیا؟" اس نے ایک عورت سے پوچھا۔

"کیا؟ کون؟"

"سانپ۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اری بیٹی، اس سے کیا سر مار رہی ہے، یہ دلہن کی بہن ہے، موئی دیوانی"
منجھو کی ساس نے کہا اور بھاگی کسی کام کو۔ آج وہ بڑی اترائی ہوئی پھر رہی تھی۔
اتنے میں اس کی اماں باہر نکلیں، وہ بھی سٹپٹائی ہوئی تھیں "اماں، منجھو بی" اس نے ٹھنکی روک کر پوچھا۔

"اچھی ہے منجھو بی، چل منّا سا بھانجہ تو دیکھ" آج اماں خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں؟ وہ اسے ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئیں۔

"اُف!" حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ننھا منھا سا چینی جیسا ہوا ایک عورت کی گود میں رکھا تھا۔ منجھو چپکی پڑی تھی۔

"اور سانپ" اس نے ڈرتے ڈرتے اماں سے پوچھا۔

"چل ہٹ"

"یہ منّا کہاں سے آیا؟" اس نے دوسرے دن پوچھا۔

"یہ وہ جو میم صاحب تھیں نا، وہ منجھو بی کے لیے لائی تھیں"

"اچھا۔ تو اماں ایک ہمیں بھی منگا دو۔ منجھو کی ساس تو اسے چھونے نہیں دیتی"

"اچھا، منگا دوں گی" اماں نے کہا اور دو چار عورتیں ہنس پڑیں۔

"تو پھر سانپ یقیناً سپاہیوں نے مار ڈالا، جبھی ٹھائیں ٹھائیں بندوقیں چلی تھیں۔ اچھا!"

مگر یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اتنی کلوٹی میم صاحب اتنا سفید بچہ کہاں سے اٹھا لائیں، دوسرے منجھو بی تو بالکل پچک کر رہ گئی تھی۔

"دو اور دو چار" اس نے حساب لگا لیا، مگر ہے ضرور کچھ گڑبڑ!

اب منجھو بی کے یہاں اس کا قطعی دل نہ لگا اور وہ اماں کے ساتھ گھر چلی آئی۔

(۷)

منجھو بی کے یہاں سے واپس لوٹی تو ایسا محسوس ہوا گویا اسے ہمیشہ کے لیے دفن

کر آئی، مگر تعجب ہے اسے ذرا بھی افسوس نہ تھا۔ رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو۔ اتنا چھینا کہ بالکل ہی کنگال کر دیا۔ اچھا ہی ہوا ایک روگ سا دُور ہو گیا۔ یہ تو اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ اب مجھو اسے نہیں مل سکتی، اس کے حصول کے لیے جان تجنا اتنا ہی فضول ہے جتنی پتھر میں جونک لگانے کی کوشش۔

بیوہ ہو کر بڑی آپا مستقل طور سے میکے آن رہی تھیں، وہ شمن کی نگران بن گئیں۔ اماں کو تو دنیا کا بس ایک کام آتا تھا — بچے پیدا کرنا — اس کے آگے نہ انہیں کچھ معلوم اور نہ ہی کسی نے بتانے کی ضرورت محسوس کی۔ ابّا جان کو بچوں سے زیادہ بیوی کی ضرورت لاحق۔

شمن کو بڑی آپا پر کبھی بھروسا نہ ہوا۔ ویسے تو برابر یہی جتاتیں کہ انہیں شمن کی بہتری مقصود ہے اور اس کی عاقبت سدھارنا چاہتی ہیں لیکن اصل میں اسے نوری کے لیے درسِ عبرت دینے کا بہترین آلہ بنا رکھا تھا:

”کہنا نہیں مانو گی تو شمّن کی طرح پھٹکا ریں گے سب۔“

”نہاؤ گی نہیں تو شمّن کی طرح جوئیں پڑ جائیں گی۔“

”پڑھو گی نہیں تو شمّن کی طرح جاہل رہ جاؤ گی۔“

”پھر تم نے شمّن کی طرح ضد کی۔“

”شمّن کی طرح جھوٹ بولنا خوب آتا ہے۔“ اور

”یہ شمّن ہی تمہیں بگاڑتی ہے، خبردار جو اس کے ساتھ کھیلیں۔“

یہی نہیں، وہ اور آگے بھی نہ چوکتی، اماں جان پر طعنے کسے جاتے:

”بھئی میں اماں تو ہوں نہیں جو تمہیں بھی۔۔۔“

”مجھے اماں جیسے چونچلے تو آتے نہیں۔“ وہ کہتیں حالانکہ دونوں بچوں کو تخمی آم کی طرح ہر وقت چوما چاٹا کرتیں۔

اس پر شمن کی اماں شرمندہ اور کھسیانی ہو کر اس کی موت کی دعائیں مانگتیں۔ خیر ان کی زندگی کا سہارا یہ فخر تو تھا کہ اتنی الابلا کے ساتھ انہوں نے بڑی آپا جیسی

ہیرا اسی بیٹی بھی تو جنی ۔

مگر یہ ہیرا سی بیٹی اٹھتی جوانی میں رانڈ ہو گئی ۔ دو بچے مرحوم نے اپنی نشانی چھوڑے جنھیں وہ چیل کی طرح نگہبانی کر کے پال رہی تھی ۔ بچے کیا تھے تہذیب اور فرمانبرداری کے دو چرخے تھے ، سوت پر سوت کات لو کیا مجال جو تکلا ٹیڑھا ہو جائے ۔ روز صبح اُٹھ کر کھٹا کھٹ سب کو سلام کرنا ، کوئی مہمان آئے تو فوراً اسے خالہ ، ممانی ، چچی ، دادی ، حسبِ حیثیت و عمر خطاب دینا ۔ جھٹ پٹ " آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ " اور " لب پہ آتی ہے دعا " سنانا اور پھر !

" نوری ناک کو کیا کہتے ہیں ؟ " " نوز " " کان کو ؟ " " ایر " " دانت کو ؟ " " چیک " " نہیں بھئی چیک تو گال کو کہتے ہیں ، دانت کو ؟ " " ٹیتھ " منو جلدی سے بولتا ۔

" شاباش ، بھئی واہ " مہمان مست ہو کر جھوم اُٹھتے ۔

" اچھا چلو اب ٹوئنکل ٹوئنکل سناؤ ۔ کرسی پر کھڑے ہو کے اور بھئی اشارے کرتی جانا "

پھر نوری کرسی پر بندریا کی طرح پھدک پھدک کر انگریزی گانے سناتی اور منو جسم کے مختلف حصوں کی انگریزی بتاتا حالانکہ اس وقت اس کی تمام تر توجہ ان لڈوؤں پر ہوتی جو مہمان کے سامنے رکھے ہوتے اور اس کا ہاتھ کمربند سے کھیلتا ہوتا ۔

لیکن عموماً مہمانوں کے آنے کے وقت شمن کہیں کھو جاتی اور میلی کچیلی گھومتی ہوئی اگر آ بھی نکلتی تو کوئی اس کا تعارف ہی نہ کراتا ۔ بہت سی بڑی آپا کی سہیلیاں اسے پڑوسن کی لڑکی سمجھ کر کبھی بسکٹ وغیرہ دے دیتیں تو فوراً بڑی آپا یاد دلاتیں :

" بس جاؤ اب کھیلو " اور وہ کھیلنے چلی جاتی ۔

بڑی آپا غریب کی زندگی کا سہارا یہ دو ننھی جانیں ہی تو تھیں اور اس کی

زندگی میں رہ ہی کیا گیا تھا سوائے آنسوؤں اور سسکیوں کے۔ یہ عمر اور رنڈاپا مگر وہ اب پہلے سے بھی زیادہ وہ بدمزاج ہو گئی تھی، گویا بیوہ ہو کر وہ۔ ظاہر ہے اب کانچ کی چوڑیاں اور رنگین دوپٹہ نہیں اوڑھتی تو یہ سب لوگوں کے اوپر احسان نہیں تھا تو کیا تھا! رنڈاپے میں زندگی کے دن گزار کر وہ مرے پر سو دُرے ہوئے۔ میاں کیسا تھا ساتھ چلتے جاتے ساس سسر اور ماں باپ کا بھی سوگ کر رہی تھی۔ جب کوئی خوشی کا تہوار آتا وہ اپنا ناٹک شروع کر دیتی؛ ایک کونے میں منہ لپیٹ کر پڑ جاتی اور بین شروع کر دیتی۔ جلدی سے گھلی ہوئی مہندی پھکوا دی جاتی، چوڑی والی کو ہش ہش کر کے ٹال دیا جاتا، سوئیوں کا زردہ پکنا ملتوی ہو جاتا، عید کی چونی ایسے مل جاتی گویا اماں پر قرض آتی تھی یا وہ اپنی جان کا صدقہ دینے پر مجبور ہیں۔

مگر بن باپ کی معصوم بچی نوری کے خوب لاڈ ہوتے۔ اس کے بہانے خوب مہندی گھلتی اور اس کے ہاتھوں پر بیل بوٹے بنائے جاتے مگر شمن کے مہندی لگانے کے خیال کو اس قدر فضول اور حقیر سمجھا جاتا کہ وہ خود لگوانے سے انکار کر دیتی۔

”بری لگتی ہے ہمیں کیچڑ جیسی مہندی“ وہ نفرت سے کہتی۔

”واہ بھئی جب ہاتھ دھو ڈالو تو کیسے پیارے لگتے ہیں“ نوری اپنے لال ہاتھوں کو دیکھ کر کہتی۔

”ہونہہ، گنواریوں جیسے لال ہاتھ، جیسے پان کی پیک لتھڑی ہو، ہی۔ ہمارے تو میموں جیسے صفا ہاتھ“ گو وہ خوب جانتی تھی کہ میموں کے ہاتھ قطعی اتنے گندے اور کالے نہیں ہوتے، لیکن جب وہ ایسی باتیں کرتی تو بچاری نوری کی مہندی کا مزا بھی کرکرا ہو جاتا اور یوں اُس کا جی کچھ ٹھنڈا ہو جاتا۔

کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ بڑی آپا رنگین دوپٹہ نہیں اوڑھتی تھی تو اُس نے بالکل سنیاس ہی لے لیا تھا، اس کے سفید کپڑوں میں بھی وہ رنگینیاں ہوتیں کہ کھل اُٹھتی اور ایک دفعہ تو نئی دولھن کا سہاگ کا جوڑا بھی ماند پڑ جاتا۔ سفید کریپ یا شفون کا دوپٹہ جس پر بیچاری بیوہ نازک سی بمبئی کی بیل چپکا لیتی؛ سفید چکن کا لگے کا کرتا، سارا اگلا مہین مہین بیلوں اور ریشمی ڈوریوں سے آراستہ، قدم قدم پر ستارے

کے جال اور موتیوں کے پھندنے۔ ہاں بچانسے پر رنڈاپا اتارنے کی ضرورت نہیں:
سبز کاہی یا آسمانی پوت کا جھولدار پجامہ۔ ہاتھوں میں وہی رنڈاپا اتارتے وقت
چوماموں نے وہ دو نازک سی بانکیں ڈال دی تھیں پڑی ہوئی تھیں اور مرنے والے
کی نشانی زمرد کی انگشتری اور بس۔ ہاں سنجلی بوا کبھی اگر زبردستی آویزے پہنا دیتیں تو خیر،
ورنہ وہی اپنی موتیوں کی لونگیں پڑی رہتیں۔ سیاہ گرگابی اور سفید پھولدار موزے۔ ریشمی
ہوئے تو ریشمی ورنہ سوتی ہی سہی۔ مانگ کی تو بچاری کو اجازت نہ تھی۔ ویسے کون روکتا
تھا۔ پر اس کا اپنا ہی دل مردہ ہو گیا تھا اس لیے بال اوپر چڑھا کر پھولے پھولے گچھے
کانوں پر چھوڑ دیتی۔ بس اتنے نیچے کہ کانوں کی لویں جھانکتی رہیں۔ روتے روتے
آنکھیں خراب ہو گئی تھیں اس لیے کہیں آتے جاتے وقت سنہری زنجیر والی عینک
لگا لیتی تھی۔

پر جب بڑی آپا رنڈاپے میں یوں سج دھج کر نکلتی تو لوگ دانتوں تلے انگلی دبا
لیتے: "ارے وہ تو سادے چیتھڑوں میں بھی پھٹی نکلتی ہے" ایک دفعہ سنجلی بوا کا پیغام
لائیں تو بیویاں بڑی آپا کو دیکھ کر ان ہی پہ پھسل پڑیں۔
اماں نے کہا، "اور سنو، وہ نگوڑی تو بیوہ ہے" بڑی آپا فخریہ اس غلط فہمی کا
ذکر کیا کرتی کہ لوگ اسے دو بچوں کی ماں کو کنواری سمجھ لیتے تھے۔ اس کا منہ تھا بھی
تو بچا کچا کنواریوں جیسا۔"
جونہی کوئی آپا کے دولہا کا ذکر کرتا اماں ٹھنڈی آہیں بھرنے لگتیں اور
الٹی سیدھی مرنے والے کی تعریفیں شروع کر دیتیں۔ "زبان تو نگوڑے کے
تھی ہی نہیں، اور سینہ یہ چوڑا، منہ بہ طباق سا۔"
اماں سدا کی گپن تھیں اور ہمیشہ بات میں کلی پھندنے لگا دیتیں۔ وہ انگل
کی چیز کو گز بھر کی بتا دینا تو ان کے لیے کوئی بات ہی نہ تھی، "فلانی جیسے اُلٹا
توا، اگلی جیسے میدہ شہاب" حالانکہ نہ فلانی بچاری اُلٹے توے جیسی اور نہ اگلی
میدہ شہاب، مگر پھر بھی لوگ ان کی باتوں کا یقین کر لیتے تھے اور وہ شریف

بزرگوں میں گنی جاتی تھیں۔

کپڑوں کے معاملے میں تو اماں نے کبھی سچ بول کر ہی نہیں دیا: "یہ تین روپے گز ہے، دلی سے منگایا ہے۔" حالانکہ سب جانتے تھے کہ کٹ پیس بیچنے والی چندھی بڑھیا چار روپے سیر کے حساب سے دے گئی ہوگی۔ اماں کا ایک جھوٹ ہوتا تو بتایا جاتا۔

آپا بڑی تو خیر میاں کے فراق میں گھل گھل کر بدمزاج ہوگئی تھی مگر یہ نوری اور منو پر کون سا رنڈاپا ٹوٹا تھا جو وہ چنگیز دوراں بن کے سینوں پر کھڑے مونگ دلتے تھے۔ جس کی چیز جب جی چاہتا مچل کر مانگ لیتے اور وہ مل جاتی۔ بات یہ تھی ان کا باپ جو مر گیا تھا۔ پر یہ مردہ باپ سو بالوں پر بھاری تھا۔ سارا گھر بلکہ سارا کنبہ مرنے والے کے بھوت سے لرزتا تھا۔ کبھی تو شمن بلبلا کر دعا مانگتی کہ کاش وہ بھی بیوہ ہو جائے یا کم از کم ماں باپ ہی مر جائیں پھر ذرا وہ خبر لے لوگوں کی۔

بڑی آپا ماں باپ کی عزت سمیٹے بیٹھی جیسے سارے گھر کی جان پر احسان کر رہی تھی۔ نفس کو مار کر اس میں حکومت کرنے کی طاقت بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں وہ باپ کی عزت کی خاطر اپنی نسوانیت کا خون کر رہی تھی مگر شمن اس کی ذرا بھی احسان مند نہ تھی۔ شوق سے وہ کوٹھے پر جا بیٹھتی تو بھی شمن کو پروا نہ ہوتی، اس کی بلا سے۔ اور پھر بڑی آپا کے بچوں سے زیادہ خوش نصیب شاید ہی کوئی ہوگا آہ! بیوہ اور یتیم!

(۸)

اس کی قسمت سے جو چیز زندگی میں آتی تھی طوفان کی طرح آتی۔ یکایک لوگوں کو اس کی تعلیم کا خیال آیا اور بس طاعون کی طرح سب کے دماغوں کو جکڑ لیا۔ سبھی تو اس کے پیچھے "پڑھو" کا ڈنڈا لے کر پل پڑے۔ بڑی آپا تو پڑھاتی کم، نوری سے مقابلہ کر کے ذلیل و حقیر زیادہ کرتیں۔ مولوی اور ماسٹر بھی آکر اپنے طاقت

اس پر تیز کرتے۔

"پل پر جا۔ کیوں؟" وہ معلوم کرنا چاہتی۔

"یہ اس کا دلیور رہے" ہُوا کرے، شمن کو کیا، اس کا دلیور تو نہیں۔ وہ جل جاتی، اسے کسی کے دلیور سے کیا ناطہ جوڑنا تھا جو وہ یاد کرتی۔

"دس تک گن" بس اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا اور اس کا جی چاہتا ایک ہتھوڑی لے کر کھٹاک کھٹاک ماسٹر صاحب کی کھوپڑی پر سو تک گن دے۔ اور پانچ چھکے تیس۔ یہ لیجیے یہ کیوں؟ پانچ چھکے سولہ کیوں نہیں؟ پھر جوڑنا، گھٹانا، ضرب، تقسیم۔ کاش اسے معلوم ہوتا کہ وہ کس کی بوٹیاں بانٹ رہی ہے اور کس کا خون گھٹا رہی ہے تو شاید اس کو رحم آ جاتا اور وہ کچھ دلچسپی لینے لگتی۔ مگر دلچسپی نہ لینا ماسٹر صاحب کی موجودگی میں ممکن نہ تھا۔ عموماً تو وہ کسی کا سوال آنکھ ٹیڑھی کر کے نقل کر لیتی اور سب کے بعد میں جا کر اپنی سلیٹ دکھاتی، مگر بعض وقت ماسٹر صاحب کچھ تاڑ جاتے اور اس کی ہی سلیٹ کے پیچھے پڑ جاتے۔ اس وقت بڑی مصیبت آتی اور وہ گھبرا گھبرا کر ہتھیلیوں میں تھوک لے کر سلیٹ پر تھوپنے لگتی۔ ایسے موقعوں پر عموماً اس کا حلق سوکھ جاتا جس پر وہ بھلا کر پیٹ میں درد یا اور کوئی حاجت محسوس کرنے لگتی۔ لیکن ماسٹر صاحب کے چانٹوں کا جادو مسیحائی کا کام کرتا اور دم بھر میں تکلیف چھو منتر ہو جاتی۔ ایک نوکر کے لڑکے کا نام لوٹا تھا جو دق کی طرح ہر وقت اپنی ماں کے کلیجے پر ماتم کیا کرتا تھا، بس عبارتی سوال تو اس کی جان کو لو این کر چپک گئے تھے اور بے طرح اس کی روح کو جھنجوڑیاں دیتے۔

کم کا ضرب، زیادہ کی تقسیم۔

مگر یہ اُس کی سمجھ میں کبھی نہ آیا کہ کم اور زیادہ میں فرق کتنا ہے۔

ایک پیسہ کی دو نارنگیاں تو ڈیڑھ روپے کی کتنی؟

اول تو سرے سے یہ بکھیڑے ہی اُس کی قسمت میں نہیں لکھے کہ وہ ایک پیسے

کی دو نارنگیاں خرید سکے، دوسرے زیادہ سے زیادہ دو پیسے کی نارنگیاں کافی ہوتیں۔ بھلا ڈیڑھ روپے کی کون بھر گاڑی نارنگیاں خریدے گا؟ سڑ نہیں جائیں گی ساری کی ساری! پچھلی گرمیوں میں آگرہ والی خالہ نے دو ٹوکرے خربوزے بھیجے، سارے سڑ سڑ کر بچا تو پھکے۔ مگر فوراً ہی اُسے آگرہ والی خالہ کا چھدری داڑھی والا میاں یاد آجاتا جس کی تیمم کی بٹی کی اس نے اور نوری نے کلیاں بنا ڈالی تھیں اور شاید اسی دن سے اس نے خربوزے بھیجنے بند کر دیے۔ اچھے ہوتے تھے بیچارے خربوزے، زمین پر پیس پیس کر چھلیندوں میں دھوے جاتے تھے اور پھر۔۔۔۔

تڑسے ایک چانٹا پڑتا اور وہ خربوزے کے بیجوں پر سے پھسلتی ہوئی جاگ پڑتی اور اس موقعے پر سلیٹ کی ڈک جو ناک میں نشانہ باندھے بیٹھی ہوتی اس کی ناک میں آلگتی۔

"سُن، اگر تجھے ایک پیسہ دیا جائے تو تو کتنی نارنگیاں خریدے گی؟" اگر خدا کی قدرت جوش مارتی اور واقعی اسے پیسہ دیا جاتا تو وہ بھلا پاگل ہوئی تھی جو کھٹی بچو نا نارنگیاں لیتی۔ اور کیا، سچ تو ہے، بھلا پیسہ کی دو والی نارنگیاں کھٹی نہ ہوں گی تو اور کیسی ہوں گی! ماسٹر صاحب تو سدا کے سڑی تھے، خواہ وہ کھٹی نارنگیاں خرید وائے دیتے تھے۔ پیسہ ملتا تو کبھی سے فیصلہ کیے بیٹھی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے کٹی ہوئی پستے لگی گوک خریدے گی اور چکھنے کے بہانے ایک ریوڑی بھی مانگ لے گی۔

"ارے بول۔۔۔ کتنی نارنگیاں آئیں گی؟"

"نارنگیاں؟ آں۔ وہ" ابھی وہ فیصلہ بھی نہ کر چکتی کہ نارنگیاں لے ہی ڈالے یا گزک کے لیے پیسہ اٹھا رکھے کہ ماسٹر صاحب بے صبر ہو جاتے: "کوڑھ مغز کہیں کی۔ ارے ہاں نارنگیاں۔ ایک پیسہ کی دو تو ڈیڑھ روپے کی؟"

"وہ ڈیڑھ؟ ڈیڑھ روپلے کی!" ذرا سوچیے۔

"ہاں ڈیڑھ روپے کی۔ روپے کے آنے بنانے آتے ہیں؟"
ماسٹر صاحب کے سامنے "نہیں" میں سر ہلانے کی اجازت نہ تھی لہٰذا!
"ہاں"۔ "تو چھر بتا"
اور وہ آنے بنانا شروع کرتی۔ کافی تو ہو نگے ڈیڑھ روپے کے آنے۔ خاصے،
ڈھیر سے، اور کیا! عید پر کوئی گیارہ آنے ہو گئے تھے تو واسکٹ کی جیب
لٹک گئی تھی۔ اماں نے نہ جانے کس کام کے لیے تین آنے قرض مانگے تھے تو
اس کی جان نکل گئی تھی۔ اماں تھیں بھی چھٹی ہوئی نادہند۔ جہاں کسی کے پاس
چار پیسے دیکھے اور ان پر غریبی چھائی۔ پھر واپس دینے کی نوبت کبھی نہ آئی، کون
تھا جو تقاضہ کر سکتا!

"اری لول ڈیڑھ روپے کے کتنے پیسے ہوئے؟"
"ڈیڑھ روپے کے پیسے؟"
"ہاں کمبخت"۔
"سولہ"۔ وہ اُکتے ہوئے مقبرے سے زچ کر کہہ دیتی۔
"سولہ، سولہ پیسے ہیں!" اور ماسٹر صاحب پر بھوت سوار ہو جاتا، جیسے
سولہ پیسے دے کر کوئی انہیں ٹھگے لے رہا تھا۔ وہ جی بھر کر مار چکنے کے بعد وہی پیسے
بنا لیتے۔
"چھیانوے منحوس۔ اچھا اب بتا تیرے پاس اتنے پیسے ہیں۔" وہ پیسے
بنوائی کا چانٹا وصول کر لیتے۔
"ہاں"
"اب تو بازار جاتی ہے"
"ہاں" گو اسے یقین تھا کہ کوئی اسے بازار نہ جانے دے گا اور نہ ہی
اتنی کٹائی کے بعد اتنی ہمت رہ جاتی، دوسرے یہ سب بہانے بنائے جا رہے
ہیں اسے اُلو بنانے کے لیے، مگر اسے فرض کرنا ہی پڑتا کیونکہ فضا میں چانٹا منڈلاتا نظر آتا۔

"اب تو وہاں ایک پیسے کی دو کے حساب سے نارنگیاں خریدتی ہے ۔"
چہ! پھر وہی کھٹی نارنگیاں! خیر وہ مجبوراً خریدتی ۔
"کتنی ہوئیں ؟"
"ایں ؟" وہ ایسی شکل بناتی گویا بس کوئی دم میں سوچ کر بتا ہی تو دے گی ۔
"نارنگیاں ؟"
"ارے بتا کتنی ہوئیں تین نارنگیوں کے حساب سے ؟" بولائے ماسٹر صاحب ۔
"تین ؟" وہ ہچکچا کر سوچتی ۔ "تین نارنگیاں، ہاں ۔" وہ وثوق سے کہتی ۔
"تین ! ڈیڑھ روپے کی تین نارنگیاں ؟"
"نہیں، نہیں ۔" وہ گڑگڑا کر ماسٹر صاحب کے وار کہنیوں پر روکتی ۔
"تو پھر —— بتا ۔ بتا ۔ فوراً ۔"
اسی طرح شام ہو جاتی، ماسٹر صاحب پسینے میں ڈوب کر نڈھال ہو جاتے، جیسے کسی نے کھن چکر میں باندھ کر گھماڈالا ہو ۔ اُن کے اعضاء بے قابو ہو کر اُلٹے سیدھے ہلنے لگتے، معلوم ہوتا اتنی دیر وہ بچوں کو پڑھا نہیں رہے تھے بلکہ اپنا نوشتۂ تقدیر پڑھ رہے تھے ۔ پسپت ہو کر وہ دوسرے دن نارنگیاں جبراً خریدوانے کا پختہ وعدہ کر کے چلے جاتے ۔

جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج ۔ جہلم، چناب، راوی —— ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا، جیسے تسبیح کے گول گول دانے ۔ جہلم، جہلم کے بعد چناب ۔ گول دائرے میں ایک دوسرے کے کرتے کا پچھلا دامن پکڑے جیسے بچے ریل ریل کھیلتے ہیں: جہلم، پھر چناب، پھر اس کے پیچھے راوی چلی جا رہی ہے ۔ پھر ——
"یاد ہو گیا ؟" ماسٹر صاحب ایک دم حملہ آور ہوتے ۔
"جی ۔ جہلم، چناب . . ."
"ٹھیک سے بیٹھ بے منّو کے بچے، ہاں آگے ۔"

"جہلم، چناب، را——"

"نہیں مانے گا رے اچھو! اسے، کیا ہوئی تیری سلیٹ! نکال، بستے میں کیا انڈے دے رہی ہے؟"

ماسٹر صاحب نہایت چابکدستی سے چومکھے چانٹے بانٹتے جاتے، کیا مجال جو کوئی کونا ڈھیلا پڑ جائے۔

"ہاں ہاں، کہاں سے نکلتا ہے؟ نکال پنسل —— ہاں ——۔ ادے بول، تو کیوں چپکی بیٹھی ہے؟"

"جہلم —— ام" وہ بھولنے لگتی۔

"ارے آگے بھی تو بڑھو، ایک جگہ کیوں مر کے رہ گئی۔ ہاں بتا۔"

"چناب" قریب قریب بالکل بھول کر وہ ہانکتی۔

"ہاں، ہاں، ہاں۔ کہاں سے نکلتا ہے؟ دیکھ رہا ہوں، ستو، بدذات؟ ارے ہاں بتا" ایسا معلوم ہوتا ماسٹر صاحب مچھلی مچھلی کھیل رہے ہیں۔ اِدھر اُدھر وہ چاروں طرف بھونک بھونک کر پڑھاتے اور کسی کو بھی نہ پڑھا پاتے۔

"لول مراد کہاں بہتی ہے؟"

"جی، زمین پر"

"این زمین پر؟" ماسٹر صاحب برا مان جاتے، گویا دریا کو زمین پر گھسیٹ کر کسی نے ان کی ہتک کر ڈالی، پر کچھ لاجواب سے ہو جاتے۔

"مگر یہ تو بتا، کہاں، کس جگہ سے نکلتا ہے اور کون سے خطے کو سیراب کرتا ہے؟"

"جی، خطے؟"

"ارے ہاں، نہیں تو کیا تیرے سر کو سیراب کرے گا۔"

"جی، سیراب —— تو....." وہ یاد کرنے کی کوشش کرتی۔

"ہاں، نہیں یاد۔ اچھا اور اس کے ساتھ کون کون سے دریا بہتے ہیں —— اسی خطے میں۔"

"خطے میں تو —— دریا بہتے ہیں۔"

"نام بتا سب دریاؤں کے، چناب اور؟"

"جی چناب؟"

"ارے بھئی ہاں منحوس اور؟"

"اور۔۔۔۔ ر۔ام۔۔۔۔ آں اور چناب" وہ دماغ کو خوب بھینچ کر زور لگاتی۔

"پھر بھول گئی دریاؤں کے نام۔ ایں!"

"جی، وہ جمنا، گوداوری، کرشنا" وہ جلدی جلدی بتاتی جاتی اور کہنی کی ٹکون بنا کر سر پر کھڑی کو لیتی، مگر ماسٹر صاحب پر تو جنون سوار ہو چکا ہوتا۔ اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی۔ کتنی کوڑ مغز تھی وہ! ماسٹر صاحب سچ کہتے تھے، اس کے دماغ میں بھوسہ بھرا تھا۔ کاش اس کے جسم میں بھی کوئی اس قسم کا مادہ بھٹا ہوتا جو مار سے ایسی ٹیسیں تو نہ اٹھتیں۔ اس نے کتنے کتنے قلم کے خول میں سے نکلے ہوئے ہرے ہرے دانے نکلے کھائے، بدمزہ اور پھیکے، مگر دماغ ویسا ہی کند رہا اور ماسٹر صاحب تو کہہ چکے تھے کہ وہ بالکل نہیں پڑھ سکتی، بھیجا ہے ہی نہیں سر میں۔ اور یہ تو وہی چناب تھا۔ جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج والا چناب۔ خدا غارت کرے اسے، یاد ہی نہ آیا۔ پھر اس کے دماغ میں گول گول تسبیح کے دانوں کی طرح جہلم، چناب، راوی۔ چکر تو ان میں رقص کرنے لگے۔ مگر ماسٹر صاحب تو کہتے ہیں دریا بہتے ہیں۔ اچھا تو دریا بہتے ہیں! مگر یہ کم بخت کہاں الٹے سیدھے بہا کرتے ہیں؟ کاش وہ گھر کے پاس آ کر ہی بہے ہوتے تو یوں اس کی زندگی میں گھٹن بند نہ بندھ جاتے۔

ان کم بخت دریاؤں سے تو ہزار گنا اچھا وہ نالا تھا جو کھیت کے بیچوں بیچ روپہلی سانپ کی طرح لہرایا کرتا تھا۔ اس کے کنارے بالکل مکھی کے برابر مینڈکیاں گھاس میں پھدکا کرتی تھیں اور جب کاغذ کی ناؤ میں وہ ان ننھے مینڈکوں کو مسافر بنا کر نالے کے دھارے پر چھوڑ دیتی تو کشتی کس شان سے سینہ تانے بہتی چلی جاتی۔ وہ تالیاں بجاتی اس کے ساتھ ساتھ دوڑتی اور جب کوئی تنکا یا لکڑی ناؤ میں پھنس کر اسے چکر پھیریاں دیتی

تو اس کے جوڑ کھل جاتے اور ننھے مینڈک بہادر تیراکوں کی طرح پانی میں چھلانگ مار کر کنارے پر آن لگتے۔ اس نالے میں کبھی کبھی کہیں سے مچھلیاں بھی بہہ آتیں، تب تو کنارے پر سینکڑوں جانور دعوت اڑانے آن ڈٹتے، بڑا مزا آتا۔

مگر جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج، انہیں بھی تو یاد کرنا تھا۔

(۹)

نوری تھی تو بڑی کی لڑکی، سانپ کا بچہ سپنولیا، شمن نے اس سے دوستی بڑے سوچ بچار کے بعد کی تھی کیونکہ گھر میں وہ تھی یا نوری، باقی سارے لڑکے جن سے ان کی ایک منٹ بھی نہ نبھتی۔ اس لیے نہیں کہ وہ لوگ اسے مارتے تھے، مارنے میں وہ خود کچھ کم نہ تھی، سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ وہ موقع بے موقع اس کی گڑیا بھی چیر ڈالا کرتے تھے؛ اور نوری کے پاس تو گڑیاں بھی تھیں جن کی وہ دونوں مل کر روز شادیاں کیا کرتیں۔ گھنٹوں اسباب کے کمرے میں کھڑکی پر چڑھی سر جوڑے گو دڑ سے کھیلا کرتیں۔ جی گھبرا جاتا تو گلی میں کھیلتے ہوئے لڑکوں کو دیکھا کرتیں۔ گلی کیا تھی، تھیٹر کی اسٹیج تھی؛ وہ گئی چندھی، بڑھیا کی نوجوان بہو ـــ کھڑکی میں سے صدیق نے پکار لگائی ـــ دو لڑکے ایک دوسرے کو نوچتے کھسوٹتے گالیاں دیتے گزر گئے ـــ "بیر لو بیر میٹھے بیر" ـــ "گردے کلیجی" ـــ "بیل، صابن، موتی" ـــــــ اور پھر چھجے پر بیٹھی سگھڑ بندریاں جو اپنے بچوں کی جوئیں بین بین کر کھایا کرتی تھیں۔ پرانی مسجد کے ملاجی، جن کے آتے ہی ڈر کر دونوں کھڑکی سے نیچے دبک جاتیں، دل دھڑکنے لگتے اور ناکوں پر پسینے آ جاتے۔ مگر پھر ان کے دلوں میں کھدبد ہوتی، رہ رہ کر جھانکنے کو جی چاہتا، وہ ڈری ہوئی چوہوں کی طرح آہستہ سے اوپر ابھرتیں۔ ملاجی دیوار سے ناک لگائے گھنٹوں کھڑے عجیب بھیانک حرکتیں کیا کرتے۔ پہلے دن جب وہ بالکل بے خبر انہیں غور سے دیکھ رہی تھیں تو وہ ان سے نجانے کیا کہنے لگے۔ پہلے تو ان کی سنائی نہ دیا کہ وہ کیا اشد ضروری بات کہنا چاہتے ہیں، مگر جب وہ ذرا آگے جھکیں تو مارے خوف کے وہ وہیں

جم کر رہ گئیں، جیسے اژدہے کو دیکھ کر بندر مسحور ہو جاتے ہیں اسی طرح سانسیں روکے، مٹھیوں سے جنگلہ پکڑے وہ ٹکٹکی گھورا کیں۔ پھر نہ جانے کیسے وہ ایک برقی طاقت سے جھٹکا کھا کر زخمی چڑیوں کی طرح پیچھے گریں اور اُٹھ کر ایسی بے تحاشہ بھاگیں جیسے ملاجی چھلانگ مار کر جنگلے میں سے ان کی گردنیں پکڑ ہی تو لیتے۔ بڑی دیر تک ان کے حواس غائب رہے، حلق خشک اور ہاتھ پیر بے قابو۔

پانی پی کر ذرا دم میں دم آیا تو ڈرتے ڈرتے انہیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی ہمت ہوئی، گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھتی ہیں: ”کہو بھئی مزاج تو اچھے ہیں؟“ اس کے بعد ایک دم سے کھو کھلے قہقہے لگا کر بے دم ہونے لگیں اور کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسی دباتی رہیں، گویا ان کے سینوں میں بڑے ہی اہم راز دفن خاموش اودھم مچا رہے ہیں۔ انہوں نے آپس میں کوئی تبادلۂ خیالات نہ کیا، جیسے وہ بڑی جہاندیدہ ہیں حالانکہ ان کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے اور ایسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں کہ بات بھول بھول جاتی تھیں۔

کھانے کے وقت شمن کا جی متلانے لگا، بار بار بھیانک زخم کے غار کی طرح اس کے ذہن میں کوئی چیز پھیلنے لگتی۔ اگر وہ گاڑی کے پہیوں میں کسی انسان کو پستا ہوا دیکھتی تب بھی ایسی دہشت اس کے جی پر نہ بیٹھتی۔ اس کے تمام احساسات پر جیسے کسی نے اونچائی سے بھاری پتھر پٹخ دیا ہو جس کے نیچے وہ زخمی کیڑوں کی طرح دبے ہوئے تلملا رہے تھے۔

کئی دن تک وہ اس دلچسپ کھڑکی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکیں، جیسے وہ کوئی قتل کر کے بھاگ آئی تھیں اور لاش اب بھی پڑی سڑ رہی تھی۔ پھر دور ہی دور سے وہ معنی خیز نظریں ڈالتی گزر جاتیں، ان کا تخیل کھڑکی سے باہر کود جاتا اور پھر وہاں سے دہشت زدہ ہو کر بھاگتا، مگر رفتہ رفتہ ان کی ہیبت کم ہو گئی اور وہ صرف ان اوقات میں بھاگ آتیں جب ظہر کی نماز سے لوگ فارغ ہوتے اور گلی قبرستان کی طرح سنسان ہو جاتی۔ پھر تو وہ اور دلیر ہوتی گئیں اور اب یہ حال تھا کہ جان

بوجھ کر ملا جی کو آتے دیکھ کر دبک جاتیں اور اچک اچک کر جھانکا کرتیں ۔ ہر بار ان کے جی متلاتے ، سوکھی سوکھی قے کے جھٹکے لگتے اور طبیعتیں مکدر ہوجاتیں مجروح دماغ ہل ہل جاتے ۔

لوری کی گڑیا شمن کا گڈا بلا ناغہ بیاہے جاتے اور پرانے جوتے کے ڈبے کی پالکی میں دلہن لا بٹھائی جاتی ۔ موتیوں کے کنگن سے آراستہ ہاتھ سے دلہن سب کو سلام کرتی اور مسہری پر سو جاتی ۔ پھر گڈا دونوں ٹانگوں پر کودتا ہوا آتا اور کرسی پر کھڑا ہو جاتا ــــــ کھیل ختم!

پڑوس میں صدیقہ کی خالہ کی شادی ہوئی تو علاوہ منڈیر پر سے گھما گھمی دیکھنے کے انہوں نے بہت سی رسمیں سیکھ لیں ۔ دلہن کی گود میں آئینہ رکھا گیا اور دولہا نے اس کا مُنہ دیکھا ۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

"بیوی میں تیرا غلام ۔ منہ کھولو" گھسیانے دولہا کو کہنا پڑا تھا اور پھر کھیر چٹائی گئی تھی ۔ دولہا نے کیا ہنس ہنس کے دلہن کے مہندی لگے شرمائے ہوئے ہاتھ پر سے کھیر چاٹ لی تھی کہ سب کھل کھلا کر ہنس پڑے تھے ، جیسے کسی نے ان کی بغلوں میں گدگدیاں کر دی ہوں ۔ دولہا دلہن کی ہر پیاری سی لگاوٹ والی رسم پر بیویاں چہک چہک کر قہقہے لگاتی تھیں ۔ شمن کو بھی ارمان بھری گدگدی محسوس ہوتی تھی اور لوری تو بضد تھی کہ چلو اندھیری کوٹھڑی میں دلہن دلہن کھیلیں ۔ یہی نہیں بلکہ شادی کے بعد عورتیں دولہا کو چھیڑ چھیڑ کر مزے لے رہی تھیں ، گویا وہ کوئی میٹھا سا لڈو تھا جسے چکھ چکھ کر چٹخارے بھر رہی تھیں ۔ پھر رات کو خوب دولہا کو کھسیانا کیا گیا جس میں چند نوجوان شوقین بیویاں حصہ لے رہی تھیں اور کنواری لڑکیوں کو ڈانٹ ڈانٹ کر بھگایا جا رہا تھا ۔ نجانے کیا ہو رہا تھا ، دروازوں کی درزوں اور روشندانوں پر بیویاں مکھیوں کی طرح چپکی پڑی تھیں ۔ جب کہ ان کے بچے اور خاوند گھروں میں پڑے سے واویلا مچا رہے تھے ۔

گڈے سے گڑیا کی شادی اب کی دفعہ اور دھوم سے ہوئی ۔ نکاح کے چھوارول

کے بجائے مُرمُرہ اٹھالیے گئے اور دولہا نے دلہن کی ہتھیلی پر سے کھیر چاٹی۔ نوری اندھی نے سارا گڑیا کا دوپٹہ کھیر میں لتھیڑ دیا۔ اس لیے شمن نے اٹھا کر بہو کو دہلیز پر پٹخ دیا جس پر نوری اور وہ خوب گتھم گتھا ہوئیں اور ایک دوسرے کے بال بھر بھر مٹھی نوچ پھینکے۔

گڑیا ویسے بھی میلی ہو گئی تھی۔ گھوڑے کا سا منہ، اس لیے جب نئی گڑیا بڑی آپا نے بنا کر دی تو انہوں نے اس کی ناک ڈورے کے بجائے کپڑے کی بنوائی اور چٹیا بھی کالا موزہ ادھیڑ کر لگائی۔ لمبا سا دوپٹہ ڈالا، پھر بھی انہیں اطمینان نہ ہوا تو ہاتھوں میں ڈورے کی انگلیاں لگوا لیں۔ پھر ایک دن بڑی ہمت کے بعد انہوں نے نہایت ہی پوشیدہ جگہ جا کر اس کی واسکٹ میں روئی کی دو گولیاں رکھ دیں، مگر اس سے انہیں اتنی شرم آئی کہ آنکھ بھر کر گڑیا کو نہ دیکھ سکتی تھیں۔ مہین کریپ کا دوپٹہ اوڑھ کر کپڑے کی ناک اور ڈورے کی انگلیوں والی گڑیا بالکل جیتی جاگتی عورت لگنے لگی۔ توبہ! ان کا دل کسی کام میں نہ لگا اور وہ دن بھر اس کا بیاہ کرتی رہیں۔ لیکن ایک دن گوند کی تلاش میں جو بڑی آپا نے گڑیوں کا جائزہ لیا تو ان کی چوری پکڑی گئی، اس کی اور نوری کی وہ گت بنائی گئی کہ دونوں موت کی دعائیں مانگنے لگیں۔ انہوں نے ایک سرے سے گڑیا کی صدری ہی چھین لی۔ اور کرتے میں کمر پر ٹانکے لگا دیے۔ اس دن سے ان کا جی گڑیوں کی طرف سے بالکل کھٹا ہو گیا، وہ انہیں بالکل کپڑے کا چیتھڑا نظر آنے لگیں جن کی ناک کی جگہ تکونی کلی لگی تھی اور انگلیوں کی جگہ ڈورے لٹک رہے تھے۔

(۱۰)

اماں شمن سے عاجز تھیں سارے دن بھاوجوں کو کوسنا پیٹنا! نوکروں سے لڑنا ان کے کام میں حارج ہونا! بھاوجوں کی زندگی اجیرن اور بھتیجوں کے لیے قہر کا سامان، ماسٹر صاحب نے توبہ کر لی اور قرآن پڑھانے والی ملانی بی نے کان

اینٹھ لیے کہ "توبہ، نوج کسی کی اولاد یوں ہاتھ سے نکل جائے۔"

اور سب سے زیادہ تو وہ نوری کو خراب کیے دیتی تھی۔ وہی ہوا جس کا بڑی آپا کو دھڑکا لگا ہوا تھا۔ شمن نے نوری کو کوڑی کام کا نہ رکھا اور وہ روز بروز گئی گزری ہوتی جاتی تھی۔ اس وقت اسے مرنے والا اور بھی یاد آرہا تھا کیونکہ ایک تو نوری ہاتھ سے نکلی جارہی تھی۔ دوسرے اس کی اپنی صحت رفتہ رفتہ گررہی تھی۔ کھانا تو کسی دن ہی ہضم ہوجاتا ہوگا اور نیند تو اس کے حصے کی اللہ میاں کے یہاں ختم ہی ہوگئی تھی۔ اس کا ایک رشتہ کا دیور حال ہی میں ڈاکٹری پاس کرکے آیا تھا، وہی بچارا بھابی جان میں جان ڈالے ہوئے تھا۔ اس کے دوروں کا علاج دنیا جہان کے حکیم ڈاکٹر ہار گئے، نہ ہوسکا، اگر تھوڑا بہت کیا تو رشید ہی نے کیا۔

ویسے دوروں کا کیا ٹھیک، کہہ سن کر تھوڑی پڑتے ہیں۔ بس اتنا اتفاق یا خدا کی مہربانی کہو کہ دورے کے وقت رشید کہیں آس پاس ضرور ہی مل جاتا، ورنہ نجانے کیا ہوتا۔ ہزاروں دوائیں پی ڈالیں مگر دوروں سے پیچھا نہ چھوٹا۔ لوگوں نے بہت چاہا کہ وہ منجھلی کے مہاسوں کا علاج کردے مگر وہ ٹال ہی گیا۔ آخر کو بچاری منجھو کی شادی ایک وکیل صاحب ہی سے ہوگئی۔ منجھو بچاری ان جانوں میں سے تھی جو نہایت سلیقے سے پیدا ہوتی ہیں، شریفوں کی طرح گھر میں رہیں، پھر کوئی اللہ کا نیک بندہ بیاہ لے گیا۔ وہاں جب تک جی میں طاقت رہی بچے پیدا کیے، پالے، پوسے، پھر کسی دائمی مرض میں مبتلا ہوکر دکھ سہتی رہیں اور ایک دن اللہ نے مٹی عزیز کرلی۔ سب کے منہ سے بے اختیار نکل گیا: واہ، کیا جنتی بیوی تھی!

پر منجھو ابھی مری نہیں تھی، اس کی تو اب زندگی شروع ہورہی تھی۔ ادھر وہ بیاہ کہ گئی اُدھر بڑی کو دوروں نے آدبوچا، اور اس بری طرح کہ توبہ بھلی۔ طبیعت نڈھال اور جی کھویا کھویا سا رہتا۔ دل بہلانے کو اس نے ہارمونیم بھی سیکھنا شروع کیا "ابنِ مریم ہوا کرے کوئی" گھنٹوں بے تال سر ہارمونیم کی پیں پیں کے ساتھ چلتا، مگر دل اور بھی بے قابو ہوتا گیا۔ رشید آکر گھنٹوں بیٹھا اسے مرض کے متعلق

ہدایتیں دیا کرتا، کبھی ایک آدھ سوئی بھی اس کے بازو میں لگا دیتا۔ بازو میں سوئی لگواتے وقت اس کے بڑی گدگدی ہوتی اور وہ لوٹ پوٹ ہو جاتی، پر دو چار دن کو دورے ختم جاتے۔

مگر بڑے بھیا کو رشید سے خواہ مخواہ کا بیر پڑ گیا۔ بات یہ ہوئی کہ ان کی دلہن، جو سدا کی بہلنے باز تھی، پچیش کا نسخہ لکھوانے کا تقاضا کیے جاتی تھی اور رشید بچارا بھول بھول جاتا تھا۔ پر ان کا کہنا تھا وہ جان بوجھ کر کسی کے بہکانے کی وجہ سے ٹال مٹول کرتا تھا۔ اور بڑی آپا اپنے دونوں بچوں کی قسم کھا کر کہتی تھی کہ بڑے بھیا کا نوکر ہی ایسا مکر رہا تھا کہ نسخہ لکھنے کو کئی دفعہ رشید میاں نے کاغذ مانگا، سنی ان سنی کر گیا۔

”وہ بچارے تو سبھی کو بھگتنے کو تیار ہیں۔“ وہ کہتی۔ پھر بھیا نے جو شکایت کی تو بڑی آپا بگڑ کھڑی ہوئی کہ ”وہ کسی کے نوکر نہیں ہیں، میری وجہ سے آ جاتے ہیں تو سارے گھر کو مرض اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔“

اور سچ بات بھی تھی۔ بڑی کی سسرال والوں پر اسی کا حق تھا۔ میاں مر گیا تھا تو کیا تھا، اس کا کنبہ تو موجود تھا۔ وہ آج چلی جاتی تو کون اس کا ہاتھ پکڑ لیتا؟ یہ تو اس کا ہی جی تھا جسے مارے بیٹھی تھی۔

کہتے ہیں کہ بڑے بھیا کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ ان بچارے کے دل میں کہاں سے بیٹھتی، یہ ان کی لاڈلی بیگم ہی کے کرتوت تھے۔ سو بس وہ پیچھے لگ گئے۔ جہاں رشید آتا وہ آن بیٹھتے اور وہ بچارا جلدی سے چلا جاتا۔ ارے کہیں یوں لشتم پشتم بھی دورے ٹھیک ہوئے ہیں۔

غضب تو جب ہوا جب انہوں نے اس کے خط پکڑ لیے اور صاف بڑی سے کہلوا دیا کہ اگر یہ پتے بازی بند نہ ہوئی تو ابا جان تک نوبت پہنچ جائے گی۔ اگر ایسا ہی ہے تو نکاح کر لو، مگر شرافت سے۔ بڑی آپا کی ساس کے کان میں بھی بھنک پہنچی اور بڑھیا صلواتیں سناتی، دہائی دیتی چڑھ دوڑی۔ وہ بے دمے بچ کہ رشید

ہمارے کا آنا بند۔ اس دن سے دوسرے بھی پھیکے پڑ گئے۔ کس کے بوتے پر پڑتے؟ بڑی بڑی کا غصہ تین تاؤ کھا گیا اور بس اسے تو پھر اپنے بچوں کی مامتا نے بے چین کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس سے نوری کی بربادی شمن کے ہاتھوں نہ دیکھی گئی، مجبوراً اسے اسکول بھیج دیا گیا۔

(۱۱)

شمن نے جب اسکول میں قدم رکھا تو پہلے اس نے چاروں طرف سے اطمینان کر لیا کہ کدھر کدھر سے دشمن کے حملے کا خطرہ ہے۔ سب سے پہلے تو اس نے میرٹن کو سمجھا دیا کہ مہربانی کر کے نہ تو اس کے . . . . سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرے جائیں اور نہ اسے گھر کی یاد نہ آنے کے لیے پیار کرنے کی کوشش کی جائے۔ وہ اس قسم کے دکھاوے سے بخوبی واقف تھی اور منجھو کو پرکھ چکنے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ کسی سے محبت کرنا یا کروانا حد سے زیادہ مکاری ہے۔ پیار سے وہ ایسی بھڑکتی جیسی نئی چڑیا بھٹکی سے۔ وہ ان باتوں کی عادی ہی نہ رہی تھی۔ نجانے کتنے دن سے نرم اور اخلاص بھرے الفاظ اس کے کانوں کے پاس بھی نہ بھٹکے تھے۔ ہر بات کے جواب میں گھڑکی سننے کی عادت پڑ چکی تھی، لہٰذا وہ کوئی کام شاباشی سننے کے لیے کرنا ہی نہ جانتی تھی، بلکہ جب تک ہر قدم پر اسے ڈانٹ نہ ملتی وہ کچھ ناامید سی ہو جاتی۔

جماعت میں جب وہ داخل ہوئی تو اس نے ایک بے اعتباری کی نگاہ سب چہروں پر ڈالی۔ اسے ان کا گھورنا اور مسکرا کر آپس میں کانا پھوسی کرنا بہت ناگوار ہوا۔ جب ٹیچر کمرے میں آئیں تو سب کھڑی ہو گئیں مگر وہ الوؤں کی طرح بیٹھی رہی، اس پر لڑکیوں کے قہقہے نکل گئے اور وہ ایک دوسرے کو کہنیاں مار مار کر اس بے عنوانی پر رائے زنی کرنے لگیں۔

"کیا آپ کی پیٹھ میں درد ہے جو آپ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا؟" رعب دار مس ممتاز نے کٹتے ہوئے لہجے میں معلوم کرنا چاہا۔

"ایں!" اس نے منہ پھاڑ دیا۔
لڑکیاں ہنسی سے لوٹ گئیں اور خفت کی وجہ سے شمن کے کان لال ہو گئے۔ اسے مس ممتاز شروع ہی سے "نفرت" لگیں۔ وہ اس سے آپ کر کے بول رہی تھیں، جس میں علاوہ انتہائی تکلف، کے ذرا طنز کی چاشنی بھی موجود تھی۔ مس ممتاز نے کوئی اور بات نہیں کی۔ اس دن کیا پڑھایا گیا، یہ اس کی خاک سمجھ میں نہ آیا کیونکہ گھبراہٹ اور پریشانی پر قابو پانے میں اسے اس قدر کشمکش سے سامنا کرنا پڑ رہا تھا کہ وہ کچھ نہ سن سکی۔

تین چار دن وہ جماعت میں خاموش بیٹھی رہی اور اب اس میں اتنی سمجھ آ گئی تھی کہ سب لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہو جاتی، بیٹھ جاتی، اندر باہر جاتی اور حاضری کے وقت بجائے "کیا ہے" کے اب وہ "جی حاضر" بولنے لگی تھی۔ مگر بولنے کے بعد بڑی دیر تک اس کے کان تمتمایا کرتے کیونکہ جب پہلے روز اس نے حاضری دی تھی تو لڑکیوں کا ہنستے ہنستے پتلا حال ہو گیا تھا، یہاں تک کہ مس ممتاز کے رعب دار سنجیدہ چہرے پر بھی دیر تک مسکراہٹ منڈلاتی رہی تھی۔

ہفتہ بھر بعد اسے نیچی جماعت میں اتار دیا گیا۔ اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی مگر لڑکیوں نے اس معاملے کو سانحہ بنا دیا۔ جدھر وہ جاتی اشارے ہونے لگتے۔ لڑکیاں اس کی بے وقوفی کے چرچے کر کے ٹھٹھے لگاتیں اور اب ہر ایک کی زبان پر یہ تھا کہ وہ اتار دی گئی۔ مس ممتاز نے رپورٹ دی کہ وہ بہت کمزور ہے اور اس درجہ میں کام نہیں چلا سکتی۔

اس نئی چھوٹی جماعت میں چھوٹی لڑکیوں کے درمیان وہ ان سب کی اماں معلوم ہوتی کیونکہ یہ لڑکیاں اس سے ڈرتی تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں اسے معلوم ہو گیا کہ وہ ان سب سے عقل، عمر اور علم میں بہت آگے ہے، اس کو سبق وغیرہ کچھ یاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے تیزی سے لڑکیوں پر رعب گانٹھ لیا۔ دو مہینے بعد جب وہ گھر واپس گئی تو پہلے سے چڑ گئی بدزبان، خود سر اور ڈھیٹ

ہو گئی تھی۔ اب اسے مار لینا بھی آسان نہ تھا۔ وہ نہایت گستاخ نگاہوں سے گھور کر تڑ سے جواب دیتی۔ اس کے علاوہ اسے کھانے کی چیزیں چرانے کی بڑی مہارت ہو گئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ جھٹ نعمت خانہ میں سے کچھ نکال کر منہ میں رکھ لیتی اور ایسے مزے سے تھوڑا سا چرا کر بغل میں دبا لیتی کہ خوب ہاتھ ہلا ہلا کر چلتی جب بھی کسی کو پتہ نہ لگتا اور منہ میں لقمہ لے کر وہ گنگناتی ہوئی نکل چلی جاتی تاکہ کوئی سوچے اس کا منہ خالی ہے۔ اس کے علاوہ پیسے اور روپے تک اڑا لیتی مگر کسی کو اس کی طرف شبہ کرنے کا خیال بھی نہ آتا۔ چوری کی چیز وہ نہایت تندہی کے ساتھ سب کے ساتھ مل کر ڈھونڈھتی، یہ طریقہ اس کی بے گناہی کو اور مضبوط بنا دیتا۔ لڑکیوں سے اور بھی اس نے غلیظ غلیظ باتیں سیکھ لی تھیں جو وہ نہایت فخر سے نوری کو سکھاتی۔

پھر جو وہ اسکول آئی تو اسے ایک نئی ٹیچر سے پالا پڑا۔ یہ ٹیچر بہت کم عمر سی معلوم ہوتی تھیں لہذا آتے ہی اس نے انہیں دق کرنا شروع کیا۔ کچھ دن اس کی شرارت بھری جنگ جاری رہی لیکن جلد ہی اسے محسوس ہوا کہ وہ ہار رہی ہے۔ انہوں نے اس کی شرارتوں پر کونے میں یا بنچ پر کھڑا کر دینے کے بجائے بالکل توجہ نہ دی، اور جیسے ہر بات کو ٹال جاتیں۔ کونے میں کھڑے ہو کر تو وہ مزے سے لڑکیوں کا منہ چڑھا چڑھا کر ہنسایا کرتی تھی جس پر استانی جل کر اسے بنچ پر کھڑا کر دیتیں، بنچ پر کھڑے ہو کر وہ لڑکیوں پر بن بن کر گرتی اور خوب ہنسی پڑتی۔

مگر چند ہی دن میں اس نے اپنے آپ کو ہزاروں ذمہ داریوں میں جکڑا پایا: کلاس کی مانیٹر وہ، بورڈ وہ صاف کرے، چاک کی فکر رکھنی پڑے، نقشہ ٹانگنے کی کیل مضبوط ہے کہ نہیں، لڑکیاں غل مچائیں تو اس کی مصیبت؛ اس کے علاوہ مس چرن، یعنی اسی نئی ٹیچر کی کتابیں اور چھتری وہ اپنے ڈیسک میں وقتاً فوقتاً رکھے اور کبھی کبھی ان کے گھر پر امتحان کی کاپیاں پہنچانے جائے۔ کمرے میں مس چرن بالکل استانی نہیں لگتی تھیں بلکہ بڑی بے تکلفی سے اس سے کرسی پر بیٹھنے کو کہتیں:

"اچھا بھئی چائے پیوگی یا نیبو کا شربت؟" وہ پوچھتیں، اور اسے شرم آنے لگتی۔ کبھی کسی نے اس سے ایسی عجیب باتیں نہ کی تھیں۔ تھوڑی سی دیر میں وہ دونوں سہیلیوں کی طرح ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگتیں۔ اس نے انہیں تمام گھر کے قصے سنائے۔ بڑی آپا سے وہ بڑی خفا تھی، اور شانو اور ستو کی شرارتوں پر تو ان کے اچھو لگ گئے۔ نوری انہیں کچھ کچھ پسند تھی۔

مس چرن نے اسے گھر کا کام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں بلانا شروع کیا۔ شمن کو اس قدر فخر محسوس ہوتا کہ کام ختم ہو جاتا تو اسے بڑا رنج ہوتا۔ مس چرن نے اسے اسکول کے علاوہ کام دینا شروع کیا اور دوسرے امتحان پر اسے ڈبل درجہ چڑھا دیا گیا۔ خوشی تو اسے اس بات کی ہوئی کہ مس ممتاز جس درجے کو پڑھاتی تھیں وہ اس سے بھی آگے ہو گئی۔

مس چرن اب بھی اسے اپنے کمرے میں پڑھاتی رہیں اور نجو کے بعد اسے پہلے انسان نے متاثر کر کے اپنے قابو میں کر لیا۔ اگر مس چرن کہتیں تو وہ مشکل سے مشکل کام انجام دے لیتی؟ ان کے لیے اسے کسی کو قتل کرنے میں بھی دریغ نہ ہوتا۔

اس کی زبان پر ہر وقت مس چرن کا نام رہنے لگا۔ لڑکیوں نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی جس سے بجائے کم ہونے کے ان کا خیال ایک رومانی چیز بن کر اس کے دماغ پر چھانے لگا۔ مس چرن کو دیکھ کر آپ ہی آپ اس کا دل ان کی طرف کھنچنے لگتا۔ وہ کہیں بھی ہوتیں اسے ان کے وجود کا احساس نبض کی طرح دھڑکتا، اپنی رگ رگ میں سرایت کرتا ہوا معلوم ہوتا۔ وہ اگر سامنے سے گزر جاتیں تو وہ جو کام کرتی ہوتی اسے گڑبڑ دیتی، بات کرتی ہوتی تو زبان لڑکھڑا جاتی۔ اگر وہ کسی اور لڑکی کو کھیل کھلاتی ہوتیں تو اس کے لیے پڑھنا دشوار ہو جاتا، رہ رہ کر ان کے قہقہے اسے سر سے پیر تک لرزا دیتے۔ سب کا خیال تھا مس چرن سیاہ فام اور بہت ہی کم رو تھیں، لیکن شمن کی آنکھیں کچھ اور ہی دیکھا کرتیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ مس چرن سے بھی حسین کوئی شے ہو سکتی ہے۔ اسے اپنے رشتہ داروں سے لگاؤ تھا، کچھ یونہی سا، خدا سے ڈرتی تھی، مگر اس کے خیال میں غرق کبھی نہ ہو سکی،

لیکن مس چرن اس کے لیے اپنے خون اور ایمان سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ عموماً ان کی تخیئلی مورتی کو عقیدت اور انتہائی جوشیلے محبت بھرے جذبات میں ڈوبی پوجا کرتی۔ وہ آئیں مس چرن، وہ گئیں۔ وہ ان کی ساڑی ہلی اور بلاؤز چمکا۔

اس کا پڑھنے میں بھی زیادہ دل نہ لگتا، مارے باندھے تے صرف مس چرن کی خاطر پڑھ لیتی تھی، گویا گھر کا کام مستعدی سے کر کے وہ مس چرن کے قدموں میں عقیدت کے پھول چڑھا دیتی تھی۔ اور تخیئل کے ساتھ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا جسم بھی مس چرن کے قرب میں رہنے لگا ہے وہ ہر وقت اپنے آپ کو اُن کے پاس محسوس کرتی: وہ کھڑی ہے۔ مس چرن کا خیالی ہیولیٰ پاس سے گزر گیا ہے۔ وہ خود سو رہی ہے مس چرن اُسے تھپک رہی ہیں۔ وہ پیاسی ہے، حلق چٹخا جا رہا ہے اور مس چرن اُس کے منہ میں ٹھنڈے ٹھنڈے خوشبودار عرق نچوڑ رہی ہیں۔ اُن کا ہاتھ اس کے ماتھے پر ہے، وہ برف کی بنی ہوئی ہیں اور اس احساس سے وہ بغیر نیند کے اونگھنے لگتی۔ وہ دیکھتی رات کو اندھیرے میں بردتی ہوئی بھٹکتی پھر رہی ہے، ٹھنڈی گھاس پر پڑی سردی سے کانپ رہی ہے، مس چرن اُسے اپنے پروں بھرے دار تکیہ پر لٹائے ہوئے ہیں۔ وہاں وہ ڈر کے مارے مکر سادھے پڑی ہے کہ اگر ہوش میں آگئی تو سارا خواب بکھر جائے گا۔

مس چرن کا خیال اُس کی جان کو مرض کی طرح لگ گیا۔ کچھ اُن دنوں بورڈنگ میں آلو کھاتے کھاتے لڑکیوں کے ہاتھے بھی بگڑ چلے تھے اور شمن تو ہرا لابلا ڈٹ کر کھا جاتی تھی۔ اُس کی نیند بہت خراب ہوگئی تھی، راتوں کو اُٹھ کر بڑبڑاتی تھی اور جیسے ہی آنکھ کھلتی اُسے محسوس ہوتا کہ مس چرن کھڑی ہیں، اگر وہ ہلی تو غائب ہو جائیں گی۔ اندھیرے میں اُن کے وجود کو گھور گھور کر وہ سونے کی کوشش کرتی۔

ایک رات کو اُس نے اپنے آپ کو برآمدے میں مس چرن کے کمرے کے آگے کچھ ٹٹولتے ہوئے پایا۔ وہ ایک دم ڈر گئی۔ وہ کیسے اتنی دُور تک سوتی ہوئی چلی آئی۔ جلدی جلدی کمرے میں آکر بچھونے میں دبک گئی۔ یہ کیا ہو گیا تھا اُسے؟ وہ خود تھی یا اُس کا بھوت جو راتوں کو اُسے گھسیٹے پھرتا تھا۔

دو تین دن بعد پھر اُس نے مس چرن کے کمرے کے آگے خود کو ہچکیوں سے روتے ہوئے پایا۔ خوف سے اُس کی گھگی بندھ گئی۔ وہ کیوں رو رہی تھی؟ یہ اُسے نہیں معلوم ہوا۔ اُسے واپس اپنے کمرے تک آتے میں بہت ڈر لگا۔ برآمدے میں اندھیرا تھا اور جاڑوں کی وجہ سے سب کمرے بند تھے۔ وہ ڈرپوک نہ تھی اور بلی وغیرہ سے اُسے خوف نہ آتا تھا مگر لوٹتے وقت وہ تیز تیز بھاگنے لگی گویا بہت سی غیر مرئی چیزیں اُس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ جب وہ میٹرن کے کمرے کے پاس پہنچی تو ننگی سی لالٹین جل رہی تھی۔ موڑ پر ایک بھیانک سایہ زور سے اُس کے آگے جھپٹا چلا گیا، اُس کی چیخ نکل گئی اور آنکھیں ہیبت سے پھٹ گئیں۔ میٹرن جاگ گئی، وہ نکل کر اُس نے آواز دی:

"کون ہے؟" شمن دوڑ کر اُس سے چمٹ گئی۔ میٹرن بھی بوکھلا گئی کہ یہ کیا بلا ہے اور اُس نے زور سے اُسے پرے دھکیل دیا۔

"یہ میں ہوں شمشاد، شمن۔" اُس نے جلدی جلدی زمین سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"یہاں بھوت دوڑا میرے پیچھے ابھی۔" وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔

"بھوت! کہاں ہے بھوت؟ چلو اپنے کمرے میں۔" میٹرن اُسے کمرے کی طرف دھکیلنے لگی۔ وہ خود ڈری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

"رات کو بھی دنگا مچاتی ہیں۔" وہ بڑبڑائی۔ اُس کے کمرے میں آکر میٹرن نے بجلی جلائی تو وہی بھوت بالکل شمن کے پاس کھڑا تھا، وہ پھر چیخی: "بھوت!"

"کہاں ہے؟ ارے یہ تو تمہاری اپنی پرچھائیں ہے، پگلی لڑکی۔" شمن کو بہت شرم آئی اور وہ چپکے سے پلنگ پر لیٹ گئی۔ میٹرن بجلی بجھا کر بڑبڑاتی چلی گئی مگر اُسے بڑی دیر تک نیند نہ آئی، اُس کا دل برابر دھڑک رہا تھا اور تمام جسم تنا ہوا تھا۔ اُس نے رات کی بات کسی سے نہ کہی۔ توبہ! اگر مس چرن کو معلوم ہو جاتا کہ وہ رات کو بھوت بن کر اُن کے دروازے پر رویا کرتی ہے تو وہ ضرور اُس سے نفرت کرنے لگتیں۔ وہ تو انہیں اتنا بھی نہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس کے دماغ پر اس بُری طرح چھائی ہوئی ہیں۔ مگر یہ بات اوروں سے زیادہ دن نہ چھپی رہی اور پھیل، حد یہ

نے ایک دن مس چرن سے کہہ دیا کہ وہ لڑکیوں کی اخلاقی حالت کو خراب کر رہی ہیں۔ بات یہ تھی کہ مس ممتاز اُن کی چھوٹی بہن تھیں اور جب سے مس چرن آئی تھیں اُن کی قیمت بہت گر گئی تھی، علاوہ شمن جیسی مرنے والی لڑکیوں کے اور قریب قریب ساری لڑکیاں انہیں بہت پسند کرتی تھیں۔

مس ممتاز بیڈمنٹن کھلاتی تھیں اور مس چرن باسکٹ بال۔ زیادہ تر لڑکیوں کو باسکٹ بال پسند نہ تھی اور مس ممتاز کا کہنا تھا کہ مس چرن لڑکیوں سے ضرورت سے زیادہ بےتکلف ہو کر ٹیچروں کا رعب کم کیے دیتی تھیں، انہیں کے بڑھاوا دینے سے لڑکیاں بیڈمنٹن کی بجائے باسکٹ بال کھیلنے لگی تھیں۔ یہ مس ممتاز کی ہتک تھی اور ساتھ ساتھ اُن کی بہن پرنسپل کی۔ شمن کو بیڈمنٹن سے نفرت تھی کیونکہ مس ممتاز اُن لڑکیوں کو بہت ذلیل کرتی تھیں جو ذرا کمزور تھیں۔ انہوں نے ٹیم بنا لی تھی: سب سے اچھا کھیلنے والی لڑکیاں ایک طرف اور پھر سب سے بُرا کھیلنے والی، جس میں شمن بھی تھی، دوسری طرف۔ روز اچھی لڑکیاں جیتتیں اور یہ ہارتیں، لہٰذا اس ذلت سے بچنے کے لیے جس دن بیڈمنٹن کی باری ہوتی شمن دردِ سر یا کوئی اور بہانہ کر کے مس چرن کو کھلاتے ہوئے دیکھتی رہتی۔ اُن کی ہر حرکت کا عکس وہ اپنے دل و دماغ میں محفوظ کر لینا چاہتی۔ یوں انہوں نے گیند اُچھالی، یوں اپنے بلّے سے ہاتھ کو ٹیڑھا کر کے جنبش دی۔ وہ گئی گیند۔ لڑکیاں کہتی تھیں کہ اُن کے ہاتھ سوکھے اور کالے ہیں مگر شمن کو وہ سنگِ مرمر کے سے نظر آتے تھے۔

راتوں کو وہ اب بھی برآمدوں میں سسکیاں بھرتی بھٹکا کرتی تھی۔ ایک دفعہ جو رات کو اُس کی آنکھ کھلی تو ہکا بکا رہ گئی۔ پرنسپل ٹارچ لیے مس چرن کے کمرے میں لمبا سا چوغا پہنے کھڑی تھیں اور مس چرن پریشان شمن کو سیدھا بٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اُسے معلوم ہی نہ تھا کہ وہ چیخ چیخ کر رو رہی ہے۔ پھر ایک دم سے وہ چُپ ہو گئی اور منہ پھاڑے مس چرن کو تکتی رہی۔ وہ مس چرن کے پلنگ پر بیٹھی تھی؛ سچ مچ کا پلنگ! وہ خواب والا دالان نہیں بلکہ سبز پھول کڑھا ہوا تکیہ، بھورا کمبل

جس میں کشمشی گوٹ لگی تھی۔

اُسے گھسیٹ کر اُس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

صبح پرنسپل نے اُس سے بہت سے سوال کیے مگر اُس نے منہ پھُلا لیا اور کسی بات کا جواب نہ دیا۔ بھلا وہ کیسے اتنی بہت سی باتیں بتا دیتی جو وہ سوچا، دیکھا اور محسوس کیا کرتی تھی۔

تیسرے دن مس چرن اسکول چھوڑ کر چلی گئیں۔ وہ کسی لڑکی سے ملنے بھی نہ آئیں۔ بس ایک دم چوکیدار اُن کا سامان لے گیا اور اُس کے بعد وہ بٹوہ ہاتھ میں لیے نکلیں اور سیدھی پھاٹک سے باہر چلی گئیں۔ اسکول میں کھلبلی پڑ گئی۔ لڑکیاں ایک دوسرے سے سوال کرنے لگیں۔ کچھ نہ معلوم نہ ہو سکا بس اتنا پتہ چلا کہ کچھ شمن پر بات اُٹھی تھی جس پر پرنسپل اور مس چرن میں کھٹ پٹ ہو گئی۔ لڑکیوں نے شمن کو چاروں طرف سے گھیر کر سوالوں کی بارش کر دی مگر وہ کچھ نہ بتا سکی۔ جب مس چرن کے جانے کی خبر پکی ہو گئی تو اُن کی ساری چاہنے والیوں نے رونا شروع کیا، اس پر پرنسپل صاحبہ اور مس ممتاز نے آکر سب کو خوب ڈانٹا۔ لڑکیاں بڑبڑا کر چپ ہو گئیں۔

مگر شمن نے ایک آنسو بھی نہ بہایا۔ وہ خاموش چپ رہی سب سے الگ الگ پھرتی رہی۔ مگر سارے وقت تول تول کر قدم رکھتی تھی، جیسے کوئی ٹوٹی ہوئی چیز اُٹھائے پھر رہی ہے جس میں ٹھیس لگ گئی تو چکنا چور ہو کر بکھر جائے گی۔

مس چرن کے جانے کے بعد وہ بہت سخت دل ہو گئی۔ اسے اتنا تو تجربہ ہو گیا کہ منجھو بی کا کوئی قصور نہیں تھا، قصور خود اس میں ہی کہیں چھپا ہوا تھا۔ اور یہ ماننے کے لیے وہ قطعی تیار تھی۔ اُسے اپنے دماغ کے اُس حصے سے سخت نفرت تھی جو ہمیشہ سارا الزام اُسی پر تھوپ دیا کرتا تھا۔ اُس نے مس چرن کے متعلق سوچنا بہت کم کر دیا۔ اُن کا خیال اس کے دماغ میں چھپے ہوئے زخم پر ٹھوکے لگاتا جس سے اُسے روحانی اذیت ہوتی۔

وہ اُس سال فیل ہوگئی لہذا اُسے مقامی مشن اسکول میں داخل کروا دیا گیا، یہاں نوری بھی اُس کے ساتھ جاتی مشن میں مس چرن سے بھی زیادہ سیاہ فام ٹیچر تھیں مگر شمنؔ کو اُن میں سے ایک بھی پسند نہ آئی۔ نوری بڑی تیز تھی اور بڑی آپا بھی اُسے برابر مار مار کر پڑھاتی رہتی تھیں اس لیے وہ بہت جلد اسکول میں جم گئی۔ مگر شمن سے نہ جانے لوگوں کو کہاں کا بَیر تھا کہ وہ مستعدی سے کام کرکے بھی لے جاتی تو وہ اُس سے اور بہتر کام کی توقع رکھتے۔ اُسے کامل یقین تھا کہ وہ کند ذہن تھی اور یاد داشت تو اُس کی بہت خراب تھی۔ سب کہتے تھے کہ وہ بہت جلد سب بھول جایا کرتی تھی۔ مس چرن کو وہ آخر بھول ہی گئی اور اُسے غور کرنے پر بھی اُن کا ناک نقشہ لباس، ہنسی، اُن کا باسکٹ بال کھلانا یاد نہ آتا۔ جب شمنؔ اُن کے کمرے میں پڑھتی تو وہ اُن کا ہلکے ہلکے گنگناتے جانا، ایسے کہ شمن کو بجائے خلل کے ایک طرح کی مدد سی ملتی جاتی تھی، فضا کو کچھ اور چکنا اور ہموار سا کر جاتا۔ بہت دفعہ ایسا ہوتا کہ وہ کسی مشکل سوال پر اٹک گئی ہے کہ مس چرن کے گنگنانے کی چھوٹی چھوٹی لہریں اُس کے سوال کی گتھی سے ٹکرائیں اور وہ ڈھیلی ہو کر کھُل جاتی۔ مگر نہیں، وہ یہ سب کچھ بھول چکی تھی۔

دو برس اُس نے مشن میں پڑھا، اُسے ایک دفعہ بڑا درجہ ملا اور دو چار انعام بھی ملے مگر اُس نے وہ سب لاپروائی سے پھینک دیئے۔ اُسے کسی چیز کی قدر کرتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا، وہی زخم سا اُس کے دماغ میں ٹیسیں مارنے لگتا جو مس چرن کے خیال سے دُکھا کرتا تھا۔ دو برس اُس نے بائیبل پڑھی اور یسوع مسیح کی تعریف میں بہت سی نعتیں سیکھ گئی مگر اُسے یہ بات بالکل پسند نہ تھی کہ گرجے میں گھٹنے ٹیکنے کے لئے مونجھ کے گدے تھے جن میں سوئیاں سی لگی تھیں جو بہت چبھتی تھیں۔

کئی دفعہ اُس کا ارادہ ہوا کہ وہ بھی چپکے سے یسوع مسیح کی بھیڑ بن جائے مگر اماں کے ڈر کے مارے ہمّت نہ پڑی۔ اُسے یہ بات معلوم کرکے بہت حیرت ہوئی

کہ یسوع خدا کے بیٹے تھے مگر پھر بھی لوگوں نے اُن کو چین سے نہ چھوڑا، آخر یہ دنیا اس قدر گنہگار کیوں ہے؟ لوگ جھٹ پٹ اچھی باتیں سیکھ کر مرتے جنت میں کیوں نہیں چلے جاتے۔

مقدس ماں کنواری تھی: یہ سوچ کر ذرا اُسے ہنسی آتی۔ وہ خود بھی تو کنواری تھی، اگر خدا نہ کرے بیٹھے بٹھائے خدا باپ اُس کے یہاں بھی ایسا ہی بھولا بھولا مُنّا سا یسوع پیدا کر دے تو وہ کیا کرے! یقیناً اماں تو اس کے لئے دودھ دیں گی نہیں، اور کپڑے تو خیر وہ پرانے کرتوں کے بنا لے گی، مگر پھر اُسے یاد آتا کہ جب اُس کے دھوبی کی لڑکی کے ایسا ہی مُنّا پیدا ہو گیا تھا تو سب نے کیسی تھُڑی تھُڑی کی تھی۔ بِشمن نے اس کو بہت سمجھایا کہ بیوہ ہے تو کیا، "خدا باپ" کی قدرت میں کسی کو کیا دخل ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے مگر وہ یہی کہتی تھی کہ "نہیں بی بی، میں نے تو پاپ   کیا ہے اور لوگ کیوں کرتے ہیں۔ گھر آکر اُس نے اماں وغیرہ کو جب یسوع کی تعریف میں نعتیں سنائیں تو انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا اور اُسے بہت ڈانٹا کہ کیا اب وہ عیسائی ہونے کا ارادہ رکھتی ہے، لہٰذا مجبوراً اُسے واپس اُسی پرانی درس گاہ میں بھیج دیا گیا جہاں پہنچ کر مس چرن کا داغ پھر ہرا ہو گیا اور مس مستانہ سے نفرت چوگنی بڑھ گئی۔

(۱۲)

اس بار اسکول کی نئی زندگی نئی بلاؤں سے شروع ہوئی جو اُس پر یکایک ٹوٹ پڑیں۔ نہایت گندی، شرمناک اور نفرت انگیز مصیبتیں۔ کئی دن تو وہ خودکشی کے منصوبے باندھتی رہی کیونکہ یوں ریجھ ریجھ کر مرنے سے تو ایک دفعہ زہر نگل لینا ہزار درجے آسان تھا۔ مگر گھر میں کسی قسم کا زہر دستیاب ہونا بھی تو مشکل تھا۔ جسمانی تبدیلیوں سے تو وہ اور بھی بدحواس ہونے لگی اور گھنٹوں تنہائی میں آنسو بہایا کرتی۔ اُسے پہلی جماعت کی وہ بھیانک اُستانی یاد آجاتیں جو بالکل گوشت کا بے ہنگم لوتھڑا تھیں۔ ویسے ہاتھ پیر تو ان کے سوکھے مارے تھے مگر پیٹ اور کلیجے پر گوشت کے پلندے

لدے ہوئے تھے۔ لڑکیاں اُن کا مذاق اُڑایا کرتی تھیں اور عجیب عجیب بیہودہ لطیفے اُن سے وابستہ کر دیے تھے۔ اُن کی نفرت محض نفرت ہی نہ تھی بلکہ اُس میں ایک طرح کا خوف اور کراہت پوشیدہ تھی۔ اصلی گھن تو شمن کو اُن سے اُس دن سے ہو گئی تھی جس دن وہ بھولے سے اُن کے غسل خانے میں گھسی چلی گئی تھی۔ وہ ہمیشہ نہاتے وقت دروازے میں کنڈی چڑھانا فضول جانا کرتی تھیں۔ مُلّاجی کے بعد یہ دوسری ہستی تھی جسے دیکھ کر اس پر فالج کی سی حالت طاری ہو گئی تھی۔

وہ خاموش تنہائیوں میں پڑی نجانے کیا کیا سوچا کرتی۔ مستقبل بھیانک خوابوں کے نئے نئے چولے بدل کر اُس کے سامنے ناچا کرتا۔ کاش کوئی ایسی دوا ہوتی جسے کھا کر وہ چوہیا برابر ہو جاتی۔ وہ بہت ہی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ جسم کے مختلف حصے مختلف اوقات میں بڑھ رہے تھے۔ پہلے تو جیسے اُس کی ٹانگوں کو جسم سے نفرت ہو گئی اور وہ بے طرح لمبی ہونے لگیں۔ رات کو وہ محسوس کرتی اُس کی ٹانگیں بڑھ رہی ہیں، لمبی لکیروں کی طرح لہراتی، پلنگ پر سے اُتر کر دیوار سے رینگتی ہوئی نامعلوم منزل کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ وہ جلدی سے کہنی کا سہارا لے کر ٹانگوں کو دیکھتی تو وہ جھٹ سے کیچوے کی طرح سکڑ جاتیں، گویا اُس نے انہیں عین وقت پر پکڑ لیا ورنہ وہ نکل ہی گئی ہوتیں۔ وہ کنکھیوں سے لیٹ کر دیکھتی کہ اب کیا کر رہی ہیں اُس کی ٹانگیں، مگر وہ ہوشیار سانپوں کی طرح مکر کیے پڑی رہتیں۔ یہی نہیں اُس کے جسم کا ہر حصہ عجیب سا ہو چلا تھا۔ ناک ایک دم چہرے سے روٹھ کر اپنے راستے پر چلنے لگی۔ اُس نے ایک کہانی پڑھی تھی جس میں ایک شہزادے کی ناک تین فٹ لمبی ہو گئی تھی۔ بیچارہ شہزادہ! کوئی اُس سے بات بھی نہ کرتا، اُس کی چوٹی بھی کچھ عجیب بے تکی سی ہو گئی تھی، جیسے چائے دانی کا کُنڈا۔ اینٹھی ہوئی چھوٹی سی دم جو اس کی لمبوتری گردن پر کسی طرح نہ جچتی۔ ایک مرض کا علاج تو اتفاق سے اُس کے ہاتھ لگ گیا۔ اُس نے اماں کی بیماری کو بھانپ لیا تھا گو اس سے چھپائی گئی تھی مگر اس کی تیز نگاہوں نے اُس شیشی کو دیکھ لیا تھا۔ جس نے ان کی جان بچائی تھی۔ موقع پا کر اُس نے وہ دوا چڑھا لی۔ اثر فوری ہوا اور

وہ قطعی اچھی ہوگئی۔ بھلا اگر وہ کسی کو اپنا مرض بتا دیتی تو اتنی جلدی کوئی دوا تھوڑی کر دیتا۔ اُس کی تو ہر بات کو ٹالا جاتا تھا۔ دوسرے منجھلی بہن نے اُسے ایک دفعہ اس قسم کی بات کرنے پر بہت بے شرم کہہ کر ڈانٹ دیا تھا۔ اور غضب تو یہ تھا کہ نوری اُس کے تمام شرمناک رازوں کی ٹوہ میں لگی رہتی مگر وہ ہمیشہ اس سے دور رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ نوری حقارت سے مسکرائے گی اور سب سے جا کر شکایت کر دے گی۔
اپنے دکھوں میں وہ آپ ہی گھلا کرتی، مگر خاک گھلا کرتی تھی! گوشت تو جگہ بے جگہ تھپا چلا جا رہا تھا۔

اُس نے بھاگنا دوڑنا کم کر دیا تھا۔ جیسے ہوا سے بھی ٹیسیں سی چبھتی تھیں۔ جسم پکّا پھوڑا ہو گیا تھا اور پنڈلیوں میں اینٹھن ہوتی تھی۔ بڑی جماعت کی لڑکیوں سے اُسے بہت نفرت تھی اور وہ اِن کا ہمیشہ مذاق اڑایا کرتی تھی۔ دھپا دھپ جب وہ رسی کودتے وقت زمین پر پٹختیں تو اُن کے کرتوں میں بلّیاں سی لڑتی معلوم ہوتیں مگر شمن کسی نہ کسی طرح کھیل میں شرکت کرنے سے بچ جاتی۔ اُسے ہر روز سزائیں ملتیں لیکن وہ سب برداشت کرتی، یہاں تک کہ ایک دن اُس کے لئے کوئی معقول بہانہ نہ پایا تو کھچ سے اُسترے سے اپنا پیر کاٹ لیا اور بڑی دیر تک اپنی کامیابی پر مسکراتی رہی

ایک دم اُس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ کھڑے کھڑے چکر آ جاتے، ہاضمہ خراب رہتا، منھ پر کالے اور سفید سفید چٹّے پڑ گئے، ماتھا پھنسیوں سے لد گیا! اور سارے جسم میں کھجلی مچتی رہتی؛ خون جیسے کھولتے ہوئے تیل کی طرح بھاری بھاری اُسے جسم میں لہراتا ہوا محسوس ہوتا۔

اُسے سُست دیکھ کر کسی نے پروا نہ کی بلکہ سزائیں بڑھتی گئیں، یہاں تک کہ اماں ابا کے پاس بھی بہت بڑی شکایت گئی۔

اُسی زمانے میں سالانہ ڈاکٹری کا وقت آیا تو اُسے ہزاروں فکروں نے گھیر لیا وہ کئی دن پہلے سے سہمی ہوئی رہنے لگی۔ یہ اسکول میں اُس کا پہلا معائنہ تھا وہ نرادن

بہانے تلاش کرنے لگی، مگر جب جلاد تلوار اُٹھا لیتا ہے تو پھر بچاؤ مشکل ہو جاتا ہے۔

جب میرٹن نے اس سے کپڑے اُتارنے کو کہا تو اُس نے اُسے "گدھی" کہہ دیا، جس پر میرٹن کو روتے روتے دورہ پڑ گیا۔ سُوکھی ماری بڑھیا میرٹن بھلا اُس کے دُکھوں کو کیا سمجھ سکتی!

لیڈی ڈاکٹر نے اُس کے دو طمانچے لگائے مگر وہ اُس سے بھی کُشتی لڑتی رہی۔ ڈاکٹرنی نے اُس سے بہت سے بیہودہ سوال کیے جس کا اُس نے "نہیں" میں ہی جواب دیا۔ جان بُوجھ کر وہ اُس کے پیچھے ہی پڑ گئی۔

اس کے بعد اُس کا دوبارہ جو معائنہ ہوا تو اُس نے بہت ہی فیل مچائے۔ اُس مردار ڈاکٹرانی کو لوگوں کو ٹٹولنے کا وہ شوق تھا کہ حد نہیں بلا کی طرح چمٹ گئی۔ اُسے زبردستی دوا پلائی اور چند ہی دن میں اُس کا خوفناک مرض پھر سے پھوٹ نکلا اور غضب یہ کہ سارے اسکول میں دھوم مچ گئی۔ لڑکیاں مارے تجسّس کے نجانے کیا سوچنے لگیں، نوری اُسے دیکھنے کے بہانے بھید لینے کئی دفعہ آئی مگر شمن نے اُسے ڈانٹ ہی بتائی۔

"سچ بتاؤ شمن" وہ بولی۔

"کیا؟"

"یہی ــــ کیا ــــ کہ برجیس کہتی ہے کہ تمہارے بچہ پیدا ہوا ہے"

ہیبت کے مارے وہ چیخیں مارنے لگی۔ اچھا، تو یہ بات تھی۔ مگر ڈاکٹرانی نے تو کچھ نہ بتایا۔ حد ہو گئی زیادتی کی۔ کسی نے اگر ابّا کو لکھ دیا تو موت سمجھو۔ گیندا کی جو گت بنی تھی وہ یاد تھی مگر پھر اُس کا ننھا منا بچہ اُسے بے طرح یاد آنے لگا۔

"تو پھر گیا کہاں؟" اُس نے دل ہی دل میں سوچنا شروع کیا۔ شاید چھپا دیا گیا ہو۔ لیکن وہ پاتی بھی کیسے! اسکول کا کام، امتحان سر پر، بھلا بچے کو کون پالتا؟

لیکن یہ اُن لوگوں کی زیادتی تھی کہ اُسے دکھایا بھی نہیں گیا۔ وہ دیکھنے شکل کی صورت کس کی سی ہوگی، بہت ہی ذرا سا ہوگا اور پریشانی دور ہو کر اُسے، ایک طرح کی فکر سی لگ گئی۔

اُس کا بخار اُترا اور وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ جب بھی کسی نے بچہ وچہ نہیں دکھایا ایک دن اُس نے باتوں باتوں میں سعادت سے ذکر بھی کیا، سعادت آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتی رہی اور پھر بولی: "مگر تمہاری شادی تو ہوئی نہیں ہے"

"ہیں؟ شادی نہیں ہوئی تو پھر سعادت ——؟" وہ چُپ رہ گئی۔ اس لیے جو تخیئل میں ننھا مُنا چوہے برابر بچہ بنا رکھا تھا آہستہ آہستہ دھندلا ہونے لگا۔

"مگر نوری جو کہتی تھی"

"نوری کو کیا معلوم" سعادت بزرگانہ انداز سے بولی، "کسی سے کہنا بھی مت، پگلی کہیں کی"

پھر سعادت نے اُسے بہت سی باتیں بتائیں اور وہ ہنستے ہنستے بیدم ہوگئی۔ شمن کو بھی ہنسی آگئی۔

جب وہ تنہا پلنگ پر لیٹی تو اُسے اس خیالی بچے کے کھو جانے کا بہت دُکھ ہوا۔ نوری کی اطلاع کے بعد وہ سچ مچ کا ایک ننھا مُنا سا کُلبلاتا ہوا بچہ نہیں اپنے سے قریب ہی محسوس کرنے لگی تھی؛ بعض وقت تو اُسے یہ بھی شبہ ہونے لگتا کہ وہ اُس کے پہلو میں پڑا سو رہا ہے اور اگر ذرا بھی ہلی تو جاگ جائے گا۔ اس احساس کے ساتھ ہی اُس کے اعضاء اکڑ سے جاتے اور وہ سانس روک کے دیر تک پلنگ پر ہلے جُلے بغیر پڑی رہتی۔ اکثر سوتے سوتے اُسے بچے کے رونے کی آواز آتی اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رات کے اندھیرے میں اُس والہے کو تلاش کرتی رہتی، حتّٰی کہ پھر اس کی آنکھ لگ جاتی۔ وہ اُس ننھی سی جان کے ساتھ نجانے کب تک اسی طرح آنکھ مچولی کھیلتی رہتی اگر سعادت اُس پر حقیقت کا

انکشاف نہ کر دیتی اور اب؟ اب نجانے کیوں بچّے کے خیال سے ہی اُسے شرم آنے لگتی۔ توبہ! کیسی بُری بات تھی۔

زندگی جیسے دھندلکوں میں سے نکل کر روشنی میں آتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اُس کے سب دُکھ دور ہونے لگے، گو اُس کی سانس گھٹتی مگر وہ سب باتوں کی عادی ہو گئی۔ زندگی نے رکھ رکھاؤ خود ہی سکھا دیا۔

(۱۳)

بات ختم ہو گئی تھی مگر اس واقعہ کی نوری نے وہ پھبڑی پیٹی کہ ایک دن پکڑ کر اُسے ٹھوک دیا۔ گھر میں وہ نوری کو بڑی آپا سے چھپا کر چار چوٹ کی مار دیا کرتی تھی مگر مجال تھی جو وہ شکایت کر جاتی۔ بڑی آپا تو خیر اُسے مارتیں مگر پھر وہ نوری کو زندگی کا مزہ چکھا دیتی۔ یہاں آ کر تو نوری بڑی مہذّب بننے لگی تھی۔ چڑیا کی بیٹ تک کو وہ باتھ روم کہنے لگی تھی اور بڑی اترا کر "دیکھیے، دیکھیے" کہہ کر بولتی تھی۔ پھر اُسے شمّن نے اُس کی سہیلیوں کے سامنے مارا۔ نوری جوان عورتوں کی طرح ماتم کر کر کے رونے لگی اور شام تک اپنا بستر بوریا اُٹھا کر اپنی سہیلی جلیس کے یہاں جا پڑی۔ بڑی آپا کو ایک نہایت ہی دردناک خط لکھا جس پر وہ اُس کے مرحوم باپ کو یاد کر کے خوب روئیں اور پرنسپل کو ایک منت بھرا خط لکھا کہ یتیم بچّی نوری کو شمّن کے پنجے سے نجات دلائیں۔ نوری ہنسی خوشی جلیس کے کمرے میں رہنے لگی اور شمّن کے کمرے میں بڑی آنکھوں والی رسول فاطمہ آ گئی۔

رسول فاطمہ سے شمّن کو جو نفرت تھی وہ جنون کی حدوں سے بھی آگے بڑھی ہوئی تھی۔ اُس کی باہر کو اُبلی ہوئی آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی اور بے رونق تھیں، جیسے چینی تھالی میں دو مینڈک رکھے ہوں۔ باریک سیدھی سیدھی تنکوں جیسی پلکیں اور گدر درے بھورے رنگ کے پپوٹے، ہر وقت اُن میں بے کسی، غربت اور بے وقوفی جھلکتی رہتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے شمّن کو ایک دم ان آنکھوں پر غصّہ آنے

لگتا اور جی چاہتا اُن میں گرم لوہے کی کیلیں ٹھونک دے۔

وہ بات بے بات اُسے جھڑک دیتی۔ اگر بھولے سے اُس کا میلا دوپٹہ یا بوسیدہ کتاب شمن کی میز یا بستر پر رکھی رہ جاتی تو اُس کا دماغی توازن بگڑ جاتا اور وہ جھلا کر اُسے دور پھینک دیتی۔ یہ نفرت اور بھی بڑھتی گئی جب کہ اُس کے ہر ظلم کے جواب میں رسول فاطمہ نہایت خندہ پیشانی سے اپنے سکڑے ہوئے ہونٹوں میں سے ٹیڑھے میڑھے دانت نکال کر گھگیانے لگتی، اور کبھی تو وہ چیزوں کو بے رحمی سے ایسے پھینکتی کہ وہ اُس کے منہ پر جا لگتیں۔

"اُوں، بھئی ہمیں یہ مذاق نہیں اچھا لگتا۔" وہ اسے مذاق سمجھتی تھی گویا شمن اتنی گری پڑی تھی کہ رسول فاطمہ سے مذاق کرے گی۔ وہ پھن کچلے ہوئے سانپ کی طرح بھنا جاتی مگر رسول فاطمہ اُس کی طرف پیار سے دیکھ کر اپنی مرجھائی ہوئی آنکھوں میں التماس پیدا کرنے کی کوشش کرتی۔

اسکول میں ساتھ سونے کی سخت ممانعت تھی مگر رسول فاطمہ کو اس قدر ڈر لگتا تھا کہ وہ آخری گھنٹی بج جانے کے بعد شمن کے پلنگ کے قریب پلنگ لے آتی۔ شمن نے کئی دفعہ حقارت سے اُسے دھتکارا بھی لیکن وہ سچ مچ اس کے پَیر چھونے لگی۔ اُس نے بتایا کہ جب سے اُس کی ماں طاعون میں مری ہوئی دو دن تک گھر میں پڑی رہی تھی تب سے اُسے مُردوں سے بہت ڈر لگنے لگا تھا اور اندھیرا ہوتے ہی اُسے چاروں طرف سے روحیں گھیرنا شروع کر دیتیں۔

"اچھا چپ رہو۔" نفرت سے شمن اُس کی ہر بات پر ڈانٹتی اور وہ خاموش ہو کر ہولے ہولے قرآن شریف کی آیتیں پڑھ کر چاروں طرف پھونکتی۔ مگر جب اُس نے اُن مقدس آیتوں کی برکت شمن پر پھونکنا چاہی تو اُس نے ایک چانٹا اُس کے منہ پر دیا۔

"سور یا، ہمارے منہ پر تھوک دیا۔" اُس نے دانت پیس کر رسول فاطمہ کو اُس کے پلنگ پر گرا دیا۔ رسول فاطمہ بہت ہی سوکھی ماری تھی، ذرا سے ٹھوکے سے بیدم ہو جاتی۔

ایک دفعہ رات کو شمن کو اپنی گردن پر چوہا سا پھدکتا معلوم ہوا۔ اندھیرے میں وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، چوہا رسول فاطمہ کے پلنگ پر بھاگ گیا، وہ پھر لیٹ گئی۔ نیم غنودگی کی حالت میں اُسے پھر چوہا پیٹ پر رینگتا معلوم ہوا۔ دھندلکے میں بڑے غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ چوہا نہیں بلکہ سوتے میں رسول فاطمہ کا ہاتھ ہل رہا تھا، وہ کروٹ بدل کر سو گئی۔

جیسے اُس نے خواب میں دیکھا کہ چوہا پھر رینگا، اور قبل اس کے کہ وہ اُسے جھٹک سکے وہ اُسے پچھاڑ کر اُس پر پوری طرح قابض ہو گیا۔ اُس کے جسم کی ساری رگیں اکڑ کر تانت کی طرح تن گئیں، ساری قوت ایک دم سن سے اُس کے جسم سے نکل گئی۔ اب وہ کبھی جنبش نہ کر سکے گی۔ رسول فاطمہ کی سوکھی ہوئی انگلیاں کیلوں کی طرح چبھ رہی تھیں مگر وہ اُسے نہ روک سکی۔ جیسے شیر اپنے شکار کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نگلتا ہے بالکل اسی طرح۔ وہ سہمی ہوئی خاموش لیٹی رہی اور چوہے دوڑتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ اُس کی ڈوبی ہوئی طاقت ابھرنے لگی، ایک ہی دفعہ اُس کا سارا جسم بغاوت پر تل گیا اور اُس نے چاہا ایک ہی جست میں وہ رسول فاطمہ کو پچھاڑ کر اٹھ بھاگے مگر وہ ہل بھی نہیں۔ احساسِ ذلت نے اُس کی ساری طاقت سلب کر لی۔ اُف! اس کی گت اور وہ بھی رسول فاطمہ کے ہاتھوں! اگر وہ اپنے جاگنے کا اعلان کرتی ہے تو پھر تو اُسے رسول فاطمہ کو مار ڈالنا چاہیے۔ اُس نے سوچا، وہ ایسے ہلے گویا سو رہی ہے، مگر کچھ دیر میں جاگ جائے گی تو شاید رسول فاطمہ ڈر کر اُسے چھوڑ دے گی —— مگر بھلا، وہ ایک بھتنی تھی اور فیصلہ جلدی چاہتا تھا لہٰذا ایک دم اُس نے جھلا کر اتنی زور سے کروٹ لی کہ اُس کی کہنی رسول فاطمہ کی اُبلی ہوئی آنکھ میں لگی مگر ذرا اوچھی، کروٹ لے کر اُس نے اپنے جاگنے کا اعلان کر دیا: "کون ہے؟"

"میں —— میں ہوں، تمہاری رسول فاطمہ۔"

کیا! اُس کی رسول فاطمہ؟ اگر وہ اتنی ڈری ہوئی نہ ہوتی تو اُسے اس گستاخی کا اُسی دم مزا چکھاتی مگر موقع نہ تھا۔ اُس نے بڑبڑاتے ہوئے زور سے اپنی چارپائی

دور دھکیلی، ایسے کہ رسول فاطمہ کا پرانا چپکا ہوا صندوق چور ہو گیا۔

صبح اُٹھ کر اُسے رسول فاطمہ سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ پڑتی تھی مگر وہ بھری بیٹھی تھی کہ وہ بولے تو بس اُس کی جان کو ہی آجائے لیکن رسول فاطمہ بھیگی بلی بنی شمن کا تازہ رنگا ہوا دوپٹہ چن رہی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ جل گئی اور ایسے زور سے جھٹکا دے کر دوپٹہ چھینا کہ رسول فاطمہ گر پڑی ہوتی۔ ساری اُس کی ہاتھوں کی گٹیاں چھل گئیں مگر وہ برا نہ مانی بلکہ رحم طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی، جیسے یہ چنگیزی مظالم اُسے بہت ہی بھاتے ہیں۔ شمن نے جھلا کر جو دوپٹے کی چینٹ کھولی تو کئی شوربہ کھایا ہوا دوپٹہ مسک گیا۔ اب تو اُس نے واقعی اُسے ایسے دھکیلا کہ بچاری کی نئی تین پیسے کی صراحی چکنا چور ہو گئی، اُس کی بڑی بڑی بے جان آنکھیں زخمی مینڈکوں کی طرح پھول کر اور اُبھر آئیں اور ان میں غلیظ نمی جھلکنے لگی۔

ذرا ذرا سی بات پر شمن اُسے دُھتکارتی رہی لیکن وہ یا تو چپکی سہتی رہی یا ہیں ہیں کر کے بے جان ہنسی ہنسنے لگی، گویا اُس کی ٹھوکروں میں جفا کی چاشنی بھری تھی۔

"بھئی ایسا بھی مذاق کس کام کا کہ ساری چوڑیاں توڑ دیں، ظالم کہیں کی" وہ اُسے اس قدر پیار سے دیکھنے لگی کہ شمن گھبرا کے کمرے سے بھاگ جاتی۔ اُس کا جی چاہا سب کچھ جا کر میرن سے کہہ دے مگر اُس کے پیر رُک گئے۔ کیا کہے گی وہ اُس سے جا کر؟ ابھی گزشتہ مہینے چھوٹی کلاسوں کی بچیوں کو بیہودہ کھیل کھیلنے پر سزا ملی تھی، وہ لحافوں میں دبکی ہوئی ایک دوسرے کو بچے جنوا رہی تھیں۔ توبہ!

رسول فاطمہ کی صورت دیکھ کر اُس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ شام کو وہ سعادت کے ساتھ بیٹھی گھر کا کام کر رہی تھی کہ ایک چھوٹی بچی نے دروازے کی آڑ سے اُسے بلایا: "یاں آیئے شمن باجی" یہ چھوٹی بچیاں بورڈنگ میں بڑی لڑکیوں کی لونڈیوں کی طرح ہوتی ہیں، چھوٹے موٹے کام، رقعہ پیغام لے جانا، چمن میں سے پھول چرا کر لانا، کتابیں لاد کر اِدھر سے اُدھر لے جانا اور اس کے بدلے میں کبھی کبھی بڑی لڑکیوں کے سر یا پیر دبانے کی عزت حاصل کرنا جتنی زیادہ

ہر دلعزیز لڑکی ہوگی اُتنی ہی زیادہ وہ چھوٹی لڑکیاں اُس کی خدمت میں حاضر رہیں گی۔ شمّن ان چھوٹی لڑکیوں میں زیادہ عزیز نہ تھی وہ خود نہایت چھچھوری سی تھی۔

"کیا ہے؟" اُس نے رُکھائی سے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

"یہ رسول فاطمہ آپا نے دیا ہے۔" ایک پرچہ دے کر وہ لڑکی شرمائی ہوئی بھاگ گئی۔ رسول فاطمہ نے نہ جانے کن خوشامدوں اور رشوت ستانی کے بعد لڑکی کو پیغامبری کے لیے راضی کیا ہوگا کیونکہ عام لڑکیاں، خصوصاً چھوٹی لڑکیاں، اُس سے بہت نفرت کرتی تھیں۔

پرچے پر شمّن کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اُس نے سعادت کی نظر بچا کر جلدی سے سویٹر کے گریبان میں چھپا لیا اور واپس پڑھنے آ بیٹھی لیکن پریشانی کی وجہ سے اس سے خاک بھی نہ پڑھا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اُسے اغوا کرنے کا خط لکھا ہے اور وہ واقعی خطرے میں ہے۔

اُس نے چاہا کوئی بہانہ کر کے باہر چلی جائے۔ خط پڑھنے کے لئے وہ بے چین ہونے لگی، لہٰذا وہ غسل خانے کا بہانہ کر کے اُٹھی۔ خط میں لکھا تھا:

"میرے من مندر کی دیوی!

آہ، اپنی عاشق سے کیوں ناراض ہو؟ کب تک خفا رہو گی؟ اگر ایسی ہی مجھ سے نفرت ہے تو اپنے پیارے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دو۔ یہ تم نے کیا جادو کر دیا ہے۔ ایک دفعہ اپنے پیروں پر سر رکھ کر معافی مانگ لینے دو۔

تمہارے حُسن کی پروانہ

رسول فاطمہ

ہیبت کے مارے وہ شل ہوگئی۔ کس قدر بدمعاشی کا خط لکھا گیا تھا۔ اب؟ کمرے میں واپس جانے کے خیال سے اُس کا دم نکلنے لگا۔ وہ کوئی ایسا بہانہ کرنے کہ سعادت اُسے اپنے کمرے میں پناہ دے دے۔ سونے کی گھنٹی بج گئی اور وہ کوئی عذر نہ تراش سکی۔ گھنٹی کی ضربوں کے ساتھ اُس کا دل بھی اونچی آواز سے دھڑکنے

لگا اور وہ ڈری کہ سعادت نہ سُن لے۔

عیر ارادی طور پر قدم رکھتی ہوئی وہ کمرے میں آئی۔ اُس نے رات کے کپڑے نہیں بدلے، پیر لٹکائے پلنگ پر بیٹھی رہی۔ نیم وحشی خیالات اُسے پریشان کرنے لگے۔ ایک لمبی آہ کمرے میں سرسرائی اور رسول فاطمہ نے کروٹ لی۔ شمن آہستہ سے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ اب اندھیرے میں اُس نے محسوس کیا کہ رسول فاطمہ کی بڑی بڑی آنکھیں اُس کے جسم میں چبھ رہی ہیں۔ اُس پر ایک دم سے نامعلوم خوف طاری ہو گیا اور جی چاہا کہ کسی کی آغوش میں یوں چھپ جائے جیسے چیل جھپٹا مارتی ہے تو چوزے دوڑ کر مرغی کے پروں کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔ پھر اُس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ باہر نکل آئی اور برآمدے میں کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"یہاں کیوں کھڑی ہو، سردی لگ جائے گی؟" رسول فاطمہ اُس کے ساتھ ساتھ رینگ آئی تھی، مگر اُس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور غسل خانوں کی طرف چل دی۔ جب وہ وہاں سے نکلی تو رسول فاطمہ سکڑی کھڑی تھی، وہ کچھ نہیں اوڑھے تھی۔ اُس کے بدوضع رات کے کپڑوں سے اُس کا حقیر مریل جسم ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ ! ... دھکا دیتی ہوئی ہاتھ دھونے کے نل کے پاس جا کھڑی ہوئی اور غیر ارادی طور پر پانی کی دھار اپنی انگلیوں میں سے چھاننے لگی۔

"چلو گی نہیں شمن؟" رسول فاطمہ منمنائی۔ شمن نے کچھ جواب نہ دیا۔ نل بند کر کے وہ اپنے حلق میں گیلی انگلیاں ڈالنے لگی۔ حلق میں گدگدی ہوئی، کوا اینٹھا اور اُدھر اُوقی ... وہ قے کرنے لگی۔ باوجود دھکیلنے کے رسول فاطمہ اُس پر چڑھی چلی آئی اور گھبرا گھبرا کر اُس کی پیٹھ سہلانے لگی۔ واقعی اُسے قے ہونے لگی۔ ہر جھٹکے پر اُس کے گلے کی نسیں پھٹنے لگتیں اور معلوم ہوتا زبان ٹوٹ آئے گی۔ جب ذرا جی ٹھیرا تو رسول فاطمہ دیوانوں کی طرح روتی ہوئی میرٹن کو بلا کر لائی۔ میرٹن نے باورچی کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور اسے الائچی چبانے کو دی۔

"... مجھے مرلضیوں کے کمرے میں پہنچا دیجئے۔ نہ جانے جو ... قے ہو ..."

رسول فاطمہ بورڈنگ کے اصول سے واقف ہو کر بھی اُس کے ساتھ جانے کو ضد کرنے لگی مگر میٹرن نے اُسے ڈانٹ بتائی! کیا عجب کوئی چھوت کی بیماری ہو! دیر تک وہ بدبُودار رضائی اوڑھے بیمار بنی مسکراتی رہی۔ اُس کا حلق بڑی طرح جکڑ رہا تھا اور کنپٹیاں دکھ رہی تھیں مگر اُسے معلوم ہوتا تھا کہ چیل سے بچ کر وہ مرغی کے پروں میں دبکی ہوئی ہے۔

ایک تو رات کو کھانا نکل گیا، دوسرے صبح جو بدبودار بسکٹ ملتے تھے وہ بھی بند کر دیے گئے تو مجبوراً اُسے دوپہر تک تندرست ہونا پڑا۔ کھانے پر وہ حسبِ معمول رسول فاطمہ کے پاس نہیں بیٹھی۔ چونکہ دعا ہو گئی تھی اس لیے رسول فاطمہ اُٹھ کر اُسے بلانے نہ آسکی۔ کھانا کھاتے میں جو ایک دفعہ اُس کی نظر میز کے دوسرے سرے پر گئی تو اُس نے دیکھا کہ وہ کچھ کھا نہیں رہی ہے اور اُس کے لیے حسبِ معمول کھانا نکال کر لگا دیا گیا ہے۔ اُس کی مسکین صورت اور بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھ کر شمن کا دل پھر قے کرنے کو چاہنے لگا۔ اُس نے اسی دن میٹرن سے کہہ دیا کہ وہ کھانے پر اپنی جگہ بدلنا چاہتی ہے۔ سعادت کے پاس ایک جگہ تھی وہاں وہ بیٹھنے لگی۔

نماز کے وقت وہ کچھ نہ بول سکی۔ جب رسول فاطمہ اس کے قریب نیت باندھ کر کھڑی ہو گئی تو پورے وقت وہ یہ کوشش کرتی رہی کہ سجدہ کرتے وقت اُس کی کہنی رسول فاطمہ سے نہ چھو جائے، اس لئے وہ بار بار آیت بھول جاتی۔

رات پھر مصیبت بن کر چھانے لگی اور اُس پر پریشانی نے حملہ کر دیا۔ آج وہ بالکل بے بس ہو گئی تھی۔ کوئی بچاؤ کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ بڑی دیر تک وہ نفلیں پڑھتی رہی۔ پھر اُس نے یا حافظ کا ورد کیا۔ آج اسے خدا بے طرح یاد آ رہا تھا اور وہ گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہی تھی۔ مگر کیا دُعا اُس نے مانگی؟ اُس کے منہ سے تو ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اور پاس ہی رسول فاطمہ دوزانو بیٹھی ہاتھوں کا چلّو اُوپر اٹھائے ہل ہل کر دُعا مانگ رہی تھی۔ شمن کا جی اور پریشان ہو گیا، اُس کو ایسا معلوم ہوا رسول فاطمہ کے چلّو میں ڈھیر سی دُعا جمع ہو گئی ہے اور جی چاہا ایک ہاتھ ایسا مارے

کہ ساری دعا یا جوڑے کے دانوں کی طرح بکھر جائے اور جب رسول فاطمہ اُسے بٹور نے جھکے ۔ تو ۔ مگر اس خیال کے ساتھ ہی اُسے ترکیب سُوجھی ۔ رات ہو چکی تھی اور میٹرن اپنا چکر ختم کر کے اپنے کمرے میں جا چکی تھی ۔ ان دونوں کو عبادت میں مشغول دیکھ کر وہ کچھ نہ بولی کیونکہ یہ مذہبی معاملہ تھا ۔ ایک دفعہ اس نے لڑکیوں کو میدان میں شب قدر منانے سے روکا تھا تو غل مچ گیا تھا دوسرے دن مقامی اخباروں کی سُرخیاں عیسائی میٹرن کے خلاف زہر اُگل رہی تھیں ۔

وہ چپکے سے اُٹھی اور آہستہ سے نماز کے کمرے کی کُنڈی چڑھا سیدھی اپنے کمرے میں ۔ رسول فاطمہ نے چونک کر اُسے پکارا : "شمن !" مگر وہ تیز قدم چل پڑی ۔ کمرے میں پہنچ کر اُس کا دل آزاد چڑیا کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا ۔ پلنگ پر لیٹ کر وہ خاموش دبے قہقہوں میں ڈوب گئی ۔

نماز کا کمرہ دور تھا ، اتنی دور کہ اگر رسول فاطمہ چیختی تب کہیں اُس کی آواز سنائی دیتی ۔ خاموش سر جھکائے وہ اس کی آواز کا انتظار کرتی رہی لیکن سوائے جھینگروں کی چیں چیں کے وہ اور کچھ نہ سُن سکی ۔ صبح رسول فاطمہ اُس کی شکایت کر دے گی ۔ پھر پھر ؟ وہ طرح طرح کے بہانے سوچنے لگی ۔ اُسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک خوفناک سانپ پر تیچر پٹخ کر بھاگ آئی ہے اور اب وہ وہاں پڑا دم توڑ رہا تھا ۔ کہتے ہیں سانپ کو مار ڈالو تو ناگن بدلہ لینے آتی ہے ، لیکن رسول فاطمہ کے بعد تو اُسے کسی ناگن کا خوف نہ تھا ۔ رسول فاطمہ دنیا میں تنہا آئی تھی ، تنہا ہی رہتی تھی اور تنہا ہی چلی جائے گی ۔ کل سے وہ اپنا کمرہ بھی بدل لے گی ۔ مگر یہ رسول فاطمہ غل کیوں نہیں مچاتی ؟

صبح نماز کے کمرے کے آگے لڑکیاں ایسے جمع تھیں گویا رات کو کوئی چوری ہو گئی ہے اور تالہ ٹوٹا پڑا ہے ۔ وہ بھی بے غرض سی اُدھر سے گزری ۔ رسول فاطمہ جانمازوں میں لپٹی ہوئی پڑی تھی ، دو چار لڑکیاں اُسے سہارا دے رہی تھیں ، دو بھاگ کر میٹرن کو بلانے گئی تھیں ۔ رسول فاطمہ بخار میں جل رہی تھی اور اُس کی

مردہ آنکھیں انگاروں کی طرح جاندار ہو رہی تھیں۔

میٹرن نے اُسے بیماروں کے کمرے میں لے جا کر لٹایا اور بہت پوچھا کہ کون اُسے وہاں بند کر گیا مگر وہ یہی کہتی رہی کہ کوئی نہیں، وہ خود نماز پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی۔

"پھر دروازہ کس نے بند کیا؟"

"کسی نے بھی نہیں" وہ برابر ٹالتی رہی۔

شمن کے دل پر رسول فاطمہ کی ایسی دہشت بیٹھی کہ اُس نے میٹرن سے خوشامد کر کے اپنا کمرہ بدلوا لیا۔ سعادت اکیلے کمرے میں رہتی تھی اس لیے اُس کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی۔ شمن کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ پڑھیں گی، ساتھ رہیں گی۔ سعادت سے اُس کی بہت بنتی تھی۔

(۱۴)

جب اُس نے دوڑ کر سعادت کو اُس کے کمرے میں آنے کی خبر سنائی تو بجائے خوشی سے اُچھل پڑنے کے وہ خاموش ہو گئی، ایک دم سے اُٹھ کر وہ میٹرن کے پاس گئی جہاں دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ جب وہ باہر نکلی تو میٹرن چلا رہی تھی، اُس نے زور سے دروازہ بھیڑ دیا اور مُنہ پھلائے لوٹ آئی۔

شمن کی ساری خوشی خاک میں مل گئی۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ سعادت اُس کے کمرے میں آنے سے خوش ہو گی۔ اُسے بڑی ذلت محسوس ہوئی مگر اُس نے جی کو سمجھا لیا کہ چونکہ سعادت ہمیشہ سے بورڈنگ میں بہترین کمرے میں رہتی آئی ہے، اس لیے وہ اس کے آنے کو اپنی حق تلفی سمجھ رہی ہے۔ سعادت اُسے خاموش دیکھ کر اسکول کا کام کرنے بیٹھ گئی اور وہ تاریخ و جغرافیے کے چکر میں پڑ کر سب کچھ بھول گئی۔

دو دفعہ رسول فاطمہ نے چپکے سے اُسے بلایا مگر وہ نہ گئی۔ رسول فاطمہ کے پاس جانے کی ممانعت بھی ہو گئی تھی کیونکہ ڈاکٹر نے اُسے دِق تجویز کی تھی۔ یہ بھی

سُنا تھا کہ گرمی کی چھٹیوں کے بعد اُسے واپس نہ آنے دیا جائے گا۔

سعادت ویسے تو اب خوش رہنے لگی تھی لیکن پھر بھی بعض وقت شمن کو محسوس ہوتا کہ وہ اس سے نفرت کرتی ہے، جیسے اُس کی موجودگی سے کمرہ گھٹا جا رہا ہو، کیونکہ اُس نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ پڑھنے کے بعد فوراً اُٹھ کر اپنی ایک سہیلی کے کمرے میں چلی جاتی تھی۔

اُس کی یہ سہیلی، نجمہ، ہائی اسکول کے زمانے میں اُس کے ساتھ رہتی تھی۔ پھر جب ٹائیفائڈ کی وجہ سے سعادت فیل ہو گئی تو وہ اُس سے ایک درجہ آگے ہو گئی تھی۔ وہ ایف۔ اے میں تھی اور ہائی اسکول کی لڑکیوں سے بہت بزرگانہ برتاؤ کرتی تھی۔ جب وہ سعادت کے کمرے میں آتی تو شمن کو دیکھ کر ذرا دیر کو ٹھٹک جاتی۔ بیٹھتی تو بالکل خاموش ورنہ جلدی سے بہانہ کر کے چلی جاتی۔

. . . . نجمہ سے شمن بالکل بے تکلف نہ تھی اور عموماً اسے دیکھ کر ذرا پریشان ہو جاتی تھی۔ یہی شمن اپنے کمرے میں آتی تو نجمہ بھی، جو ہنس ہنس کر سعادت سے باتیں کرتی ہوتی، ایک دم خاموش ہو جاتی اور دوسرے لمحے اُسے کوئی نہایت ضروری کام یاد آتا اور وہ چلی جاتی۔ مگر نجمہ کو دیکھ کر شمن کچھ عجیب طرح بے چین ہو جاتی۔ جتنی دیر کھڑی وہ باتیں کرتی رہتی شمن کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا کرتا۔ وہ جلدی سے اُس کی طرف سے توجہ ہٹا کر بیکار سے کام کرنے لگتی، مگر جب وہ چلی جاتی تو شمن کو بہت افسوس ہوتا کہ آخر اُس نے اسے اچھی طرح دیکھا کیوں نہیں۔ وہ اُس کی اُودی پھول دار شلوار کی تڑپتی ہوئی سلوٹیں، سفید چکن کا کرتہ، جس کا گریبان ذرا نیچے کو کھنچا ہوا تھا اور کمر پر چُست کرنے کے لیے متوازی پلیٹیں پڑی تھیں، شانوں پر جھولا جھولا جھول اُس کی کمر کو اور بھی پتلا بنا دیتا، اور اس کا کاسنی چُنا ہوا دوپٹہ جو شانوں پر سے ہوتا ہوا بغل میں گھوم جاتا تھا اور آنچل تازہ پھولوں کے گچھے کی طرح سمٹ کر بازو پر جھولا کرتا، جب وہ مڑ کر جانے لگتی تو اُس کی چوٹی کا پھندنا اُس کے کولہوں پر ٹھمکیاں لیتا اور اُودی شلوار کے

پائنچوں میں سے اُس کی سانولی ایڑیاں خاصی گوری معلوم ہوتیں، جیسے مور کے بھورے رنگ کے انڈے۔

نجمہ بڑی نازک تھی۔ معلوم ہوتا تھا اُس کے جسم میں ایک بھی پکّی ہڈی نہیں۔ شمن کا دل اُسے چھونے کے خیال سے گھبرانے لگتا۔ گرم اور نرم ایسی کہ اگر ہاتھوں میں لے کر زور سے دباؤ تو اُبلے ہوئے انڈے کی طرح پھسل جائے۔

ایک دن یونہی وہ شمن کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ شمن پریشان ہو گئی اور جب اُس نے اپنے دوپٹے کا آنچل جھٹکا تو وہ شمن کے بازو پر آن گرا۔ شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے چھت پر سے اُس کے اوپر سانپ ٹپک پڑا۔ وہ سُن بیٹھی رہی، پھر آہستہ سے جھٹک کر آنچل گرا دیا۔ لیکن فوراً ہی اُسے افسوس ہونے لگا، جیسے اُس نے گود میں سے کوئی بڑی پیاری چیز پھینک دی۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی کہ کاش پھر نجمہ اُسی الھڑ انداز سے آنچل پھینکے اور وہ اُس کے بازو سے آن الجھے مگر نجمہ چلی بھی گئی۔

بعض وقت جب نجمہ سعادت سے باتیں کرتی ہوتی تو شمن اُسے نگل جانے والی نگاہوں سے گھورنے لگتی۔ وہ اس کے ہونٹوں کی خفیف سی جنبش، وہ سر موڑ کر ذرا اپنے شانے پر دیکھنا، جیسے وہاں کسی کی پیار بھری نظروں کا جواب دے رہی ہے، یا جب وہ اپنی گداز انگلی میں انگوٹھی گھما کر معصومیت سے چھت کی طرف دیکھتی، تو شمن پاگلوں کی طرح اس ننھے سے ڈرامے کو دیکھا کرتی۔ نجمہ اسے محسوس کرتے ہی ایک دم خاموش ہو کر ہونٹ بھینچ لیتی گویا پوچھ رہی ہے: "کیا کہتی ہو! کہو بھی چلو نا۔" مگر شمن کھسیا جاتی اور ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ اُس کی ریڑھ کی ہڈی میں رینگنے لگتا۔ زور سے پیٹ میں جیسے ایک دم بھوک چمکتی اور پھر پیاس لگنے لگتی، مگر وہ بے توجہی سے کوئی اوٹ پٹانگ کام کیا کرتی۔

پھر اُسے اور کچھ ہونے لگا۔ بیٹھے بیٹھے اُسے نجمہ کے ہونٹوں کی جنبش، آنچل کا گچھا اور کمر پہ لگی ہوئی پلیٹیں یاد آجاتیں۔ وہ تھوڑی دیر تو اُن سے لطف لیتی مگر

پھر جھنجھلا کر انہیں دور دھکیل دیتی۔

ایک دن ایک عجیب واقعہ ہُوا۔ سعادت بخت کے کمرے میں سے اُس کی ساٹن کی صدری پہن آئی۔ کلاس میں جب شمن نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا تو ایسا محسوس ہُوا جیسے اُس نے کوئی گرم رکابی پکڑ لی ہو۔ اُس نے جلدی سے گھبرا کر ہاتھ ہٹا لیا، مگر دوسرے لمحے وہ سعادت کی پیٹھ پر ہاتھ رکھنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈنے لگی۔ اُسے ایسا معلوم ہُوا گویا چکنے چکنے سانپ اُس کی ہتھیلی میں سرک رہے ہیں۔ دوپہر کے وقت گرمی کی وجہ سے سعادت نے صدری اُتار کر کرسی پر لٹکا دی اور کھانا کھانے چلی گئی۔ شمن نے کھانے پر سے آکر جو صدری کو دیکھا تو زور زور سے اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ دوبارہ اسکول شروع ہونے کی گھنٹی بج گئی شمن بہانے بناتی رہی۔

"چلتی ہو کہ نہیں؟ مس جرجی کا گھنٹہ ہے، دیر ہو گی تو کھا لیں گی۔"

"تم چلو ــــ میں ذرا ــــ" وہ لوٹا اٹھا کر غسل خانے جانے کی تیاری کرنے لگی۔

جب سب لڑکیاں بورڈنگ سے چلی گئیں تو ڈرتے ڈرتے زمین پر لوٹا رکھ کر اُس نے صدری کی طرف دیکھا۔ پھر بھی اس کو اطمینان نہ ہوا اور وہ جا کر دروازہ بند کر آئی۔ آہستہ آہستہ دبے پیر وہ بڑھی۔ دھڑکن ایکا ایکی اتنی تیز ہو گئی کہ معلوم ہُوا سینہ ہی پھٹ جائے گا۔ ایک مست کن بھبکا اُس کی ناک میں پہنچا اور اسے چکر آنے لگا۔ باہر کسی نے کوڑے کے ٹین کو ٹھوکر ماری اور جلدی سے اُس نے صدری پلنگ پر پھینکی ــــ مگر دروازے سے وہ لوٹ آئی ــــ جلدی میں اُس نے صدری بجائے کرسی کے پلنگ پر ڈال دی! اور جو سعادت دیکھ لیتی تو؟ غضب ہو جاتا۔ وہ ضرور بھانپ جاتی کہ صدری جگہ سے بے جگہ کی گئی ہے۔

کلاس میں مس جرجی نے کیسے ڈانٹا، اُسے کچھ سنائی نہ دیا، وہ سر جھکا کر خاموش بیٹھ گئی مگر بڑی دیر تک اُس کی انگلیاں صدری کے مس سے جھنجھناتی رہیں۔ جیسے اُن میں میٹھی میٹھی مرچیں لگ گئی ہوں!

اسکول ختم ہوا تو وہیں کیاریوں کے پاس منڈیر پر بیٹھ گئی۔ پنسل کو اینٹ پر گھستے ہوئے اُس نے سوچنا شروع کیا: آج اُسے معلوم ہو رہا تھا گویا اس نے کوئی حسین چوری کی ہے۔ ایک دفعہ اسکول میں پارٹی ہوئی تھی تو اس نے چپکے سے ایک رس گلا اُٹھا لیا تھا مگر کسی کے پیر کی چاپ سُن کر وہ جلدی سے اُسے نگل گئی اور ہاتھ دھونے کے نل میں سے پانی پینے لگی۔ اُس رس گلے کا ذائقہ مشکل سے چند سیکنڈ اُس کی زبان پر میٹھا ہوگا مگر اب تک وہ جب چاہتی تخیّل کی مدد سے اُس کی مٹھاس مُنہ میں کھینچ لاتی اور اس کا سارا مُنہ لذّت سے بھر جاتا۔ آج بھی وہ صدری کی خوشبو کو اپنے نتھنوں میں کھینچنے لگی۔ عطر تو نہ تھا مگر تھا ضرور کچھ۔ سعادت میں تو وہ ہمیشہ سے جانتی تھی کہ مُرغی کے بچّے جیسی بُو آتی تھی مگر اس خوشبو میں تو کچھ لونگوں کے بگھار کی سی مہک تھی، بالکل ہی نئی، اور آسانی سے کھنچ کر نتھنوں میں گھٹنے لگتی تھی۔

اب تو اُسے نجمہ کی طرف آنکھ اُٹھاتے بھی شرم آتی تھی، مگر قوّتِ احساس سے سب کچھ بتا دیتی تھی کہ اب نجمہ کدھر دیکھ رہی ہے، اُس کے بکھرے ہوئے بال کدھر کو زیادہ جھک گئے ہیں؛ آج اُس نے صندلی شنگھائی کے ریشم کا کرتا پہنا تھا وہ ایسا جسم پر چپک گیا ہے جیسے جسم پر صندلی وارنش چڑھا دی گئی ہو! آج اُس کے ہموار چمکیلے دانت دنداسہ لگانے سے ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے شراب کے گلاس میں موتی تیر رہے ہوں۔ سفید سفید چمکیلے دھاردار موتی۔ نجمہ کے دانت دور سے دیکھنے میں بہت تیز معلوم ہوتے تھے، جیسے نیولے کے نوکیلے دانت۔ شمن آہستہ آہستہ اپنے دانتوں پر زبان پھرتی تو بڑی گدگدی معلوم ہوتی۔

شمن جب کمرے میں پہنچی تو نجمہ کے قہقہے نے اُس کے پیر پکڑ لیے۔ سعادت اور نجمہ پچھلے اسباب کے کمرے میں ہنس ہنس بول رہی تھیں۔ اب کچھ دن سے نجمہ جب آتی سعادت سے کوئی ایسی چیز مانگتی جسے نکالنے کے لیے اُسے صندوق کھولنا پڑتا۔ وہ اُٹھ کر اندر جاتی اور پیچھے پیچھے نجمہ بھی چلی جاتی، پھر وہ گھنٹوں وہاں بیٹھی ہلکے ہلکے بولا کرتیں۔ شمن کا دل کسی کام میں نہ لگتا اور وہ سانس روک کے نجمہ کی آواز پر کان لگائے بیٹھی رہتی۔

اُس کی اتنی ہمّت نہ ہوتی کہ وہ بھی اُٹھ کر اندر جا بیٹھے، مگر اُسے سعادت سے نفرت ہونے لگی کہ وہ جان بوجھ کر اُسے نجمہ سے دُور رکھتی ہے۔

اسکول میں فینسی ڈریس ہؤا تو انہوں نے کالج کی لڑکیوں کی بھی دعوت کی۔ ویسے بورڈنگ دور نہ تھا اور لڑکیوں کو ملنے کی بھی ممانعت نہ تھی مگر عموماً اُن کے جلسے تہوار جُدا ہوتے تھے۔ عید کا موقع تھا اور ڈنر بڑا شاندار ہونے والا تھا ہر لڑکی کا دل مردانہ لباس پہننے کو چاہتا تھا۔ لہذا ڈے اسکالر لڑکیاں حسب فرمائش اپنے اپنے گھروں سے لے آئیں۔ شمّن نے بھی ایک سوٹ منگوا لیا۔

مردانے کپڑے پہن کر لڑکیاں شرم کے مارے گر گر پڑیں، خصوصاً وہ تو بے حال ہوگئیں جنھوں نے داڑھی مونچھیں لگائی تھیں۔ کچھ تو کمروں میں گھسی بیٹھی تھیں، شرم کے مارے چادریں اوڑھے ہوئے اور زیادہ بہادر لڑکیاں انہیں گھسیٹ گھسیٹ کر نکال رہی تھیں۔ اخترؔ موٹی سے مولانا شوکت علی کی وضع کی داڑھی اور ٹوپی پہن رکھی تھی جسے دیکھ کر لڑکیوں کی چیخیں نکلی جا رہی تھیں مگر وہ مزے سے ٹہل رہی تھی۔ ایک لڑکی نے عرب نوجوان کا لباس پہن لیا تھا جس میں وہ بالکل زنانی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کے پاس نوری ریشمی ساڑھی پہنے پھدک رہی تھی۔ بچاری نوری نے ساڑھی بھی تو نہیں پہننا شروع کی تھی۔ اس لیے اُس کے لیے وہی عجیب و غریب چیز تھی۔ مگر وہ عرب نوجوان خورشید کے پیچھے لگی تھی جو مصری لباس میں بالکل بنجا بن ٹھن رہی تھی۔

شمّن اپنا سیاہ سوٹ پہنے تین دفعہ دروازے میں سے نکلی مگر پھر ڈر کر بھاگ گئی۔ دو چار لڑکیوں نے اُسے گھسیٹا مگر پھر چھوڑ دیا۔ سوٹ پہنے تو کئی لڑکیاں گھوم رہی تھیں۔ مگر شمّن کا بڑا حال تھا گویا ننگی مادر زاد ہو۔ سب مہمان حال میں جمع تھے اور برابر کالج کی لڑکیاں گزر رہی تھیں۔ اُس نے دیکھا سعادت دھوبی بنی ہوئی ہے۔ سفید پگڑی اور لمبی لمبی مونچھیں اور کپڑوں کی گٹھڑی شانے پر اور اُس کے ساتھ۔ اُس کے ساتھ نجمہ دھوبن بنی ہوئی۔ نام کو دھوبن تھی مگر وہ تو پوری پدمنی بنی ہوئی تھی۔ گھوم گھیر کا جھلمل کرتا لہنگا اور شوخ گوٹے سے ٹھنپا ہوا باریک دوپٹہ اور وہی صدری!

دہی لونگوں کے بگھار کی مہک میں بسی ہوئی سراٹن کی صدمتی! آج اُس نے دنداسہ بھی لگایا تھا اور لپ سٹک بھی اور گال بھی ہلکے رنگ دار تھے۔ اور پیر؟ اُس کے پیر دیکھ کر شمن کا دم نکل گیا: مور کے انڈوں جیسی ایڑیوں میں لال روشنائی۔ وہ ننگے پیر تھی اور چاندی کی پازیب زمین پر گھسٹ رہی تھی۔ ماتھے پر اس نے ٹیکہ لگا رکھا تھا۔ جو بالکل ہیرے کی طرح دمک رہا تھا۔ شمن شرمانا وغیرہ سب بھول کر مبہوت اُسے دیکھتی رہ گئی۔

"ارے شمشاد کو دیکھنا!" نجمہ زور سے ہنسی اور سب لڑکیاں اُسے دیکھ کر قہقہہ لگانے لگیں۔

"ہائے اللہ بالکل لڑکا لگ رہی ہے۔" نجمہ کا منہ لال ہو گیا۔

"تم کیوں نہیں چلتیں۔ چلو نا۔" سعادت نے نرکھائی سے کہا۔

"آؤ بھئی دھوبی تم تو ہو جاہل۔ اور یہ صاحب بہادر۔ ہمیں تو یہ پسند ہیں۔" نجمہ مذاق میں شمن کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگی اور شمن کو ایسا معلوم ہوا وہ سو رہی ہے، یہ سب خواب میں ہو رہا ہے۔

شمن کے لباس سے کوئی متاثر نہ ہوا مگر معلوم ہوتا تھا کہ جب بھی نجمہ اُس کی طرف دیکھتی اُس کا منہ تمتما اٹھتا اور وہ قہقہے مارنے لگتی۔ شمن بھی اُسے برابر دیکھ رہی تھی۔ آج وہ اُس کے بالکل قریب بیٹھی تھی، ایسے کہ کئی دفعہ نجمہ کا جالی دار دوپٹہ اُس کے ہاتھوں پر آن گرا۔

مگر سعادت کچھ مکدر سی بیٹھی تھی۔ اُسے نجمہ کا ہنسنا اور بات بے بات شمن سے بے تکلف ہونا ذرا بھی اچھا نہ لگا۔ کھانے پر مارے گھبراہٹ اور جوش کے شمن سے کچھ نہ کھایا گیا۔ کئی مرتبہ نجمہ کی پازیب کھل گئی تو اُسے باندھنی پڑی۔ پھر بھاری جھمکوں سے اُس کے کان دُکھ رہے تھے، بار بار اُن کی خبر لینا پڑتی تھی۔ گو زبان سے وہ نجمہ کی بہت کم باتوں کا جواب دیتی تھی لیکن اُس کا بھولا بھولا چہرہ، اُس پر بدمعاشوں جیسی مونچھیں، بال جو بار بار ہیٹ سے باہر پھسل آتے تھے، ہر بات پر شرما کر گھبرا جانا اور پھر خاموشی

سے کھسیا کر مسکرا دیتا۔ ایسی باتیں تھیں کہ نجمہ سے بے تکلف ہوئے نہ رہا گیا اور وہ اُسے شمن کہنے لگی۔

جب شمن نے کچھ کہا تو اُس پر بھی نجمہ کو بہت ہنسی آئی۔ سعادت نہایت سنجیدہ بنی اپنی ایک اُستانی سے آنے والے امتحان پر گفتگو کر رہی تھی۔ اس لیے مونچھیں اُتار دی تھیں اور ہمانے کو ڈوپٹے کی طرح اوڑھے ہوئے تھی، بجائے دھوبی کے وہ بڑی بی معلوم ہو رہی تھی۔

جب انعام دیے جانے کا وقت آیا تو نجمہ گھبرا گھبرا کر سعادت کو ڈھونڈنے لگی لیکن سعادت اپنے کمرے میں تھی۔ نجمہ بھاگی ہوئی گئی۔ شمن کا دل بیٹھنے لگا۔ نجمہ سعادت پر مری جا رہی تھی۔ اُس کا جی نہ مانا تو وہ بھی کمرے میں گئی۔ وہاں اُس نے دیکھا سعادت بُری طرح پلنگ پر پڑی رو رہی ہے۔ نجمہ اُسے منا رہی ہے مگر سعادت کے غصے کی انتہا نہیں۔ اسے دیکھ کر وہ چپ ہو گئیں۔ اتنے میں چند لڑکیاں بھاگتی ہوئی آئیں اور کہا: "نجمہ باجی، مس جرمی بلا رہی ہیں۔" نجمہ مجبوراً اُٹھ کر چل دی۔ شمن بھیگی بلی کی طرح ساتھ ساتھ۔ ہال میں تمام فینسی ڈریس والیاں دو دو کے جوڑوں میں گزر رہی تھیں۔ جب کوئی عجیب جوڑا گزرتا تھا تو خوب تالیاں بجتی تھیں۔

"ارے دھوبن کہاں ہے۔ نجمہ"۔ مس جرمی پکار رہی تھیں۔

"ہیں، تمہارا دھوبی کہاں ہے؟"

"سعادت کی طبیعت خراب ہو گئی"۔ نجمہ نے مری آواز سے کہا۔

"یہ تو بُرا ہوا۔ اچھا تو تم کسی اور کے ساتھ چلی جاؤ۔ جلدی کرو، اب تمہاری باری ہے۔"

بغیر کچھ کہے سنے نجمہ نے شمن کا ہاتھ پکڑ لیا اور آگے بڑھ گئی۔ نہ جانے شمن کہاں پیر رکھتی تھی اور کہاں پڑتا تھا، اُسے تو بس اتنا احساس تھا کہ نجمہ کے ہاتھ میں اُس کا ہاتھ ہے اور وہ ہوا میں معلق ہے۔ نجمہ کو انعام ملا۔ انعام تو تین تھے مگر پھر لڑکیوں نے ایک دوسرے کو دینا شروع کیے، یہاں تک کہ ہر لڑکی کے لیے انعام کا اعلان ہو

گیا۔ نوشی کو اس کی بڑی ہوئی دوست برجیس مے دیا اور برجیس کو افسر نے۔ پھر تینوں انعاموں پر بحث کرنے لگیں۔

نجمہ نے شمن سے اور کوئی بات نہیں کی۔ انعام لینے کے بعد وہ واپس سعادت کے پاس آگئی اور جب جلسہ ختم ہونے کا آخری گیت گایا جا رہا تھا تو شمن کی آواز گلے ہی میں گھٹ گئی۔ سعادت بالکل خوش کھڑی تھی اور نجمہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے سُر سے سُر ملائے آخری گیت گا رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں غرق، دنیا سے بہت دُور تھیں۔

رات کو جب شمن پلنگ پر لیٹی تو بڑی دیر تک ہچکیوں کے مارے اُس کا بُرا حال رہا۔ خاموش وہ اپنی ہتھیلیوں میں دانت گڑائے اپنی آواز کو گھونٹتی رہی۔ سعادت آج کمرے میں نہیں تھی۔ آج چونکہ چھٹی تھی اس لیے لڑکیوں کو ایک دوسرے کے کمرے میں جانے کی اجازت تھی۔ وہ شرم سے بے حال تھی! اسے کیا ہو گیا تھا۔ خوف سے اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ بالکل پاگل ہوا چاہتی تھی... والی رسول فاطمہ کی طرح۔ اوہ! آج اُسے رسول فاطمہ یاد آنے لگی اور بے انتہا معلوم ہوا کہ وہی اُس کی قاتل تھی۔ اس لیے ہی تو رات بھر اُسے سردی میں اکیلا کمرے کو بند کر دیا تھا۔

اور اب وہ بھی رسول فاطمہ کی طرح۔ اُف! شرم اور نفرت سے اُسے پسینہ آگیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی آگ سے اُس کا سینہ پھک رہا تھا۔ نجمہ، نجمہ۔ اُس کی رُوح پکار رہی تھی۔

رسول فاطمہ! اُس کی سوکھی کلائیاں اور چوہے کی شکل کے ہاتھ، خراب صحت اور بدوضع جسم۔۔ ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ اوہ، وہ اُس کی قاتل تھی۔ وہ اُس کی آخری التجا بھری سانسیں، وہ گھٹی ہوئی آہیں، شمن کو معلوم ہوا جیسے مکڑیوں کی طرح اُس کے جسم پر رینگ رہی ہیں۔

مگر وہ مری تو نہیں تھی۔ میٹرن نے کہا تھا وہ پہاڑ پر چلی جائے تو اچھی ہو جائے گی۔ کاش، کاش وہ پہاڑ پر چلی جائے! شمن دعائیں مانگنے لگی۔

مگر نجمہ؟ رسول فاطمہ کے متعلق پشیمان ہو کر اُسے نجمہ کے خیال میں غرق ہونے کا تھوڑا سا حق محسوس ہونے لگا۔

نیند نہ آئی۔ بےچینی سے وہ پلنگ پر لوٹتی رہی مگر نجمہ ایک خوفناک، بے رحم خواب کی طرح اس کے دماغ میں بھری ہوئی تھی۔ جس وقت اُس نے رسول فاطمہ سے نجات پائی تھی اُسے خیال ہُوا تھا کہ سانپ کو مار ڈالو تو ناگن آ کر بدلا لیتی ہے۔ تو یہ نجمہ اس سے بدلہ لے رہی تھی۔

خوف سے اُسے پھر رونا آنے لگا۔ اپنے پلنگ کے چاروں طرف ناگنوں کی پھنکاریں سُن سُن کر وہ نیم جان ہو گئی۔ تڑپ تڑپ کر وہ نہ جانے کب سو گئی!

(۱۵)

وہ ہر ممکن کروٹ سے بدلی مگر نیند نہ آئی۔ نجمہ ایک بھیانک خواب کی طرح اُس کے دماغ میں بھری ہوئی تھی۔ جب اُس نے رسول فاطمہ سے رہائی پائی تھی تو اسے ایسا معلوم ہُوا تھا جیسے اُس نے سانپ کو کچل ڈالا، مگر جبھی اس کے دل میں دبا چھپا یہ خوف بھی سمایا ہُوا تھا کہ اگر ناگ کو مار ڈالو تو ناگن بدلہ لینے آتی ہے، وہ اپنے ناگ کی مردہ آنکھوں میں دشمن کی تصویر دیکھ کر اسے ڈسنے پہنچ جاتی ہے۔ تو یہ نجمہ اُس سے رسول فاطمہ کے زخموں کا بدلہ لے رہی تھی۔ دکھ اور خوف سے وہ تڑپ کر رو دی۔ ساری رات پلنگ کے چاروں طرف ناگنوں کی پھنکاریں سرسراتی رہیں جنھیں سُن سُن کر وہ نیم جان ہو گئی۔

صبح اُٹھ کر اُس نے سعادت سے بات نہ کی۔ وہ خود کچھ کھچی کھچی نظر آ رہی تھی۔ شمن خاموش لائبریری میں بیٹھ کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ چھٹیوں کے تین دن پہاڑ بن بن کر اُس کے تنہا اور مجروح جسم کو پیستے رہے۔ سعادت روز رات کو غائب ہو جاتی اور بھرے بورڈنگ میں شمن کو قبرستان کا سناٹا چھایا نظر آتا۔ لائبریری میں وہ نہ جانے کتنی دیر بیٹھی موٹی موٹی ڈکشنریوں کو بے معنی نظروں سے گھورتی رہی۔

اُن میں سے ایک میں بھی تو اس کے مرض کا علاج نہ تھا۔ کسی خوفناک انجام کی آمد کے خوف سے وہ سہمی جا رہی تھی۔ یہ اُس کے دل کا غبارہ جو آہستہ آہستہ سلگ رہا تھا کب پھوٹ چکے گا!

جیسے کسی نے اُس کی خاموش دعاؤں کی آہٹ سُن لی، اس کا دل غبارے کی طرح پھولنا شروع ہوا اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر تھوڑی دیر اور نجمہ اسی طرح مذبذب دروازے میں کھڑی رہی تو یہ غبارہ پھوٹ ہی جائے گا، مگر نجمہ آہستہ سے بڑھ کر الماریوں میں کتابیں دیکھنے لگی۔ وہ شمن کی پیٹھ کے پیچھے کھڑی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کی پیٹھ پر کوئی انگیٹھی دہک رہی ہے۔ سارے جسم پر گرم گرم نکتے سے پھدکتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ سانس روکے کتاب کے صفحے پر جھکی رہی۔ غبارہ آہستہ آہستہ پچکنے لگا۔ ”ارے تمہارے پاس ہے یہ کتاب، میں کہہ رہی تھی کون لے گیا اٹھا کر۔“ نجمہ نے اُس کے پاس کی کرسی گھسیٹی۔ شمن نے جلدی جلدی کتاب کے ورق تندہی سے لوٹنے شروع کر دیے۔

تھوڑی دیر نجمہ بیٹھی باتیں کرتی رہی، اِدھر اُدھر کی فضول بکواس، اتنی دیر شمن چوری چھپے اس کی ساٹن کی صدری، جس کے دو بٹن ٹوٹے ہوئے تھے، اور بغل میں دبا ہوا کافوری دوپٹے کا گچھا دیکھتی رہی۔ نجمہ بے چینی سے ٹانگیں ہلا رہی تھی۔ اس کی کاہی اطلس کی مچلتی ہوئی شلوار آہستہ آہستہ لہرا رہی تھی۔ پھر وہ ایک دم چپ ہو گئی اور بڑے غور سے شمن کے خوفزدہ اور مسرت بھرے دہکتے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگی۔

”شمی!“ نجمہ نے اتنے آہستہ کہا جیسے کسی نے دو باریک بالوں کو آپس میں رگڑ دیا ہو۔ شمن کی آنکھیں لرزتی ہوئی اٹھیں اور فوراً جھک گئیں۔ نجمہ نے اپنی دو انگلیاں آہستہ سے شمن کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔ ایک دم اُس کی ہتھیلی میں تشنج ہوا اور وہ سمٹ کر نجمہ کی انگلیوں کو نگلنے لگی۔ دروازے میں سعادت کھڑی مسکرا رہی تھی۔ نجمہ نے تیزی سے اپنی انگلیاں چھین لیں اور عجب تھکی ہوئی سی ہنسی اُس کے ہونٹوں

پر مچلنے لگی۔

"سعادت!" اُس نے ہمت کر کے کہا، "آؤ نا کہاں چلی گئی تھیں؟ میں تمہیں" مگر سعادت نے ایک تلخ جنبش سے اُس کی بات ٹال دی اور بڑی مشغولیت سے کتابیں دیکھنے لگی۔

نجمہ سعادت کے پیچھے پیچھے گئی۔ شمن نے دیکھا وہ کسی اہم مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے گیلری کے آخری کونے پر رُک گئیں۔ نجمہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی جسے سعادت ٹال کر جانا چاہتی تھی مگر نجمہ نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

جلد ہی یہ بات بورڈنگ میں پھیل گئی کہ سعادت اور نجمہ کی جنگ ہو گئی۔ نیز شمن پر بھی مشتبہ نظریں پڑنے لگیں، کو یقین تو نہیں پھر بھی اہل نظر کا خیال تھا کہ کچھ اُس کا بھی دخل ہے۔ سعادت کا پرانا دردِ سر کا مرض عود کر آیا اور نجمہ کو گوشت کی بُو سے قے ہونے لگی، لہذا دونوں نے کھانا نہ کھایا۔ لڑکیوں کے گروہ کھسر پھسر کرنے اور قہقہے لگانے لگے۔ سعادت کی علالت تو طویل ہو گئی مگر نجمہ بدستور کھانے کے کمرے میں آنے لگی۔ وہ ایک دم سے بہت ملنسار ہو گئی۔ جن لڑکیوں سے وہ کبھی بات بھی نہ کرتی اُن سے ہنس ہنس کر مذاق کرنے لگی لیکن بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں میں ایک پوشیدہ فکر جھلکنے لگتی۔ اس کا ہر مذاقیہ جملہ زبردستی ڈھالا ہُوا معلوم ہوتا۔ ویسے تو لڑکیاں اس کی بات کا جواب بڑی خندہ پیشانی سے دیتیں لیکن اس کے جاتے ہی چلی کٹی کہنے لگتیں۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ اس کی ظاہرہ خوش مزاجی کی اصل وجہ کیا تھی۔ اسے صرف سعادت کا غم مٹانے کے لئے اُن کی مدد کی ضرورت تھی۔ مگر کسی کو اسے رکھائی سے جواب دینے کی ہمت نہ تھی کیونکہ وہ استانیوں میں کافی پسند کی جاتی تھی اور اپنی جماعت میں ہمیشہ اوّل رہتی تھی۔

موقعے کی مناسبت کو دیکھتے ہوئے شمن آہستہ آہستہ کسی نہ کسی بہانے سے اس کے قرب میں رہنے کی کوشش کرنے لگی: کچھ نہیں تو وہ اُس کی ڈاک ہی پکڑنے کی فکر میں رہتی تاکہ اسے دینے کے لیے اس کے کمرے میں جا سکے۔ بار بار کسی جملے کے معنی پوچھنے یا نیند

کتاب کا پتہ معلوم کرنے اُس کے پاس چلی جاتی۔ نجمہ کا موڈ بڑا اُلجھا ہُوا ہوتا۔ اگر غلطی سے وہ ذرا بے تکلف ہو جاتی تو فوراً واپس کھنچ جاتی اور جلدی سے اُسے کمرے میں سے ٹال دیتی، یہاں تک کہ بعض وقت تو شمن کو اُس کی رکھائی سے بڑی چوٹ لگتی۔ تین دن ہو گئے سعادت اور نجمہ کے درمیان پرچہ بازی ہوتی رہی لیکن ملاپ کی کوئی صورت نہ نظر آئی۔ اس عرصے میں نجمہ کئی دفعہ شمن کے کمرے میں بھی آئی، ہنس ہنس کر باتیں بھی کیں مگر کچھ خشک سی ہو کر فوراً چل دیتی۔ کئی بار دونوں باغ میں بھی ملیں مگر عجیب سی خاموشی نے انھیں جلد ہی بھاگ جانے پر مجبور کیا۔

امتحان شروع ہونے والے تھے۔ یہ امتحان بھی بورڈنگ میں شاندار تہوار کی طرح آتے ہیں۔ کئی دن پہلے سے لڑکیاں ایک دوسرے کو WISH کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ پھل پھول کا تبادلہ شروع ہو جاتا اور بہت سی تو دوپٹے، ساڑھیاں، چوڑیاں وغیرہ دیتی لیتی ہیں۔ آپس کے لین دین سے زیادہ یک طرفہ دین ہوتا ہے، یعنی وہ لڑکیاں جو دوسروں پر مرتی ہیں وہ بڑے دل کھول کر دیتی ہیں۔ وہ خواہ کتنی غریب ہیں، وظیفے پر گزارہ کر رہی ہیں، خیرات میں کتابیں اور ہدیے ملتے ہیں مگر جس پر مرتی ہیں، اس کے لیے چوری کریں گی، ڈاکے ڈالیں گی، بھیک مانگیں گی مگر اپنی چہیتیوں کو دس دس روپے کی چوڑیاں، پانچ چھ روپے کے ہار پھول اور گجرے ضرور پہنا دیں گی۔

جس لڑکی کی زیادہ مرنے والیاں ہوں گی اتنی ہی زیادہ اُسے چیزیں ملیں گی۔ اس کے علاوہ عین امتحان کی صبح ہار اور گجروں سے لاد دیں گی اور بعض چہیتیاں تو ایسی پھولوں میں چھپ جاتی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے لیڈر کا جلوس نکل رہا ہے۔ بعض مرنے والیاں پھولوں اور گوٹے کے گہنے پہنا کر بالکل دلہن بنا دیتی تھیں اور پھر یہ دلہنیں شرماتی لجاتی امتحان کے کمرے میں چلی جاتیں۔ ہر مرنے والی کا ہار پہننا لازمی تھا۔ بعض حاسدوں کا خیال تھا کہ اتنے ہار مرنے والیوں کے نہیں ہوتے، کتنے بس دکھانے کو یہ لڑکیاں خود منگا کر پہن لیا کرتی تھیں تاکہ لوگ سمجھیں ان کی

اتنی مرنے والیاں ہیں پتہ۔

شام ہی سے شمن نے بھی نجمہ کے لیے سوا روپے کا موٹا سا گجرا منگوایا۔ رات کو جب تک وہ جاگتی رہی اُس پر پانی چھڑکتی رہی۔ بار بار اُس نے ان خوش نصیب پتیوں کو چھوا جو کل نجمہ سے معانقہ کرنے والی تھیں۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اُن پتیوں کی آڑ میں چھپ رہتی۔

صبح اس نے گھبراہٹ میں ناشتہ بھی نہ کیا۔ گجرے کو کبھی اس ہاتھ میں لیتی کبھی اُس میں۔ وہ کس طرح نجمہ کے گلے میں ہار ڈالے گی۔ شاید سیتا جی کو رام چندر جی کے گلے میں مالا ڈالتے وقت بھی اتنی الجھن نہ ہوئی ہوگی۔ بلا سے، انھیں مذاق اُڑانے والی لڑکیوں اور میٹرن کی تیز نگاہ کا ڈر تو نہ تھا۔ اور یہ اُجڈ غیر شاعرانہ دماغ کی لڑکیاں تو بس انسان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی تھیں۔ وہ برآمدوں میں کھڑی ہو جاتیں اور چونکہ خود کسی پر نہ مرتی تھیں اس لیے ہر مرنے والی کی گھبراہٹ اور گجروں کا مذاق اُڑاتیں، جس سے بعض وقت چہیتیاں بھی مجروح ہو جاتیں اور عام کھسیانہ پن اور بدمزگی پھیل جاتی۔ مرنے والیاں بگڑ جاتیں تو یہ دوسری لڑکیاں، جنھیں بازار والیوں کی طرح سمجھتی تھیں، کٹتے ہوئے طعنوں سے اُن کے کلیجے چھلنی کر دیتیں، ان کی کمزوریوں کو شارع عام پر کھول کر بکھیر دیتیں۔ مگر یہ مرنے والیاں بھی بڑے پتھر کے کلیجے والی ہوتی ہیں۔ کوئی طعنہ، کوئی ملامت اُنھیں اِن کے راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔ وہ ضرورت سے زیادہ بے حس اور بے حیا ہو جاتی ہیں۔ بعض تو ایسی مرنے والیاں تھیں جن کے گھر والے تک اُن کے اس جنون سے عاجز تھے۔ اگر ان پر ذرا بھی سختی کی جاتی تو وہ پاگل سی ہو جاتیں اور پھر مجبوراً اُن کے ساتھ رعایت کرنا پڑتی۔

جب پھولوں میں لدی پھندی نجمہ اپنے کمرے میں سے نکلی تو شمن کے ہاتھ پیر لرزنے لگے۔ جیسے تیسے کر کے اُس نے ہار نجمہ کے گلے میں ڈال دیا۔ نجمہ نے ہلکی سی مسکراہٹ سے اُس کی قیمت ادا کر دی لیکن بجائے امتحان کے کمرے میں جانے کے وہ سعادت کے پاس بیماروں کے کمروں میں چلی گئی۔ نہ جانے کیوں شمن کے پیر بھی اُس کے پیچھے پیچھے

اُکھڑ گئے۔

اُلٹے پیروں وہ واپس ہوئی اور بوجھل پیروں کو گھسیٹتی ہوئی کھوئی کھوئی جماعت میں چلی گئی۔ وہاں تو اس کے دل پر جیسے منوں مٹی پڑ گئی۔ سعادت بالکل تندرست اور خوش خوش بیٹھی تھی۔ اس کا گجرا جو، اس نے اتنے ارمانوں سے نجمہ کو دیا تھا، جوڑے میں لپیٹے ہوئے تھی۔

سعادت اور نجمہ پھر ایسے ہی ملنے لگیں گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ نجمہ کے امتحان ختم ہو گئے اور اب سعادت اور شمن کے امتحان شروع ہوئے۔ شمن نے نجمہ کو سوا روپے کا گجرا پہنایا تھا، اُس نے سعادت کے لیے تو کروڑوں ہار پھول منگائے مگر شمن کے لیے شاید ہار منگانا بھول گئی۔ اُسے کسی نے بھی ہار نہ پہنائے۔ اگر اُسے معلوم ہوتا تو وہ چوری چھپے خود ہی منگا کر پہن لیتی۔ پھولوں میں لدی ہوئی لڑکیوں کی قطار کے آخر میں سر جھکائے وہ امتحان کے کمرے کی طرف جانے لگی۔

"شمن ... بھئی مجھے گجرے نہیں اچھے لگتے، یہ پھول میں گھر سے لائی ہوں، اچھے ہیں نا؟" بلقیس نے اسے مہکتے شگفتہ پھولوں کا گچھا دیا۔ بلقیس ڈبے اسکالر تھی اور آٹھویں میں پڑھتی تھی۔ شمن کو معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کا ننگا تن ڈھانک دیا اور اسے باغ کے باغ بخش دیئے۔ پرچہ کرنے میں اُس کا دل نہ لگا اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے رعایتی ترقی ملی۔

امتحان کا نتیجہ معلوم ہوتے ہی چھٹیاں ہو گئیں اور دو مہینے کے لیے لڑکیاں اپنے گھروں کو چل دیں۔ بسیرا لینے کے لیے پھر سے چڑیاں اُڑ گئیں۔ دو مہینوں کا بسیرا!

دوسری منزل

(۱۶)

دوبارہ جو وہ اسکول میں آئی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ بلقیس کی بڑی بہن جو حال ہی میں انگلینڈ سے آئی تھیں پرنسپل ہو گئی تھیں اور بلقیس اور اس کی چھوٹی بہن جلیس مع بلے چوڑے خاندان کے پرنسپل صاحبہ ہی کے ساتھ اسکول کے احاطے میں آن رہی تھیں۔ سعادت کو ڈاکٹروں نے ایک سال کے لیے پڑھنے کو منع کر دیا تھا، اس کی صحت میں گھن سا لگ گیا تھا۔ نجمہ پاس ہو کر کسی اور کالج میں لاہور چلی گئی تھی۔ شمن کو دنیا سنسان اور اُجاڑ معلوم ہوتی، دل میں تنہائی کی ہُوکیں سی اُٹھتیں، نجمہ کا خیال پھوڑا بن کر ٹیسیں مارتا۔ اس میں کس قدر دُکھ بھرا ہُوا تھا مگر زندگی کی چاشنی بھی تو تھی۔ نجمہ نے اسے اپنی ایک تصویر کبھی دی تھی، جسے اُس نے اپنا بہترین مونس غمخوار پایا۔ سعادت بھی اسے اب بہتر رنگ میں یاد آتی۔ ویسے جہاں نجمہ کا سوال نہ تھا وہ اس کی بہترین دوست تھی۔ کاش اس نے نجمہ کو کبھی دیکھا ہی نہ ہوتا۔ اور اگر دیکھا تھا تو؟ تو؟ وہ آگے کچھ نہ جانتی تھی۔ مگر اُسے سعادت سے دوستی ٹوٹ جانے کا صدمہ تھا۔ نجمہ تو ایک شعلہ تھی کہ وقتاً فوقتاً ہاتھ تاپنے کی حالت ہو مگر سعادت ایک میٹھا چشمہ تھی جس سے کلاس میں، کلاس کے باہر، کھیل کود میں بھی بے پناہ رنگینیاں اور ہمدردیاں وابستہ تھیں۔ سعادت کو ہنسنے کا مرض تھا۔ وہ اور شمن ذرا ذرا سی بے مزہ باتوں پر گھنٹوں چمن کے سبزے پر لوٹیں لگاتیں۔ سعادت بہت ہوشیار تھی اور وہ ایک معلم جیسی مدد بھی دیتی۔ یہی نہیں وہ اگر شمن کو بددل یا سست دیکھتی تو بڑی سختی سے ڈانٹتی۔ شمن کو اُس کی ڈانٹ میں مادرانہ پیار اور فکر کی جھلک نظر آتی اور بعض وقت وہ اترانے کے لیے نخرے دکھاتی: "تمہاری بلا سے، ہمیں فیل ہو جانے دو" وہ اترا کر کہتی۔

"بس جی بس، زیادہ بکواس نہ کرو۔ ورنہ" سعادت ڈانٹتی۔

"ورنہ۔ ورنہ کیا؟"

"ورنہ یہ۔کہ۔۔۔ کچھ نہیں۔ میری پیاری بہن کیسی۔ آئیے" اور وہ شمن کے گلے میں باہیں ڈال دیتی۔ مگر جب نجمہ آئی تو؟ تو سارا شیرازہ بکھر گیا اور شمن سعادت کی موت کی دعائیں مانگنے لگی، اس کے سفلی جذبات بالکل شیطانی اعمال بن گئے۔ توبہ!

بلقیس سے شمن کی دوستی بھی عجیب وغریب طریقے پر ہوئی۔ ایک دن بلقیس اور وہ بڈمنٹن کھیل کر پسینہ سکھانے کے لیے چمن کی بنچ پر بیٹھی تھیں کہ ایک دم سے بلقیس نے پوچھا: "تم نجمہ پر مرتی تھیں نا؟"

"نہیں۔ نہیں تو۔ واہ" شمن گھبرا گئی اور قسمیں کھانے لگی۔

"ارے ہم سے جھوٹ بولتی ہو! ہونہہ، جیسے ہم جانتے نہیں، اور سعادت تم سے جلتی تھی۔ کیوں؟"

"جی ہاں۔کبھی بھی نہیں۔"

"تو اس میں بات ہی کیا ہے۔ میں خود پہلے نجمہ پر مرتی تھی مگر آپا جی نے مجھے بتایا کہ لڑکیوں کو ہمیشہ لڑکوں پر مرنا چاہیے۔"

"توبہ!" شمن نے بدک کر کہا۔

"ہاں اور کیا۔ اُن سے تو شادی کر کے ہمیشہ ساتھ بھی رہ سکتے ہیں۔ کیوں ہے نا جی"

"مگر۔۔۔۔ یہ تو۔۔۔۔ ہائے اللہ بری باتیں نہ کرو بلقیس"

"اس میں بری بات کیا ہے۔ جبھی تو آپ مجھے کوڑیالے اچھے لگتے ہیں۔ میں بڑی بھی تو ہوں تم سے" بلقیس روش پر سے کنکریاں چن کر ہوا میں اچھالنے لگی۔

"کوڑیالے؟"

"ہاں۔ ارے؟ کوڑیالے! تم نہیں جانتی کیا ہوتے ہیں۔ چہ ہشتو بھی اُلو ہو تم" بلقیس قہقہہ لگا کر گھاس پر لوٹ گئی۔ "ارے کوڑیالے پگلی، کالے اور سفید" اس نے ٹھنڈی

گھاس پر گال رگڑ کر ہلکی سی پھریری لی۔ "زہریلے۔ نف..... " نماز کی گھنٹی بج گئی اور دونوں بات ختم نہ کر پائیں۔

دو تین دن بلقیس کھیلنے ہی بورڈنگ میں نہ آئی جو شمن کی الجھن دور ہوتی۔ اس کے جی میں کھد بد ہو رہی تھی۔ اس کا جی نہ مانا اور اس نے لغت میں دیکھا مگر اس میں لکھا تھا "کوڑیالے، چتی دار سانپ، سیاہ اور سفید، سخت زہریلے... جن کے کاٹے..."

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کوڑیالے سانپ بلقیس کو کیوں پسند ہیں۔

"بی بتاؤ نا کوڑیالے کون ہوتے ہیں۔" اس نے موقع پا کر پوچھا۔

"کوڑیالے، دل کے ٹکڑے، جان ہوتے ہیں اور کون ہوتے۔"

"اونہہ تو بتاؤ نا۔"

کئی دن شمن پوچھتی رہی اور بلقیس ہنس ہنس کر ٹالتی رہی مگر ایک دن اس نے شمن کو ایک تصویر دکھائی، یہ ایک وجیہہ نوجوان کی تھی جو سیاہ شیروانی اور سفید پاجامہ پہنے تھا۔ ایک دم سے وہ دونوں قہقہہ لگا لگا کر ہنسنے لگیں۔ اچھا تو یہ تھے کوڑیالے! کالی شیروانی یونیورسٹی کا یونیفارم تھا اور یہ تصویر رشید کی تھی۔

ویسے بلقیس اور جلیس بورڈنگ میں نہیں رہتی تھیں پر جب کبھی ان کا دل چاہتا وہ سارے قوانین بالائے طاق رکھ کر بورڈنگ میں آن دھمکتیں۔ پرنسپل کی بہنیں، بھلا کس کی مجال تھی جو چوں بھی کر جائے۔ پھر ان کا دل لگنے لگا اور بلقیس شمن کے کمرے میں مستقل رہنے لگی مگر جب جی چاہتا بغیر اجازت بھاگ جاتیں۔ جلیس بدمزاج تھی اور نوری کی جماعت میں تھی۔ وہ دونوں ایک کمرے میں رہتیں مگر روز جوتا چلتا۔ شمن اور بلقیس نہایت بزرگانہ طریقے پر انہیں سمجھانے جاتیں اور ملاپ ہو جاتا اور پھر دونوں ایک دوسرے کا دوپٹہ اوڑھے گلے میں ہاتھ ڈالے چمن میں گھومنے لگتیں۔

پہلے پہل تو نوری نے بلقیس پر مرنے کی کوشش کی اور جلیس نے شمن پر مگر بلقیس نے نہایت جنگلی پن سے دونوں کو کھسیانہ کر دیا۔ اور پھر کچھ سوچ بچار کے بعد نویں جماعت کی ملک بڑکی کو دونوں نے چاہنا شروع کیا مگر بلقیس نے وہاں بھی ان کا ناک میں دم کر دیا۔

جہاں کوئی چیز گم ہو جاتی۔ وہ فوراً چلّا چلّا کر جلبیس اور نوری پر الزام لگاتی کہ وہ اپنی چہیتی کو دے آئی ہوں گی۔ بات یہ تھی کہ ایک دفعہ بچاریاں بلقیس اور شمن کے منگائے ہوئے پھلوں میں سے دو نارنگیاں چُرا کر دے آئی تھیں۔ مگر اب بلقیس کی سڑی ہوئی چیں بھی گم جاتی تو وہ یہی کہتی کہ نوری اور جلبیس اپنی دوست کو کھلا آئیں۔ اس پر نوری اور جلبیس خوب روتیں اور خوشامدیں کرتیں کہ ہولے ہولے بولو کہیں وہ سُن نہ لے۔ شاہ جہاں ان دونوں سے دوگنی بڑی تھی اور زیادہ منہ نہ لگاتی تھی پر جب اُس نے بلقیس کا ڈھنڈورا سنا تو دونوں کو کمرے سے نکال دیا۔ دونوں روتی ہوئی بچھونوں میں جا پڑیں۔ اُدھر سے بلقیس اور ساتھ ساتھ شمن نے بھی چھیڑنا شروع کیا۔ خوب گیت جوڑ جوڑ کر ٹہل ٹہل کر گائے۔ نوری اور جلبیس قسمیں کھا کر کہتی تھیں کہ "شاہجہاں آپا نے ہمیں نکالا تھوڑی، یہ کہا: مہربانی سے چلی جائیے" مگر بلقیس کہتی تھی کہ شاہجہاں نے پہلے تو دھکا دیا اُوپر سے چپلیں لگائیں۔ بیچاریوں کے دل ٹوٹ گئے اور اس دن سے شاہجہاں کی جانی دشمن ہو گئیں۔ جلبیس ویسے ہی دل جلی تھی، بچاری کا ناطقہ بند کر دیا۔ اس تلخ تجربے کے بعد دونوں نے چخ کی مزید کوشش نہ کی اور زیادہ تر وقت بدذاتی کرنے، کچے آم توڑنے اور مرنے والیوں کو دِق کرنے میں صرف کرتیں۔

بلقیس کی پانچ بہنیں تھیں۔ اُن میں سے سب سے بڑی پرنسپل تھیں۔ بڑی حسین، نازک اور شرمیلی سی۔ کسی طرح پرنسپل نہ لگتیں۔ ساری کی ساری لڑکیاں اُن پر لٹو ہو گئی ہوتیں، شمن خود لٹو ہو جاتی اگر اُس نے بلقیس سے ان کا کچا چٹھا نہ معلوم کر لیا ہوتا۔ جناب بہت ڈرپوک تھیں۔ بدمنٹن کھیلتے میں ہار جاتیں تو لڑنے لگتیں اور کم از کم گیارہ آدمیوں سے بیک وقت عشق لڑا رہی تھیں جن میں سے دو تو پروفیسر تھے اور باقی "کوڑیالے"!

پرنسپل کی بہن ہونے کی وجہ سے بلقیس بورڈنگ میں اُلٹے سیدھے حکم چلایا کرتی تھی۔ کھانے کے کمرے سے سوائے بیمار لڑکیوں کے اور کسی کو کھانا کمرے میں منگوانے کی اجازت نہ تھی اور اگر ایک گلاس بھی اِدھر سے اُدھر ہو جاتا تو آفت آجاتی مگر بلقیس کے کمرے میں جھوٹی رکابیوں کے ڈھیر سڑا کرتے۔ مہیترن دیکھتی اور خون کا سا گھونٹ

پی کر رہ جاتی کیونکہ اس سے پہلی میٹرن صرف اس لیے نکال دی گئی تھی۔ کہ وہ آئے دن لڑکیوں کی رپورٹ دفتر میں لے جاتی تھی اور لڑکیوں میں بلقیس جلیس اور ان کی چند لاڈلیاں تھیں۔ اور لڑکیاں بھی بلقیس جلیس کی خوشامدوں میں لگی رہتیں، خصوصاً وہ بدنصیب بچیاں جنہیں بورڈنگ سے کھانا مفت ملتا تھا یا فیس معاف تھی وہ اپنی دانست میں پرنسپل صاحبہ کی خیرات پر پلتی تھیں۔

بلقیس کوڑیالوں سے نت نئے قصے آکر سناتی۔ وہ اور جلیس کافی چھوٹی تھیں۔ جبھی سے اُن کے کوڑیالوں کی تعداد اطمینان بخش تھی۔ پانچوں بہنوں کے سارے عاشق اگر جمع کیے جاتے تو خاصی پلٹن بن جاتی۔ آہستہ آہستہ بورڈنگ میں کوڑیالوں کا ذکر عام ہونے لگا۔ ڈے اسکالر لڑکیوں کے بھائی بند چٹکلوں اور رقعوں کے ذریعے بورڈنگ کی نیم مردہ زندگی میں رس رچانے آنے لگے۔ چھوٹی موٹی خرید و فروخت، پرانی کتابوں کی ردّ و بدل، لاسٹکی کے سلسلے سے زندگیاں آگے چلنے لگیں۔ فلم دُھلوانے یا پرنٹ بنوانے کے بہانے عشق لڑنے لگے۔ بالکل جیسے ہزار سال پہلے کی دنیا میں لوگ تصویروں پر عاشق ہو جاتے تھے اسی طرح یہ نادیدہ عشق بھی چلتے، لڑکھڑا جاتے اور گر پڑتے۔

اور یہ کوڑیالے تھے بھی غضب کے۔ اور کچھ نہیں تو لڑکیوں کے نام عید کارڈ ہی چلے آ رہے ہیں۔ بگڑ رہی ہیں، کوس رہی ہیں لیکن سارے بورڈنگ میں گھمائے جا رہے ہیں۔ ہر ایک کو فخریہ دکھائے جا رہے ہیں، ایسے، گویا کچھ پروا ہی نہیں۔ دیکھ دیکھ کر لڑکیاں اُوئی اور ہائے توبہ چلا رہی ہیں۔ ایک عورت اور مرد ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں، نیچے ٹیڑھے میڑھے شعر لکھے ہیں۔

آہستہ آہستہ یہ مرض اور پھیلا۔ ہر لڑکی نے اپنے چچیرے، ممیرے، خلیرے بھائی کا رومان جوڑ جاڑ کر سنانا شروع کیا۔ بلقیس کے عاشقوں کی تعداد کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ اس کے بھائی کے جتنے دوست تھے وہ سب تو رجسٹرڈ عاشق تھے، اور بھی جسے پینگ بڑھاتے ہوتے وہ بھائی رشید سے دوستی کر لیتا اور اس بہانے مزے سے ایلبم میں نام ڈال کر روز آن موجود ہوتا۔ جتنے بھی کالج میں روشن خیال انقلابی لڑکے تھے

وہاں مختلف سماجی اور سیاسی مشکلات پر بحث کرنے اور آئندہ پود کو روشن خیال بنانے کی تجویزیں سوچنے آجایا کرتے۔ سب بہنیں نہایت روشن خیال عموماً باہر شب خوابی ہی میں اُن سب سے ملتی جلتیں۔ تاش کیرم کا زور بندھتا، نغمہ سرائیاں ہوتیں، باغیانہ بحثیں ہوتیں، کونوں کھدروں میں نہیں سب کے سامنے عشق چلتے۔ پرنسپل صاحبہ کا بنگلہ روشنی سے معمور رہتا جس میں پانچوں بہنیں ستاروں کے جھرمٹ کی طرح جگمگایا کرتیں۔

رات کو گھنٹوں بلقیس ان کے قصے بتاتی، بارہ بج جاتے مگر ختم نہ ہو پاتے۔ ایک دو ہوں تو کوئی گنے، یہ ان عاشقوں کی فوج سے کون نمٹتا جائے گا۔ بابر مرزا تھے تو آپا ہی کے عاشق مگر گدگدیاں بلقیس کے بھی کیا کرتے۔ حیدر صاحب تو آپا کی عمر دن کے تھے مگر اُس پر دیوانے تھے۔ دو تین قلم اُن سے چھین چکی تھی جس میں سے ایک اُس نے شمن کو دے دیا تھا۔ وہ تو اُن کی انگوٹھی بھی چھین لیتی مگر انہوں نے ہنس کر کہا تھا کہ وہ دہلی سے ننھی منی انگوٹھی منگوا رہے ہیں۔

"یہ انگوٹھی تو تمہاری کمر میں آجائے گی۔" انہوں نے اس کو دونوں ٹانگوں میں بھینچ کر اُس کی کمر کو اپنی انگلیوں کے چھلے میں لینے کی کوشش کی جس سے اُس کے بڑی گدگدی ہوئی تھی۔ شمن یہ قصے سنتے سنتے شل پڑ جاتی۔

"تو کیا تم اُن سے شادی کر لوگی۔"

"ہمیں کیا پتہ، دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"اگر تم حیدر صاحب سے شادی کر لوگی تو بچارے عباس کا کیا ہوگا، انصار تو اللہ قسم مر جائے گا اور عشرت۔ یہ ڈیڑھ بالشت کا عشرت بھی تم سے محبت کرتا ہے، چہ توبہ!" شمن کو اُن سب پر ترس آنے لگا۔ "ہائے بچارے عاشق!" "اچھی تو میں کیا کروں؟ آخر یہ سب جلیں پر.... اُس کا بیچاری کا ایک کالیا ہے اور ایک بچارا ادّھا نفیس۔ چہ لعنت میں تو تھک گئی۔" وہ عاجز ہو کر کہتی اور سچی بات تھی ان انقلابیوں میں زیادہ تر غریب جسمانی طور پر بھیڑیے چیچک مارے اور ریوڑھ سیاہ

ہی تھے جو اپنی روح کو تسلّی دینے کی خاطر حسُن کی جلا چاہتے تھے اور پروانوں کی طرح شمعوں کے متلاشی تھے۔ جلیس سب سے چھوٹی تھی پھر بھی آثار کہتے تھے کہ اپنے زمانے کی نادر شاہ نکلے گی۔ ٹوٹے پھوٹے رنگروٹ ابھی سے قطاریں باندھ رہے تھے۔ کاش بلقیس اپنے عاشقوں میں سے ردّی ردّی چھانٹ کر بورڈنگ کی لڑکیوں کو دے دیتی۔ جو بیچاریاں خیالی پلاؤ سونگھا کرتی تھیں۔

"تم بھی اپنی باتیں بتاؤ۔" بلقیس کہتی۔

"واہ۔ ہماری کوئی بھی بات نہیں۔"

"چہ کیسی ہو تم، تمھیں کوئی نہیں چاہتا؟"

شمن کا دل بجھ جاتا، شرم اور احساسِ کمتری سے اس کے گال تمتما جاتے۔ لہٰذا ایک دن اُس نے سوچ بچار کے بعد نام لے ہی دیا حالانکہ اُسے اپنے سارے سگے، سوتیلے اور رشتے کے بھائیوں سے نفرت تھی۔ اور وہ بھی تو ہمیشہ اُسے دق ہی کیا کرتے تھے۔ اُن میں سے کسی نے بھی تو ویسی بھائیوں جیسی حرکت نہ کی تھی جس کا دوسری لڑکیاں مزے لے لے کر ذکر کرتی تھیں۔ مجبوراً ہی اُس نے اسحاق بھائی کا نام لے دیا تھا۔ لیکن اُسے خوب معلوم تھا کہ اگر اُن کو یا ان کی بیوی کے کان میں اس بات کی بھنک بھی پہنچ جاتی کہ شمن اُن کے عشق کے قصّے گھڑ کر سناتی ہے تو آفت آجاتی۔ وہ اماں سے جوتے لگوائے جاتے کہ سارا نشہ ہرن ہو جاتا۔ اسے ویسے سوائے اسحاق بھائی کے اور سب ناپسند تھے۔ اُن کی بڑی لڑکی سے اس کی دوستی بھی رہ چکی تھی۔

"تو وہ تمھیں پیار کرتے ہیں؟"

پیار سے شمن کو نفرت تھی۔ دوسرے اسحاق بھائی سے پیار کرنے والے خیال سے اس کا دم لوٹنے لگتا تھا۔ لسّی پی کر جب وہ دودھ کا جھاگ مونچھوں میں سے چوس لیتے تو اُسے اُبکائی آجاتی تھی۔

"واہ، پیار نہیں کرتے تو تمھیں کیا چاہتے ہیں؟" بلقیس کو اس پر رحم آنے لگا تو شمن نے جی کڑا کر کے سوچا کہ اگر اتنی دور سے وہ اسحاق بھائی سے پیار کروا لے

تو اس کا جی کیسے مٹلا سکتا ہے لہٰذا اُس نے شرماتے ہوئے اقبال کر ہی لیا کہ اُنھوں نے پیار کیا تھا۔ اسحاق بھائی سے ایک قلم چھیننے کا ذکر بھی اُن سے خوب مزے لے لے کر بیان کیا حالانکہ وہ خوب جانتی تھی کہ اسحاق بھائی کے پاس صرف مڑے ہوئے نب اور کٹر چبے ہوئے ہولڈر رہتے تھے جو کوئی بیوقوف بھی چھیننے کا ارمان نہ کرے گا، پر بلقیس کو کیا خبر؟

بلقیس کی اور شمن کی دوستی ایسی بڑھی کہ دن رات ساتھ رہتیں، ساتھ اُٹھتی بیٹھتیں اور ساتھ ہی پڑھتیں۔ بلقیس اُسے بہت پسند تھی، سعادت سے بھی زیادہ۔ پتہ نہیں نجمہ سے کم یا زیادہ؛ نجمہ اور چیز تھی، دہکتی ہوئی شراب اور بلقیس صاف نتھرا ہوا میٹھا پانی، گو وہ بڑی بے شرم تھی اور بغیر کسی جھجک کے کپڑے اُتار دیتی تھی۔ نہانے جانے سے پہلے وہ کپڑے اُتار کر جوؤں اور مچھروں کے کاٹے کے نشان اپنے جسم پر ڈھونڈا کرتی تھی۔ اگر کوئی آجاتا تو وہ خود جھینپ کر لوٹ جاتا، بلقیس کو ذرا بھی احساس نہ ہوتا۔

"واہ بھلا لڑکیوں سے کیا شرم؟" وہ ڈھٹائی سے کہتی۔ ایک دفعہ میٹرن نے ڈانٹا تو بلقیس نے اس سے کہہ دیا کہ "چونکہ تمھارا جسم چھلپڑے جیسا ہے اس لیے مجھ سے جلتی ہو۔" اس پر میٹرن روئی بیٹھی اور بلقیس کو بھی ڈانٹ پڑی مگر وہ کہیں سننے والی تھی۔ اس کا جسم بڑا خوبصورت اور سڈول تھا جسے دیکھ دیکھ کر وہ آئینے میں آپ ہی آپ مسکرایا کرتی۔ کبھی اُس کے ہونٹ جھوٹ موٹ روٹھنے کے انداز میں آپ ہی آپ اُبھر آتے اور کبھی خود بخود جھینپ کر وہ آئینے کے پاس سے بھاگ آتی۔ نہانے کا ارادہ کر کے وہ کپڑے کبھی نہ نکالتی بلکہ نہا کر یونہی لحاف میں دبک جاتی۔ جب خوب گرم ہو جاتی اور سارے جسم کے روئیں سونے کے تاروں کی طرح چمک اُٹھتے تو وہ کپڑے نکالتی۔ لیکن وہ گھنٹوں فیصلہ نہ کر پاتی کہ اُودی شلوار پر کیا سی دوپٹہ اوڑھے یا کاسنی؛ وہ اس بارے میں شمن کی رائے لیتی۔ شمن بھاری گردن موڑ کے بتا دیتی۔ اسے کچھ ڈر سا لگتا تھا بلقیس سے کیونکہ کئی دفعہ

باتیں کرتے میں اس کا دل بے اختیار اُس کی گردن پر اُنگلیاں پھیرنے کو چاہنے لگتا۔ وہ نرم نرم سڈول سی گردن جسے وہ بڑے پیارے انداز سے ایک طرف موڑے رہتی۔

بھائی رشید کو پہلے تو بلقیس کا ایک عاشق ہی سمجھی تھی کیونکہ اُن کی تصویر جو اُس نے کوڑیالوں کی تشریح کے سلسلے میں دکھائی تھی میز پر اب بھی رکھی تھی، جب بلقیس نے بتایا کہ وہ اس کے سگے بھائی ہیں تب وہ سمجھی۔ یہ بھی اسی خاندانی خوبی کے حامل تھے۔ جس کالج یا یونیورسٹی میں پڑھا تین چار زخمی چڑیاں تڑپتی چھوڑیں۔ کالج کی بہت سی لڑکیاں ان کی دیوانی تھیں۔ کئی امیر لڑکیاں تو ان سے ٹیوشن بھی لیتی تھیں۔ وہ خود تو چاہے فیل ہو جاتے ہوں مگر جن لڑکیوں نے ان سے دو چار سبق لیے وہ شرطیہ کامیاب ہو گئیں۔

"خدا قسم تم فوراً مر جاؤ گی رشید پر۔" بلقیس شمن سے کہا کرتی۔ مگر شمن کو بورڈنگ سے باہر قدم رکھنے کی تو اجازت نہیں تو پھر بھلا مرنے کا موقع کیسے ملتا۔

مگر قسمت نے ایک عجیب طریقے سے اُسے رشید سے ملایا۔ سالانہ پکنک کے موقعہ پر پرنسپل صاحبہ اپنے بھائی اور چند نوجوانوں کو بھی ساتھ لے گئیں۔ وہ سب دوسری موٹر میں گئے اور پیڑوں کی آڑ میں نہاتے دھوتے رہے۔ وہ تو لڑکوں کو اس خیال سے لے گئی تھیں کہ کوئی لڑکی ڈوب ڈاب جائے تو وہ لوگ نکال لیں۔ وہ سب دُور ہی دور تھے لہذا پردہ ساتھا پر لڑکوں کے دل اُدھر ہی لگے ہوئے تھے۔ بھول بھول کر اُدھر جا نکلتیں، چیخ چیخ کر ہنس رہی تھیں اور ایک دوسرے کو دھکے دے رہی تھیں۔

"شمن رشید سے ملو گی؟ وہ ادھر ہے پیڑ کے پیچھے۔" بلقیس نے الگ لے جا کر کہا

"واہ بھئی میرا پردہ ہے۔" شمن گھبرا گئی۔

"اُونہہ تم چلو تو میں اُس کی آنکھیں بند کر لوں گی۔"

بڑی مشکل سے یہ طے ہوا کہ بلقیس اپنے دوپٹے سے اُس کی آنکھیں بند کر دے گی۔ پھر شمن جھجکتی ہوئی گئی۔ رشید کا قد لمبا سا تھا اور جسم چھریرا، آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی جس سے ناک بھی چھپ گئی تھی صرف ہونٹ کھلے تھے اور آہستہ آہستہ پھڑک رہے تھے جیسے اُسے سخت ہنسی آ رہی ہو۔ گھنے بالوں کا ایک جنگل سر پر کھڑا تھا۔ مچل مچل کر دوپٹے کے پیچوں میں سے بال نکل رہے تھے۔ گریبان کا ایک بٹن کھلا تھا جس میں سے اس کی بھدی گردن کی نسیں ہنسی روکنے کی وجہ سے پھڑکتی نظر آ رہی تھیں۔

”ہی ہی ہی“ وہ ایک دم سے ہنس پڑا، شمن اور بلقیس بھی ہنسنے لگیں، رشید ٹٹولنے لگا۔

”ارے بھائی کہاں ہیں یہ تمہاری دوست شم شم۔ اِن سے کہو ہم سے ہاتھ تو ملائیں۔“ بلقیس نے اُسے بہت گھسیٹا مگر وہ نہ مانی۔

”دیکھو بھئی پھر ہم زبردستی پکڑ لیں گے ہاں۔ پھر برا نہ مانے کوئی۔ ہم آنکھیں کھولتے ہیں۔“ رشید نے دھمکی دی۔

مجبوراً شمن نے اپنا ڈرا ہوا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں رینگا دیا، پھر فوراً چھڑانے لگی کیونکہ رشید نے تو مضبوط پکڑ لیا تھا۔

”ارے یہ تمہاری شم شم کا ہاتھ ہے؟ نہیں جی یہ تو چوہیا کا پنجہ ہے۔“ شمن نے ہنسی روکنے کے لئے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا۔

”تو کیا ایک ہی ہاتھ ہے بس؟ اور باقی کا جسم؟ ارے بلی ان کے پیر بھی ہیں یا نہیں۔“

”ہیں!“ بلقیس ہنسی دبا کر بولی۔

”کتنے؟“

”دو... کھی کھی...“

”اچھا؟ اور۔ اور بلی اُن کے کان؟ کان ہیں؟“

”ہاں ہاں بھئی۔“

”اور ناک؟“ شمن ہاتھ چھڑانے کے لیے دوہری ہو ہو گئی مگر بیکار۔

"بھئی ایسی باتیں کروگے تو ہم بولیں گے بھی نہیں" بلقیس نے کہا۔

"اچھا جانے دو۔ یہ بتاؤ ناک کہاں ہے ان کی۔ ناک!" رشید نے پھر ٹٹولنا شروع کیا۔ اندھوں کی طرح اُس کی انگلیاں ٹھٹکتی ہوئی شمن کے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔ بھوئیں، پلکیں، نتھنے، ہونٹ۔ یہاں تھوڑی دیر کو ٹھٹک گئیں پھر گالوں پر سے ہوتی ہوئی بالوں پر۔

"ارے بلّو؟ ان کے چٹیا تو ہے ہی نہیں۔ کیسی ہے یہ چٹیا؟" وہ اُس کا کان ٹٹولنے لگا۔ ہنسی کے مارے دونوں کا بُرا حال ہو گیا اور شمن جھٹکا مار کر بھاگی۔

"ارے بے ایمانی۔ بے ایمانی۔ ارے پکڑ لیو بی۔" رشید نے دوپٹہ نوچ کر شمن کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ بھاگ نکلی۔

لیکن اب اُس کی جھجک ٹوٹ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بہانہ کر کے پھر بلقیس اور وہ رشید کے ساتھ کھیتوں میں خربوزے چرانے گئیں۔ وہاں اُس نے دونوں کو کیچڑ میں گھٹنوں تک پھنسا دیا۔ وہاں سے نکل کر جامنوں کی تاک میں لگ گئے۔ دونوں نے اپنے دوپٹے بچھا دیئے اور بھاگ بھاگ کر کچّی پکّی جامنیں بیننے لگیں۔ رشید کو لڑکیوں کے دوپٹوں کا استعمال بہت اچھا آتا تھا۔ وہ بجائے انھیں لڑکی کے کندھوں کے اپنے سر پر باندھنا زیادہ پسند کرتا تھا، اور پھر دوپٹوں کی گیندیں کیا عمدہ بنتی تھیں! وہ زور کی چوٹ لگتی تھی کہ بس!

جب پکنک سے لوٹ کر آئی تو شمن کو معلوم ہوا وہ بادلوں میں جھول کر آئی ہے۔ پلنگ پر لیٹ کر سونے سے پہلے اُس نے پوری پکنک کو شروع سے لفظ بہ لفظ دہرایا۔ بلقیس کے دوپٹے میں سے رشید کے مچلتے ہوئے بالوں کے گچھے، وہ اُس کے بھنچے ہونٹ اور گردن کی کپکپاتی ہوئی نسیں اور پھر ایسا معلوم ہوا رشید کا ہاتھ رینگ رہا ہے اُس کے ماتھے پر، بالوں پر، نتھنوں پر۔ ہونٹوں پر آکر رک گیا۔ جلدی سے اُس نے گردن دیوار کی طرف موڑ لی اور سو گئی۔

صبح ہی بلقیس نے بتایا کہ رشید اُس پر بے طرح عاشق ہو گیا ہے۔

"ہٹو! تمہیں کیسے معلوم؟" شمن کا دل دھڑکنے لگا۔

"میں پہچان لیتی ہوں۔ جیسے ہی تمہارا نام لو لال سُرخ ہو جاتا ہے اور کیا۔"

"شمن خود رشید کے نام سے لال سُرخ ہو گئی لہٰذا گھل گھل کر دونوں رشید کی باتیں کرتی رہیں۔ مگر کسی بہانے سے بھی وہ رشید سے نہ مل سکتی۔ نہ ہی اُس کا دل ایسا بیقرار تھا۔ ابھی بچاری خوراک مل چکی تھی، ابھی وہی ہضم نہیں ہوئی تھی۔ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے پکنک کی بہاریں آنکھوں میں سمائی رہتیں۔

لیکن خدا شکر خورے کو شکر دے ہی دیتا ہے۔ بلقیس کی سالگرہ نے دنیا ہی بدل دی۔ اس کی جماعت کی ساری لڑکیاں اور کئی سہیلیاں جن میں شمن بھی شامل تھی مدعو کی گئیں۔ شمن کے پاس کوئی تحفہ بھی نہ تھا صرف ایک سر پر باندھنے کا ریشمی رومال تھا وہی اس نے کاغذ میں لپیٹ کر چپکے سے بلقیس کو دے دیا مگر بلقیس مارے شرارت کے سارے ہال میں اُسے نچاتی پھری۔ شمن نے دروازے کی آڑ میں سے دیکھا کہ وہ اُسے اپنے سر پر باندھ رہی تھی کہ رشید نے آکر چھین لیا اور دوپٹے کی طرح اوڑھ کر منہ چڑانے لگا۔

"آں، شمن دیکھو یہ رشید نہیں مانتے بھئی ہمارا رومال؟" مگر رشید رومال لے کر باہر بھاگ گیا۔ "دیکھو بھئی منع کرلو رشید کو، ہمارا رومال چھین لیا۔" اُس نے شمن سے شکایت کی۔ پھر وہ کھڑکی میں سے رومال کا حشر دیکھنے لگیں۔ رشید اسے گلے میں ڈالے ہاکی کھیل رہا تھا۔

شام کو سب لڑکیاں وغیرہ تو چلی گئیں مگر شمن کو پرنسپل صاحبہ کی خوشامد کر کے بلقیس نے روک لیا۔ وہ دونوں اور جلبیس مل کر کیرم کھیل رہی تھیں کہ رشید دندناتے چلا آیا۔

"رشید۔ رشید ارے پردہ ہے پردہ!" بلقیس اور جلبیس چلائیں اور شمن کو دوپٹوں میں چھپانے لگیں۔

"کس کا پردہ ہے؟ لڑکیاں تو گئیں!"

"نہیں بھئی شمن نہیں گئی - ارے بھئی رشید - آپا بی رشید نہیں مانتے "
"دیکھو جی اگر آپا بی سے شکایت کی تو ہاں بس " رشید نے دھمکی دی " پردہ ہو یا نہ ہو
ہم کیرم ضرور کھیلیں گے " وہ گھس ہی آیا -
تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد یہ طے ہؤا کہ رشید اپنا منہ ڈھانک کر کھیلے -
بلقیس اور شمن ایک طرف اور جلیس اور رشید دوسری طرف -
" بھئی کچھ بد کر کھیلو، ویسے مزہ نہیں آنے گا "
" اکنی اکنی " جلیس بولی -
" نہیں بھئی رشید لوٹ کر رکھ دے گا ہمیں، دو دو پیسے " بلقیس چلائی -
" اچھا بھئی میں ہاروں تو اکنی دوں گا اور تم ہارو گی تو چٹکی "
" نہیں، نہیں جناب چٹکی کی نہیں ہے - ایسی زور سے مارے گا کہ کیا بتاؤں "
بلقیس نے دہشت زدہ ہو کر کہا -
بڑی مشکل سے یہ طے ہؤا کہ رشید کی اکنی اور ان دونوں کی چٹکی، مگر ہلکے کی بلدرد
سے مارنے کی نہیں - پردے کی وجہ سے رشید وہی ریشمی رومال کا گھونگٹ کاڑھ کر بیٹھ
گیا اور کھیل شروع ہؤا!
چھڑانے کے لیے اُسے سب دلہن دلہن کہہ رہے تھے، رومال باریک تھا اور اُس
میں سے اُس کی آنکھیں صاف چمک رہی تھیں -
" بلقیس یہ تو سب دیکھ رہے ہیں! " شمن نے چپکے سے شکایت کی -
" خبردار رشید جو تم نے شرارت کی، خدا قسم مار ڈالوں گی " بلقیس نے ڈانٹا -
کھیل پورے شباب پر آ گیا تو پردہ وردہ سب غائب - رشید نے بے ایمانی کی ابتدا بلقیس
نے ہر بار اُس کا ہاتھ ہلا دیا اس لیے وہ ہار گیا - دوسرے کھیل میں رشید نے ذرا سنجیدگی
سے کھیلنا شروع کیا اور بلقیس اور شمن کا دم نکلا - وہ چیخ کر اُس کا ہاتھ ہلا دیتیں تاکہ
وہ گرد بڑھا جائے مگر قسمت میں ہار بدی تھی - کھیل جیت کر رشید نے بڑی احتیاط
سے رومال کا گھونگٹ کاڑھ لیا اور آستینیں چڑھا لیں -

"چلیے دلوائیے چنٹی!" اُس نے شمن کا ہاتھ پکڑ لیا اور دو انگلیاں جوڑ کر ہتھیار تیار کیا۔

"بھئی زور زور سے مارنے کی نہیں ہے" بلقیس اس کے اوپر چڑھ بیٹھی۔

"خوب، میری انگلی نکل گئی تو کچھ نہیں اور اپنی باری پہ چلیں رونے۔ خدا قسم آج ہڈی نہ توڑ دوں تو بات نہیں" اُس نے پھر انگلیاں تولیں۔ جیسے ہی اُس نے مارنے کا ارادہ کیا شمن نے ہائے کر کے ہاتھ چھڑا لیا۔

"دیکھا تم نے؟ تمہاری دوست حد سے زیادہ مکار ہیں، یعنی ہیں سے مارا نہیں اور ہائے!"۔ "اِن سے کہو سیدھی بیٹھیں، جگہ بے جگہ لگ جائے تو ہم ذمہ دار نہیں"

بڑی دیر تک وہ چنٹی مارے بغیر ڈراتا رہا۔ مار چکتا تو چھٹی ہوتی اور بھئی ایک ہی تو بیچاری چنٹی ہے، مزے لے لے کر ماریں گے ہم تو" اتنے میں پرنسپل صاحبہ کے نوکر نے آکر حکم دیا کہ بورڈنگ کی سب لڑکیاں جائیں۔ سب کون؟ رہ کون گیا تھا سوائے شمن کے۔

"اچھا تو یہ چنٹی ادھار رہی" رشید نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"اچھے رشید ہمیں بورڈنگ تک پہنچا آؤ" بلقیس گڑگڑائی

"بہشت، ہم سونے جا رہے ہیں" رشید اترایا۔

"اچھے ہمارا بھیا کیسا" بلقیس اس کی گردن میں جھول گئی۔

پانچ منٹ کا راستہ ہنس ہنس کر آدھ گھنٹے میں طے کیا۔ دیر تک پھاٹک پر کھڑے ہو کر بحث ہوتی رہی۔ رشید کہتا تھا شمن کو ہاتھ ملا کر مہذب لوگوں کی طرح خدا حافظ کہنا چاہیے اور شمن کمبیانی کھڑی پھاٹک کی وارنش ناخونوں سے کھرچ رہی تھی۔ جب بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی تو جل کر بلقیس نے شمن کو اُس پر دھکا دے دیا۔ بہت سمٹی پھر بھی اُسے دونوں ہتھیلیاں اُس کے سینے پر ٹیکانی پڑیں۔ گھبرا کر رشید ادھر سے کر کے ہٹ گیا۔ اور شمن اندر بھاگ گئی

بہت دیر تک وہ بلقیس کے چٹکیاں نوچتی اور کوستی رہی۔

(۱۷)

نمائش آئی اور بلقیس کی وجہ سے شمن کو کئی دفعہ جانے کی اجازت مل گئی۔ نمائش بھی ایک عظیم الشان تہوار ہے۔ سال کے سال میدان حشر بپا ہوجاتا ہے۔ سال بھر کے سوئے ہوئے مُردے صور کی پکار پر جاگ اُٹھتے ہیں اور پندرہ دن کے لیے ارمانوں کی دنیا میں بسنت کھل اُٹھتی ہے۔ خرید و فروخت کے لیے ٹکے کس کے پاس ہوتے ہیں۔ دوسرے نمائش میں کون بیوقوف خرید و فروخت میں وقت گنوائے۔ ایک آفت برپا ہوتی ہے۔ جس دکان پر جاؤ کالی شیروانیوں اور کالے برقعوں کا جھمگٹ۔ برقعوں کی مجال نہیں جو ایک دم کے لیے ان شیروانیوں کے سائے سے دور رہ سکیں۔ شُہدے خریدو وہاں موجود، چوڑیاں چھانٹو ہاتھ گھسائے دیتے ہیں، ساڑھیوں کی دوکان پر کھڑے آوازے کس رہے ہیں، کھلونوں والے کی دکان پٹ پڑی ہے غرض جہاں دیکھو لبس کوٹہ یا لے پھنکار رہے ہیں۔ لڑکیاں ہیں کہ بدحواس ہوئی جاتی ہیں۔ اگر شکایت کرتی ہیں تو اُلٹا اپنا آنا بند۔ غرض سولی پہ جان ٹنگی ہے۔ ویسے بے کوڑیالوں کے بھی دنیا تلخ اور اُجڑی ہوئی ڈانٹ ڈپٹ کو دُور ہٹا دیا تو باقی کیا رہ گیا نمائش میں؟ یہ جگمگاتے جواہرات؟ وہ زریں ملبوسات؟ جی نہیں یہ اوروں کی دولت ہیں۔ مفلس طالب علم کو تو اپنی زندہ دلی ہی میں ہزاروں نمائشیں مل جائیں گی۔

بلقیس بہت دن سے شمن سے تصویر کے لیے کہہ رہی تھی۔ رشید اپنے دوست کو انگلینڈ بھیج کر انلارج کرانے کو کہتے تھے۔ میرٹن کی آنکھ بچا کر دونوں کھسک گئیں اور روپیہ کی آمد والی تصویریں کھچوانے لگیں۔

"جلدی سے کھینچیے" انہوں نے وہاں کھڑے ہوئے فوٹو گرافر سے کہا۔ یونیورسٹی کے لڑکوں کی طرح وہ بھی سیاہ اور سفید تھا۔

"آپ تصویر کھنچوائیں گی" وہ خندہ پیشانی سے مسکرایا۔

"اور کیا، بھئی جلدی کیجیے"

"جلدی ہی کیجیے۔ تو آئیے یہاں بیٹھیے اسٹول پر" اُس نے نیا سگرٹ سلگایا شمن

اور بلقیس کی رائے ہوئی ذرا سا پاؤڈر اور لپسٹک لگالی جائے تو اچھا رہے۔ تصویر میں کچھ تو آہی جائے گا۔

"آئینہ نہیں ہے آپ کی دوکان میں، ذرا۔۔" اُنھوں نے پوچھا۔

"آئینہ۔ ہوگا کیوں نہیں۔ ادھر آئیے" وہ اُن دونوں کو پچھلے کمرے میں آئینہ دکھانے لے گیا۔ وہ پاؤڈر لگاتی رہیں اور وہ کھڑا مسکراتا رہا۔

"عطر بھی تو لگائیے" وہ شرارت سے بولا اور جیبیں ٹٹولنے لگا۔

"عطر؟ عطر؟"

"ہاں ہاں صاحب۔ عطر کی خوشبو بھی تو آتی ہے تصویر میں۔ یہ دیکھیے میرے پاس ہے" اس نے انگلیوں میں عطر لے کے اُن کے کپڑوں میں لگانا شروع کیا اور بڑی بے تکلفی سے:

"رہنے دیجیے" شمن نے چلا کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"اچھا۔ اچھا صاحب بیٹھیے اسٹول پر۔ ذرا اچھی طرح بیٹھیے" اور وہ دونوں بیٹھ کر ادائیں لینے لگیں۔

"یوں بیٹھئے اور دوپٹے کو سنبھالیے۔ میرے خیال میں دوپٹہ تو اُتار ہی دیجیے" وہ کیمرے سے زیادہ ان کے دوپٹے وغیرہ پر توجہ دے رہا تھا۔

"ہائے اللہ کتنا بیہودہ فوٹوگرافر ہے" شمن نے بلقیس کے کان میں کہا۔

"آپ کو تصویر کھینچنا ہو تو کھینچیے، ورنہ۔۔۔" وہ ہمت کر کے ڈانٹنے لگی۔

"مگر یہ آپ کے گال پر پاؤڈر۔۔۔" اس نے شرارت سے مسکرا کر پیار سے بلقیس کا گال چھوا اور سگرٹ کا دھواں بالکل اُن کے منہ پر چھوڑنے لگا۔

دونوں ایسی گھبرائیں کہ فوٹوگرافر کو شاید رحم آگیا اور وہ ہٹ گیا

"اچھا صاحب ریڈی" دونوں ریڈی ہوگئیں۔ دو چار بار کپڑے میں سر ڈال کر پھر بولا۔ "اوہنوں۔ یہ آپ نے بال کیسے بنائے ہیں۔ لائیے میں ٹھیک کر دوں۔"

"آپ کو اس سے کیا؟ آپ تصویر کھینچ رہے ہیں یا۔ چلو شمن چلیں"

"ارے ارے، آپ تو خفا ہو گئیں۔ بیٹھیے بھئی شمن... اوہ معاف کیجیے گا۔ جی، میں تو آپ کے فائدے کے لیے ہی کہہ رہا تھا۔ بالکل خراب آئے بال تو فوٹو گرافر کو الزام دیں گی آپ کہ تصویر بگاڑ کر رکھ دی اور کیا۔" وہ کچھ ردہڑ سا گیا پھر وہ دونوں راضی ہو گئیں اور اُس نے اُن کی ٹھوڑیاں پکڑ پکڑ کر بال سنوارنا شروع کیے۔ بلقیس نے جھٹک کر اس کے سینے سے سر ہٹا لیا جیسے وہ بُری طرح کھینچ کر بال بنا رہا تھا۔ وہ شرارت سے ہنسا اور شمن کی طرف چلا کہ اتنے میں کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز آئی اور تھوڑی سی دیر میں تین چار آدمی اور آ گئے۔ شمن اور بلقیس کو ڈر لگنے لگا۔

"ہم جاتے ہیں۔ آپ تصویر کھینچتے ہیں نہ بات..."

"تو جائیے۔ خدا حافظ!" وہ ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

"ایں؟ یہ آپ؟" نو وارد بولا، "تشریف لائیے۔"

"ہم تصویر کھچانے آئے تھے... مگر... اتنی دیر لگا دی۔"

"تو تشریف لائیے اندر۔ معاف کیجیے گا ذرا میں کھانا کھانے گیا تھا۔"

"اور۔ اور... وہ۔ وہ فوٹو گرافر جو ابھی ابھی یہاں تھا؟"

"جی میں ہی ہوں فوٹو گرافر۔ تو آئیے۔" اس نے فخریہ اپنی کالی شیروانی کو دیکھ کر کہا، "آئیے تشریف لائیے۔"

"تو... وہ... کون تھا؟" بلقیس ہکلائی۔

"کون؟"

"اوہ... وہ حمید۔ ارے صاحب وہ تو کالج کے ایک صاحب ہیں، پرنٹ لینے آئے تھے۔ آئیے اندر آ جائیے۔" اُس نے بات ٹالنا چاہی۔

"ایں؟" بیوقوفوں کی طرح وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔

"آئیے پھر۔" فوٹو گرافر نے اپنے اوزاروں سے کھٹ پٹ کرنی شروع کی۔

"نہیں، اب ہم کل کھنچوائیں گے، آج دیر ہو گئی۔"

دونوں گھبرائی ہوئی جب گئیں وہاں سے۔ دل دھڑک رہے تھے۔ میٹرن ان کی

تلاش میں سرگاڑی پیر پٹختی پھر رہی تھی۔ یہ دونوں ملیں تو پڑی ڈانٹ۔

"ارے، اور ہم آپ کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔" دونوں جھوٹ بولیں۔ اس دن بلقیس کی وجہ سے وہ بچ گئیں ورنہ میٹرن ان بہانوں کو جانتی تھی۔ کتنی لڑکیاں روز اسی طرح کھو کر مل جایا کرتی تھیں۔ اور مزہ بھی بڑا آتا ہے یوں جان بوجھ کر کھو جانے میں۔ جی بھی تو نہیں چاہتا واپس ملنے کو۔ کاش کسی طرح ساری عمر کے لیے اسی طرح نمائشوں میں بھٹکتے پھریں اور میٹرنیں نہ پکڑ سکیں۔

دوسرے دن وہ تصویر کھنچوانے نہ جا سکیں مگر نمائش میں وہی کوڑیالہ حمید برابر آہیں بھرتا شعر پڑھتا ان کے پیچھے لگا رہا۔ اسے ان دونوں کے نام تو معلوم ہی ہو گئے تھے۔ شرارت میں وہ اپنے دوستوں کو شمن اور بلقیس کہتا تو وہ فوراً چمک کر جواب دیتے: "فوٹوگرافر صاحب!"

"آؤ شمن بندے سے عرض ماریں۔" ایک اتراتا اور لڑکیوں کی نقل کر کے اپنے دوست کو چھیڑتا۔

"ہاں بلقیس چلو تصویر کھنچوائیں۔" دوسرا اٹھلا کر جواب دیتا۔

شمن اور بلقیس جل جاتیں مگر انھیں ہنسی بھی آرہی تھی۔ جب تک وہ ساتھ رہتے وہ جلتی رہتیں مگر جیسے ہی وہ بچھڑ جاتے ان کی آنکھیں بے چینی سے تلاش کر کے انھیں ڈھونڈ لاتیں، اور پھر ڈھکے چھپے جملے کسے جانے لگتے۔ نمائش کے پھاٹک کے پاس شمن اور بلقیس کو ایک چھوکرے نے ایک بنڈل لا کر دیا کہ یہ وہ دکان پر بھول آئی تھیں۔

"تمہارا ہوگا بلقیس۔"

"نہیں تو! میں نے کچھ خریدا ہی نہیں۔ کھولو تو دیکھیں کیا ہے اس میں؟"

کھول کر دیکھا تو ٹافیاں، چاکلیٹ اور مٹھائیاں! مارے خوشی کے چیخ نکل گئی اور دونوں بنڈل پر ٹوٹ پڑیں۔ فوراً ان کی نگاہیں اٹھیں اور اس کوڑیالے کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ ہلکی سی سر کی جنبش سے اس نے انھیں سلام کیا

اور فوراً دونوں بگڑ گئیں۔ بلقیس نے رائے دی: "پھینک دو۔" مگر بھوک کا تقاضا ہؤا۔ یہ ہیو تو بی ہو گی۔ بورڈنگ میں جیب خرچ ہی کتنا ملتا ہے۔ دونوں وہاں سے چل دیں۔ کچھ ردوکد کے بعد دونوں نے جیبوں میں مٹھائیاں بھر لیں۔

جب نمائش ختم ہو گئی تو شمن اور بلقیس کے نام عاشقانہ خط آئے۔ بڑے جوتے پڑتے اگر بلقیس پرنسپل صاحبہ کو سب صاف صاف نہ بتا دیتی۔ ہاں تصویریں کھچوانے کا واقعہ گول کر گئیں۔ بات دب دبا گئی۔ بلقیس نے بتایا کہ غریب کوڑیالہ کتنے ہی خط بھیج چکا ہے مگر سب پرنسپل صاحبہ نے پھاڑ کر جلا دیے۔ جب بات بہت بڑھی تو اٹھا کر سارے خط انہوں نے پی۔ ڈی۔ سی کو بھیج دیے۔ اس کے بعد یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ کوڑیالے کا زہر بھی پھیکا پڑ گیا۔ رشید کو بھی اس معاملے کی خبر مل گئی اور اُس نے یہ بات اور لڑکوں میں پھیلا دی اور سارے لڑکوں نے مل کر نگوڑ مارے کوڑیالے کو ناکوں چنے چبوانے شروع کیے۔ بلقیس کی رائے تھی کہ خواہ مخواہ بچارے کو پریشان نہ کیا جائے، آخر اُس نے ایسا کیا جرم کیا تھا! اُلٹا اسی کا تو ہر طرح کا نقصان ہؤا تھا!

سالانہ جلسے کا ڈرامہ ہؤا تھا تو اُس کی تصویریں کھینچنے کے لیے رشید ہی کو بلا لیا گیا۔ ویسے ڈرامے کی ساری لڑکیاں اُس کے سامنے آتی تھیں۔ باہر کا کوئی آدمی بلایا جاتا تو بیکار غل مچتا، جہلا کو اعتراض ہوتا۔

شمن لڑکا بنی تھی، اور مونچھیں لگا کر تو شرم کے مارے اس کا دم نکلنے لگا بلقیس اُس کی محبوبہ رودزا النڈ بنی تھی۔

"ارے بی یہ چھوکرا کون ہے؟" رشید نے حیرت سے پوچھا اور شمن اپنی تلوار پھینک کر جھاڑیوں میں چھپ گئی اور تصویر کھچوانے سے قطعی انکار کر دیا، مگر تصویر کھچوانا ضروری تھی اور اُسے محبوبہ روزا لنڈ کا ہاتھ چومنا تھا اور یہاں تو اُسے کھڑا ہونا ہی وبال معلوم ہو رہا تھا، ٹانگیں لرزی جاتی تھیں اور ہاتھ ٹھنڈے تھے۔

"ارے چھوکرے ذرا پرے سے ہٹ کر کھڑا ہو" رشید نے کہا اور شمن پہ چڑھ

کر منمنانے لگی۔ بلقیس نے رشید کو ڈانٹا۔

"واہ، شمن تو ڈیوک کا بیٹا ہے، چھوکرا چھوکرا کیے جاتے ہو؟"

"اچھا تو ڈیوک کے بیٹے کمبخت کی منجھن کی مونچھیں بھئیں! خوب!"

"ہشت جھوٹے، منجھن ہتوڑی کا جل ہے"۔ بلقیس نے پیار سے شمن کی مونچھ کو دیکھا۔

"ہائے بالکل تو اصلی لگ رہی ہیں"

اگر پرنسپل صاحبہ آ کر نہ ڈانٹتیں تو مذاق کبھی ختم نہ ہوتا اور نہ تصویریں کھینچتیں۔

"آپا بی اب کے ڈراما ہو تو ہمیں لڑکی بنا دیجئے گا"۔ رشید نے پرنسپل صاحبہ سے کہا "بھئی جب کالوچ لگا کر لڑکیاں مرد بن سکتی ہیں تو پھر میں کیوں نہیں لڑکی بن سکتا، بھئی واہ!"

جب سب جانے لگے تو رشید نے چپکے سے شمن سے کہا: "ارے دیکھیو جی میاں لڑکے، ہماری چنٹی اُدھار رہے، کہیں ہضم نہ کر جانا"۔ وہ ہنسی، روکتی جھلاتی بھاگ آئی۔

(۱۸)

شمن اور رشید کا رومان پینگیں بڑھاتا رہا۔ روزانہ بلقیس اُس کا ایک پرچہ شمن کو لا کر دیتی۔ اُس پرچے میں کچھ بھی نہ ہوتا سوائے اُس پرانی چنٹی کے ارمان بھرے ذکر کے۔ اسے رشید شم شم یا میاں لڑکے لکھتا۔ سوائے رشید کے شمن کو کچھ بھی تو یاد نہ رہا ششماہی امتحان میں وہ بُری طرح فیل ہوئی اور گھنٹوں شرم سے روتی رہی۔ رعایتی درجہ مل گیا حساب میں وہ ہمیشہ سے کمزور تھی، پرنسپل صاحبہ نے اسے ٹیوشن دلوادی۔ کچھ سن کر رشید ہی اسے ٹیوشن دینے پر مقرر کیا گیا۔ اور کوئی شریف و معقول آدمی ملتا ہی کہاں تھا!

یہ طالب علم اور معلم کا رشتہ بھی کس قدر رومان انگیز ہوتا ہے، بات بے بات عشق اُبل پڑتا ہے۔ پڑھائی تو خاک بھی نہ ہوتی، شمن اور رشید گھنٹوں آسانی سے باتیں کیا کرتے۔ جب بہت دیر ہو جاتی تو دوسرے دن کی امید دل میں لے کر جدا ہو جاتے

پڑھنے کے لیے شمن کو پرنسپل صاحبہ کے بنگلہ ہی پر جانا پڑتا۔ شام ہی سے بنگلہ اندرسبھا کا اکھاڑہ بننا شروع ہو جاتا۔ دوستوں کے جھمگٹ شروع ہو جاتے۔ خاصا بے تکلف جماؤ جمتا جس میں بے تکلف زندگی پر مباحثے ہوتے، انسانی حقوق پر لکچر دیئے جاتے۔ پانچ چاند کے ٹکڑوں کے گرد ستاروں کے پرے سجتے، مہذب اور لطیف معاشقے چلتے اور بنگلہ قہقہوں سے گونج اُٹھتا۔

ایک دن وہ اور بلقیس برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی رشید کی تازہ شرارتوں پر بات چیت کر رہی تھیں کہ پھاٹک کھُلا اور کسی نئی لڑکی کا سامان آنا شروع ہوا۔ سامان بہت سا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ کئی بہنیں آئی تھیں، مگر سامان کے ساتھ نہ کوئی نہ کوئی۔ اس دن چونکہ میچ تھا اور رشید گئے ہوئے تھے لہذا شمن بنگلہ پر ہیں گئی تھی۔

دوسرے دن پرنسپل صاحبہ دو لڑکیوں کو لیے ہوئے اپنے دفتر میں چلی گئیں۔ لڑکیاں خوبصورت ہی نہیں امیر بھی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک تو ان میں سے چھ سات سال کی تھی اور دوسری پندرہ سولہ کی۔ ان کے ریشمی ملبوسات اور فیشن سے متاثر ہو کر لڑکیاں کلاسوں میں سے نکل نکل کر جھانکنے لگیں۔

کھانے پر پرنسپل صاحبہ نے بلقیس اور جلیس کو بلا کر اُن دونوں لڑکیوں کو ان کے سپرد کر دیا اور چاروں نہایت مہذب بنی بنگلے سے آیا ہوا کھانا میز کے صاف ترین کونے پر بیٹھی کھاتی رہیں۔ کھانے پر آج ویسے بھی ضرورت سے زیادہ صفائی تھی۔ ٹوٹے ہوئے ٹام چینی کے ڈونگے اور بے قلعی رکابیاں اس خاص میز پر نہ تھیں بلکہ نئی پلیٹیں، جو کبھی دعوتوں پر نکال لی جاتی تھیں، لگی ہوئی تھیں۔ کھانا بھی بہت تھا۔ چونکہ جمعہ تھا اس لیے مکھن نکلے ہوئے دودھ کی پھیکی پھیکی کھیر بھی تھی۔ اتنے میں پرنسپل صاحبہ اور ایک لحیم شحیم حسین بیگم نہایت زریں لباس پہنے داخل ہوئیں اور اُن نئی لڑکیوں کے پاس جا کر باتیں کرنے لگیں۔ لڑکیوں کی کھسر پھسر سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی اماں جان تھیں۔

نو وارد لڑکیوں کی اماں نے بھی کھانا چکھا اور منتظمین کی تعریف کرتی رہیں،

"ایسا مزے دار کھانا تو گھر پر بھی نہیں ملتا۔" مرغن کھانوں کا اشتہار، چربی کی پوٹ نواب زادی بولیں۔ "لذیذ اور صحت بخش!" موٹاپے سے عاجز کباب پراٹھوں سے تھکی ہوئی بیگم کی زبان میں اتنا احساس ہی کب رہا ہوگا جو کھانے کی اچھائی برائی پرکھ سکتیں۔

کھانے کے درمیان ہی سے لڑکیاں اور بیگم پرنسپل کے ساتھ واپس جانے لگیں تو بضد بلقیس اور جلیس کو بھی ساتھ لے لیا۔

شام کو بلقیس اُن دونوں لڑکیوں کو لیے ہوئے واپس آئی۔ وہ اب تک بھڑکیلے لباس پہنے تھیں اور ساتھ ساتھ بلقیس بھی ایک خوبصورت سا دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی۔ سارے وقت اُن لڑکیوں کے ہمراہ رہی۔ بورڈنگ میں تو یہ لڑکیاں کیا آئیں عجائبات آ گئیں۔ اپنا کام چھوڑ چھاڑ ساری لڑکیاں دیکھنے ٹوٹ پڑیں۔ اتنی دیر میں ان کا کمرہ بھی سج کر تیار ہو گیا تھا۔ علاوہ خوبصورت مسہریوں کے سنگھار میز، جو نہایت ہی عجیب چیز معلوم ہوتی تھی، اور میزیں، لیمپ، قالین، غالیچے ریشمی پردے غرض معلوم ہوتا تھا کہ جنگل میں کسی نے پھولوں سے لدا ہوا گلدستہ کھڑا کر دیا۔

شمن ان کے کمرے کے سامنے سے بھی نہ گزری۔ بورڈنگ میں جب سے اس کی بلقیس سے دوستی ہوئی تھی وہ دوسری لڑکیوں سے بہت دور ہٹ گئی تھی۔ پرنسپل صاحبہ کی منظور نظر ہو کر وہ سب کی نظروں سے گر چکی تھی۔ وہ اُسے خوشامدی، مغرور اور خود غرض سمجھنے لگی تھیں۔ آج جب بلقیس نئے مہمانوں کی آؤ بھگت میں غرق تھی وہ بے سہارا اور تنہا الو کی طرح اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔ کھانے پر بلقیس لڑکیوں کے ساتھ بنگلے پر چلی گئی اور مسکراتی ہوئی طعن آمیز نظروں کے درمیان وہ خاموش اپنی جگہ بدبودار سالن اور خشک چاول نگلتی رہی۔

بلقیس کچھ چیزیں لینے کمرے میں آئی تو شمن نے منہ پھلا کر شکایت کرنا چاہی، مگر بلقیس بڑی جلدی میں تھی۔

"اچھی نواب صاحب بھی آج آئے ہوئے ہیں۔ بے حد خوبصورت کپڑے ہیں۔

نسیمہ نے مجھے زبردستی یہ دوپٹہ دے دیا۔ آپا بی کا حکم ہے کہ لڑکیوں کا دل نہ گھبرانا۔ کوئی بات بھی ہے، کہتی ہیں پرسوں نواب صاحب کو پہنچانے دہلی تک چلو" وہ جلدی جلدی، چیزیں سمیٹتی رہی۔

"اوہ کوکو تو غضب کی پیاری ہے۔ رشید پر تو فدا ہے۔ سارے دن کندھے پر چڑھی رہی" وہ ذرا جھینپی ہوئی سی جلدی سے چل دی۔

دو چار روز کی چھٹیاں آ گئیں۔ بلقیس جلیس اُن لڑکیوں کے ساتھ ان کے والدین کو خدا حافظ کہنے دہلی چلی گئیں۔ جب وہ آئیں تو بھی بلقیس سے کوئی بات نہ ہوئی۔ رشید کسی میچ میں گیا ہوا تھا اس لیے شمن پھر بنگلے سے دور ہی رہی۔ پھر وہ پڑھنے پہنچی تو اس نے کچھ فضا بدلی پائی۔ حالانکہ رشید کو وہ تیس روپیہ ابا سے ہزاروں چالیں چل کر دلواتی تھی مگر وہاں آج اس طرح برتاؤ کیا جا رہا تھا گویا وہ کوئی یتیم لڑکی ہے جس پر رحم کھا کر وہ پڑھا دیا کرتا تھا۔ رشید موجود نہ تھا۔ وہ لڑکیاں زیادہ تر بنگلے پر ہی رہتیں اور ساتھ ساتھ بلقیس بھی آہستہ آہستہ بورڈنگ سے اپنی چیزیں بین بین کر گھر لے جا رہی تھی۔

رشید آیا تو اس دن بالکل پڑھائی نہ ہوئی۔ اوّل تو نسیمہ کے ساتھ کیرم کھیلنا تھا، دوسرے کوکو برابر کندھوں پر کود رہی تھی۔ علاوہ بلقیس اور جلیس کے قریب قریب ہر ایک فرد اُن لڑکیوں پر مکھیوں کی طرح چپکا ہوا تھا۔ ان دونوں نے تو جس دن سے وہ آئی تھیں اپنے کپڑے چھوڑ کر اُن کے ہی پہننے شروع کر دیئے تھے۔ پرنسپل صاحبہ تک کو زبردستی کر کے نسیمہ نے اپنا شنان کا ستاروں ٹکا دوپٹہ اوڑھا رکھا تھا۔ نسیمہ پیچھے پڑ جاتی تھی اور اپنا زیور اور کپڑا اُنھیں پہنا کر ہی دم لیتی۔

نسیمہ کی سنگھار میز جیسے کیمسٹ کی دکان! بلقیس جلیس تو ہر وقت منہ پر الا بلا لوتا کریں۔ سارے بورڈنگ کی لڑکیاں اُن کے کمروں پر جمع اُن کی تعریفوں میں جھکا کرتیں۔ نسیمہ نے تھوڑے ہی دنوں میں میدان پر پورا قبضہ کر لیا۔ قریب قریب ہر لڑکی پاؤڈر لپسٹک، پرانے ریشمی جمپر، دوپٹے یا چپل کے احسان کے نیچے دب گئی۔ ان کے ساتھ اُن کی بچپن کی کھلائی بھی تھی جسے سارا بورڈنگ اُن کی نقل میں بے بے کہتا تھا۔ موٹی

چوڑی مردمار سی عورت خوشامدی لڑکیوں کو ہزار دھتکاریں بتاتی پر وہ اُس کے قدم چومنے کو تیار رہتیں۔

نسیمہ اور کوکو پر بورڈنگ کی کوئی پابندی عائد نہ تھی۔ نوکروں کے رہنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر ان کے کیس میں مجبوراً پرنسپل صاحبہ نے دی۔ وہ لوگ کھانا اپنے کمرے میں کھاتیں۔ کھانا تو خیر اُن کی "بے بے" خود اپنے ہاتھوں سے پکاتی تھی چینی کے برتن بھی اُن کے اپنے تھے۔ اُنھیں دو کمرے مع دو غسل خانوں اور اسباب کے کمرے کے ملے ہوئے تھے۔ اچھا خاصا گھر تھا۔ اُن کے برآمدے کی طرف سے کسی کو گزرنے کی اجازت نہ تھی۔

جلد ہی سنگھار کا مرض پھیلنے لگا۔ غریب لڑکیوں نے لال رنگ کی روشنائی اور چار آنے والا پینسیلوں پر لگانے کا پوڈر ہی ہتھیا لیا۔ جدھر دیکھو لال پیلے گال اور مصنوعی گھونگر والے بال نظر آتے۔ بجلی کے آلے نہ ملے تو سلائیں گرم کرکے ہی بال الجھا لیے، سچے ستارے اور گوٹے نہ جڑے تو پن اور چھوٹے پتر سے ہی چپکا لیے۔ ان لڑکیوں کی وجہ سے بورڈنگ میں بزاز، چوڑی والے اور پھل والے کو بھی آنے کی اجازت مل گئی۔ اور کچھ نہیں تو قرض پر ہی خرید و فروخت شروع ہو گئی۔ کمبختوں کے پاس نہ جانے کہاں سے قارون کا خزانہ آن ٹوٹا تھا کہ سارے بورڈنگ کو قرض دینے کے بعد روزانہ ٹوکریوں پھل اور بنڈلوں بسکٹ آتے اور لنگر بٹتے۔ حلوے بنتے اور پارٹیاں ہوتیں۔ آج کوکو کی سالگرہ ہے، سارے بورڈنگ کی دعوت، پرنسپل صاحبہ کے خاندان بھر کی دعوت۔ آج نسیمہ کا جی گھبرا رہا ہے، بلقیس کی سالگرہ کی دعوت وہ خود کر رہی ہے مع سارے خرچے کے، اُوپر سے بلقیس اور جلیس کو جوڑا مل رہا ہے، خیرات میں مرنے والیوں کا بھی بھلا ہو رہا ہے۔

شمن اب حساب میں اتنی کمزور نہ رہی تھی جتنی نسیمہ اُردو میں۔ اس نے ساری عمر کانوینٹ میں گزاری تھی، اب اس اسلامی اسکول کی عاقبت سدھارنے بھیجی گئی تھی۔ لہٰذا رشیدہ اسے پچھتر روپیہ پر اُردو، جغرافیہ اور حساب پڑھانے لگا

تھا۔ نسیمہ نویں جماعت میں تھی۔ گو اس کی انگریزی کئی استانیوں سے اچھی تھی اور اُردو میں دوسری جماعت کی بھی قابلیت نہ تھی، انگریزی کے گھنٹے میں وہ شمن کی کلاس میں بھی آجاتی۔ سوال سننے سے پہلے وہ جواب دے دیتی اور استانیاں کہ استانیوں کی باچھیں کھل جاتیں، نیز دوسری لڑکیوں پر اور جوتا باری ہوتی۔ سارے وقت نسیمہ یا کچھ کچھ بلقیس بولا کرتیں اور استانیاں اُنہیں شاباشی دیا کرتیں۔ باقی کی لڑکیاں گھبرائی اور شرمندہ بیٹھی پھٹکاریں سنا کرتیں۔

یہی نہیں، کھیل کے میدان میں نسیمہ نے سب کو چت کر دیا۔ وہ کبھی اندھا دھند بھی کر جاتی۔ باز پُرس پر نہایت تیز انگلش میں بولنے لگتی جس پر ساری لڑکیاں جھجک جاتیں اور انگریزی کی [illegible] اُس کی ساری گستاخیاں انگریزی کے پیارے سے جملے سے معاف کر دیتیں۔ نہ جانے کیوں شمن نے پہلی نظر میں نسیمہ کو دشمن کا عہدہ دے دیا تھا۔ ہر موقعے پر اُس کی اور نسیمہ کی ٹکر ہو جاتی۔ دونوں کی گستاخ نظریں ٹکراتیں مگر جھک جاتیں۔ اب بھی جب رشیدہ ماما اُس سے دو چار میٹھی باتیں کہہ دیتا مگر وہ بات نہ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ کچھ بھولتا جا رہا ہے۔ پرنسپل کی نظروں سے بھی وہ اُتر گئی تھی اور بورڈنگ میں تو اُس کی حیثیت تھی ہی ایک غیر جیسی۔ نوری تو جلیس کے ساتھ کوکو کا دم چھلا بن چکی تھی۔ غرض ایک بار پھر اُسے ایک ناقابلِ بیان سنسان تنہائی کا احساس ہوا اور اس شدت سے کہ اُس نے ہر چیز سے بغاوت کر دی۔

سب سے پہلے تو وہ کتابوں پر ٹوٹ پڑی۔ نسیمہ کی زبان تیز تھی مگر معلومات صفر کے برابر تھیں۔ تھوڑے ہی دن میں اُس نے نسیمہ کی قینچی کا جواب بگڑی ہوئی حفظ کی ہوئی انگریزی میں دینا شروع کیا۔ پورے پورے صفحے رٹ کر اُس نے نسیمہ کو چت کر دیا۔ اڑیل گھوڑے کی طرح وہ پیر جما کر کھڑی ہو جاتی اور ساری مسکراہٹوں اور قہقہوں کا جواب وہ رکتی ہوئی زبان میں دیتی رہی۔ اسے کھیل سے نفرت تھی مگر جلتی دھوپ میں اُس نے مشق کی، یہاں تک کہ وہ کھیل میں بھی چوٹ کھائی شیرنی کی طرح سب پر حاوی ہو گئی۔

نسیمہ کے احسانات تو خیر تھے ہی جادو کے منتر، شمن کی ضدیں ہٹ دھرمیاں اور

گستاخیاں بھی بیکار نہ گئیں۔ رفتہ رفتہ ساری وہ لڑکیاں جو کسی طرح نسیمہ کی نظروں سے اتر گئی تھیں شمن کے جھنڈے تلے آگئیں۔ نسیمہ کو اب بورڈنگ میں بہت کم وقت گزارنے کو ملتا تھا کیونکہ اسکول سے آکر فوراً وہ اُردو کی کمزوری دور کرنے بنگلے پر چلی جاتی تھی۔ گو کبھی اب وہ پھول جیسی گڑیا نہ رہی تھی۔ بے بے کے توبس کی نہ تھی۔ بدتمیز بچیوں کے گروہ میں مل خاک دھول میں لوٹا کرتی اور وہ کو کو جیسے چوہٹے کے لیے لڑکیاں بے اختیار کلاسوں سے نکل پڑتی تھیں، اب چپتیں کھا کر کمروں سے نکلتی۔ پھل بھی کچھ کم آنے لگے تھے کیونکہ زیادہ تر تو بنگلے پر چلے جاتے۔ نسیمہ تو زیادہ تر کھانا بھی وہیں کھاتی۔

شمن کمرے میں خاموش بیٹھی تھی۔ وہ اب اکیلی رہتی تھی۔ بلقیس کے جانے کے بعد اُس نے کسی کو نہ آنے دیا تھا۔ وہ ایک تقریر کو رٹنے میں مشغول تھی جو اُسے دوسرے دن کرنا تھی کہ اتنے میں بلقیس آئی۔ وہ کچھ شرمندہ اور پشیمان سی تھی۔ کسی کتاب کے بہانے سے وہ دیر تک میز ٹٹولتی رہی، پھر بیٹھ گئی۔ شمن نے بات نہ کی تو خود ہی بولی "پولیٹکس بک میری کھو گئی، ذرا اپنی دے دو" شمن نے کتاب اُٹھا کر سامنے ڈال دی۔

"کل کے لیے تیاری کر لی ؟"

"ہاں"

"لاؤ میں سن لوں" بلقیس نے قریب آکر سپیچ کی کاپی لے لی۔ شمن کے گلے میں آنسو اٹکنے لگے، جی چاہا سنائے کھری کھری، مگر بلقیس کی جھکی ہوئی نظریں دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔

"چہ خدا قسم نسیمہ مر بھی جائے تو نہیں بول سکتی۔ پتہ ہے اُس نے ابھی تک نوٹ بھی تیار نہیں کیے ہیں"

"بھئی وہ تو بغیر نوٹ کے بول سکتی ہے"

"خاک بھی نہیں۔ رشیدہ نے اتنی غضب کی تقریر تیار کر کے دی جناب نے پڑھی تک نہیں"

"میری اور عیسیٰ کی لڑائی ہوگئی" وہ تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولی۔

"ہیں؟ ہٹو!"

"سچ!"

"مگر؟"

"کمینہ ہے! پتہ ہے تمھیں اتوار کو" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ شمن نے بالکل تجسس کا اظہار نہ کیا۔

"مجھے کہنے لگے کہ آٹھ پلیٹوں کا فلم ہے، چار نسیمہ کی تصویریں کھینچ لینے دو پھر تمہاری۔ اور جناب بعد میں معلوم ہوا صرف چھ تھیں جن میں سے ایک جلیس نیکر پہن کر کھنچوائے گی۔ جی ہاں گویا میں مرتی ہوں ان کے فلموں پر۔"

"ایک ہی فلم تھا۔"

"ہاں۔ کہنے لگے دہلی سے لانا پڑے گا۔ اور خدا قسم اتنی بیہودہ ہوتی ہیں بعض لڑکیاں یعنی رشیدہ بیچاری نے جناب کی سینکڑوں تصویریں کھینچیں اور اب . . . . چہ خوب ہے!" بلقیس روہانسی ہوگئی۔ "ایک لفظ نہیں پڑھتیں۔ آپا بی نے کہا تو فوراً دو مہینے کی ٹیوشن کا چیک لا کر دے دیا۔ یہ آپا بی خدا قسم اتنی وہ ہیں، نہ جانے کیوں دیتی ہیں۔" آپا بی غریب پانچ بہنوں اور ایک لاڈلے بھائی کی اکیلی کفیل تھیں۔

"تم بھی تو دیتی تھیں۔" شمن نے کہہ ہی دیا۔

"جی ہاں، جوتی دیتی ہے چڑیل سے۔ ہُنہ۔ وہی زبردستی کرتی تھیں۔ پتہ بھی ہے عیسیٰ کو اب کے اپنے گھر مسوری سے چلنے کو کہتی ہیں۔"

بلقیس شمن سے رونا رو کر چلی گئی۔ سہ پہر کو میٹرن سے نسیمہ کے لڑنے کی آواز سن کر ساری لڑکیاں کھڑی ہوگئیں۔ بات یہ تھی کہ بزاز آیا تھا اور پرنسپل صاحبہ کے حکم سے لوٹا دیا گیا۔ میٹرن سے جو نسیمہ نے کہا تو وہ بے زاری ظاہر کرنے لگی جس پر نسیمہ خوب بگڑی مگر شکست ماننا پڑی۔ وہ باہر نکل کر جو کچھ خریدنا تھا خرید لائی، میٹرن چوں نہ کر سکی۔ شام کو ہال کے سامنے نوٹس ٹانگا گیا کہ بورڈنگ میں کسی سودے والے کو آنے کی

اجازت نہیں، خرید و فروخت صرف اتوار کو ہوگی اور بورڈنگ کے باہر کے کمرے میں۔ ساری لڑکیوں نے یہ ظالمانہ نوٹس پڑھا اور بڑبڑائیں، گویا بڑی اکھنیں خریدنی کرنی تھی۔

تیسرے چوتھے دن شمن جو کمرے میں گئی تو بلقیس کو خاموش پلنگ پر بیٹھے دیکھا۔ اسے دیکھ کر وہ خاموش تکتی رہی پھر منہ پھیر کر بستر پر اوندھی گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ہائیں بلّی کیا ہوا؟" آج بہت دن بعد شمن نے اُسے پیار سے پکارا۔

"ہائے شمن!" بلقیس اس سے لپٹ کر پھوٹ پڑی۔ بڑی دیر تک وہ اُسے علیسیٰ اور نسیمہ کے عشق کا حال بتاتی رہی۔ علیسیٰ۔ آئی۔ سی۔ ایس کے مقابلے میں بیٹھ چکا تھا اور اس کے باپ کی سفارش سے یقین تھا کہ وہ کامیاب ہو جائے گا۔ اور آج بلقیس نے جب اس کی دی ہوئی البم اٹھا کر پھینک دی تو وہ اُلٹا بُرا مان گیا۔

"بلقیس تم میری البم لے لینا" نسیمہ نے اُسے چھیڑا۔ "میں اب دوسری منگوا رہی ہوں پیرس سے۔"

ہُنہ! گویا بلقیس کسی کی بیکار چیزیں جمع کیا کرتی ہے۔ اور پھر علیسیٰ نے معافی بھی تو نہیں مانگی۔ خیر وہ آج ہی عباس اور انصار کو چائے پر بلائے گی، شمن کو بھی چلنا ہوگا۔

پرنسپل صاحبہ کے پرچہ پر شمن کو جانے کی اجازت مل گئی۔ آج خوب جھمگٹا تھا۔ بلقیس بہت سجی ہوئی تھی مگر نسیمہ نے ضد میں کپڑے نہ بدلے تھے۔

"بلّی اس دوپٹے کے ساتھ کا جمپر بھی لے لیتیں، میرا تو جی کھٹا ہو گیا ہے چھپی ہوئی جارجٹ سے۔" نسیمہ نے چھچھورے پن سے سب کے سامنے یہ ظاہر کر دیا کہ بلقیس اُسی کے ویسے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ بلقیس خون کا سا گھونٹ پی گئی مگر اُس کا پارہ چڑھ گیا جب اُس نے عباس اور انصار دونوں سے انگریزی شاعری پر فلسفیانہ بحث کر کے بلقیس کو بالکل پس پردہ ڈال دیا۔

رشید نے شمن سے کچھ نہ کہا۔ اُس کی ہتیلی میں کہیں سے ایسی باریک پھانس لگ گئی تھی کہ نکلتی ہی نہ تھی۔ شمن دیر تک اُس کی ٹائی پن کی مدد سے پھانس ڈھونڈتی رہی مگر نہ ملی۔ کھانے پر کچھ نسیمہ اور بلقیس میں تیز تیز حملے چلے جن پر سب نے بلقیس ہی کو ڈانٹا۔ یہاں تک کہ انصار بلکہ بھی کہنے لگا کہ بلقیس بڑی کٹ حجتی کرتی ہے۔ بلقیس کھانا چھوڑ کر چلی گئی جس پر نسیمہ کو ہنسی آ گئی۔

بورڈنگ جانے سے پہلے نسیمہ اور بلقیس میں پھر ٹھن گئی۔ بیچ بچاؤ کروا دیا گیا مگر بلقیس کو پھر سب نے ڈانٹا۔ نسیمہ کے ساتھ شمن کو اُس نے جانے بھی نہ دیا۔ اور وہ اکیلی ہی چلی گئی۔ عیسیٰ، عباس اور انصار ساتھ جانے کو بلبلاتے رہے مگر پرنسپل خانم نے کہا کہ بورڈنگ کی حدود میں لڑکوں کا جانا ٹھیک نہیں۔

رو رو کر بلقیس نے شمن کو رات کو اپنے کمرے میں رکھ لیا۔ بڑی دیر تک وہ اُس کا رونا روتی رہی۔ سونے سے پہلے رشید کسی کام سے کمرے میں آیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔

"اچھی بجلی بجھاتے جاؤ۔" بلقیس نے اُٹھنے کی تکلیف سے بچنے کے لیے رشید کی خوشامد کی۔

وہ بجلی بجھا کر اندھیرے میں بلقیس کی ناک پکڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کی ناک چھوڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس نے شمن کی چھنگلیا کو آہستہ سے دبا کر چھوڑ دیا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ شمن دیر تک سُن پڑی جاگتی رہی۔

دوسرے دن کھانے کی چھٹی میں ہال کے سامنے نوٹس ٹنگا تھا کہ بنگلے پر آنے کے لیے پہلے پرنسپل صاحبہ کی لکھی ہوئی اجازت کی ضرورت ہوگی۔ معنی خیز نظریں نسیمہ پر پڑ رہی تھیں اور سر جوڑ جوڑ کر باتیں ہو رہی تھیں۔ شام کو ایک پوٹلی میں نسیمہ کی دی ہوئی ساری چیزیں اُس کے کمرے پر بلقیس کا نوکر دے گیا۔ نسیمہ نے جھاڑو دیتی ہوئی مہترانی کو بلا کر پوٹلی جوں کی توں اُسے دے دی۔ نہ جانے کتنے جھلملاتے دوپٹے، کرتے، جوتے، ایسنس، پاؤڈر، لپ اسٹک کے ڈبے، بندے، انگوٹھیاں اور [illegible]

کی حسرت بھری نگاہیں دیکھتی رہیں اور مہترانی سب کچھ سمیٹ لے گئی
امتحانوں سے پہلے ہی گرمی کی وجہ سے نسیمہ اور کوکو پہاڑ پر چلی گئیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اب نہ آئیں گی۔ ان کا فرنیچر غریب لڑکیوں میں بانٹنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ مگر وہ فرنیچر بنگلے پر پہنچ گیا۔

(۱۹)

چھٹیاں آئیں تو گھر جانا ہی پڑتا ہے۔ ویسے ہی گھر اُسے ناپسند تھا مگر اب کے چھٹیوں میں تو حد ہو گئی۔ نوری سیدھی اپنی ددھیال چلی گئی۔ اس کا دل بری طرح گھبراتا۔ گو وہ کئی مضامین میں کمزور تھی مگر اُلٹ کر دیکھنے کو جی نہ چاہتا۔ گھر ویسے بھرا پُرا تھا اور دن غپاڑا مچا رہتا تھا مگر شمن کا کوئی دوست نہ تھا۔ اُس کی ایک بھاوج کے بچہ ہوا۔ اس اودھم میں تنہائی ذرا کم ہو گئی مگر پھر بھی اُسے ہر چیز بے تکی، ادھوری اور بے ڈھنگی معلوم ہوتی۔ کالج میں ہر چیز کیسے انتظام سے ہوتی تھی۔ یہ تھوڑی کہ ہر چیز لشتم پشتم!

بلقیس کا خط آیا اور اس کے ساتھ رشید کا پرچہ بھی۔ بڑے بھیا نے خط کھول کر دیکھ لیا اور بڑے بلے ویسے بھی مگر شمن ایک چالاک! اُس نے کہہ دیا کہ یہ اُس کی سہیلی کے چھوٹے بھائی نے لکھا ہے، اور رشید لکھتا بھی تو بچوں جیسی باتیں تھا۔ اس نے وہی اپنی پرانی ادھار کی چٹنی مانگی تھی۔ بڑی تھکی ہوئی آواز میں ڈوبی ہوئی بھیک!

کچھ دن بعد بلقیس پہاڑ پر چلی گئی اور خط آنے بند ہو گئے۔ ایک خط سے اُسے معلوم ہوا کہ وہ اور بلقیس نینی تال میں پڑھیں گی۔ اس کے بعد جب وہ کالج واپس گئی تو اسے معلوم ہوا کہ رشید انگلینڈ چلا گیا۔

شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے فلم کی ریل چلتے چلتے بیچ میں سے ٹوٹ گئی اور ہال کی بجلیاں پھک روشن ہو گئیں۔ ان کی کرخت روشنی کی نوکیلی شعاعوں سے اُس کی آنکھیں چندھیا کر جھپک گئیں۔ خاموش اور خوفزدہ وہ سانس روک کر سمٹ گئی۔ بچہ شرارت کرنے میں اُنگلی کاٹ لیتا ہے تو جھٹ اسے کرتے میں چھپائے سہما ہٹا کونے میں دبک

جاتا ہے۔ شمن کے احساسات بھی دکھ اور شرم سے خوفزدہ ہو کر نہ جانے دل کے کس سنسان کونے میں اوندھے منہ جا گرے۔ شاید ہمیشہ کے لیے!

بلقیس کا خط آیا بھی تو اس میں رشید کا کوئی ذکر نہ تھا۔ وہ بھی شاید اس کی طرح آنکھیں چھپا رہی تھی۔ جب کوئی اچانک کیچڑ میں پھسل پڑتا ہے تو رحم دل جلدی سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں تاکہ گرنے والا چوٹ تو جی کھول کر سہلا سکے۔ شمن زیادہ مرہم پٹی کی قائل نہ تھی، بڑی بے رحمی سے سب کچھ دور جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

اسے اب گھر پر بھی دلچسپی معلوم ہونے لگی تھی۔ اس نے چھپے چوری سائیکل سیکھ لی اور بھائیوں سے بھی پریم بڑھانا شروع کیا۔ نوری جب ددھیال سے آئی تو حد درجہ پکی ہو گئی تھی۔ پڑوس کی لڑکیوں کے ساتھ چھپ چھپ کر اس نے عجیب و غریب کپڑے سینا سیکھ لیے تھے۔ حالانکہ اُسے ابھی ان کی بالکل ضرورت نہ تھی مگر بڑے پُراسرار طریقوں سے پہنے جاتے، میلے ہوتے اور دھو کر بند صندوقوں میں سکھائے جاتے۔ وہ اپنے ایک رشتہ دار کے بھائی سے محبت کرنا سیکھ آئی تھی جس کے نام کے پہلے حرف سے دہری ہو کر شرمایا کرتی۔ شمن نے اُسے رشید کے متعلق کچھ بھی نہ بتایا، اور اب بتانے کو رہا بھی کیا تھا، وہ جان جان کر اُسے بھائی رشید کہتی، لفظ بھائی پر غیر معمولی زور دے کر۔

بڑی آپا بالکل بدل گئی تھی۔ اُس کی دوستی مونچھوں والی عزیز بیگم سے ہو گئی تھی بیگم کے میاں انھیں قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے مگر وہ تو بڑی آپا سے دوپٹہ بدل رشتہ قائم کر چکی تھیں۔ وہ تو گھر ہی میں آن رہتیں مگر لوگوں نے ایسا غل مچایا کہ حد نہیں۔ بیچاری آپا رو رو کر اپنے مرحوم میاں اور سسر کو کوستی رہی۔ عزیز بیگم سے سارے گھر کو نفرت تھی۔ بڑے لڑکے تو اُن کا نام سُن کر ہی چڑھ جاتے۔ گو وہ پردہ کرنے کے قائل نہ تھے۔ پھر بھی وہ اُن سے چھپ چھپ کر انھیں یاد دلاتیں کہ وہ جوان ہو رہے ہیں لہٰذا خطرے کی حدود میں آ چکے ہیں، اور چھوٹے اُن کی مونچھوں سے جھینپتے تھے جنھیں وہ کند چمٹی سے کچھ یونہی سا چھدرا سا کر لیتی تھیں۔ اُنھیں دیکھ کر شمن کو بے اختیار نجمہ یاد آ جاتی، گو صورت میں بہت بل تھا مگر نہ جانے کیا بات تھی جو دونوں میں موجود تھی۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ

جس میں غنودگی اور بیماری ایک ساتھ ڈبکیاں کھاتی نظر آتیں، وہ پتلی چھوٹی سی چال
گرم گرم سانسیں اور دہکا ہوا رنگ!

اسی زمانے میں شمن کی ایک خالہ کا لڑکا اعجاز ان کے گھر میں آکر رہنے لگا۔ اعجاز
کا باپ مر چکا تھا اور اماں نے دوسرا نکاح کر لیا تھا۔ سوتیلا باپ اس کے حق میں سوت
سے بدتر تھا۔ وہ اُسے اور خالہ دونوں کو بُری طرح کوٹتا تھا اس لیے اسے یہاں بھیج
دیا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اعجاز کو کوئی کس بات پر مار سکتا تھا۔ وہ عموماً چپ چاپ
اُلّو کی طرح بیٹھا بولنے والوں کے ہونٹ تکا کرتا۔ شرارت تو وہ کرنا جانتا ہی نہ
تھا۔ لوگ ارمان کرتے ہیں کہ اُن کے بچے شریر نہ ہوں مگر اعجاز کو دیکھ کر وہ بھی کانپ
اُٹھتے۔ وہ بالکل مار کھائے ہوئے بندر کی طرح ایک جگہ بندھا چاروں طرف آنکھیں
دوڑایا کرتا۔ اس کی آنکھیں ایک ہی وقت میں بھوکی، ندیدی اور متحیر نظر آتیں لیکنِ
مانگے بھی اُس کی ہر ہلکی سی جنبش سے التجا اور بھکاری پن ٹپکتا۔ کھانے پر سب سے پہلے
بغیر پکارے پہنچ کر دسترخوان کی سلوٹیں دور کرنے لگتا اور چمچوں کو قرینے سے سجاتا۔ جب
تک کھانا شروع نہ ہو جاتا وہ صبر سے میٹھا میٹھی میٹھی پیار بھری نظروں سے دیکھا کرتا۔
ایک ہی شوق کے ساتھ اچھی بُری ہر چیز نگل جاتا۔ نمک مرچ، کھٹاس مٹھاس کے امتیاز
سے بے نیاز ہر کھانے کی چیز اُسے مزے دار معلوم ہوتی۔ عموماً وہ سب کے بعد کھانا
ختم کرتا اور نیچے کچھ روٹی اور رکابی کی پونچھن کا بڑا سا لقمہ بنا کر منہ میں رکھ لیتا۔ یہ آخری
لقمہ وہ بڑے انہماک سے دیر تک چباتا رہتا۔ ہاتھ منہ دھو لیتا لیکن کھانے کا مزہ قائم
رکھنے کے لیے وہ کُلّی ہرگز نہ کرتا۔ ویسے منہ ہاتھ دھونے پر کبھی اُسے کچھ کہنے کی ضرورت
نہ تھی۔ صبح ہی صبح برتن دھونے کے نل سے منہ دھو کر بڑی نفاست سے کرتے کے دامن
سے منہ پونچھ ڈالتا مگر دیکھنے میں پھر بھی نہایت غلیظ نظر آتا: گدلی اور مردہ رنگ
کی جلد اور میلے بال اور میلے کپڑے۔

گھر کے کام کاج میں وہ بڑی مستعدی دکھاتا۔ عموماً اپنے سے چھوٹوں کا کام کر دیتا۔
اُسے مرغیوں کو دانہ ڈالنے اور کتوں کو جھوٹے ٹکڑے کھلانے کا بہت شوق تھا

دسترخوان سے سارا کوڑا سمیٹ کر وہ احاطے کے کسی سنسان کونے میں مرغیوں اور کتوں کو پکار کر ڈال دیتا، لیکن جلد ہی لوگوں کو اس کے اس شوق کی اصلیت معلوم ہو گئی۔ کتوں کو دینے سے پہلے وہ سالن لگے ہوئے ٹکڑے، بچی بچائی ہڈی سے چپکی ہوئی بوٹی اور ایسی ہی دوسری کارآمد چیزیں منہ میں رکھ لیتا۔ اتنا کھانے پر بھی ایک طرح کی بے چین بھوک اس کی آنکھوں میں بلبلایا کرتی۔

اعجاز کا پیار کا نام اجّو تھا۔ نہ جانے کمبخت پر کس کو پیار آتا ہوگا، مگر لوگ بچوں کے نام رکھتے وقت دوسروں کے احساسات کا تھوڑے ہی خیال رکھتے ہیں۔ وہ بڑا ڈرا بزمار تھا۔ ابا کو انگریزی بالوں سے سخت نفرت تھی اور لڑکوں کے سر منڈواتے وقت قدر مچا دیتے تھے مگر جیسے ہی نائی آتا اجّو اپنا بے ہنگم سر لے بیٹھتا اور مسکرا مسکرا کر منڈوا لیتا۔ انعام کے دو پیسے لے کر وہ کمر بند میں بڑی سی گانٹھ باندھ لیتا۔ مگر ابا کو یہ انعام دے کر بالکل خوشی نہ ہوتی۔ اپنے اصول پر قائم تھے مگر اجّو کا گھٹا ہوا سر دیکھ کر نفرت کی ایک لہر ان کے دل میں بھی اٹھتی۔ سب کو اس کے سر سے نفرت تھی۔ بچپنے میں ایک ہی رخ لیٹے رہنے سے اس کا سر ایک طرف کو لٹکے ہوئے خربوزے کی طرح پچکا ہوا تھا۔ چپت کھا کر وہ خوش مزاجی سے ہنس پڑتا، جس پر رحم کا جذبہ ذرا سر اٹھاتا لیکن فوراً ہی یہ رحم ایک غیر فانی نفرت میں تبدیل ہو جاتا۔

چھوٹے بڑے سبھی اور اس کا مذاق اڑاتے، نوکر گوکیاں دیتے اور برابر والے اس سے گھن کھاتے۔ اس پر طرّہ یہ کہ جب شمّن پیدا ہوئی تھی، تو خالہ نے اجّو کے نام کا ٹھیکرے میں روپیہ ڈال دیا تھا! ٹھیکرا تو تھا نہیں کیونکہ شمّن کے پیدا ہونے پر ہیم آئی تھی مگر زبانی بات ہو گئی تھی۔ امّاں بھی چپ ہو گئی تھیں کہ خالہ کا دل نہ ٹوٹے۔ ماں غریب ہزار جان سے بیٹے پر قربان تھیں۔ جب کوئی تہوار آتا وہ نئے کپڑوں کا جوڑا اور تل کے لڈو لے کر آجاتیں۔ اجّو اچھا بیٹا بن کر وہ لڈو پاندان کی تھالی میں لے کر ہر ایک کے سامنے پیش کرتا، مگر سب کے انکار کر دینے پر سارے لڈو اسی کو نگلنے پڑتے۔

علاوہ غریب ہونے کے خالہ بدمذاق اور پرانے فیشن کی بھی تھیں۔ اتنے بڑے

گھوڑے کے لیے پھول دار کرتا اور لال ٹول کا رومال لاتیں۔ عید کے دن صبح تڑکے ماں بیٹے اُٹھ کر باسی یخ پانی سے غسل فرماتے اور کورے کلف دار کپڑے پہن کر اچھو سب کو سلام کرنے اُن کے بچھونوں پر پہنچ جاتا۔ ساتھ ساتھ دعاؤں کی پوٹلی بغل میں دبائے ہنستی مسکراتی خالہ ہوتیں، مگر سب ہی تو اس خلل اندازی پر بڑبڑاتے اور کوئی بھی جی سے دعا نہ دیتا۔ اچھو پتنگ ہو یا کیک سب کو بیٹن ہی کہتا۔ تاش کھیلتے ہیں جب وہ اسپیڈ اور ڈائمنڈ کے بجائے وہی حکم اور اینٹ کہتا تو منجھلے بھیا کا خون کھول اٹھتا۔

"اچھو کے بچے سلام کر ناک پکڑ کر ادھر اور اُدھر بھی" اچھو ناک پکڑ کر چاروں طرف سلام کرتا۔ "اچھا اب ایک ٹانگ پہ کھڑے ہو جلدی، جلدی" وہ اس کے گٹوں پر سٹاک سے پچرڑی مارتے۔ "نہ بھیا کیوں مارے ڈالے ہو لنگوڑے کو" خالہ گھگیاتیں اور پھر اچھو سے خوشامد میں دوسرے بچوں کے بستر تہ کرواتیں، بکھرے ہوئے جوتے موزے رکھواتیں۔ ایک پیسہ، آدھی چوسی ہوئی آم کی گٹھلی، جھوٹے دودھ چاول کا لالچ دے کر اچھو سے ہر قسم کی خدمت لی جا سکتی تھی، اور غریب ہزاروں گٹھلیوں اور جھوٹی ہنڈیوں کے نیچے دبا ہوا کوڑیا غلام کی طرح کام کرتا۔

جب شمن اچھو کو دیکھتی تو وہ اُسے موٹی سی گستاخ گالی نظر آتا۔ اُس کے جذبات کھول کر بغاوت پر آمادہ ہو جاتے اور اُس کا جی چاہتا کسی کی بوٹیاں دانتوں سے چبا کر تھوک دے۔ اُوپر سے عاقبت نااندیش خالہ نے اچھو کی گت دیکھ کر سوچا اگر منگنی کا ذکر چھیڑ دیا جائے تو شاید آئندہ داماد سمجھ کر اس شدّت سے آزار نہ پہنچایا جائے لہٰذا وہ بیچ صحنچی میں بیٹھ کر ارمان بھری باتیں کرنے لگیں، سب دم بخود رہ گئے اور شمن کے تو تن بدن میں چنگاریاں چھٹنے لگیں۔ مارے نفرت کے وہ اُس کے منہ پہ تھوک بھی تو نہ سکی۔ مگر اچھو پر کچھ عجیب ہی اثر ہوا۔ وہ ہکا بکا تھوڑی دیر چاروں طرف دیکھتا رہا پھر ایک دم اُس کی کھوپڑی پر نہ جانے جسم کی کن رگوں سے خون چھلک آیا، اُٹھ کر وہ بے تحاشا باہر بھاگ گیا۔

اُس دن سے شمن سے وہ بے طرح شرمایا اور جھینپا سا رہنے لگا۔ شمن کو دیکھ کر

وہ مفلوج سا ہو جاتا اور اگر وہ پاس سے بھی گزر جاتی تو وہ شل ہو جاتا۔ اس کی غیر فانی بھول کے بعد یہ پہلا جذبہ تھا جو اس شدت سے اچھو پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ گھر میں قدم رکھتا تو شمن کے پتنگے لگنے لگتے۔ اُمیدوار دامادوں کی سی سنجیدہ شرم اور تکلف دیکھ کر اُس کا جی چاہتا اُس کے منہ پر جوتا مار دے اور بدترین جملے اُس کی شان میں دہرائے۔ ایک اور بھی زبردست انقلاب پیدا ہو گیا اُس میں۔ وہ اُس کی چلبلی بیوقوفیاں جو وہ لوگوں کے خوش کرنے اور ہنسانے کو کیا کرتا تھا یکلخت بند ہو گئیں۔ گو وہ شمن سے شرمایا رہتا لیکن چھپ چھپ کر گھنٹوں اُس کی ہر جنبش کو گھورا کرتا۔

رات کو سب بچوں کے پلنگ برابر برابر ڈال دیئے جاتے۔ اچھو کسی نہ کسی بہانے سے اپنا پلنگ شمن کے قریب اٹھا لیتا۔ کسی کو خیال بھی نہ آتا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے کیونکہ لوگ اُسے حد درجہ کا بیوقوف سمجھتے تھے، لیکن شمن کا ہی جی جانتا تھا۔ جب سب سو جاتے تو اچھو آہستہ آہستہ اُس کے پیروں میں اپنے پیر کا انگوٹھا اور انگلیاں ملا کر چٹکیاں لیا کرتا۔ وہ اُسے ڈانٹ کر دور جھٹک دیتی مگر وہ سوتا بن جاتا اور رات کو آنکھ کھلتی تو اُسے اپنے پلنگ پر بہت سے کھٹمل سے معلوم ہوتے۔ شاید وہ ساری رات جاگا کرتا تھا کیونکہ دم بھر کو شمن چین سے نہ سو پاتی۔ اچھو کا ہاتھ پیر اُس کی پنڈلیاں ران کو سہلایا کرتا۔

"کیا ہے اچھو؟ ہم مار دیں گے۔" اُس نے کئی بار جوتا اُٹھا کر مارا مگر سویا ہوا اچھو آہستہ آہستہ اُسے خوفزدہ کرنے لگا۔ وہ اُس سے بچنے کے لیے بوڑھی انا کی پٹی سے پٹی ملا کر سونے لگی اور دوسری طرف پلنگ دیوار سے اڑا لیتی اور ان سے وہی بادشاہ اور بادشاہ زادی کی بوسیدہ اور بے مزہ کہانیاں سنا کرتی۔ سنتی کیا خاک، کہانیاں اُسے رٹی پڑی تھیں۔ پڑی ہوں، ہاں کیا کرتی۔ اُس کے خیالات بہت دور کسی نہایت ہی دلچسپ ہلکی پھلکی کہانی کا تانا بانا بننے میں مشغول ہوتے۔ اس لطیف کہانی کی وہ ہیروئن ہوتی اور ہیرو؟ نہ جانے کون، کون تھا، کس کی مجال تھی جو اس کی ان کہانیوں کا ہیرو بننے سے انکار کرے۔ اُس نے ایک بار "ہیر رانجھا" فلم دیکھا تھا۔ ہیرو نے کیا

بھولے پن سے آنکھ مچولی کھیلنے میں رالہ نجمے کو پکڑ لیا تھا۔ کچھ ایسی ہی دل دھڑکانے والی معصوم سی ملاقات اُس کی اور رشید کی ہوئی تھی۔ پکنک میں جب۔۔۔ وہ۔۔۔

وہ سو جاتی سائیں سائیں۔ خواب اُسے لمبے لمبے پینگ دے کر جھلاتے۔ ایک بار ہی اُوپر چڑھتی چلی جا رہی ہے، پھر چڑھتی ہے اور پھسل پڑتی ہے۔ چکنی چکنی زمین اس کے پیروں کے نیچے گدگدیاں کرتی مچل مچل کر بھاگ رہی ہے۔ وہی بلقیس کا کمرہ اور کیرم کا تختہ۔ رشید بلقیس کے دوپٹے کا گھونگھٹ کاڑھے ہیں۔ وہ پردہ کرتی ہے نا رشید سے۔ رشید کی بے ایمان آنکھیں دوپٹے کی مہین چلمن میں سے جھانک رہی ہیں۔ وہ ہا۔ گئی، جیتا ہوا رشید اُس کی کلائی پکڑ کے ذرا انگلیوں کو ملائے چٹکی مارنے کو تیار ہے۔ کہ ایک دم سے ٹھنڈی دم گھونٹنے والی خلا اُسے لپیٹ کر پھرکی کی طرح گھما ڈالتی ہے۔ گرم گرم پانی کی بے آواز دھاریں کندھوں اور کنپٹیوں پر سے پھسلتی رینگتی چلی جا رہی ہیں کہ ایک دم سے وہ جاگ پڑتی۔ اوہ! اچھو کے بھوت کے ہاتھ!

دبی ہوئی خوفزدہ چیخ کے ساتھ وہ دیکھتی کہ اچھو اس کے سرہانے سے جھانک کر پانی پینے کے مٹکوں کے پاس بڑا مشغول نظر آ رہا ہے۔ وہ اُس کی لرزتی ہوئی پھٹکار کا کوئی جواب نہ دیتا اور پانی پی کر خاموش اپنے پلنگ پر جا گرتا۔ گھنٹوں خوف سے شمن کانپا کرتی، ہزاروں نبضیں جگہ بہ جگہ ٹھنٹھنایا کرتیں۔

نفرت میں خوف کا اور اضافہ ہو گیا۔ اچھو دن بھر تو بالکل معصوم دکھائی دیتا لیکن۔ لیکن رات کو بھوت کی طرح ڈراؤنا نظر آتا۔ اس کی صورت اور بھی مسخ ہو چلی تھی۔ وہ رات بھر اوندھائے پڑھنے میں جٹا رہتا۔ تعجب تو یہ ہے کہ اس کی وہ غیر فانی بھوک ایک دم غائب ہو گئی تھی۔ کئی بار بلانے پر وہ دستر خوان پر آتا، دو چار لقمے بے توجہی سے کھا کر چل دیتا۔ اب اُسے دودھ میں لساند، خربوزوں میں ہیک اور آموں میں کھٹاس بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ میٹرک میں رٹ رٹ کر وہ وظیفہ پا سکا لیکن شاید ہی کوئی دن جاتا ہوگا جب کہ وہ رات کو شمن کے سرہانے یا پائنتی کھڑا نظر نہ آتا ہو۔ اب وہ ہاتھ نہیں لگاتا تھا بلکہ بے چینی سے ٹہلتا، رک جاتا، جھکتا اور پھر

جھجک جاتا۔ ایک دن شمّن کا دوپٹہ پلنگ کے نیچے لٹک رہا تھا، اُس نے جھک کر اُٹھایا پھر گھبرا کر اُس کے اُوپر ڈال دیا لیکن فوراً ہی وہ پچھتانے لگا کہ آخر اُس نے پھاڑ کیوں پھینک دیا۔ دوپٹہ دوبارہ اُٹھانے کی ساری کوشش اُس کے لرزتے ہوئے ہاتھوں نے خاک میں ملا دی۔ شمّن کو کلبلاتا دیکھ کر وہ جلدی سے پانی پینے لگا۔

عموماً شمّن جاگ بھی جاتی تو پڑی پڑی اس خاموش ڈرامے کو دیکھا کرتی۔ جونہی اُسے دلیر ہوتا دیکھتی کروٹ لے کر جاگنے کی دھمکی دیتی، گر وہ خوب جانتی تھی کہ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بیداری کا اعلان کر سکے۔ کروٹ لے کر وہ کبھی کبھی بڑبڑانے لگتی۔

"مر جائیے، مر جائیے، کاش، اچّو مر جائے۔" وہ کچھ نہ سمجھتا اور جھک کر اُس کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھنے لگتا، مگر ایک دن تو شمّن کے ضبط کا پیمانہ چھلک ہی گیا۔ نہا کر وہ گیلے بال کھولے سو گئی۔ رات کو اُسے ایسا معلوم ہُوا کوئی اسے بالوں سے پکڑ کر جھونکے دے رہا ہے۔ جھلّا کر اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور چیخیں مارنے لگی۔ اُس کی سانس رُک گئی، منہ پھٹا تھا مگر آواز نہ نکلتی تھی۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو اچّو اُس کے بالوں میں بھوکے کتّے کی طرح منہ دیئے سسک سسک کر رو رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے اچّو کے اُس نے زور سے چپل اٹھا کر ماری۔ چیخ کر اُس نے گھر کا کونا کونا چھان مارا مگر چپل نہ ملی۔

"میں نے رات کو کُتّے کے کھینچ ماری تھی، نہ جانے کدھر گئی۔"

"اوئی، کُتّا رات بھر بندھا رہا ہے! کُتّا کہاں سے آیا؟" کسی نے کہا۔

"اے شاید دری کھلی رہ گئی ہو، کوئی جنگلی کُتّا ہوگا۔"

"ہاں جنگلی ہی تھا۔ ایسا ڈراؤنا۔" شمّن نے سہارے پر چلنا شروع کیا۔

"یہ کُتّے موئے کاٹے اٹھا بھی تو لے جاتے ہیں۔"

"کُتّے چپل کا کیا کریں گے؟"

"اے یونہی اللہ مارے اٹھا لے جاتے ہیں۔ میری نئی دِلّی کی جوتی کلیم میاں کی کتیا اُٹھا لے گئی، حرامخور نے ساری چھلنی کر ڈالی۔"

بات ٹھٹکتی ہوئی گلیوں سے کہیں پہنچی مگر شمن کی الجھن نہ گئی۔ آخر چیل گئی کہاں؟ اُس دن سے اجّو کا پلنگ دوسرے چبوترے پر پہنچ گیا، شمن نے شکر کیا کمبخت سے جان تو چھوٹی۔ اس کے بعد اُس نے اجّو کو حد درجہ بے تعلق اور اپنے پڑھنے لکھنے میں غرق دیکھا جو تی کھا کر جیسے اُس کا پیٹ بھر گیا۔ چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور شمن کے جانے میں دو چار دن رہ گئے تھے کہ اجّو کو سکول سے پیدل آتے میں لُو لگ گئی۔ ویسے تو کسی کو پتہ نہ چلا لیکن شام کو جب اُسے سستی سے پڑے رہنے پر ابّا نے ڈانٹ کر پلاؤں میں پانی دینے کے لیے کہا تو لپک کر اُٹھ بیٹھا، دو چار قدم چلا بھی مگر پھر جھوم کر زمین پر آ رہا۔ دیکھا تو ایک سو پانچ بخار!

شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے خدا نے اُس کی دعا قبول کر لی اور اجّو چلا۔ رات بھر اُسے بخار اور ہذیان نے جھنجھوڑا اور دوسرا دن بھی بیہوشی میں گزر گیا۔ ویسے ابّا کو کسی کی خبر نہیں رہتی لیکن اگر کوئی بیمار ہو جائے تو گھر کو ہوٹ پوٹ کر کے رکھ دیتے ہیں؟ یہاں تک کہ اگر مرغی کی بھی ٹانگ ٹوٹ جاتی تو ایک ہنگامہ مچ جاتا۔ اجّو کی طبیعت اور زیادہ خراب ہوگئی۔ وہ اُٹھ اُٹھ کر بھاگتا۔ سارا گھر اُس کا ماتھا چھونے گیا مگر شمن نے جا کر جھانکا بھی نہیں۔ باری باری سب کی ڈیوٹی لگائی گئی تو شمن کو بھی جبراً جانا پڑا۔ وہ ارادہ کر کے گئی تھی کہ مردار کے ہاتھ بھی نہ لگائے گی مگر جب اُسے بے سُدھ دیکھا تو ترس آ گیا اور وہ برف کی ڈلی لے کر اُس کے سر پر رگڑنے لگی۔ سر میں سے بھپکے نکل رہے تھے، ہونٹ پپڑائے ہوئے تھے اور آنکھوں کے کونوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اجّو کی حالت قابلِ رحم تھی۔ باہر برف کی قلفیاں کھل رہی تھیں؛ شمن ندیدی نہ سہی پر جی تو لوٹ رہا تھا۔ اس نے چاہا چپکے سے کھسک جائے مگر اجّو نے پانی کے لیے ہونٹ چبانا شروع کیے۔ اُس نے برف کی ڈلی لے کر اُس کے گرم گرم دہکتے ہوئے ہونٹوں سے لگا دی؛ ہونٹ اُس کی اُنگلی سے چھو گئے! وہ اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اجّو نے آنکھیں کھول دیں اور بغیر آنکھیں جھپکائے اُسے دیکھتا رہا۔ ایک مسخ سی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔ شمن بھاگ کر جانے لگی۔

"شمن" اُس نے ایک بار حلق سے نکالنے کی کوشش کی مگر وہ باہر آکر ملائی کی برف کھانے لگی۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور حلق جل رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی برف کے چھلکے اُس کا گلا بھینچنے لگے۔ برف کی پیالی رکھ کر اُس نے اپنی انگلیوں کے پورے بھاپ سے گرم کرنا شروع کیے، جیسے کسی لاش کو چھو لینے سے اُن کا خون جم کر رہ گیا ہو۔

وہ گھر سے پلنگ پر پانی جھڑاک کر پڑ رہی۔ جسم میں گرم گرم سلاخیں دوڑتی معلوم ہوتی تھیں۔ حلق بار بار کاغذ کے ٹکڑے کی طرح خشک اور بے لذت ہوتا۔ اچو کی بخار سے جھلسی ہوئی آواز اس کے کان میں سانپ کی پھنکار کی طرح رینگ رہی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا اُس کے جذبات کیوں بے طرح اتھل پتھل ہوئے جا رہے ہیں۔

دوسرے دن جب اچو کا بستر بدلنے کے لیے اٹھایا گیا تو شمن کی کھوئی ہوئی چپل وہ دونوں ہاتھوں میں بھینچے اوندھا پڑا تھا۔ بخار اُتر کر حرارتِ غریزی سے بھی پارہ نیچے گر گیا تھا اور آنکھیں پتھرا چکی تھیں!

(۲۰)

سوتے سوتے جو آنکھ کھلی تو شمن نے گھر میں عجیب طرح کی چہل پہل دیکھی؛ ایک لمبا بانس لیے چپراسی کمروں کے جالے لے رہا تھا اور مہترانی پرموری صاف نہ کرنے پر ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ بڑی آپا ناک پر کپڑا باندھے تختوں کے نیچے سے کوڑا نکلوا رہی تھیں، اماں الماریاں کھول کر چینی کے برتن نکلوا رہی تھیں۔ معلوم ہوا کلکتہ والے چچا مع اپنے ہونہار سپوت عباس کے تشریف لا رہے تھے۔ عباس اکلوتے ہونے کے علاوہ انگلینڈ سے انجینئری پاس کر کے آئے تھے۔ کلکتے والے چچا حد درجہ نالائق اور نکمے تھے۔ مگر یہ اُن کا بٹیا نہ جانے کس طرح ہیرا نکل آیا۔ گورنمنٹ سے وظیفہ لے کر انجینئری پاس کر آیا۔ چچا بچارے کے دن پھر گئے۔ خاندان میں ان کی حیثیت ہمیشہ ایک خوفناک چھوت کی بیماری سی رہی۔ جہاں جا کر بیٹھ جاتے دھکے دے کر نکالے بغیر نہ نکلتے۔ اماں تو اُن سے پردہ کرنے لگی تھیں۔ لڑکیاں یوں ہی دعا سلام کر کے چلی آتیں اور وہ نوکروں کی دھتکاریں اور

مذاق کا نشانہ بنے جب تک ہمت قائم رہتی جمے رہتے، پھر کہیں اور بھٹو کریں کھانے چلے جاتے۔ عباس کو ایک ماسٹر نے رحم کھا کر رکھ لیا تھا اور آج جو وہ چمکتے ستارے کی طرح آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرنے واپس آیا تو سارے خاندان کی آنکھیں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ منجھلے اور چھوٹے ماموں اسٹیشن پر ہار پھول لے کر پہنچے۔ خالہ بی لے تو چار اسٹیشن پہلے ہی ناشتہ کا انتظام کروایا تھا۔ شمن کے یہاں چینی کے برتن اور چاندنیاں قالین نکلنے لگے تھے اور کوٹھے کا کمرہ سجنے لگا۔

خیر خدا خدا کر کے عباس میاں مع اپنے بد قماش، اب اور بھوبڑ ماں اور نیک رُو بہن فہمیدہ کے دوپہر کی گاڑی سے پہنچ ہی گئے۔ اماں نے عباس کو کھینچ کر گلے لگایا اور چچا کو بیچ مع دعا دی۔

"ارے فہمیدہ ماشاءاللہ کتنی بڑی ہو گئی" بڑی آپا اُسے پیار سے لپٹا کر بولیں: "تم نوری کے ساتھ سونا، اچھا!"

خالہ بی جل کر کوئلہ ہو گئیں۔

"اُوئی! بھلا اپنی عمر کی لڑکیوں کو چھوڑ کر نوری کے پاس کیا جی لگے گا۔ ارے بیٹی تم اپنی ثمینہ آپا کے ساتھ جاؤ، وہ تمہارا منہ ہاتھ دھلوا دیں گی۔ کیا کھڑی کھڑی تک رہی ہو منہ، ارے ثمینہ، بہن کو غسل خانے لے جاؤ نا"

بڑی آپا حیرت زدہ رہ گئیں۔ اندھیر ہے کہ نہیں! رانڈ بیوہ کا کسی کو خیال نہیں۔ لوگ اپنی بیٹیوں کے آگے یتیم کا حق بھی مارنے سے نہیں چوکتے۔ انھیں پورا یقین تھا کہ چچا سب سے پہلے حقدار کا خیال کریں گے مگر فہمیدہ کو ثمینہ اور احمدی سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لے اُڑیں!

"ارے شمن، عباس کے لیے گرم پانی بھجوا دیا ہو تا کہ ٹھنڈا نہ بیٹھی ہو" اماں نے ڈرتے ڈرتے کہا، بڑی کا مزاج بڑا تیز تھا۔

"اے شمن بیٹی خاک اتنا سوچیں گی۔ نوری، جاؤ تو ذرا میری بجلی کی انگیٹھی پر پانی گرم کر کے اُوپر لے جاؤ" یہ بڑی آپا بولیں۔

مگر اس سے قبل کہ نوری پانی گرم کرتی چھوٹی ممانی منہ دھلوا فخریہ عباس میاں کو لے کر اوپر سے اتر آئیں، سب کے سب منہ دیکھتے رہ گئے اور وہ مسکراتی ہوئی اسے کرسی پر بٹھا کر پان لگانے لگیں۔

چچا غریب تو لوٹ گئے اور سمجھے بھی نہیں کہ کیوں اتنی خاطریں ہو رہی ہیں۔ بیچارے کو بڑی آنکس سی محسوس ہوتی۔ وہ تو بیچارے الٹی خوشامدوں کے عادی تھے، جب آتے تھے ڈیوڑھی میں پلنگ ڈلوا دیا جاتا تھا، وہیں سینی میں کھانا بھیجا جاتا۔ سارے کنبے کی خوشامدوں سے وہ ہول کھا گئے، پر جلدی ہی اُنہیں معلوم ہو گیا کہ خاندان میں ضرورت سے زیادہ لڑکیاں ہیں اور لڑکے کم اور نتیجۃً بوکھلا بوکھلا کر کبھی وہ عباس کے لیے ثمینہ کو پسند کرتے اور کبھی نوری پر رحم آ جاتا تھا۔ ثمینہ کی عمر جا رہی تھی تو نوری کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ وہ یتیم تھی۔ کبھی بلقیس پر مہربان تو کبھی حسنا پر، کبھی شمن پر عنایت کی بارش تو کبھی احمدی پر۔ ان کا بس چلتا تو وہ ساری کی ساری لڑکیوں کو ایک دم بیاہ لیتے۔

وہ کسی کام کو کہتے تو سارے گھر میں کھلبلی پڑ جاتی۔ مائیں لڑکیوں کو دوڑاتیں اور وہ بیچاریاں کھسیانی ہو کر رہ جاتیں۔ ایک مقابلہ ہو رہا تھا، گویا دیکھیں کون چچا جی کو خاطروں سے بے حال کر کے ٹرافی، یعنی عباس کو، جیت لے جاتا ہے۔ بڑی آپا نے تو ایک نئی ہی ترکیب نکالی، وہ یہ کہ نوری انگریزی کے جملوں کے معنی پوچھنے عباس کے سر پر سوار کر دی، مگر ثمینہ ماشاء اللہ خود ہوشیار تھیں اور عباس کی زیادہ تر توجہ اُن ہی کی طرف رہتی تھی۔ نوری کو وہ بچہ سمجھتے، شمن کو بدمذاق اور احمدی کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے، اس بیچاری کا نتیجہ تو صاف ظاہر تھا۔

ثمینہ بی کچھ لجائی شرمائی عباس کے مذاق کا جواب دیتی رہتیں۔ اُن کے لیے سویٹر بننا شروع کر دیا تھا جسے خالہ بی بھی بنواتی جاتیں۔ بلقیس حد سے زیادہ شرمیلی تھی، پھاتماں کے ٹہوکوں پر مجبور ہو کر بڑھتی اور پیچھے کھنچ آتی۔ شام تاش پچیسی کا جماؤ ہوتا۔ چچا گالیاں بک بک کے پل باندھ دیتے۔ ایک دفعہ اسی طرح گالی بکنے پر اماں نے

اُن سے پردہ کر لیا تھا پر آج سب مہذب بیبیاں کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔ خالہ بی پنکھے کے پیچھے منہ چھپا کر خی خی ہنستیں۔ چچا خوب بے ایمانیاں کرتے مگر شریر بچہ سمجھ کر معاف کر دیے جاتے۔ چچی اُبلی دلیواروں پر سیک کی پچکاریاں مارتیں کہ اماں لرز لرز اٹھتیں مگر کیا مجال تھی جو کوئی بول جائے۔ بات یہ تھی کہ عباس بادا اماں کے غلام تھے۔

یوں تو عباسؔ ثمینہؔ سے سب سے زیادہ متاثر تھے مگر جونہی وہ کسی کام سے ہٹتی وہ احمدیؔ، شمنؔ یا بلقیسؔ پر مہربان ہو جاتے۔ مذاق تو وہ سب ہی لڑکیوں سے کرتے اور اُن کے مذاق کا رُخ دیکھ کر ہی سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچ جاتی۔ ویسے ثمینہ سب سے بڑی تھیں اور پہلا حق ان کا تھا، یہاں تو بحث کی گنجائش ہی نہ تھی۔ شمنؔ کے باپ کے احسانات چچا کی جان پر بہت تھے لہٰذا یہاں کی کوئی کسر نہ رہ گئی تھی۔ نوریؔ یتیم تھی اور یہاں خاندان والوں کی شرافت اور عباسؔ کی عالی ظرفی کا سب کو یقین تھا۔ پھر فیصلہ کیسے ہوگا؟ سب منتظر تھے۔

ویسے عباسؔ بہت ہی دلچسپ تھے۔ جونہی وہ اندر آتے لڑکیاں کسی نہ کسی بہانے سے جمع ہو جاتیں اور پھر یا تو ان کا بٹن ٹوٹ جاتا جسے بلقیسؔ، احمدیؔ یا شمنؔ ٹانکتیں یا ثمینہؔ کی چھنگلیا کے پاس والی انگلی میں نظر نہ آنے والی پھانس چبھ جاتی جو کبھی سے نہ نکلی پر جاسے کی طرح کھٹکا کرتی۔ جب عباسؔ اس پھانس کو نکالتے تو ایسے ایسے جملے سوجھتے کہ ثمینہؔ پسینہ پسینہ ہو جاتی:

"بھئی اس شریر انگلی کا بس ایک علاج ہے یہ وہ ہنستے۔

"بھلا کیا علاج ہے وہ؟ وہ آپ کر دیجیے نا" ثمینہ شرماتیں۔

"اس کا علاج یہ ہے کہ ایک جگمگاتی ہوئی انگوٹھی..."

"ہٹیے!" وہ شرما کر ہاتھ کھینچ لیتی، خالہ کی باچھیں کھل جاتیں۔

"اچھا خیر لیجیے، اب کچھ نہ کہوں گا"

اس کے علاوہ نوریؔ روز بروز انگریزی کے الفاظ میں کمزور ہوتی جاتی۔ بڑی آپا غم و فکر سے گھلنے اور ڈانٹوں کے مارے نوریؔ کو نگلے لیتی۔ چچا مرغِ مسلم کھاتے

کھاتے ادھر مرے ہو گئے۔ بیچی نے گاجر کا حلوہ اتنا نگلا کہ معدہ جواب دے گیا۔ فہمیدہ کے دوپٹوں کو رنگتے اور چھیتے ثمینہ اور احمدی کے انگوٹھے سوج گئے۔ سب سانس روکے فرائض میں غرق صبر سے نتیجہ کا انتظار کر رہے تھے۔ دیکھئے اونٹ کس کل بیٹھتا ہے، کس کی قسمت جاگتی ہے!

ثمینہ کو عباس پسند تھے۔ اس لیے ہی نہیں کہ اُن کے بال گھونگریالے اور آنکھیں غلافی تھیں بلکہ وہ ہنساتے جو بہت تھے۔ بیٹھے بیٹھے گال میں چٹکی بھر لینا ایک دم سے درد سر کا بہانہ کر کے گھٹنے پر لیٹ جانا پان بجائے ہاتھ کے منہ میں لینا اور لیتے وقت انگلی دانتوں سے دبانے کی کوشش کرنا، بھوسے میں سان یا گھٹنا مسل دینا وغیرہ۔

جاڑوں کے دن سب رضائیاں اوڑھ کر بیٹھ جاتے اور ان رضائیوں کے بادلوں میں عباس کے ہاتھ بجلیوں کی طرح کوندتے۔ لڑکیوں کے گروہ میں ننھی ننھی لرزشیں مچل مچل کر بکھر جاتیں۔ وہ دور ہٹتیں لیکن پھر سمٹ آتیں۔ گھر کے بزرگ بھی و بچتی، کے ہنسی مذاق سے ذرا دور پان چھالیہ میں غرق بیٹھے رہتے مگر ان کے کان انھیں کی طرف لگے ہوتے۔

رات کو جب سب لڑکیاں کھسر پھسر کرتیں تو عباس کی ڈالی ہوئی چنگاریاں دہک اُٹھتیں۔ سوائے ثمینہ کے وہ سب ایک دوسرے سے بے تکلف تھیں اور ان کے دلوں میں ذرا بھی تو رشک نہ تھا۔ گوپیوں کی طرح وہ مل جل کر ایک ہی کرشن کی بانسری کی لے پر ناچتیں، اور جب عباس راس رچانے کے لیے کھانے یا آرام کے کمرے میں آتا تو وہ سب کچھ بھول کر اس کے گرد منڈلانے لگتیں، مگر ثمینہ زیادہ تر فہمیدہ کی دیکھ بھال میں لگی تھی۔ وہ اسے اکیلے میں بھابی کہہ کر چھیڑا کرتی تھی، ثمینہ نے اُسے سب کے سامنے کہنے کو منع کر دیا تھا۔ وہ اب عباس سے اور بھی زیادہ شرمانے لگی تھی۔ خالہ بی دن رات گوکھرو، لچکوں اور کرنوں کے ذکر کیا کرتیں۔ ان کی اندھیری کوٹھڑی میں کچھ دن سے مراد آبادی اور تانبے کے برتنوں کی آواز گونجنے

لگی تھی۔

بڑی آپا بھی غافل نہ تھیں۔ انھوں نے چٹ پٹ چوہے ریتیاں تڑوا کر نئے فیشن کے دست بند بنوانے شروع کر دیے تھے اور ہر وقت چلبی کے ان مٹلوں کا ذکر کرتیں جو وہ کلکتے یا بمبئی سے منگوا لینے والی تھیں۔ جو ایک دم سے سب کچھ ساتھ طے ہو گیا تو بیچاری مارے ہولوں کے مر نہ جائیں گی۔

شمن کی اماں دم سادھے ہوئے تھیں کیونکہ ذرا سی دیر میں بڑی آپا اپنے بے وقت مرنے والے میاں کو یاد کر کے ماتم شروع کر دیتی تھیں۔ منافی ہو کر نواسی کا پیغام چلبی لیتیں؟ پھر بھی آپا . . . . احتیاطاً طعنے دیتی رہتی۔

"اے ہے لوگ یتیم بیوہ کا خون چوسنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ارے بھئی، لڑکوں کو تو بہت مل جائیں گے، یتیم کو جڑ جائے تو بہت جانو۔ قرآن پاک میں بھی یہی لکھا ہے کہ پہلے یتیم بیوہ کا حق، پھر . . ." مگر خالہ بی تو یہ باتیں سن کر بالکل بھولی انجان بن جاتیں؟ وہ جہیز کی تیاری میں منہمک تھیں!

اس کے علاوہ اور بھی قیاس آرائیاں ہوتیں، جیسے گھوڑ دوڑ کے میدان میں لوگ موسم دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں اسی طرح بڑی آپا خالہ بی سے اور چھوٹی ممانی سے باتیں کرتیں۔

"نہیں بی میری بات مانو یا نہ مانو پر دیکھ لینا وہ بلقیس سے تو کرنے کا نہیں۔ ہاں اپنی نوری . . . !" ممانی آپا کو خوش کرتیں۔

"اے بی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ تمیزن تو کیا شمن سے ہی کر لے تو بہت جانو۔" بڑی آپا جواب دیتیں۔

"دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔ ویسے تمھاری خالہ بیچی جھاڑ کے پیچھے تو پڑ گئی ہیں۔ اے کل آنکھ کے نشہ کا لحاف بنایا ہے کیا موا چھچھورا اور ذلالوں جیسا میں نے تو کہہ دیا بہن . . ."

غرض ایسا معلوم ہوتا تھا میدان میں گھوڑے چھوٹ پڑے، کبھی ایک

آگئے تو کبھی دوسرا آگیے۔ یا جیسے انٹرویو ہو رہا ہے، لوگ اپنی اپنی سی کر چکے ہیں، نتیجے کا بے صبری سے انتظار ہے۔ چچا چچی پیغام دے ہی نہیں چکے" اور نہ ہی منہ سے پھوٹتے ہیں۔ کھایا پیا اور پیر پسار کے سو گئے، اور یہاں سب کی نیندیں حرام ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ہر ایک کے دروازے پر بارات کھڑی ہے مگر دولہا اندر قدم نہیں رکھ چکتا۔

ادھر عباس نے آنکھ مچولیاں کھیلنا شروع کر دی تھیں۔ بلقیس جب پچھلے برآمدے سے چھالیا نکال رہی تھی تو نہ جانے عباس کدھر سے آن پہنچے اور پکڑ لیا، بڑی مشکل سے بھاگی۔ اور پھر ایک دن شمن جو ایک دم ڈرائنگ روم میں چلی گئی تو وہ ثمینہ خاتون کو گھیرے کھڑے تھے۔ ثمینہ تو بھاگ گئی پر جب شمن جانے لگی تو عباس نے ہاتھ پکڑ لیا: "کہو گی تو نہیں؟ کیوں شمن؟"

"کیوں نہیں کہوں گی۔ چھوڑ دیجئے ذرا۔" شمن نے ذرا شرارت سے کہا اور ہنسی۔

"نہیں نہیں۔ دیکھو کسی سے نہ کہنا۔ سنو۔۔۔" اور وہ کوئی بہت ضروری بات سنانے اور قریب آگئے۔

"اچھا بھئی چھوڑ دیجئے تو، کسی سے نہ کہوں گی۔" وہ اپنی جان چھڑانے لگی۔

"اوں ہوں۔ قسم کھاؤ ہمارے سر کی قسم کھاؤ پہلے۔" عباس نے گھسیٹ کر اسے اور قریب کر لیا۔

"اچھا۔ اچھا آپ کے سر کی قسم، چھوڑ دیجئے۔" وہ بوکھلائی۔

"لیکن سنو تو۔" انھوں نے اُسے بھینچنا چاہا۔

"شمن!" انھوں نے تڑپ کر بھاگتی ہوئی مچھلی کو پکڑنے کی ناکام کوشش کی۔

دیر تک وہ جھلائی ہوئی ہانپتی رہی۔ عباس کے قرب سے نہ جانے کیوں اُسے اتنی گھن آئی۔ وہ اُن سے نفرت کر سکتی تھی مگر دور سے، یہ اتنے قریب کی چہلیں اُسے بڑی کڑوی معلوم ہوئیں۔

"کیوں؟" وہ دیر تک سوچتی رہی۔ عباس کے بال مشہدی سے کتنے ملتے تھے۔ وہ کچھ

قہقہے بھی اُسی کی طرح لگاتے تھے مگر سلمہ پھر کیا چیز تھی جس سے اُسے گھن آئی؟ لوگ ایک ہی چمچہ منہ میں ڈال ڈال کر کھاتے ہوں تو بس متلا ہی جاتا ہے۔ اس منہ کا لعاب اُس منہ میں! توبہ! تھوڑی دیر ہی پہلے ثمینہ بھاگی تھی ... اور ....

عباس کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور جانے کے خیال سے وہ اُداس ہو جاتا۔ اُس کے ساتھ ساتھ لڑکیاں بھی بددل ہو جاتیں اور سارے بڑھے بوڑھے بھی سہم جاتے۔ وہ ایک ایک دن ٹال رہا تھا اور بڑی سنجیدگی سے لڑکیوں کو اندھیرے اُجالے گھیر رہا تھا۔ اور ادھر بھی چاروں طرف ٹھکیاں کھلی تھیں، دانے ڈالے جا رہے تھے، جال پھیلے جا رہے تھے اور شکاری لاسہ لگائے آس میں بیٹھے تھے۔

شادی بیاہ کے دن رات چرچے ہوتے مگر چچی اور چچا منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ آخر خالہ بی کے صبر کا پیمانہ چھلک ہی گیا۔ چچا کے جواب سے ایسا معلوم ہوا ایک آندھی آئی اور آبادیوں کی آبادیاں ویران کرتی چلی گئی۔ آئی۔ سی۔ ایس کا انٹرویو ہوتا ہے۔ کامیاب طلبہ کیسے ہشاش بشاش مسکراتے ہوئے مٹھائیاں بانٹتے ہیں۔ نذر نیاز پوری کی جاتی ہے اور جو بیچارے قسمت کے مارے رہ جاتے ہیں ان کے یہاں چھوٹی موٹی موت سی ہو جاتی ہے، ہزاروں ارمانوں کا خون اور لاکھوں تمناؤں کا قتل! لیکن اگر یہ معلوم ہو کہ گورنمنٹ نے دھاندلی کر کے آئی۔ سی۔ ایس کا عہدہ ہی توڑ دیا تو یہ ایک قومی اور ملکی موت کہلائے گی۔ یہی ہوا کہ چچی کے چلنے سے پہلے سب کو عباس کی شادی کا زبانی بلاوا دے دیا۔ اُس شادی کا جو انگلینڈ جانے سے پہلے ہی ان ماسٹر صاحب کی لڑکی سے طے ہو چکی تھی جنھوں نے عباس کو تعلیم دلوائی تھی۔ لڑکی کانی بھینگی تھی اور غریب بھی مگر سگھڑ بہت تھی!

سگھڑ بہو نے نہ جانے کتنے جہیزوں، چوہے رتیوں اور آنکھ کے نشہ کے لحافوں پر جھاڑو پھیر دی۔ ایک دم اماں کو مرغیوں پر پیار آنے لگا۔ گاجر کے حلوے ختم ہو کر دوبارہ نہ بنے۔ فہمیدہ کو جو خالہ جوڑا دے رہی تھیں اُس کا دوپٹہ نہ جانے کہاں کپڑوں کے بیچ ہو گیا اور [illegible] احمدی کو بھا گیا۔ دلیا ور [illegible] بریک کی ...

ملبے اور گہرے زخموں کی طرح دلوں کے پار ہونے لگیں۔ چچا اور چچی ایک ضروری کام کی وجہ سے فوراً روانہ ہونے پر مجبور ہو گئے اور شمن کے ہسٹریا کے دورے پھر سے تازہ ہو گئے۔ نوری کی یتیمی مولا بخش کی سولی کی طرح اُبھر آئی اور منجھلی ممانی بلقیس کو نامراد بدنصیبن جلی کے خطابوں سے پکارنے لگیں۔

چچا اور چچی خوفناک پھوڑوں جیسی ٹیسیں کلیجوں میں چھوڑ گئے۔ چچی وہ تکیے بستر میں بھولے سے باندھ لے گئیں اور فہمیدہ شمن کے چاندی کے بندے اُتارنا بھول گئی۔ چچا سارے تاش کے پتے صندوق میں سان گئے اور عباس؟ نہ جانے کتنی آہیں اور شب بیداریاں چند معصوم دلوں میں چھوڑ کر چل دیا۔

(۲۱)

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہوتے ہی اس کا داخلہ ایک امریکن مشنری کالج میں ہو گیا۔ اب شمن کو معلوم ہوا کہ دنیا کتنی لمبی چوڑی ہے؟ اب تک تو وہ جیسے انڈے کی سطح پر رینگ رہی تھی چکنی بے رنگ اور لامتناہی مگر پھر بھی محدود، جتنا بھی چلے جاؤ وسعت ختم نہیں ہوتی، پھر بھی جہاں تھے وہیں۔ کالج میں قدم رکھتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے ڈاک گاڑی میں اڑی چلی آ رہی تھی کہ جنکشن آ گیا۔ اسے بہت جلد اس جنکشن کے غل غپاڑے میں ڈوب جانا پڑا۔ ادبی جلسے، دلچسپ لیکچر، پُرزور تقریریں، ہنگامہ خیز سیریں اور قیامت انگیز عشق بازیاں۔ پہلی بات جو وہ لڑکیاں بے تکلفی کی کرتی ہیں وہ عاشقوں اور چاہنے والوں کی ہی ہوتی ہے۔ لڑکیاں ایک دوسرے کا بھاؤ اسی ذریعے سے معلوم کرتی ہیں۔ مثلاً میری پر ساری یونیورسٹی مرتی ہے، بٹیا راٹھے پر سیاست کی پوری کلاس فدا ہے اور کملا پر سنسکرت کے پنڈت جی تین سال سے مر رہے ہیں، کشور پر فارسی کے استاد نیم جان تھے، باقی لڑکیوں پر بھی حصہ رسدان کے چچیرے اور ممیرے بھائی اور پڑوسی فدا تھے۔ کم از کم کالج کی فضا میں تو ان کا یہی عقیدہ تھا۔ کالج کے قوانین بڑے سخت تھے ویسے تو کسی کا سگا باپ بھی بغیر چھان بین کے ملنے نہیں دیا جاتا

تھا اس کے باوجود بھی عشق کا اتھاہ ساگر پڑا اٹھا ٹھیں مار رہا تھا اور اس معاملے میں چھلے ہوئے منہ اور مرجھائے ہوئے پیلے دانتوں والی میٹرن کی بھی کچھ نہ چلتی تھی۔

ان میٹرن سے سب کو ہی بغض للّٰہی تھا۔ شاید جنگ عظیم میں اُن کا عاشق مارا گیا تھا یا شاید چھوڑ چھاڑ کر چل دیا اور غریب نے اس بہانے کی آڑ میں پناہ لے لی۔ ہر لڑکی کے راز معلوم کرنے کی فکر میں لگی رہتیں۔ جہاں دس بجے اور اللہ کی بندی بجلی گل کرنے کے لیے سر پر سوار۔ وہ دو دو گھنٹے پہلے سے سونے کی تیاریاں شروع کر دیتیں۔ غسل کر کے منہ پر پالش کی جاتی، گنتی کے چار بال اینٹھ کر گھونگر بنائے جاتے اور یہی گھونگر بٹی ہوئی بتیوں کی صورت میں اُن کی پیشانی پر تھرکتے نظر آتے۔ ڈھیلا ڈھالا جاپانی کمونا جس پر اژدہوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اور بغیر ایڑی کی سلیپریں پہن کر جب وہ چلتیں تو ان کا ڈھلا ہوا جسم ایسے کلبلاتا گویا اُن اژدہوں میں جان پڑ رہی ہے۔

باوجود انتہائی نفرت کے ہر لڑکی کو ان کی خوشامد میں اتوار کو ان کے مرحوم عاشق کی تصویر کی تعریف کرنا پڑتی۔ یہ تصویر ایک فوجی گورے کی تھی۔ نہایت کریہہ، فٹ بھر لمبا کرخت چہرہ اور اوپر کا تنگ ہونٹ دانتوں پر سے ایسے کھنچا ہوا جیسے کسی پر غصے میں دانت پیس رہا ہے۔ مُنڈی بھویں اور چھدرے بال۔ بیالوجی کی لڑکیوں کا خیال تھا کہ میٹرن اور اس گورے کا بیج مل جاتا تو یقیناً گھوڑے کی کوئی عجیب الخلقت قسم پیدا ہوتی۔

یہ میٹرن کسی لڑکی کو بغیر عاشق کے تصور ہی نہیں کر سکتی تھیں حالانکہ خود بیچاری نن تھیں۔ ایک دفعہ پریما کا سگا بھائی آیا تو وہ برآمدے ہی میں کھڑی تھی، اجازت لینے کا خیال بھی نہ آیا اور وہ اس سے باتیں کرنے لگی، بلکہ شمن کو بھی ساتھ گھسیٹ لے گئی۔

بچارا زیندر حد سے زیادہ بوکھلایا ہوا رہا، پھر بھی جونہی میٹرن کو پتہ چلا ہانپتی ہوئی موقعِ واردات پر پہنچی۔ ہتیرا پریما نے کہا کہ وہ اُس کا سگا بھائی ہے، دوسرے نہایت چغد ہے مگر وہ نہ مانی اور رپورٹ کر دی۔ مگر پریما ایک چلتی پرزہ، وہ اُن

لگا یا کہ پرنسپل بھی خاموش ہو گئیں۔ پہلے تو دو ملاقاتی کارڈ ڈھونڈ کر اُن پر ملنے والوں کے نام لکھے گئے اور پھر ان پر شمن اور پریما کے سرپرستوں کے دستخط کرائے گئے جو ایک بی۔ اے کی لڑکی نے کر دیئے۔ ان کارڈوں کی رُو سے شمن کو نہ صرف پریما کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت تھی بلکہ وہ اُس کے گھر چھٹیوں میں جا کر دن رات رہ سکتی تھی۔ حالانکہ شمن اور پریما صرف دو ماہ سے کلاس فیلو تھیں لیکن ان کارڈوں پر لکھا تھا کہ ان کے والدین خاندانی دوست ہیں۔ یہ کارڈ پرنسپل کی میز پر چپکے سے رکھ دیئے جب پرنسپل آئیں تو پریما نے بڑی معصومیت سے کارڈوں کا ذکر کیا، بلکہ اخبار کے نیچے سے نکال کر اُن کے ہاتھ میں پکڑا دیئے، اُلٹی میٹرن پر ڈانٹ پڑی!

لہٰذا اتوار کو شمن پریما کے ساتھ اُس کے گھر گئی۔ نرہندر کے ساتھ اور چھ سات دوست بھی تھے مگر پریما نے زبردستی کی اور موٹر لبالب بھر گئی۔ دوپہر کا وقت، چلچلاتی دھوپ۔ لُو کے تھپیڑے جھلسائے دے رہے تھے مگر شمن کے جسم میں ٹھنڈی چنگاریاں رینگ رہی تھیں۔ عمر میں پہلی بار اتنے ڈھیر سے کھردرے کوٹ، بڑے بڑے جوتے اور بے درست ہیٹ اُس سے اتنے قریب آئے تھے۔ شاید ان دونوں پر رعب ڈالنے کے لیے سب زیادہ اترا رہے تھے۔ وہ پریما سے بے حد بے تکلف تھے۔ ان میں سے ایک، جسے سب ٹٹو بٹو کہہ رہے تھے، پریما کے شانے سے لگا اُونگھ رہا تھا اور ہر جھٹکے کے ساتھ اُس کا سر پریما کے سینے پر آن گرتا جس پر پریما دانت پیس کر اس کے گھنے بالوں کے گچھے جھنجھوڑ ڈالتی۔ انور اُس کے برہنہ بازو پر اپنی تین دن کی مونڈی ہوئی مونچھیں چبھونے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ نہایت فراٹے سے نہ جانے کیا اُوٹ پٹانگ قصہ شمن کو سنانے میں غرق تھی۔ موٹر احاطے میں گھومتی ہوئی برآمدے کے سامنے رُک گئی۔ بیٹھے بیٹھے جوڑ سُن ہو گئے تھے، بڑی مشکل سے ٹانگیں کھینچ کھینچ کر نکالیں اور سب چیختے چلاتے اندر چلے۔

شمن سب سے پیچھے تھی۔ اُس نے دیکھا کہ پریما کسی سے [illegible]

دوست چیخ چیخ کر اُن دونوں کی ہمت افزائی کر رہے تھے، آخر کو پریما پست ہو کر صوفے سے لڑھک پڑی!

"شاباش رائے صاحب!" نریندر نے حریفِ مخالف کی پیٹھ ٹھونک کر کہا۔

"ارے شمن... رائے صاحب یہ ہے وہ شمن۔" پریما نے تعارف کرایا۔

"ہوں!" وہ چشمے کے نیچے سے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر بولے۔ اُن کے ہونٹوں میں ایک لمبا سا سگار جھول رہا تھا اور اس میں سے دھوئیں کی لمبی لمبی چسکیاں لے کر وہ ہونٹ گول کرنے سے باریک ڈوروں کی صورت میں پھونک رہے تھے۔ پاس ہی اسٹول پر زگوں کی طشتری اور برش بکھرے پڑے تھے اور سامنے ایک عورت کی نامکمل تصویر دیوار پر چسپاں تھی۔

شمن آنکھ بچا کر غور سے انھیں دیکھنے لگی۔ خوب مضبوط گٹھا ہوا جسم، اونچا قد اور تپے ہوئے سونے جیسا رنگ، اُس پر چاندی سے بھی زیادہ اُجلے بالوں کا ڈھیر! یہ عجیب و غریب صورت دیکھ کر شمن ایسی بوکھلائی کہ اسے یاد بھی نہ رہا کہ وہ کتنی دیر سے انھیں گھور رہی ہے، کہ ایک دم سے رائے صاحب بولے:

"ارے... کیا نام ہے اس لڑکی کا؟ کچھ جنگلی سی معلوم ہوتی ہے۔"

"شمن!" دو تین گلے ایک دم چلائے۔

"چمن؟"

"نہیں، شمن!"

"ادھر آ... چمن!" رائے صاحب نے دھوئیں کی ڈوریاں پھونکتے ہوئے کہا۔ شمن اُٹھ کر گئی۔ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے وہ اُس کے قریب آ گئی اور ایسے تمسخر سے دیکھنے لگے گویا وہ کوئی عجیب و غریب جانور ہے۔ شرارت سے اُن کے چہرے کے چھوٹے چھوٹے خط و خال مسکرا رہے تھے اور بھنویں پھڑک رہی تھیں۔ ایک دم سے انہوں نے اس کی آنکھوں کے پپوٹے کھینچ کر دیکھے۔

"زبان نکالو" انھوں نے سنجیدگی سے کہا۔ شمن نے بے ساختہ زبان نکال دی

جس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا اور وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ آئی۔

"کیا بات ہے، کچھ بھوکی معلوم ہوتی ہے۔ ارے پریما کچھ دانہ پانی تو ڈال اس چڑیا کے لیے۔ کیا ہے تیرا نام۔۔۔ چمن؟"

"شمن رائے صاحب!" پریما چلائی۔

"شمن؟ یہ شمن کیا ہوتا ہے؟ نہیں ہم تو اسے چمن کہیں گے۔ اسے کھانے کو دو کچھ ارے بٹیرو تو اتنی پیلی کیوں ہے؟ کیا تیرے پاس پوڈر سوڈر کچھ نہیں؟ ادھر آ" اس سے پہلے کہ شمن کچھ سمجھتی رائے صاحب نے اس کے گالوں پر برش سے سرخ رنگ لگا دیا، کھسیا کر وہ ہتھیلیوں سے گال رگڑنے لگی۔

"بڑے خراب ہیں آپ، ہٹیے!" پریما نے انھیں دھکیل دیا اور شمن کو غسل خانے میں لے گئی۔

شام کو رائے صاحب اور سب لوگ تیرنے کے لیے حوض میں اترے۔ شمن کو تیرنا نہیں آتا تھا اس لیے وہ کنارے پر پانی میں پیر ڈال کر بیٹھ گئی۔ رائے صاحب دو تین دفعہ اوپر سے کودے اور بڑی دیر تک تیراکی کے کمالات دکھاتے رہے، کبھی چت تیرتے تو کبھی پٹ اور کبھی دیر دیر تک پانی میں غوطہ لگا جاتے۔

"ارے یہ چل کوا کیسا بیٹھا ہے" انھوں نے شمن کو کنارے پر پیر لٹکائے دیکھ کر چھیڑا۔ "یہ پانی میں کیوں نہیں اترتی؟" جب پریما نے بتایا کہ وہ تیرنا نہیں جانتی تو انھوں نے اس کے کان میں کچھ کہا اور غوطہ مار گئے۔ شمن حیرت سے منہ پھاڑے پانی کو گھورتی رہی کہ اب نکلیں اور اب نکلیں کہ ایک دم سے سب چلائے:

"مگر۔ مگر!" اور شمن غڑاپ سے پانی میں! اور بدحواس ہو کر رائے صاحب کو ناخنوں سے کھرچنے لگی جو اسے ڈوبنے سے بچانے آئے تھے

"ہیں ہیں۔ ارے نوچے گی تو پھر مگر کو دے دوں گا۔" شمن کھسیا کر بسورنے لگی اور سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

رات کو جلدی جلدی کھانا کھایا گیا، اس کے بعد سب ڈرائنگ روم میں جمع

ہو گئے۔ سب کی رائے ہوئی کہ ناچ ہو۔ پہلے تو پریما نے اپنے تازہ سبق کا مظاہرہ کیا۔ اور جب وہ تھک گئی تو سب چلائے: "رائے صاحب، رائے صاحب!"

پہلے تو رائے صاحب خاموش رہے، پھر انھوں نے سگار طشتری میں ڈال دیا اور دیوار کی طرف پشت کر کے خاموش کھڑے ہو گئے۔ باجا بجتا رہا اور وہ پاؤں جمائے دیوار پر گھورتے رہے، پھر آہستہ سے انھوں نے کرتا اتار کر ہوا میں اچھال دیا اور اپنے برہنہ بازوؤں کو سہلاتے رہے۔ پھر شمن کا منہ حیرت کے مارے پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ بجلی کی سی تیزی سے وہ مڑے اور ان کا کسرتی جسم سر تال پر لہرانے لگا، جیسے کوئی سنگین چٹان یکایک انگڑائی لے کر جاگ اٹھا ہو۔ وہی بدن جو کچھ دیر پہلے قد سے بوڑھا معلوم ہو رہا تھا کھنچے ہوئے ستار کی طرح بج اٹھا۔ سڈول قبضوں کی بے پناہ جنبش، پنڈلیوں کا مضبوط خم اور چوڑے چکلے سینے کا جلال۔ معلوم ہوتا تھا سُر باجے سے نہیں بلکہ ان اعضا کی لوچدار جنبش سے نکل رہے ہیں۔ انگلیوں کی حرکت، پیر کا دھماکا اور مچھلیوں کی ہر لرزش نغمہ بن کر پھیل گئی۔ پشت پر روشن لیمپ چاندی جیسے گھنے اور خمدار بالوں کو ترشے ہوئے ہیروں کی طرح منور کر رہا تھا۔ ایک دم جیسے طوفان کی رفتار تیز ہو گئی۔ ساز دوگن میں بجانے لگے۔ قہر و غضب کا پُرجلال دیوتا پُراسرار دنیا سے نکل کر غیظ و غضب کے کوڑے برسانے لگا۔ دھم دھم گرج کے ساتھ کائنات کو ہلا کر رکھ دیا۔ رائے صاحب ایک ہیبت ناک پہاڑ معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی سفید دھوتی سمندر کے جھاگوں کی طرح قدموں میں لہریں لے رہی تھی۔ ان کے نقرئی بال بالکل ایسے معلوم رہے تھے جیسے پہاڑ کے پیچھے سورج طلوع ہو رہا ہو۔

ساز رک گئے، ناچ ختم ہو گیا مگر شمن کا دماغ ناچتا رہا اور جب مذاق میں رائے صاحب نے زور سے "ہو" کر کے اس کے آگے تالی بجائی تو بے ساختہ اس کی گھگی سی بندھ گئی اور اگر سب نہ ہنس پڑتے تو وہ بالکل ہی بدحواس ہو جاتی۔ وہ حیران سب کی صورتیں دیکھنے لگی اور پھر خود بھی قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"ڈرپوک چوہیا!" رائے صاحب نے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر

جھکول ڈالا اور اس کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

"بول سیکھے گی تو بھی ؟"

شمن نے دانت نکال کر سر ہلا دیا۔

"ہنہ! بڑی آئی سیکھنے والی۔ پریما ذرا اس چھوکری کو دیکھنا کہتی ہے ناچ سیکھے گی۔ ارے بھئی لانا تو ڈگڈگی، میں ذرا اس کو ناچ سکھا دوں۔"

"میں کوئی بندریا ہوں؟ واہ!"

"اوہو! بندریا نہیں تو پھر کیا بھالو ہے؟ اچھا مٹھائی لا اور شاگرد بن جا۔"

"پہلے آپ سکھائیے تو پھر مٹھائی لاؤں گی۔"

"واہ بھئی خوب رہی۔ پہلے فیس دو، تبھی تو ناچ سکھائیں کہ وہ ویسے ہی؟ بس دو مہینے میں تیتری کی طرح ناچنے لگے گی۔"

"واہ میں تو آپ کی طرح... آپ..."

"شمن، رائے صاحب نے میری تو مٹھائی ہضم کر لی اور کچھ نہیں سکھایا" پریما بولی۔

"ارے شش، خاموش۔ ہاں کیا نام ہے لڑکی تیرا؟ چمن؟ اچھا مٹھائی جانے دے بس تو اب کے چھٹی میں آ کر ہمارے کرتے میں بٹن ٹانک دے اور ہم تجھے ناچ سکھا دیں گے، سمجھی؟"

"بٹن؟"

"ہاں بٹن۔ سب کرتوں کے بٹن ٹوٹ گئے ہیں۔ یہ جو پریما ہے نا، ایک دم ردی، نکمی! بس شوخی کرنا جانتی ہے۔" پریما اس تعریف پر اترا اٹھی اور رائے صاحب کی گود میں لد گئی۔

بٹن ٹانک کر ناچ سیکھنے کا پکا وعدہ کر کے وہ پریما کے ساتھ ہی ہوسٹل لوٹ آئی۔ راستے بھر وہ رائے صاحب کی باتیں دوہرا کر ہنستی رہی۔ جسم کو پلنگ پر ڈال کر ایسا معلوم ہوا جیسے وہ میلوں کی دوڑ لگا کر آئی ہے۔ ناچ کے تاثر میں اب تک اُس کی روح پھنسی ہوئی پیچ در پیچ گھوم رہی تھی۔ نہ جانے کیوں آج اُس کا دل کسی

مقناطیسی طاقت کے آگے ماتھا ٹیک دینے کو چاہتا تھا، آج اس کے دل میں عبودیت نوخیز کلی کی طرح کھل رہی تھی۔

"رائے صاحب کا نام کیا ہے؟" اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں پریما سے پوچھا۔

"اے، پگلی! میرے پتا جی ہیں رائے صاحب!" پریما ہنسنے لگی۔

"مگر۔۔ مگر پریما!" وہ پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیوں؟" اُس نے کروٹ لے کر پوچھا۔

"کچھ نہیں پریما۔" وہ خاموش ہو گئی۔

"ہم انھیں رائے صاحب کہتے ہیں، انھیں سب ہی رائے صاحب کہتے ہیں۔ بڑے اچھے ہیں، میرے اوپر جان چھڑکتے ہیں۔"

شمن چڑ گئی۔ اس کا جی چاہا پریما کو ڈانٹے کہ وہ کیوں اُن سے جان چھڑکواتی ہے مگر پھر یہ بات اسے انتہائی بے تکی معلوم ہوئی، وہ خاموشی اپنے سینے سے چپٹائے آگے پیچھے جھولتی رہی۔ لوہے کے پلنگ کے زنگیائے ہوئے تاروں سے اکھڑا اکھڑا نغمہ نکل کر اُسے سوچنے میں مدد دینے لگا۔

(۲۲)

شام کو لڑکیاں اُونچے اونچے سیاہ بلومر اور جمپر پہن کر کالج کے میدان میں آزادانہ چھلانگیں لگاتیں، مالی، بیرے اور چوکیدار برہنہ رانوں اور سڈول پنڈلیوں کو گھور گھور کر آنکھیں سینکتے۔ چھوٹا جمعدار بھی شام کو اسی وقت برآمدے جھاڑتا۔ میٹرن کو اس جمعدار سے خاص عناد تھا۔ وہ اُن کے ہاسٹل میں صفائی کرتا تھا اور بقول اُن کے نہایت ہی بدمعاش اور بدنگاہ تھا۔ زیادہ تر وہ اُسے ڈانٹتی ہی نظر آتیں۔ جب دیکھو جب ہوسٹل کے سنسان کونوں میں اُسے گھیرے ایک آدھ تار مکڑی کے جالے کا، دو چار آوارہ تنکے دکھا دکھا کر ڈانٹ رہی ہیں، مگر وہ بھی بلا کا ضدی تھا، سر جھکائے اپنے سفید دانت چمکایا کرتا۔ وہ اُس پر جھلا جھلا کر چڑھی بیٹھتی تھیں، مگر وہ انہیں ٹوٹی ہوئی

جھاڑو سے بھی زیادہ ناکارہ سمجھتا۔ اُس کی جھاڑو کے سپاٹوں سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ کبھی کا اپنی دانست میں کوڑے کے ساتھ جھاڑ چکا ہے، یہ اُن کا ڈھیٹ پن تھا کہ پھر بھی ٹوٹی پڑتی تھیں۔ نہ معلوم اُسے دیکھ کر انہیں کیا ہو جاتا تھا۔ جب وہ لڑکیوں کو گھورتا تو وہ بلبلا اُٹھتیں۔ اپنی چھوٹی سی مونڈھیا پر بیٹھ کر تاسف سے سر ہلاتیں۔ انھیں تعجب تھا کہ ذہن میں لڑکیاں ان غنڈوں کی آنکھیں اپنی رانوں پر رینگتی ہوئی بھی نہیں محسوس کرتیں۔ وہ خود اپنا پھنسا ہوا فراک اور اُبلتے ہوئے کولہے جو مونڈھیا کے چاروں طرف پہاڑ کی چٹانوں کی طرح جھولتے رہتے سمیٹنے میں مشغول رہتیں۔ نہ جانے اتنی نحیف ونزار مونڈھیا ان کا وزن کس طرح برداشت کر رہی تھی! وہ اس ظالمانہ انداز سے اُس پر پہلو بدلتیں گویا وہ چھوٹے مہتر پر سوار اُسے دبانے کی کوشش کر رہی ہیں ان کا بس نہیں تھا ورنہ وہ اُس کی ہڈیاں چیر کر جھاڑو بنا ڈالتیں یا اُس کے خون سے فرش دھلوا ڈالتیں۔ وہ اس کی بدمعاشی کو ہندوستان کی مذہبی تنگ نگاہی پر محمول کرتیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ عیسائی ہو جائے تو یقیناً اُس کی سیاہ روح پاک ہو جائے۔

بڑے سازداری کے انداز سے وہ لڑکیوں سے اُس کے چال چلن کے بارے میں گھما پھرا کر سوال کرتیں، وہ انہیں چھپ کر جھانکتا تو نہیں ہے کمرہ صاف کرتے میں کوئی فحش اشارے تو نہیں کرتا؟ اس کی مسکراہٹ بڑی لرزہ خیز تھی۔ ایک مہتر تھا نینی تال میں، جہاں وہ پہلے پہل نوکر ہوئی تھیں، وہ اکیلے دوکیلے لڑکیوں کو پکڑ کر چوم لیا کرتا تھا۔ ایک اور بھنگی جبلپور مشن اسکول میں اُنھیں نہاتے میں چھپ کر دیکھا کرتا تھا۔ یہ بھنگی لوگ ہم لوگ کو بڑا حیران کرتے، ان کا عورت بھی بہت خراب کرتے ہیں۔ یہ قصے سناتے وقت ان کی دھنسی ہوئی بے رونق آنکھیں گزشتہ زمانے کے خزانِ نعمت کی یاد میں بھوکی بھوکی ہو جاتیں اور ہونٹوں پر شدت سے پسینہ پھوٹ نکلتا۔ بیچاری سفید دیوداسیاں بجائے وجیہہ قباؤں والے کاہنوں کے ان کالے بھنگیوں کے ہتھے چڑھ رہی تھیں۔ ان کی سیاہ روحوں کو خدا باپ کے قدموں تک گھسیٹ لے جانے میں وہ خود غلاظت کی دلدل میں گھسٹے جاتیں۔ ان میموں کی یہ گت دیکھ کر رونگٹا

کھڑے ہو جاتے۔ ایک فاتح قوم ہندوستان کی جھلسا دینے والی ہوا اور ہندوستانیوں کی پاگل کر دینے والی تاریک ذہنیت کے آگے بالکل ہاری ہوئی اور شکستہ نظر آنے لگتی۔ وہ گلاب کو شرما دینے والی رنگتیں، تیل میں ڈوبے ہوئے پرانے چمڑے کی طرح سوکھ جاتیں، وہ آسمان کی نیلاہٹ سے زیادہ شفاف آنکھیں سوکھے تالاب میں پیاسے مینڈکوں کی طرح اُبل آتیں، بال اور پلکیں خزاں رسیدہ پتوں کی طرح غائب، جگہ بہ جگہ گوشت کے اُبھار، تنگ جوتوں میں سے ٹخنوں پر کے گوشت کے جھولتے ہوئے لوتھڑے۔ یہ تھیں وہ چیزیں جو باقی رہ جاتیں۔ میٹرن جب ہندوستان آئی تھیں تو جنگِ عظیم کی لُو سے جھلسی ہوئی مگر نوخیز کلی تھیں۔ اور اب گوبھی کی پالا ماری گانٹھ کی طرح بکھری جاتی تھیں۔

بھنگی سے اُن کی ایسی لاگ ڈانٹ بڑھی کہ ایک دن وہ چھتری لے کر اس پر پل پڑیں۔ اسے مار کر وہ پسینے میں شرابور روتی ہوئی کرسی پر گر گئیں۔ لڑکیوں کے ٹھٹ کمرے پر ٹوٹ پڑے۔ بظاہر سب ہمدردی ظاہر کرتی رہیں لیکن کسی کو بھی اتنی توفیق نہ ہوئی کہ اُن کے ماتھے پر سہلاتی تاکہ ان کا جی ٹھکانے ہوتا۔ دوسرے ہوسٹل کی میٹرن کو خبر ہوئی اور وہ دوڑی ہوئی آئیں، لڑکیوں کو بھگایا اور ان کے جسم کو، جو ربڑ کے فیتوں اور ڈوریوں سے مصنوعی گڑیا کی طرح جکڑا ہوا تھا، ذرا ڈھیلا کیا تو ہوش ٹھکانے ہوئے۔ علم نفسیات کی لڑکیاں آپس میں سرگوشیاں کر کے قہقہے لگانے لگیں۔ بات پرنسپل تک پہنچی اور چھوٹے مہتر کو میتری بھون ہوسٹل میں بھیج دیا گیا۔

بیچاری معاملات کی اس الٹ پھیر کے لیے بالکل تیار نہ تھیں اور نہایت بُردباری سے سر ہلا کر کہتیں کہ پرنسپل کو اپنے اس فیصلے پر پچھتانا پڑے گا۔ اُن کے دباؤ سے نکل کر بھنگی ساری لڑکیوں کو خراب نہ کر دے تو بات نہیں!

چھوٹے بھنگی کے بجائے بڈھا مہتر، جو بانیٔ کالج کے زمانے سے کام کر رہا تھا، نشاط محل میں صفائی کرنے لگا۔ اُسے سب جمعدار کہتے تھے۔ ڈاکو مَن جیسی صورت، سیارہ پچھتارہ جیسی رنگت، شب بیداری اور بھنگ کی وجہ سے سُرخ انگارہ آنکھیں،

آواز ایسی جیسی گہری سی باؤلی میں کوئی بھوت گڑگڑا رہا ہو۔ نہایت صاف اور مقطع وردی، رعب دار چال۔ میٹرن جو کوئی بھی حکم دیتیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا۔ "تم جانتے ہیں!" بیچاری ہیبت زدہ ہو کر رہ جاتیں۔ لڑکیوں سے رو رہا ایسی آواز میں اپنی بے عزتی کا گلہ کرتیں۔ جو زیادہ جی بھر آتا تو سارا غصہ انھیں پر اُتار دیتیں "کیلے کے چھلکے بے جگہ کیوں پھینکے؟" ردی کاغذ جمع کر کے بڑی کھوج لگاتیں کہ اُس پر کس لڑکی نے لکھا ہے۔ معلوم کر لینے کے بعد وہ سارے پُرزے مع کڑی تنبیہ کے ساتھ نوٹس بورڈ پر لٹکا دیتیں۔ لڑکیاں نوچ ناچ کر پھینک دیتیں۔ ایک دفعہ خود پرنسپل نے جو دنیا بھر کی ردی بورڈ پر چپکی دیکھی تو غریب کو الٹی ڈانٹ بتائی۔

دنیا میں ان کی صرف ایک دوست تھیں: مس جونسن۔ چھ فٹ سے بھی کچھ نکلتا ہوا قد، سپاٹ سینہ اور مردوں جیسے کٹے ہوئے بال! شیو کرتی تھیں جو اُن کی لاؤبالی عادتوں کی وجہ سے روز روز نہ ہوتا۔ یہ ورزش اور کھیلوں کی تعلیم دیتی تھیں۔ نیک بخت اس زور سے گیند میں ہٹ لگاتی تھیں کہ جی لرز اُٹھتا۔ نئی نئی لڑکیاں تو اُن کے سامنے ٹانگیں کھلے جمپر پہنتے شرماتیں۔ آواز پھٹی ہوئی جیسی پندرہ سولہ برس کے لڑکے کی ہوتی ہے۔ میٹرن اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو "ڈارلنگ" کہتی تھیں اور جب کوئی سویٹر یا ان کا اور کوئی کپڑا سیتیں تو جا جا کر لڑکیوں کو دکھاتیں۔ ذکر کرتے میں وہ ہمیشہ "ڈیر مس جونسن" ہی کہتیں، اور ان "ڈیر مس جونسن" سے لڑکیوں کو یونہی بغض تھا۔ اوّل تو وہ سوائے ورزش کے احکامات کے بہت کم بولتیں۔ شمن کو تو ان سے بات کرتے موت آتی۔ گڑگڑا کر تی بھاری امریکی لہجے والی انگریزی زبان کا ایک لفظ بھی پلّے نہ پڑتا۔ ورزش کرتے میں ذرا کسی نے غلطی کی اور دبوتی لے جھپٹ کر لگایا اک مُکا!

ایک دن کھیل کی نئی یونیفارم کے لیے مس جونسن لڑکیوں کی ناپ لے رہی تھیں، شمن کو سخت گھبراہٹ معلوم ہوئی۔ ایک ایک لڑکی اندر جاتی اور ناپ دے کر واپس لوٹ آتی۔ شمن کی جب باری آئی تو وہ ہچکچاتی ہوئی دفتر میں داخل ہوئی۔ مس جونسن

ناپنے کا فیتہ لیے ایک کاپی پر جھکی کچھ لکھ رہی تھی۔ شمن کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"گڑ گڑ گرما،" نہ جانے انھوں نے کیا حکم دیا، مگر وہ گھبرا گھبرا کر دوپٹے کا پلّو چباتی رہی۔

"گڑ ماڑ۔ گڑ ماڑ!" وہ پھر کچھ بڑبڑائیں۔ شمن نے دو قدم اُٹھائے۔ آگے نہ پیچھے! اب کے جو انہوں نے ڈانٹ کر ذرا صاف زبان میں قریب آنے کا حکم دیا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"یہ کیا واہیات ہے؟" وہ گرجیں۔

شمن کھسیانی زبردستی کی مسکراہٹ جمائے آگے بڑھی۔ فیتہ لے کر انہوں نے ناپ لینا شروع کیا۔ "ہاتھ اوپر کرو!" شمن کچھ نہ سمجھی۔

"اُونہہ، بے وقوف ہاتھ اُوپر۔" شمن نے بغلیں بھینچ لیں۔

مس جونسن نے ایک جھنجھوڑی دے کر اسے سیدھا کھڑا کیا اور دو جھٹکے کندھوں میں جمائے۔ شمن ڈری ہوئی بکری کی طرح روتی ہوئی فرش پر گڑی مڑی ہو گئی۔

"سیدھی کھڑی ہو!" مس جونسن کہتی رہیں اور وہ اُسی طرح کبڑی، ناک سے رونے کی آوازیں نکالتی ہوئی بھاگ کر دروازے سے ٹکرائی۔

"ارے اِسلی گرل!" مس جونسن کا دو دن کا مونڈا ہوا بالائی ہونٹ مسکراہٹ سے پھڑپھڑایا مگر شمن سیدھی اپنے کمرے میں آ کر پلنگ پر گر پڑی اور دیر تک گھوڑے سے ہنہنانے جیسی دبی دبی آوازیں نکال کر روتی رہی۔

اس دن سے اسے مس جونسن سے ایسی شرم آئی کہ وہ برابر نیلی چٹھی، جو بیمار لڑکیاں مس جونسن کے لیٹر بکس میں ورزش سے معافی مانگنے کے لیے ڈالتی تھیں، دبے پیر جا کر ڈال آتی۔ ان نیلی چٹھیوں کی تعداد اتنی بڑھی کہ وہ اُس کی ہیلتھ رپورٹ کے ساتھ چپکا کر ہوسٹل کی لیڈی ڈاکٹر کے پاس بھیجی گئیں اور پھر ایک دن بورڈ پر اُس کا نام اُن لڑکیوں کی فہرست میں نظر آیا جو مسلسل خرابیِ صحت کی وجہ سے ڈاکٹری معائنے کی محتاج تھیں۔

[illegible] اور نارنگیوں کے

باغ میں واقع تھا۔ نہایت صاف ستھرے خوبصورت کمرے اور سامنے کھلا میدان۔
عام طور پر لڑکیاں اتوار کو غل غپاڑے سے بچنے کے لیے رات کے کپڑے پہن کر
ان کمروں میں ذرا سا بیماری کا بہانہ کر کے جا لیٹتیں۔ یہ بھی مشہور تھا کہ کالج سے ملحق
جو یونیورسٹی تھی وہاں کے لڑکے آتے جاتے ان کمروں کی کھڑکیوں کی طرف تاکا کرتے
تھے اور کئی قصے بھی ان کھڑکیوں سے وابستہ تھے۔ کئی لڑکیاں بدمعاش لڑکوں سے فرار
ہونے سے پہلے انہی کمروں میں بیماری کا بہانہ بنا کر رہی تھیں۔

اسپتال کی نرس ایک سیاہ فام حبشی نژاد امریکن تھیں۔ پھیلے ہوئے جسم کی
ٹھنگنی سی عورت نرسوں کے سفید براق لباس میں سنگ موسیٰ اور سنگ مرمر کا
بنا ہوا مقبرہ معلوم ہوتیں۔ عام طور پر ان کی گفتگو ان فرار ہونے والی لڑکیوں کے
متعلق ہوتی جو بھاگنے سے پہلے ان کے زیر سایہ رہی تھیں۔ ہر لڑکی کو وہ اصول صحت
سمجھاتے وقت جسم کی خوبصورتیاں قائم رکھنے کی اہمیت پر مدلل لکچر دیا کرتیں۔ "بوائز
کو گھیرنے کے تیر بہدف نسخے تو انہیں ازبر یاد تھے۔

"پنڈلیوں کے بال فلاں پوڈر سے اڑا دو تو موٹے نہیں نکلیں گے۔ کمر پر سے ساڑھی
خوب کھینچ کر باندھو، ایسے۔" وہ ساڑھی کو بالکل تہبند کی طرح کس کر بتاتیں۔
"اتنی تنگ باڈی مت پہنا کرو، سارا جسم لٹک جائے گا۔ انگلش گرلز کو دیکھو۔"
وہ انگلش گرلز کا ایسے ذکر کرتیں گویا انگریزوں نے ساری مفتوحات ان منڈی ہوئی
ٹانگوں اور چست باڈیوں کے ہی بل بوتے پر زیر کر رکھی ہیں۔ جسم سے بدبو دور کرنے
کی اور مختلف پوشیدہ دواؤں کے نام مفت بتایا کرتی تھیں مگر بجائے شکر گزار
ہونے کے لڑکیاں الٹی چراغ پا ہو جاتیں۔

یہ نرس ہر وقت امریکہ یعنی اپنے دیس کی تعریفیں کیا کرتیں اور بڑے بڑے
معززین کا ایسے ذکر کرتیں جیسے وہ ان کے سگے چچا ماموں تھے۔ عبادت کے لیے جب
ساری لڑکیاں اور پروفیسر صبح ہر کے کھانے سے قبل جمع ہوتیں تو وہ بھی امریکن اسپرچول
گنگناتیں میں کالے تل کی طرح ملاحت سے چمکا کرتیں۔ ان کی آنکھیں سفید چڑیوں کی قبر سے

کے غرور سے اور بھی گرنا ہوں میں جا کر جھکنے لگتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ سب کو اس تجربے سے متاثر کرنا چاہتی ہیں کہ دیکھو ہم سفیدی کے کتنے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ سفید مینارے بھی اپنے سرانداز سے یہی کہتی معلوم ہوتیں کہ لوگو دیکھو تم ہمیں اور عرش عش کر دو، ہم کتنے بلند ہیں کہ کیچڑ ہو یا کوڑا، ہم ہر ایک کو پاس بٹھا لیتے ہیں۔ یہ دیکھو ہم اِن اُلّو کے پٹھوں کے ساتھ کِس خندہ پیشانی سے بیٹھے مسکرا رہے ہیں اور تم ہمیں ناک چڑھا اور مغرور کہتے ہو؟ نہ جانے یہ سفید قومیں سیاہ انسانوں کو انسان سمجھ کر اس کا احسان کس پر جتانا چاہتی ہیں اور کس دھوم سے اُس کا ڈھنڈورا پیٹتی ہیں۔ انگلش چرچ جدا ہے اور وہاں کتوں اور اُن کے ساتھ ہندوستانیوں کے جانے کی اجازت نہیں، مگر مہینے میں ایک دفعہ باری سے سفید استانی کالے چرچ میں عبادت کر کے اُسے مقدس بنانے ضروری چلی جاتی۔ ہندوستانی لڑکیاں مارے غرور اور احسان کے بوجھ کے گردنیں اکڑا اکڑا کر عبادت گاہ میں داخل ہوتیں۔

شمن کی ایک عیسائی دوست ایلیا تھی۔ بڑی منہ پھٹ اور زبان دراز۔ جنوبی ہند کی مخصوص چاکلیٹی رنگت، بھونرا سے سیاہ بال اور سادھوؤں کی سی سُرخ ڈوروں سے کھنچی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، اودے ڈنک سے پکتے جامن جیسے چھلکے ہوئے ہونٹ اور سُتا ہوا چہرہ۔ اُس کے گالوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں اور دانت غیر معمولی نیلاہٹ مائل سفید تھے۔ جب وہ زور سے قہقہہ لگاتی تو بہت سے دانت چمک اُٹھتے جو بڑے دھاردار اور زہریلے معلوم ہوتے۔ لڑکیاں اُس کے متعلق عجیب عجیب باتیں کیا کرتیں۔ گو وہ عیسائی تھی لیکن گرجے بہت کم جاتی، اور اگر جاتی بھی تو صرف لڑکیوں کے ساتھ مل کر حمد گانے۔ اُس کی آواز بہت رسیلی تھی اور گانے کا بہت شوق تھا۔ غسل کرتے وقت وہ پوری آواز سے اوٹ پٹانگ گیت گایا کرتی۔ اُس کے کمرے میں بجائے یسوع کے کرشن کی تصویر لگی تھی جس کے آگے وہ سونے سے پہلے گھٹنے ٹیک کر بائبل کی آیتیں پڑھ کر سینے پر صلیب کا نشان بنایا کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی "مجھے سفید رنگت سے گھن آتی ہے، اور صلیب پر لٹکے ہوئے مسیح پر رحم آتا ہے، اور رحم کے ساتھ

عقیدت کا جذبہ بجائے عبودیت کے دل میں بغاوت کی آرزو پیدا کر دیتا ہے، دوسری طرف ہنستے کھیلتے بنسری بجاتے کنہیا جی کو دیکھ کر دل ناچ اُٹھتا ہے۔“

پھر ایک دم سے اسے نہ جانے کیا ہوا کہ کرشن کی تصویر تو نکال کر پھینک دی اور اس کے بجائے وہ تصویر لگالی جس میں ایک بندر پیڑ پر بیٹھا کیلا کھا رہا تھا، دوسرا بندر نیچے سے ایک لکڑی اُس کی پیٹھ میں چبھو رہا تھا اور پہلے بندر کا آدھا کھایا ہوا کیلا زمین پر گر رہا تھا جس پر نیچے والا بندر مسکرا رہا تھا۔ جب لڑکیوں نے اُس سے اس تبدیلی کی وجہ پوچھی تو وہ اپنے مخصوص قہقہے لگا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتی۔

”کرشن جی کی بنسری کو کیڑا لگ گیا تھا، اُس میں سے مینڈک ٹرٹرا رہا تھا“ وہ ہانکتی، ”مکھن کا بڑا شوقین تھا نا، معلوم ہوتا ہے تھوڑا مکھن بنسری میں لگا رہ گیا سو دیمک چاٹ گئی“ اور پھر وہ منہ چڑا کر کہتی: ”انھیں سوائے عورتوں سے مذاق کرنے کے اور کام ہی کیا تھا؟ سُنا ہے بیاہی عورتیں زیادہ پسند تھیں“

اس پر لڑکیوں نے اس کی بُری گت بنائی، پرنسپل سے شکایت کر دی۔ یہی نہیں، وہ کئی بار شمن سے اُلجھ پڑی: ”یہ سب پیغمبر عورتوں پر کیوں فدا تھے؟ یوں تو میری ہشتم بھی پیغمبر تھا۔۔۔“ مگر شمن غصے سے بے قابو ہو گئی اور آنسو نکل آئے۔ ایلما نے خاموشی سے معافی مانگ لی۔

تین چار دن بعد بندروں کی تصویر میں تغیر ہوا، پیڑ پر بیٹھا ہوا بندر جان بل بن گیا اور نیچے والے نے دھوتی پہن لی اور ہاتھ سے چھوٹ کر گرتا ہوا کیلا ہندوستان کا نقشہ بن گیا۔

ایلما کو ڈرائنگ بہت بُری آتی تھی مگر وہ اس بھدی تصویر میں نت نئی گلکاریاں دکھاتی اور اپنے نیلگوں دھار دار دانت کھول کر لمبے لمبے قہقہے لگاتی۔

اُس کی بیہودہ گوئی اس قدر بڑھی کہ ایک دن لڑکیوں نے سختی سے پرنسپل سے شکایت کر دی۔ دیر تک وہ اُس سے بحث کرتی رہی، جب دفتر سے نکلی تو بہت خاموش تھی اور منہ اترا ہوا تھا۔ شمن کو اُس کی باتیں بڑی عجیب معلوم ہوتی تھیں مگر

اُسے اداس دیکھ کر اس کا جی کڑھ گیا۔ اُس نے بتایا کہ پرنسپل نے کہا ہے کہ اگر آئندہ اُس کے متعلق شکایت سنی گئی تو رسٹی کیشن کر دیا جائے گا اور وہ باقاعدہ عبادت میں شریک نہ ہوئی تو ہوسٹل سے نکال دی جائے گی۔ گو شمنؔ کو اُس کی باتوں سے ڈر معلوم ہوتا تھا پھر بھی وہ اُسے سمجھاتی رہی۔ دسمبر کی چھٹیوں کے بعد الماّؔ نے کالج چھوڑ دیا اور یونیورسٹی چلی گئی۔ وہیں کیلاش ہوسٹل، جو یونیورسٹی میں لڑکیوں کے لئے خاص طور پر کھولا گیا تھا چلی گئی، مگر اکثر وہ شمنؔ کے پاس آیا کرتی۔

شمنؔ کو اُس نے کچھ خشک سی کتابیں بھی پڑھنے کو دیں مگر اُن میں اس کا قطعی جی نہ لگا۔ الماّؔ یونیورسٹی میں جا کر چمک اُٹھی، کلاس میں اوّل رہنے کے علاوہ اُسے یونین کا پریزیڈنٹ بھی بنا دیا گیا جہاں وہ ہنگامہ خیز تقریروں سے لڑکوں اور پروفیسروں پر چھا گئی۔

(۲۳)

اسکول اور کالج میں کتنا لمبا چوڑا فرق ہے! کہاں ایک مسلم درس گاہ اور کہاں امریکن مشن کالج! کہاں تو یہ حال کہ اگر کوئی لڑکی کھیل کھیل میں سینہ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہن کر آجائے تو لڑکیوں کو دورے پڑ جائیں اور تہلکہ مچ جائے، جرمانے ہوتے پھر الگ۔ اور کہاں یہ کالج میں دوسری ٹرم شروع ہوتے ہی نئی لڑکیوں کو یونیورسٹی کے لڑکوں سے تہذیب طریقے پر ملایا جاتا اور اس مقصد کے لیے ایک باقاعدہ دعوت ہوتی۔ پرنسپل اور استانیاں اور پروفیسر خود ہر ایک لڑکی کو ایک لڑکے سے ملواتیں، تھوڑی دیر ساتھ رہتیں اور پھر ان کو بے تکلف باتیں کرنے کے لیے چھوڑ جاتیں۔ اس جلسے کی بڑی زور دار تیاریاں ہوتیں، چائے پانی کے علاوہ ڈرامے اور ناچ گانے کا بھی ایک پروگرام تیار کیا جاتا۔ لڑکیاں بھی کپڑوں لتوں کا انتظام کرتیں، خوب شاندار جوڑے تیار کیے جاتے۔

نئی لڑکیاں تو جلسے کی دہشت سے ہی بے حال ہو جاتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی سخت عیب کی بات ہونے والی ہے۔ بہت سی تو اپنے گھر والوں پر اس کا ذکر ہی نہ کرتیں

بلکہ چھپے چوری ہی گناہ کر لیتیں۔ پرانی لڑکیاں ان کا مذاق اڑاتیں:

"سنو شمن تمھیں اپنے ساتھی کا پیار لینا ہوگا" پریمیلا نے شرارت سے کہا۔

"ہائے!" شمن کو پسینہ آگیا۔

"اور کیا، پیار تو لینا ہی ہوتا ہے اور پھر دوسرے دن پرنسپل کو ایک پرچے پر لکھ کر دینا ہوتا ہے کہ تم نے اتنے لوگوں کا پیار لیا" اوروں نے تائید کی۔

"ہاں، اور پھر جس نے سب سے زیادہ پیار لیے ہوں اس کو انعام ملتا ہے۔"

"اور... اور جو نہ لے تو؟"

"جو نہ لے تو اس کو جرمانہ، اور سالانہ رپورٹ پر لکھ دیا جاتا ہے کہ یہ لڑکی بالکل کمزور ہے، خراب!"

مارے پریشانی کے شمن کی نیند اڑ گئی۔ جو ابا میاں کے پاس سالانہ رپورٹ پہنچی، اور انھوں نے دیکھا تو بس خیر نہیں۔ نہ جانے کن مصیبتوں اور سفارشوں سے تو بھیجا تھا، ورنہ وہ تو یہی کہتے تھے کہ اسی کالج کی کلاسیں کھلوانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ دوسرے منجھلے بھیا جب سے انگلینڈ سے آئے تھے تعلیم نسواں کے حد سے زیادہ خلاف ہو گئے تھے۔ یہ الٹی ہی بات تھی۔ حمید بھائی نے انگلینڈ سے آکر بوڑھی نانی تک کا پردہ تڑوا دیا۔ بیچاری ہزار بڑبڑاتیں پنکھوں کی آڑ لیتیں، مگر بھنگی، بہشتی، باورچی سب ہی گھر میں آتے۔ جوان جوان بہوئیں مزے سے لیٹی بچوں کو دودھ پلایا کرتیں، خالہ اماں بیٹھی خوب آرام سے کھجوایا کرتیں، اور بیگم اماں نہایت بے تکلفی سے لیٹی چودہ پندرہ برس کی میرا سے ٹانگیں دبواتیں۔ بوڑھی نانی لرزتیں اور بھرّاتیں۔ بہشتی، بھنگی پہلے لنگی سر پر ڈال کر آتے تھے اب یہ خود بیچاری گھونگھٹ کاڑھ لیتیں۔

"نانی اماں اتنی بوڑھی ہو گئیں مگر مردوں سے شرمانا نہ چھوڑا" حمید بھائی چڑاتے اور نانی غریب مڑ مڑ صورت دیکھتیں۔

مگر منجھلے بھیا نہ جانے کن متعفن مولویوں کی غلاظت میں ہولی کھیل کر آئے تھے۔ کہ اور زیادہ پردے کے حامی ہو گئے تھے۔ خاندان کی سب سے بیوقوف اور بے ہنگم

لڑکی سے شادی طے کی اور شمن کی تعلیم کے خلاف جہاد قائم کیا۔

بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی! جلسے کا دن بھی آ ہی گیا۔ شمن کو تو بخار سا چڑھ آیا۔ رات بھر اُسے عجیب عجیب واہیات خواب بن بن کر ستاتے رہتے۔ کبھی کالج کے غنڈے اُسے چیختے چلاتے اپنے پیچھے دوڑتے دکھائی دیتے، کبھی دیکھتی وہ شیشے جیسے چکنے پہاڑ پر اُلٹی پھسل رہی ہے اور اس کے کپڑے تار تار ہو گئے ہیں، ہتھیلیاں چھل گئی ہیں، کبھی دیکھتی میٹرن چھوٹے بھنگی کی پیٹھ پر سوار اُسے جھاڑو سے ہانک رہی ہے، وہ غسل خانے میں نہا رہی ہے کہ بہشتی شہزاد نرس نے چوپٹ دروازے کھول دیے۔ وہ چیخ مار کر گڑی مڑی ہو گئی۔ جب اُس کے حواس درست ہوئے تو پرمیا اُس کے منہ پر سے چادر اُتار رہی تھی: "کیا ہوا؟ کیا کوئی بُرا سپنا دیکھا تو نے؟"

"ہاں!" وہ گھبرا کر آنکھیں مچکانے لگی۔

"پگلی کہیں کی! ایسے زور سے چیخی کہ میں ڈر ہی تو گئی۔ اُٹھو نا۔ چائے کی گھنٹی بھی ہو گئی!"

سارے دن کسی کام میں جی نہ لگا۔ عام طور پر لڑکیاں بالکل بے فکر سی نظر آ رہی تھیں۔ غور سے وہ ہر لڑکی کو گھور گھور کر اس کے دل کا حال معلوم کرنا چاہتی مگر کچھ بھی تو ظاہر نہ ہوتا اُن کے چہروں سے۔ یا تو وہ واقعی بڑی بہادر تھیں یا اس کی طرح بن رہی تھیں۔

شام کو ہر کمرے میں کپڑے بدلے جانے کی دُھوم شروع ہو گئی۔ سوئی دھاگے اور بٹن سے لے کر ساڑھیاں بلاؤز اور بندے وغیرہ ایک دوسرے سے مستعار مانگے جانے لگے۔ شمن نے اپنی لٹھے کی شلوار اور چنا ہوا دوپٹہ نکالا۔ آج اسے دوپٹہ بہت ناکافی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اس بار ایک چنٹ کو کھول ہی رہی تھی جو اُس نے انگلیوں میں چھالے ڈال کر بڑی کاوشوں سے بنائی تھی کہ پرمیا آ گئی:

"ارے پگلی، شلوار قمیص پہن کر جائے گی! وہ ڈانٹ بتائیں گی پرنسپل کہ یاد کرو گی۔"

"کیوں؟"

"کیوں کیسی؟ معلوم نہیں کہ ساڑھی پہننی چاہیے کالج کی لڑکیوں کو:

"مگر میرے پاس تو اس وقت بس دہی چارخانے والی ہے، اور جمپر بھی نہیں۔"

"تمہارا تو بالکل ہی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بھلا اس جلسے میں سوتی ساڑھی چلے گی؟ میرے پاس ہے، آؤ۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لے گئی۔

شمن نے بہتیری کوشش کی خوشامدیں کیں مگر پریما نے اُسے کاسنی ریشم کی ساڑھی جس پر بھاری بنارسی فیتہ لگا تھا، اور بروکیڈ کا شلوکا پہنا دیا۔ وہ تو ہلکا سا پاؤڈر ہی لگا لیتی اور بس، مگر پریما نہ مانی اور زبردستی سرخی اور کاجل لگایا، پھر بھر بھر ہاتھ چوڑیاں اور جھمکے، جن پر ملمع کیا ہوا تھا مگر اصلی معلوم ہوتے تھے، اُس نے خود ہی پہن لیے۔ نہایت سبک ایڑھی کا جوتا پہن کر چلنا اسے بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے وہ پل صراط پر چل رہی ہے۔ جوتا ذرا پنجہ دباتا تھا مگر وہ سہہ گئی۔ آج اُس نے پریما کی حرص میں کُم کُم کی بندی بھی لگائی۔

جلسے کا شور شروع ہو گیا جسے دیکھو بے طرح سج رہا تھا۔ مس جونسن تک نے آج اپنی مردانہ وضع کی فراک پر پھولوں کا گچھا لگا کر کچھ نسوانیت سی پیدا کر لی تھی۔ تھوڑا بہت زنانہ پن جو اُن میں باقی رہ گیا تھا۔ میٹرن بھی آج تنگ فراک کو اور زیادہ تنگ بنا کر منڈھے ہوئے تھیں۔ ان کے جسم پر بندھی ہوئی ڈوریاں اور فیتے بستر بند کے تسموں کی طرح اُن کی فراک میں سے جھلک رہے تھے۔ ایلما بھی مہمانوں میں آئی تھی۔ اپنی سادہ دکھنی ساڑھی اور اودے چوڑے میں وہ بالکل الورا کے غاروں کی دیوداسی معلوم ہو رہی تھی۔

شمن کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سارے مہمان اُسی کو گھور رہے ہیں اور کوئی دم میں بھاری بنارسی فیتے کی ساڑھی اُس کے جسم سے پھسل کر اُسے برہنہ چھوڑ جائیں گی۔ ساڑھی پہننے کی عادی نہ ہونے کی وجہ سے کبھی پلو کھینچتی، کبھی پلیٹوں کو ٹٹولتی کہ کھل تو نہیں گئیں، پھر ایک دم آنچل بہت زیادہ لمبا لگنے لگتا تو چپکے سے اسے سرکا کر اُڑس لیتی۔ ایک دم سے ایسا معلوم ہوا کہ کم کم کی بندی گولی کی طرح ماتھے میں آ لگی چبھ رہی ہے اور کوئی دم میں انار کے دانے کی طرح پھوٹ کر اس کے سارے چہرے

پر بہہ جائے گی اور ساتھ ہی ملمع کے چھلکے لوتھل ہو کر کان کی لوؤں کو کھینچنے لگے۔

اتنے میں پروفیسر اور پرنسپل بھی آگئیں، اور تعارف کا سلسلہ شروع کر دیا گیا! اندھا دھند ہاتھ پکڑ پکڑ کر جوڑے لگانے شروع کر دیے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں زیادہ تر لڑکیاں ایک ایک لڑکے کی ہمراہی میں نظر آنے لگیں۔ جب شمن اس عجیب و غریب تماشے کو خوب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ چکی تو اُسے اپنے سامنے بیٹھا ہوا پریشان حال لڑکا نظر آیا۔ شمن نے اُسے چونک کر دیکھا، اُس کی منافرت بھری نظروں سے وہ اور بھی سٹپٹا گیا اور بری طرح ہکلا کر اپنی ٹائی ٹٹولنے لگا۔ شاید وہ بھی آج شمن کی طرح پہلی دفعہ سوٹ پہن کر آیا تھا!

جب ذرا حواس درست ہوئے تو اس نے نہایت گھبراتے ہوئے اور لڑکوں کی نقل میں چائے بنا کر پھل وغیرہ شمن کو پیش کرنے شروع کیے۔ انگریزی میں شمن شکریہ کہتی اور وہ جواب میں مستعدی سے "کوئی بات نہیں میڈم!" کہتا لیکن بوکھلاہٹ میں کئی بار "میڈم" کے بجائے "سر" کہہ جاتا اور پھر شرم سے نیلا ہو کر اُس کے حلق میں پھندے پڑنے لگتے۔ اُس کو اتنا گھبرایا ہوا دیکھ کر شمن کو ہنسی آگئی۔ وہ کافی بہادری سے انگریزی کے گھسے گھسائے جملوں میں اس سے باقاعدہ باتیں کرنے لگی۔ چھوٹی سی بات کو نہایت شستہ اور قواعد سے مرصع انگریزی میں کہتی۔ وہ دونوں باتیں کرنے لگے لیکن دو چار جملوں میں ہی گفتگو کا سارا مواد ختم ہو گیا۔ مجبوراً دونوں نے نہایت تندہی سے کھانا شروع کر دیا۔ زبانی دقت میں چائے کی پیالیاں ہونٹوں سے چپکائے رہے کیونکہ چائے پینے میں بولنا ضروری نہ تھا۔ بیچ بیچ میں وہ نہایت حسرت سے اور لوگوں کو دیکھتے جو ایک دانہ بھی نہیں کھا رہے تھے اور برابر قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک دم شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے گندے نالے کی متعفن کیچڑ اُس کے حلق میں گھول دی، بڑی زور سے اُبکائی آئی مگر اُس نے گلا بھینچ کر چائے کے بڑے سے گھونٹ سے لقمہ نگل لیا۔ گرم چائے نے سارے حلق اور معدے تک کو جھلسا دیا۔ بے اختیار اُس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے، اس کا ساتھی

بڑے رحم کی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا اُس کی طرح وہ بھی ٹین کی مچھلی کھانے کی عادی نہیں۔ اس مچھلی کو کھانے کے لیے مشق کی ضرورت ہے اور وہ مشق مفصل خانے میں مسلسل الٹیوں کے بعد حاصل ہو سکتی ہے، مگر اس وقت دو ننھی چڑیاں پنجرے کی تیلیوں کو حسرت سے تک رہی تھیں اور زبان بند تھی۔

شمن نے دیکھا کہ ایلیاؔ اسے بڑے غور سے دیکھ کر کچھ چپکے چپکے اپنے ساتھی سے کہہ رہی ہے، پھر اُس کا مخصوص قہقہہ فضا میں کھنکا اور دھار دار دانتوں کی قطاریں چمک اُٹھیں۔ گھبرا کر دونوں نے چائے کی پیالیاں رکھ دیں اور ایک دوسرے سے چھپا کر رومال ڈھونڈنے لگے

ایلیاؔ نے تاک کر ایک پکا سا انگور پھینکا۔ شمنؔ ایسی گھبرائی جیسے ڈوب ہی تو جائے گی اُس کے رس میں۔ باوجود تندہی سے تلاش کرنے کے رومال نہ ملا۔ ہنسی کے بوکھلائے ہوئے ساتھی نے جلدی سے رومال نکال کر اس کا گال پونچھ دیا۔ شمنؔ کو معلوم ہوا جیسے کُمکُم کی بندی اُس کے سارے جسم پر بہہ گئی۔ اور وہ بیچارا بھی کرنے کو تو اس قدر ہمت کا کام کر گیا مگر پھر اس بڑی طرح جھینپا کہ شمنؔ کو ترس آ گیا۔ ایلیا اور اُس کا ساتھی بے حال ہو کر ہنسنے لگے۔ پھر وہ دونوں اپنی کرسیاں گھسیٹ کر اُن کی میز پر آ گئے۔

"ارے مسٹر تم تو بہت چل نکلے ہو، واہ بھئی!" ایلیاؔ کے ساتھی نے اس زور سے بیچارے کی پیٹھ ٹھونکی کہ ہل کر رہ گیا۔

"شمنؔ اپنے دوست سے ملاؤ نا۔" ایلیاؔ نے کہا۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔" وہ ہکلا کر رہ گئی۔

"ہیں؟ ایسی کھانے میں مشغول ہو کہ نام بھی نہ پوچھا۔"

"جی۔۔۔ نہیں تو۔" حمایت میں بولا۔

"ارے بھائی اتنی دیر سے برابر کھا رہے اور۔۔۔"

"جی ہاں۔۔۔" وہ بھی ہکلایا، اس پر دونوں نے پھر قہقہوں کی بھرمار کر دی۔

"اور تم بڑے آوارہ ہوتے جاتے ہو، ابھی، . . ."

"میں سچ کہتا ہوں . . . آ معاف کیجئے گا۔" وہ جلدی سے شمن کی طرف مڑا۔

"میں نے تو یونہیں پونچھ دیا تھا کہ آپ کا رومال نہ خراب ہو۔"

شکر ہے کہ الیما اور اُس کے ساتھی افتخار کے آجانے سے وہ دم گھونٹنے والا طلسم خاموشی تو ٹوٹا۔ افتخار نے دونوں کو چھیڑ چھیڑ کر بے تکلف بنا دیا۔ تھوڑی دیر میں ڈرامہ شروع ہو گیا۔ الیما افتخار کو کہیں چھوڑ کر شمن اور اُس کے ساتھی کے بیچ میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں جلسے کا لطف آگیا۔ عجب مزاج تھا الیما کا بھی! عشق بازی پر تل جاتی تو سب کو نچا کر پھینک دیتی اور ایک دم جی اُکتا جاتا تو سب کو سوکھے پتوں کی طرح جھاڑ کر اُٹھ کھڑی ہوتی۔

ڈراما ختم ہُوا اور جلسہ بھی بکھر گیا۔ لوگ جانے لگے۔ پریما اپنے بھائی نریندر کے ساتھ اُسے ڈھونڈنے آپہنچی۔ دوسرے دن چھٹی تھی اور پریما اُسے اپنے ساتھ دو دن کے لیے گھر لے جانا چاہتی تھی۔ دونوں کپڑے بدل کر جب رجسٹر میں دستخط کرنے گئیں تو میٹرن نے کہا پہلے پرنسپل سے لکھوا کر اجازت لاؤ، ایک ہندو لڑکی کے گھر جانے کے لیے عام دستور سے مختلف اور زیادہ پختہ اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔

پرنسپل کے پاس سے پریما روہانسی صورت بنائے واپس آئی۔

"کیوں، اجازت ملی؟"

"نہیں۔ ڈانٹ ملی اور جرمانہ۔"

"اچھا ہُوا۔ ہم پہلے ہی کہتے تھے ٹھیک نہیں۔ بہت نٹ کھٹی کرتی ہو تم۔"

میٹرن خوش ہو کر بولیں۔

"اور پرنسپل صاحبہ نے کہا ہے کہ کیونکہ یہ جرمانہ آپ کی کوششوں سے ہُوا ہے لہٰذا آپ کو ہی چاکلیٹ کھانے کے لیے دے دیا جائے۔" یہ کہہ کر اُس نے ان کے سامنے اجازت کا پرچہ ڈال دیا۔ جس میں نہایت شستہ سختی سے یاد دلایا گیا تھا کہ انہیں بے کار باتوں کے لیے پرنسپل کو حیران نہ کرنا چاہیئے۔

اس کے بعد نہ پوچھیے کیا ہوا۔ ہیرٹن نے بے عزتی کی حد دیکھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ استعفا دینے کی دھمکی دینے لگیں، جو وہ کبھی نہ دے چلی تھیں۔

شمن اور پریما کپڑے بدل کر دوسرے دن پہننے کے لیے کپڑوں کی پوٹلیاں باندھ کر نرنیدر کے ساتھ موٹر کی اگلی سیٹ میں ٹھس گئیں۔ کچھ مہمان ابھی رخصت ہو رہے تھے، زور شور سے شب بخیر کہا جا رہا تھا۔ جب موٹر احاطے میں مڑ کر پھاٹک سے گزری تو شمن نے دیکھا اُس کا جلسے والا ساتھی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ جیسے وہ جاتے جاتے رُک گیا ہو!

"اُوہ!" اُس نے پہچان کر کہا۔

"کون تھا؟" پریما نے پوچھا۔

"کوئی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ۔ ۔ ۔

"لڑکا تھا؟ ہوں! یہ بات ہے!" پریما نے زور سے اس کے چٹکی لی اور نرنیدر نے ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی۔

شمن ایک عجیب شیریں جذبے کے ماتحت مسکرا اُٹھی۔ کیرم کھیلتے میں نشانہ ٹھیک بیٹھے تو دل جھوم اُٹھتا ہے، بالکل اسی طرح کوئی چیز دماغ میں سرد اور شیریں لہر کی طرح تیر گئی۔

راستے بھر پریما جماہیاں لے کر اونگھتی رہی اور نرنیدر نہ جانے غلطی سے یا قصداً اُس کی ران کو کہنی سے ہلاتا رہا مگر وہ کہیں اور تھی؛ دور۔ موٹر سے بہت آگے۔ وہ اُڑی چلی جا رہی تھی۔

(۲۴)

رات آرام سے گذری۔ دوسرے دن شمن کرسی پر بیٹھی رائے صاحب کے کرتوں میں بٹن ٹانکتی رہی اور وہ اُس کے پیروں کے پاس قالین پر پھسکڑا مارے بیٹھے کہانیاں سناتے رہے اور سوئی میں تاگہ پرو کر بھی دیتے جاتے۔

"اُلٹا مرٹ مانک دیکھو بٹن، سُنا!" وہ بڑی معصومیت سے بٹن کو الٹ پلٹ کر غور سے اُلٹا اور سیدھا دیکھتے۔

"یہ سیدھا" وہ بڑی ہچکچاہٹ سے کہتے اور شمن ہنستی۔

پھر وہ اُسے شہزادیوں، بھٹیاریوں اور جادوگرنیوں کے قصے سنانے لگے۔ یہ کہانیاں شمن نے ہزاروں بار سُنی تھیں مگر رائے صاحب ان میں دل سے باتیں جوڑتے جاتے۔ وہ بار بار بھول کر اُس ایک بھٹیاری کا ذکر بیچ میں گھسیٹ لاتے جو ہر مسافر کے ساتھ چوسر کھیلتی تھی اور پاس اپنی بلّی بٹھا لیتی تھی، جب ہارنے لگتی تو بلّی کو اشارہ کر دیتی اور بلّی لیمپ بجھا دیتی۔

"اتنے میں وہ چال بدل جاتی اور مسافر ہار جاتا" رائے صاحب بڑے جوش سے کہتے۔

"واہ، بھلا بلّی لیمپ کیسے بجھا سکتی ہے؟"

"ایں؟" رائے صاحب بڑے بھولپن سے چونکتے۔

"اور کیا، بلّی لیمپ کیسے بجھا سکتی ہے"

"پھُو... کر کے" وہ بلّی کی نقل کرتے۔ شمن ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی اور رائے صاحب بھی بچوں کی طرح کھلکھلا اُٹھتے۔

"نہیں، اصل میں بھٹیاری جو تھی وہ چراغ جلا کر بلّی کے سر پر رکھ دیتی، جب اشارہ کرتی تو بلّی سر ہلا کر چراغ گرا دیتی، بس"

"مگر مسافر بڑے بیوقوف تھے: اوّل تو وہ چراغ بلّی کے سر پر کیوں رکھنے دیتے تھے؟ بھلا بلّی کا سر بھی چراغ رکھنے کی چیز ہے؟ دوسرے وہ اُس کے ساتھ کھیلتے ہی کیوں تھے؟"

"چل ہٹ بھی، اب یہ میں کیا جانوں! تو ہوتی تو اُن سے ضرور پوچھتی"

"اور کیا، اور بھٹیاری کو پولیس سے پکڑوا دیتی"

"اونہہ، سارا کہانی کا مزا کرکرا کر دیا۔ پگلی کہیں کی، بھلا بھٹیاریوں کو پولیس پکڑ

سکتی ہے ؟"

کہانی کہتے وقت اُن کے چہرے اور دماغ میں کتنا بچپن آجاتا تھا! اُن کے چہرے کی جھریاں خفیف مسکراہٹیں بن جاتیں اور آنکھوں پر سے بڑھاپے کا غلاف سرک جاتا۔ یہی چہرہ اخبار پڑھتے وقت اور دفتر میں کام کرتے میں کس قدر بُردبار اور خشک ہو جاتا تھا!

شام کو رائے صاحب کرسی پر لیٹ گئے اور پکارا!

"بھئی ہمارے سر میں تیل کون ڈالتا ہے ؟" پریما اور نریندر لڑنے لگے۔ پریما کا کہنا تھا کہ وہ تو ہوسٹل میں رہتی تھی، نری سارے وقت رائے صاحب کو ہر ٹیپ کرتا رہتا تھا، پھر بھی اُس کا جی نہیں بھرتا۔ نریندر کہتا تھا کہ پریما کو ایک سِرے سے تیل ڈالنے کا سلیقہ ہی نہیں۔

"چمن تیل ڈالے گی، نری پیروں کے انگوٹھے کھینچے گا اور پریما میری گود میں بیٹھے گی" رائے صاحب نے فیصلہ کیا، پریما فوراً اچھل کر ان کی گود میں لپٹ گئی۔

رائے صاحب کے بال بالکل سفید نہ تھے۔ اُن میں پلاٹینم کی سی دھندلی سیاہی جھلکتی تھی، جیسے پہاڑوں پر جمی ہوئی بلوریں برف پر ہلکا سا شام کا غبار چھایا ہوا ہو۔ بالوں میں غضب کا گھناؤ تھا اور ذرا سا چھو دینے سے اُن میں بجلی سی دوڑ جاتی تھی۔ رائے صاحب ان بالوں سے کس قدر پراسرار اور غیر مرئی معلوم ہوتے تھے۔

شمن محویت کے عالم میں اُن کے پالش کیے ہوئے خنوں کو ڈری ڈری چھو رہی تھی، پاس ہی پریما گھاس پر اوندھی لیٹ کر اُونگھنے لگی، نریندر بیڈمنٹن کورٹ بنوانے چلا گیا اور شمن رائے صاحب کے بالوں کے گنجان کُرسے میں ڈوبتی اُبھرتی رہی۔ پُرسکون انداز میں اُن کی آنکھیں بند تھیں مگر پلکیں کانپ رہی تھیں۔ وہ سوئے نہیں تھے۔ آدھے کھلے ہونٹوں میں سے سچے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے مصنوعی دانت اور سونے کے تار نظر آرہے تھے۔ اُن کے تلخ تبسم کو نیند کے ہلکوروں سے لپٹتے دیکھ کر شمن کو ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ نرم نرم ٹھنڈی دلدل میں دھنستی چلی جارہی ہے۔ کنپٹی

کے پاس ننھی ننھی شریانیں، معلوم ہوتا دبی ہوئی زندگیاں بھڑک رہی ہیں۔ بیچوں بیچ ماتھے پر اُودے سے قشقے کی طرح کھنچی ہوئی رگ، آنکھوں کے گوشوں میں چڑیا کے پنجوں کے نشان، پتھر میں سے تراشا ہوا مضبوط جبڑا! اس پر رعب اور نامعلوم سی دہشت طاری ہو گئی۔ بے خیالی میں اُس کی سرد اور سہمی ہوئی اُنگلیاں اُن کی مڑی ہوئی گردن پر جا ٹکیں!

"ارے کیا کر رہی ہے؟" دنیا جاگ پڑی، شمن گھبرا کر اپنی انگلیوں کو چٹخانے لگی۔ رائے صاحب نے ماتھے پر شکن ڈال کر زور زور سے کھانسنا اور چھینکنا شروع کر دیا۔ شمن کو ان کی اس چھچھوری حرکت سے سخت کوفت ہوئی، وہ جاگ پڑی۔

"تھک گئی؟ چل ہاتھ دھو، آج تجھے چاٹ کھلائیں گے۔" وہ پیار سے بولے۔

رائے صاحب اُٹھ کر پریما کے کان میں گھاس کے تنکے سے گدگدی کرنے لگے۔ پریما ننھے بچوں کی طرح مچل مچل کر اُٹھی اور گھاس پر بیٹھ کر سب نے چاٹ اور کافی اڑائی۔

رات کھانے کے بعد پریما بیٹھی ایک تارہ چھیڑ رہی تھی۔ کالج میں فرصت نہ ملتی تھی جو مشق کرے اور یہاں کھیل کود ہی اتنا ہوتا کہ کچھ یاد ہی نہ آتا۔ کل رائے صاحب نے اُسے کوئی فلمی گیت گاتے سنا تو ملامت دینے لگے۔ راگ راگنیاں بھول کر وہ بیل ٹیس میں پڑتی جا رہی تھی۔ انھیں کتنا ارمان تھا کہ بہت نہیں تھوڑا ہی سہی کچھ تو آرٹ سے ان بچوں میں بھی لگاؤ پیدا ہو جاتا۔

طنبورا اُٹھا کر انھوں نے نہ جانے کس راگ کا الاپ شروع کر دیا۔ پیر کے پنجے سے تال دیتے جاتے۔ دیر تک وہ کچھ گاتے رہے۔ شمن خاک نہ سمجھی مگر وہ اُن کی گہری لوچدار آواز رات کی خاموشی میں مل جل کر اُسے نیند کے جھولے جھلانے لگی۔ نہ جانے کیا سُر تھے، دھیمے اور نرم، جو احساسات پر پھوار کی طرح برستے رہے۔

قریب قریب ہر اتوار کو شمن ان کے گھر جاتی۔ ہر سال لڑکیوں کو ملنے جلنے والوں کا ایک کارڈ بھروانا پڑتا تھا۔ عام طور پر تو لڑکیاں کارڈ پھینک پھانک دیتی تھیں۔ کیونکہ جب گھر والوں کے دستخطوں کے لیے بھیجتیں وہ کبھی واپس نہ آتے۔ اب کارڈ بھروانے

کے لیے بڑی مصیبت آئی۔ پہلے کارڈ پر جو دستخط تھے وہ جعلی تھے اور اس دفعہ پرنسپل نے کارڈ بجائے لڑکیوں کو دینے کے سرپرستوں کو خود براہِ راست بھیج دیے تھے اور وہاں سے شمنؔ کے لیے یہ جواب آیا کہ کہیں جانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں، اگر کوئی رشتہ دار ملنے آئے گا تو وہ اجازت نامہ ساتھ لائے گا۔ لیکن اس طرح بڑی گڑبڑ ہوئی۔ خود بڑے بھیا ملنے آئے اور گھنٹوں پرنسپل سے لڑے۔ وہ ابا میاں کے پاس ہو کر نہیں آرہے تھے لہٰذا اجازت نامہ ندارد تھا۔ غصے میں آکر وہ کارڈ خود بھر کر دستخط کر دیے گئے۔ ایک اور لڑکی کا گارڈین ملنے آیا لہٰذا اُس سے بھی اجازت نامہ طلب کیا گیا۔ وہ بہت چراغ پا ہوا۔ خیر یہ طے ہوا کہ وہ وہیں بیٹھ کر اجازت نامہ لکھے۔ میٹرن سوتے سے اٹھائی گئی تھیں، وہ بڑبڑاتی ہوئی پرنسپل کے کمرے سے ملاقات کے کمرے تک پیغام رسانی کرتی رہیں۔ پھر قلم دوات منگوایا گیا، گھنٹوں لگ گئے پر ملاقات نہ ہو سکی۔ گارڈین تھنّا کر چل دیا اور سرپھرے نے اخبار میں الٹی سیدھی چیزیں چھاپ دیں۔ ایک اور لڑکی کا سگا بھائی ملنے آیا۔ اتفاق سے وہ سامنے ہی برآمدے میں کھڑی تھی بے اختیار دوڑ کر لپٹ گئی۔ بڑی دیر بعد خیال آیا کہ اجازت تو لی ہی نہیں، اگر میٹرن کو خبر ہو گئی تو؟ اور واقعی سانپ کی طرح اُس کی پسلی پھڑکی اور میٹرن سر پہ موجود۔

"بغیر اجازت کس سے بات کر رہی ہو"

"اپنے بھائی سے"

"ثبوت کیا ہے کہ یہ تمھارا بھائی ہے؟"

"ثبوت؟ ارے یہ میرا سگا بھائی ہے۔ کیا تم سمجھی ہو یہ میرا عاشق ہے؟"

"کیا معلوم؟" لڑکی جل گئی۔

"مگر یہ تو کہتا ہے کہ آپ سے ملنے آیا تھا۔۔۔ آپ کا"

"ہشت" اس کا بھائی بولا اور میٹرن کا تو یہ حال کہ انگاروں پر لوٹ گئیں۔ لڑکی بولی، "اگر آپ کو یقین نہیں کہ یہ میرا سگا بھائی ہے تو چلیے سائنس روم میں خون کا معائنہ کرا کے دیکھیے، اور کیا!" غرض آئے دن یہی جھگڑے ہوا کرتے۔ روز روز

کے قصّوں سے منتظمین بھی تنگ آ گئے تھے۔ لڑکیوں کی چالوں کے آگے کسی کی نہ بن آتی۔ بڑی لے دے مچتی لہٰذا پھر کارڈ بھروانے کا تقاضا ہوا۔

اب کہ شمن کو دوسری چال چلنا پڑی، یعنی نہایت صفائی سے کارڈ پر دستخطوں کی نقل کر ڈاک سے پرنسپل کی خدمت میں بھیج دیا۔ یہ ننھی ننھی چوریاں بڑی پیاری معلوم ہوتیں۔ اتنے رعب دار بزرگوں کو اُلّو بنا کر لڑکیاں چپکے چپکے ان کے کھوپڑیوں پر ہنستیں۔ ڈھائی تین سو کارڈوں میں دو چار جعلی چلا دینا کچھ مشکل بات نہ تھی!

شمن کا جانا صرف چند اتواروں کے لیے رکا اور وہ پھر جانے لگی۔ رائے صاحب سے اُس کی خوب گھٹتی۔ بچوں میں وہ بچّہ بن کر کھیلتے، خوب بے ایمانیاں کرتے۔ پریما کی تو ان سے باقاعدہ کشتی ہوتی۔ پھر بھی اگر وہ پریما کی طرح شمن کے گدگدیاں کر دیتے یا گال نوچ دیتے تو وہ بڑی طرح جھینپ جاتی اور دیر تک الگ الگ رہتی۔ اُن کے سامنے ننھا سا بچّہ بن جانے کی خواہش ہونے لگتی۔

ایک دن مذاق میں انھوں نے اسے بھینچ ڈالا تو وہ کھسیا کر رو پڑی۔ رائے صاحب کچھ متحیّر اور کچھ پریشان ہو گئے۔ اتنے زور سے تو انھوں نے بھینچا بھی نہ تھا! جب شمن مسکرا دی تو وہ بن کر روٹھ گئے۔

کھانے پر وہ نریندر سے کچھ گاؤں وغیرہ کے متعلق باتیں کرتے رہے اور پھر کسی کام سے اپنے دفتر میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ شمن اُن کی بے رُخی سے روہانسی ہو گئی۔ اگر وہ واقعی خفا ہو گئے تھے تو؟ بے اختیار اُس کا دل بورڈنگ بھاگ جانے کو چاہا۔

پلنگ پر چت پڑی وہ سنسان دوپہر میں سوچا کی۔ آخر اتنی جلدی اُس کے آنسو کیوں نکل پڑتے ہیں؟ رائے صاحب کو دیکھ کر اُس پر رقّت کیوں طاری ہو جاتی تھی؟ پھر اُسے نریندر کا خیال آ گیا: وہ سب کے سامنے کتنا چپکا بنا رہتا تھا پر اکیلے میں بُری طرح سٹپٹا جاتا۔ شمن اُس کی گھبراہٹ سے اور بھی دلیر ہو جاتی، اور جب وہ شوق بھری کن انکھیوں سے اسے تاکتا تو بزرگانہ انداز سے مسکرا اٹھتی۔ اب وہ بچّہ نہ تھی، اسے معلوم تھا نریندر اسے چاہتا ہے! یہ چاہت کیا ہوتی ہے؟ نریندر اُسے بالکل

چغد معلوم ہوتا۔ اس کی محبت کتنی بے تکی اور کتنی بے ہنگم تھی۔

اور رائے صاحب؟ وہ تو اسے دیوتا نظر آتے۔ بیٹھے بیٹھے اُس کا جی چاہتا وہ لمبی لمبی اُن کے صندل جیسے پاک قدموں میں لیٹ جائے، وہ آہستہ سے اسے سہارا دے کر اُٹھائیں اور اُس کا جھکا ہوا سر اپنے پراسرار سینے سے لگائیں۔ اُن کا فراخ سینہ، جس میں سے مقدس مندروں کی سی مسحور کن خوشبو آتی تھی، ایک بار ہی وہ اپنے نتھنے چوڑے کر کے اس مہک کو پی جائے اور ابدی غنودگی میں ڈوب جائے۔

پریما کہتی تھی کہ ماں کے مرنے کے بعد انھوں نے دوسرا بیاہ نہیں کیا، دونوں بچوں کے لیے سب کچھ بن کر رہ گئے۔ کچھ لوگ تو اُنہیں چھچھورا کہتے تھے اور بعض انھیں فلسفی مجذوب اور نہ جانے کیا کچھ سمجھتے تھے۔ شمن کو وہ نارد جی اوتار معلوم ہوتے۔ پریما کے ساتھ رہ کر اسے ہندو دھرم بہت مقدس معلوم ہونے لگا تھا۔ کبھی کبھی وہ کُم کُم کی ٹیکی چپ کر لگاتی اور آئینے میں اسے اپنی شکل عجیب سی معلوم ہوتی۔ ننھی سی خونیں بوند سے اُس کے چہرے پر ہزاروں رنگینیاں اور سنگار پیدا ہو جاتے۔ اُس کی آنکھیں کچھ کچھ املیا کی مست سادھوؤں کی سی آنکھوں سے مشابہ ہو جاتیں۔ اور بال زندہ سانپوں کی طرح رینگنے لگتے۔ معلوم ہوتا وہ ٹھنڈے ٹھنڈے شعلوں میں لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ سلگ رہی ہے۔ اُس وقت رائے صاحب کے طلسمی بال اور ڈھلی ہوئی صبح کی طرح جھلملاتی پیشانی کے علاوہ اسے کچھ نہ نظر آتا اور وہ نہ جانے کن نامعلوم تاریکیوں میں بھٹکنے لگتی۔

شام کو کھانا کھاتے میں کچھ دھرم اور سماج کا ذکر چھڑ گیا۔ پریما زور شور سے لکچر دینے لگی۔ نریندر بھی بیچ بیچ میں بول اٹھتا، ایکا ایکی رائے صاحب بولے:

"ارے او چھمی، تو ہندو ہے کہ مسلمان؟"

سب ایک دم خاموش ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"رام رام، جو کہیں مسلمان ہوئی تو اپنا دھرم تو بھرشٹ ہو گیا سمجھو۔"

"رائے صاحب ہمارا دھرم ایسا بودا نہیں کہ کوئی اُسے بھرشٹ کر سکے۔ دنیا

کی کوئی شکتی ہمارے دھرم کو آنچ نہیں پہنچا سکتی۔" پریما بولی۔

"چل چل، جانے دے۔" انھوں نے پریما کے جوش کو ایک طرف جھٹک کر کہا۔

"کیوں ری شمن، تو بتا۔"

"رائے صاحب دیکھیے میری طرف۔" نریندر جوش سے چیخا۔

"نہ، نہ بھئی میں کچھ نہیں دیکھتا، یہ جو لڑکی ہے نا، یہ اگر مسلمان ہوئی تو۔ ۔ ۔"

"رائے صاحب آپ،" پریما غصہ سے بے حال ہوگئی۔ "اور آپ کے کتنے دوست جو مسلمان ہیں تو۔ ۔ ۔"

"ہمارے دوستوں کی اور بات ہے۔ وہ۔ ۔ ۔ مگر یہ لڑکی تو۔ ۔ مجھے نہیں معلوم تھا، رام رام۔" مارے شرم کے نریندر اور پریما روہانسے ہوگئے اور شمن نے سہم کر پلیٹ سے ہاتھ کھینچ لیا۔ رائے صاحب کے چہرے پر ویسی ہی درشتی قائم تھی۔

"مذاق نہیں ہے، اب ہم سب کو پرائشچت کرنا پڑے گی سو الگ، اور بھئی اس چھوکری کو ہندو بنانا پڑے گا۔ کیوں پھر۔ ۔" وہ جھک کر شمن کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔

"تو لے تجھے بھی ہندو بنائے دیتا ہوں۔" گلاس میں سے پانی لے کر وہ ناخنوں سے شمن کے منہ پر چھڑکنے لگے۔ اڈم شڑم نہ جانے انھوں نے کیا پڑھنا شروع کیا۔ ایک دم سے پریما دوڑ کر اُن کے بازو سے جھول گئی اور زور سے شانے میں دانت گاڑ دیے۔

"اُفوہ۔ کتیا!" رائے صاحب جلدی جلدی اپنا کندھا سہلانے لگے۔

"اچھا مت بنانے دو، ہم تو کہتے تھے چلو بھئی اچھا رہے گا، کوئی موٹا سا بنیا ڈھونڈھ کر اس کا بیاہ کر دیں گے، مگر۔ ۔ ۔"

شمن تنتناتی ہوئی میز پر سے اُٹھ کر کھڑکی میں جا بیٹھی اور آنکھیں بھینچ بھینچ کر جھوٹے آنسو نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ارے، رے رے، ہمارا بیٹا روٹھ گیا۔" وہ پیچھے پیچھے آئے، دیر تک وہ

اُسے بہلاتے رہے مگر شمن روٹھی رہی۔

"آنکھیں میچیں کون آئے، آنکھیں میچیں کون۔" اُنھوں نے آنکھیں بند کر کے اُس کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ ان کی بائیں آنکھ کھلی ہوئی تھی جس میں سے شربتی شراب شرارت سے جھانک رہی تھی، شمن ہنس پڑی، لپک کر رائے صاحب نے اُسے اُٹھا لیا اور کرسی پر ڈال دیا۔

شمن نے ایک کہانی سنی تھی کہ ایک آدمی اپنے ایک دوست کو دفن کرنے گیا تو اُس کی تسبیح قبر میں گر گئی۔ بعد میں اُسے یاد آیا تو اُس نے سوچا چل کر لے ہی کیوں نہ آؤں۔ اُس نے جا کر قبر کھولی اور نیچے اُترا تو دیکھا مردہ غائب، ہاں قبر کے سرہانے ایک کھڑکی کھلی ہے۔ اس کھڑکی کے اندر داخل ہوا تو سامنے اُس کا دوست ایک مرصع تخت پر جلوہ افروز نظر آیا۔

"یار بڑے ٹھاٹ ہیں تمھارے تو" اُس نے کہا۔ "ہاں بھائی تمھاری دعا سے مزے میں ہیں اور بھائی تمھاری تسبیح رہ گئی تھی سو یہ رہی" وہ بولا۔ "ہاں وہی تو لینے چلا آیا تھا، خیر تم سے بھی ملاقات ہو گئی، اچھا بھئی السلام علیکم"

"وعلیکم السلام"

وہ آدمی قبر سے نکلا تو معلوم ہوا دنیا ہی بدل چکی ہے: نہ گھر نہ بار نہ بچے نہ بیوی! ایک سو دو سو برس کے بوڑھے نے بتایا کہ اُس کے لکڑ دادا کے سکڑ دادا کے زمانے میں سنا جاتا تھا کہ کوئی آدمی اس نام کا رہتا تھا۔

تو یہ ہیں قدرتِ الٰہی کے کرشمے۔ یہاں تو علیک سلیک ہی ہوئی اور وہاں جگ بیت گئے۔ جب رائے صاحب نے اُسے اُٹھا کر کرسی پہ ڈالا تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ آسمان پہ ستاروں کے ہنڈولے میں چکر پھیریاں کھا کر ایک دم رک گئی۔ ہر چیز اُسے اپنے گرد ڈگمگاتی محسوس ہو رہی تھی اور مند مند تیکھی مقدس خوشبو سے اُس کا دماغ سُن ہو کر رہ گیا۔ جلدی سے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ٹھنڈے پانی کا گلاس اُٹھا کر اپنے صدیوں کے پیاسے ہونٹوں سے لگا لیا۔

(۲۵)

دسمبر کی چھٹیوں میں اُسے اِس مرتبہ کوئی گھر سے لینے نہ آیا۔ گنتی کی دو چار لڑکیاں بورڈنگ میں رہ گئیں وہ بھی اپنے اپنے مشغلوں میں لگی دبی رہتیں۔ پریما اور شمن ہر وقت ساتھ رہتی تھیں، اُس کے جانے کے بعد شمن دن بھر پریشان بھٹکتی رہتی۔ کسی پیڑ کے نیچے دری ڈال کر ناولیں پڑھا کرتی، پھر کبھی کبھی شام کو دو چار لڑکیاں مل کر سنیما چلی جاتیں، تب تو شمن اور بھی بوکھلا جاتی۔ خاموش کرسی پر لیٹ کر وہ رامائن کا ترجمہ پڑھا کرتی، سیتا جی کی زندگی پر اُسے بڑا رشک آتا۔ کس مزے سے وہ رام چندر جی اور لچھمن جی کے ساتھ جنگلوں میں پکنک منایا کرتی ہوں گی۔ چودہ برس کی لمبی چوڑی حسین پکنک! ایما کہتی تھی کہ اچھا ہی ہوا جو رام چندر جی کو بن باس ملا، کچھ تو غریبوں کی دکھ بھری زندگیوں کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔ کتنے انسان ہیں جو جانوروں سے بدتر اور جنگلوں سے بھی گئی گزری زندگی گزارنے پر مجبور ہیں لیکن تاریخ میں کوئی ایک لفظ بھی ان کے بارے میں نہیں لکھتا۔ یہ بڑے لوگ اگر عیش و عشرت سے اکتا کر سنیاس لے لیں تو مصنف کی۔ لیکن جو اُن سنیاسیوں کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا جو پیدا ہی ننگی دنیا میں ہوتے ہیں۔

چند ہی دنوں میں اُس نے ان گنت کتابیں پڑھ ڈالیں جن میں سے "جین ایر" نے اُسے حد سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ آخری باب، جہاں وہ اپنے اندھے آقا کے پاس لوٹ کر آتی ہے، اس کو اتنا پیارا معلوم ہوا کہ تین چار بار پڑھ کر بھی سیری نہ ہوئی۔ ٹیگور کی کہانیاں، خصوصاً "کاسٹ اوے" پڑھ کر تو سچ مچ آنسو نکل پڑے۔ ہارڈی کی مشہور ناول "ٹیس" نے بھی اسے ہلا کر رکھ دیا۔ مگر سب سے زیادہ جس چیز نے اس کی رگ رگ کو نچا کر پست کر ڈالا تو وہ بائرن، شیلے اور کیٹس کی شاعری تھی۔

جب کل پانچ چھٹیاں رہ گئیں تو پریما اور نریندر اسے لینے آ پہنچے۔ شمن کو یاد بھی نہ رہا کہ وہ پریما سے ناراض تھی۔ نریندر کے ساتھ گھس کر بیٹھنے میں بھی اعتراض نہ ہوا اور جب اُس نے حسبِ عادت اُس کا پیر کچلا شمن نے چٹاخ سے اُس کے گال پر ایک تھپڑ لگا دیا۔ پریما بھی اُس کی حمایت میں نریندر کے چٹکیاں بھرنے لگی۔ موٹر اُڑی چلی جا رہی تھی اور اس سے

جب بھی پیر شمن اُڑ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ روحانی طور پر تو پہنچ بھی چکی ہے۔ رانیدھا پرمیا اور نریندر سے ناراض ہیں کہ وہ اُسے اتنی دیر میں کیوں لائے۔ وہ اس کے انتظار میں کس قدر تھک گئے ہوں گے۔ اُسے دیکھتے ہی وہ نقلی مگر اصلی موتیوں جیسے دانت ایک دم جگمگا اُٹھیں گے۔

مگر گھر پہنچ کر نہ ہی دانت جگمگائے اور نہ اُس کے انتظار میں کوئی تھکا ہوا نظر آیا۔ رانی صاحب اپنے چند دوستوں کے ساتھ شکار کو گئے ہوئے تھے، آنے کے متعلق کچھ نہیں کہہ گئے تھے۔ گھر سونا سونا ہو رہا تھا، شمن آکر پچتائی۔ اُدھر سے نریندر نے بدمذاقیاں شروع کر دیں۔ پرمیا کو سوتا پا کر اُس نے شمن پر سچ مچ اعلانِ عشق کر دیا اور وہ بھی اس بھونڈے طریقے سے کہ لیں ٹوٹ ہی تو پڑے۔ شمن کو اُس پر بجائے غصّے کے پیار سا آگیا، وہ مسکرا دی اور جیسے ایک عقلمند ماں بچے کو شیشے کا گلاس مانگنے پر بڑے پیار سے بہلا دیتی ہے اسی طرح شمن نے نریندر کو چمکار دیا اور جب وہ ناامید ہو کر سسکیاں لینے لگا تو شمن کا جی چاہا اُس کا بے وقوف سر اپنے سینے سے لگا کر تھپکیاں دے اور سُلا دے۔ وہ اپنے آپ کو ایک دم نہایت عقلمند اور بزرگ سمجھنے لگی۔ نریندر اسے بے حد یتیم اور بیکس معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بیچارا اُس کی بزرگانہ باتیں سن کر ویسے ہی حیرت زدہ ہو رہا تھا، بالکل ہی سٹپٹا گیا۔ چائے پر کچھ جھینپا، کچھ روٹھا بیٹھا رہا۔

شام کو رانی صاحب اچانک واپس آگئے۔ گویا شمن کی خاموش پکار نے انھیں کھینچ بلایا۔ خاک اور دھول میں اَٹے ہوئے خاکی کپڑے، میلے بالوں پر خاک کی افشاں۔ جیسے سورج پر ہلکے ہلکے بادلوں کی پرچھائیاں، دھوپ سے رنگ کچھ اور جھلس کر شوخ ہو گیا تھا۔ اور جب پیڑائے ہوئے ہونٹوں کے درمیان ستاروں کی لڑیاں چمکیں تو شمن کا دل خوب زور زور سے اُچھلنے لگا اور اُس کی نگاہیں مٹی میں لتھڑے ہوئے بھاری جوتوں پر جم گئیں۔

آتے ہی اُنھوں نے بھر گلاس برف کا پانی پیا اور خلافِ معمول سر ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گئے۔ پرمیا اور نریندر ویسے اُن سے اتنے بے تکلف تھے، مگر انھیں خاموش

دیکھ کر بیچاروں کی زبانیں گنگ ہو جاتیں۔ اُن کی ایک تنبیہی نگاہ چانٹے کی طرح لگتی۔ اور پرتیا جیسی بے چین ہستی بھی دبک کر رہ جاتی۔

"کیا بات ہے؟" شمن نے خاموشی اور سکون سے متأثر، آہستہ سے پرتیا سے پوچھا۔

"تھک گئے ہیں، یا شاید..." وہ رک گئی۔

"کیا؟"

"شاید مس فلپ سے لڑائی ہو گئی۔ وہ کبھی تو شکار کو گئی تھیں۔" پرتیا نے اسے ڈرائنگ روم کے آخری کونے میں لے جا کر کہا۔

"کون ہیں یہ مس فلپ؟"

"ہیں ایک۔ یہاں انسپکٹریس آف اسکولز ہیں، رائے صاحب کی کلاس فیلو تھیں۔ شادی بھی طے ہو گئی تھی مگر جب انگلینڈ میں رائے صاحب ممی سے ملے تو بس نہ جانے کیوں دو دن میں شادی بھی کر ڈالی۔ اب.. ارے تم نے ممی کی تصویر نہیں دیکھی جو رائے صاحب نے بنوائی ہے! ٹھہرو ابھی دکھاؤں گی۔ ہاں تو ممی کی زندگی ہی میں یہ گھنٹوں آکر بیٹھا کرتی تھیں۔ ممی آرٹسٹ تھیں اور اس قدر سیدھی کہ ہماری دادی جی خوب اُن سے گھر کا کام کرواتی تھیں۔ وہ دتی باندھتی تھیں، اور بڑی کاہل تھیں۔ یہ چڑیل جب ہی سے انھیں پھانسنے کی فکر میں تھیں، یہ فلپ کی بچی! رائے صاحب اسے بہت چاہتے ہیں مگر جلاتے بھی خوب ہیں، مگر جب روتی ہے تو پچھتاتے ہیں۔"

"بڑی بری ہے!" شمن کے دل نے پکارا۔

"ہاں مگر رائے صاحب اسے کبھی نہیں مناتے۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ بس ملاقات ہو جاتی ہے کسی پارٹی جلسے میں۔ اور رائے صاحب کی تو یہی عادت ہے کہ ذرا دیر میں ہنسا دیا اور ذرا میں رلا دیا۔ پھر اس دن..

"پرتیا!" رائے صاحب کی بھرائی ہوئی آواز جیسے چرچ کے ہال میں گونجی۔

"ارے ... شمن بھی آیا ہوا ہے۔" جب اُس کے دوست یہ رائے صاحب نے گویا اب اُسے دیکھا۔ وہ ذرا مسکرا اُٹھے اور بولے ... "بھئی ذرا اُتار" وہ کوٹ میں پھنسے ہوئے بولے

شمن کوٹ اُتارنے لگی۔ قمیص بُری طرح پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی اور جسم جل رہا تھا وہ پراسرار مند بدن کی سی خوشبو کا جھونکا اُسے آہستہ سے جھنجھوڑ گیا، مگر وہ سنبھل گئی اور زمین پر بیٹھ کر جوتا کھولنے لگی۔ رائے صاحب نے پیر کھینچ لیے۔ اور جھک کر ہونٹوں سے اُس کے گال پر دو انگلیاں ماردیں۔ شمن گھبرا کر کھڑی ہوگئی اور بیرا جوتے کھولنے لگا۔

کھانے کے کمرے میں شمن کو چوتھے سے رشتے معلوم ہوئے۔ اُس نے بتی جلائی تو نریندر نامی عاشق کے سارے ضروری تاثرات چہرے پر جمع کیے کرسی پر اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ شمن جیسے اُس کے حال دل سے بے خبر کرسی کھینچ کر پاس بیٹھ گئی۔

"کتنی گرمی ہے!"

نریندر چپ!

"آج تو آئس کریم بنتی"

نریندر چپ!

"رائے صاحب کو فالودہ پسند ہے نا؟" اس نے براہِ راست پوچھا۔

چپ!

"اونہہ، کوئی سامنے کی کھڑکی ہی کھول دے، پنکھے بھی تو بند ہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہیں آگ لگ گئی ہے ... ہائے کوئی ..."

نریندر نے ایک حقارت آمیز نظر اُس پر ڈالی، اور جھنجھلاتا ہوا کھڑکی کے کواڑ دھڑا دھڑ کھولنے لگا۔

"نری کیا بہت غصہ ہو؟" اُس نے پیار سے چھیڑا۔

"نہیں"

"ہاں.... تو پھر آئس پریم کے ذکر پر مسکرائے کیوں نہیں؟" باوجود کوششوں کے نرنیدر مسکراہٹ کو نہ روک سکا۔

"اہو ہو، بن رہے تھے جناب! اندیسے کہیں کے! کہیں جاڑوں میں بھی کوئی آئس کریم کھاتا ہوگا!"

"تم نہیں جانتی کہ...."

"ہونہہ، جیسے تم تو بہت جانتے ہو"

اگر تمہیں کسی سے اتنا پریم ہوتا" وہ انگریزی چھانٹنے لگا۔

"آہا، پریم! پریم کی نیّا.... پریم.... کھونا اُگئے؟"

"ہنہ.... میں.... " نرنیدر بھنایا۔

"دیکھو نرنیدر تم مجھے ڈانٹو گے تو... ہاں، اچھا نہ ہوگا۔ بڑے آئے ڈانٹ کے بولنے والے۔ اور اسی پہ کہتے ہو پریم ہے؟ خاک پریم ہے تمہیں۔ جی ہاں، پریم ہوتا تو یوں اپنا ریکٹ چھپا کر نہ رکھتے اور لوکاٹ توڑتے وقت پکے پکے خود نہ نگل جاتے۔"

"کیوں جھوٹ بولتی ہو، کتنے سارے توڑے مگر اُس نے پرمیا نے لپک لیے ہُنہ!"

"خیر لوکاٹ تو پرمیا نے لپک لیے اور ریکٹ کی بات کو پی ہی کر گئے؟ ہُنہ، جیسے میں کھا ہی تو جاتی تمہارا بلاّ۔"

ایک دم سے نرنیدر پیر پٹختا چل دیا، شمن مسکراتی ہوئی اطمینان سے کرسی پر پھیل گئی۔

"یہ لو ریکٹ اور مجھ سے بات نہ کرنا" نرنیدر نے ریکٹ پٹخ دیا، کچھ دیر شمن اُسے دیکھتی رہی اور پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

"او.... فوہ نرّی!"

"مجھ سے مت بولو جی، سو دفعہ کہہ دیا، ہاں، نہیں تو...."

شمن امتا کے معصوم جذبے سے بے چین ہو کر ہنسنے لگی۔ اگر اس طرح، بالکل ایسے ہی فرہاد شیریں کے سامنے تیشہ کھینچ کر کہتا، "ہم سے نہیں کھدتی نہر... جی!" تو یقیناً وہ شہر یار کو چھوڑ چھاڑ اسی کے گلے کا ہار بن جاتی اور پھر حکم ملتا ہے: "ہم سے مت بولو جی!" وہ خوب ہنسی۔

"اوہ، نری ڈیر!" وہ نریندر کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اس کا منہ تکنے لگی۔ ایک دم سے نریندر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ریچھ کی طرح لپٹ گیا۔ شمن نے گھبرا کر اسے دور دھکیلا۔ سارے بال اور کان کھسوٹ ڈالے، بیچارا اپنٹے ہوئے کتے کی طرح کونے میں دبک گیا اور شمن کچھ خوفزدہ، کچھ شرمندہ بھاگنے لگی کہ آتی ہوئی پریما سے ٹکر ہوئی۔

"ارے کیا ہوا؟"

"آ... آ... کچھ نہیں، یہ نریندر مجھے مار رہا تھا" وہ ایک دم بات پلٹ کر ہنسنے لگی، پھر مصنوعی غصے سے گال پھلا لیے۔

"ہائیں! نری کے بچے! یہ رہا تیرا ریکٹ، اور کہتا تھا کہ گم ہو گیا؟"

"ہاں، چھوٹا سا ہے زمانے کا" شمن نے تائید کی۔

"کیوں مار رہا تھا بیچاری شمن کو؟ کیوں؟ کیوں؟" وہ ریکٹ کے جال سے نریندر کے سر پر پیٹے لگانے لگی۔

بپھرا ہوا نری جھنجھوڑ ہی کھاتا کہ اتنے میں رائے صاحب کمبل لپیٹے آ پہنچے اور بات ٹل گئی۔

"آج نریندر کو کیا ہو گیا ہے؟" رائے صاحب نے اسے غصے اور شرم سے سرخ دیکھ کر کہا، "تم دونوں نے ستایا ہو گا۔ کیوں؟"

"پریم ہو گیا ہے بیچارے کو" شمن نے دبی زبان سے ہنسی روک کر کہا۔

"کیا ہو گیا ہے؟"

"پریم، پریم... رائے صاحب" پریما نے چیخنا شروع کیا۔

"کیسے؟ اپنے نری کو؟" رائے صاحب بن کر فکرمند ہو گئے۔

"ہاں، اچھا بیچاریا"

"میں مار دوں گا، ہاں" نریندر غرایا

"ارے باپ رے! مگر کس سے ہو گیا ہے پریم؟"

"ایک ہے" ششی اترانے لگی۔

"جھوٹی، ہُنہ" نریندر مارے شرم کے اور بھی جھنبا گیا۔

"ہا، بیچارہ۔ رائے صاحب اب اپنا نرتی تو۔ ۔ ۔"

"میں چھری مار دوں گا۔ ۔ ۔" پریما کی تجی۔

"اور رائے صاحب۔ ۔ ۔" قبل اس کے کہ پریما کچھ بولے نرتی نے کھٹ سے چھری کا دستہ اُس کی انگلی پر رکھ دیا۔

کھانے پر نریندر کے عشق نے سب کو ہنسا دیا، خصوصاً ششی تو بے تحاشا ہنستی رہی۔ اُسے یہ کھیل نہایت ہی مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا۔ رائے صاحب میں بھی اپنی پرانی شگفتگی لوٹ آئی، وہ دیر تک بیٹھے کانٹوں اور چھری کی مدد سے میز پر مجسمے بنا کر امتحان لیتے رہے، مگر انہوں نے صرف شوربہ پیا اور جلدی سے جا کر سو گئے۔

ششی اور پریما اُداسی سے نڈھال ہو کر ایک ہی پلنگ پر سو گئیں، یعنی ششی جاگتی رہی اور پریما سو گئی۔ ششی نے جاگنے اور خود سے بات کرنے کی ایک عادت سی ڈال لی۔ روزانہ سونے سے پہلے وہ خود اپنے حضور میں اپنے سارے احساسات اور تجربات ایک ایک کر کے پیش کرتی اور اُن پر خود اپنا فیصلہ سنتی، یہاں تک کہ وہ نہ جانے کب سو جاتی۔ اس سونے میں اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے مزے دار کہانیاں سُنا کر سلا دیا ہو۔ اُیعنا جب نے جو ہوا سے اُسکے گال پر دو انگلیاں چھوا دی تھیں وہ ایک دم تازہ ہو گئیں، ساتھ ہی اسے گزرے ہوئے جنم کی بھولی ہوئی باتیں یاد آ گئیں۔ دور، بہت دور، صدیوں پہلے رشید نے کیرم کھیلتے میں اُس کی کلائی کو پکڑا تھا، چنٹی مارنے کے لیے دو انگلیوں کو ملا کر پھر چھوڑ دیا تھا اور وہ سسکتی ہوئی چنٹی اب بھی اُس کی رگ رگ میں چمکیں لے رہی تھی۔ اُس نے اپنی کلائی پر سنسناتا ہوا گال رکھ دیا اور رائے صاحب کی دو انگلیوں کا مس کلائی میں بنگیا۔

گیا۔ اس طرح گویا اُس نے اس نیم مردہ چوٹ میں نئی جان ڈال دی، اسے سکون کی نیند آ گئی۔

صبح اُس کی آنکھ خلافِ معمول دیر میں کھلی تو کالج کی گھنٹی کی آواز کہیں دور سنائی دی۔ ذرا ہوش آنے پر معلوم ہوا وہ کالج میں نہیں بلکہ پریما کے پلنگ پر ہے۔ اور یہ آواز کسی سلے کانسی کی تھالی رسوئی میں گرائی تھی۔ اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

رائے صاحب اب بھی شکست نظر آ رہے تھے۔ شمن دیر تک مس فلپ کو کوستی رہی جس سے لڑ کر وہ اتنے مکدّر ہو گئے تھے۔ مگر پھر بھی اُسے دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں تازگی آ جاتی۔ اور وہ ایک آدھ جملہ ضرور کس دیتے، دیر تک بیٹھ کر تاش بھی کھیلے اور بے ایمانیاں بھی کیں۔ آج شمن کا دل بے اختیار اُنھیں چھونے کو چاہتا تھا لہٰذا وہ پریما کے ساتھ ساتھ اُن سے لڑنے بھی لگی۔ نہ جانے کس بات پر انھوں نے زور سے اُس کی اُنگلی چٹخا دی تو بچوں کی طرح مچل گئی۔ اُس کا جی چاہتا تھا ایک دم اُن کے مضبوط سینے کے پٹ کھل جائیں اور وہ سرنگوں ہو کر اُن میں سما جائے۔

وہ روٹھی ہی رہی۔ پریما دھوبی کو کپڑے دینے چلی گئی اور نریندر کا دورہ قائم تھا وہ منہ پھلائے برآمدے میں پڑھتا رہا کہ رائے صاحب آ گئے۔ شمن نے بن کر منہ پھلا لیا، انھوں نے اُس کے پھولے ہوئے گالوں کی نقل میں اپنے گال پھلا لیے اور شمن کے ہلنے پر اُس کے پاس بیٹھ گئے۔ شمن پر تو بھتنی سوار تھی وہ نہ جانے کس بات پر جل اُٹھی اور اُن کے چھیڑنے پر بِھر کر رونے لگی۔

"ارے، رے، رے میرا چمن" رائے صاحب نے اُسے چھوا تو وہ اور بھی بگڑ گئی۔ وہ متعجب ہو کر صورت دیکھنے لگے۔ اُنھیں سنجیدہ دیکھ کر وہ ڈر گئی اور بری طرح اُن سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

رائے صاحب نے ہنستے ہوئے اُسے بچوں کی طرح تھپکنا شروع کیا۔ وہ خاموش اُن کے سینے سے سر لگائے لمبی لمبی سانسیں بھرتی رہی، یہاں تک کہ اس پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ رائے صاحب نے جھک کر اُس کا چہرہ دیکھا تو وہ ایک دم سوتی بن گئی۔۔۔

رائے صاحب نرمی سے تھپکتے رہے، پھر آہستہ سے اُنھوں نے اسے سرکا کر پلنگ پر لٹانے کا ارادہ کیا تو وہ ایک دم انھیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کانپ اُٹھی۔

"نہیں، نہیں رائے صاحب" اُس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا ہے؟ کچھ... ارے" وہ اُس کی آنکھوں کی وحشت سے ڈر گئے۔

"میں... میں... نہیں رائے صاحب، مجھے گرایئے مت رائے صاحب... رائے صاحب.. رائے صاحب میں... میں... آپ سے پریم کرتی ہوں!" اس نے سُوکھے ہوئے گلے سے آخر کہہ ہی دیا۔

"ہیں؟" وہ اُس کی طرف اجنبیوں کی طرح دیکھنے لگے۔

"میں آپ سے... پریم... رائے صاحب... میں..." اُس کی آواز اور گھٹ کر سہم گئی۔

"ایں، شمن... اچھا سو جاؤ" وہ جلدی سے اُس کی لپٹی ہوئی انگلیاں الگ کرنے لگے۔

"نہیں... نہیں رائے صاحب، میں مر جاؤں گی۔ رائے صاحب مجھے... رائے صاحب مجھے دور نہ کیجیے" رائے صاحب ایسے جھجکے جیسے کسی نے اُن کے ماتھے پر پتھر مار دیا۔

"رائے صاحب... میں اپنا دھرم بھی بدل دوں گی" اُس نے اور قریب ہو کر کہا، رائے صاحب چاروں طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"ارے پریما..." انھوں نے آواز دی۔

"مت بلایئے کسی کو۔ رائے صاحب میں مر جاؤں گی۔ میں پریم کرتی ہوں رائے صاحب"

سامنے دروازے میں نریندر کتاب لیے حیرت سے منہ پھاڑے کھڑا تھا، جو شاید اُس نے شمن کو یہ کہتے سنا اُس کا چہرہ کانوں تک لال ہو گیا، جیسے کسی نے اُسے ماں کی گالی دے دی ہو۔ شمن کی زبان لڑکھڑا گئی، وہ ڈھیلی ہو کر پلنگ پر اوندھے منہ گر پڑی۔

رائے صاحب چلے گئے، بغیر دوسرا لفظ زبان سے نکالے اور شمن کا جی چاہا کاش پلنگ سمیت وہ زمین میں سماتی چلی جائے۔ نیچے، نیچے، اتنے نیچے کہ بالکل زمین کے کلیجے میں جا چھپے۔ مارے ہیبت اور شرم کے وہ آنکھیں بند کیے اسی طرح شام تک پڑی رہی۔ کوئی ایسی ترکیب ہوتی جو وہ بنا کچھ کہے سنے اپنا منہ ڈھانکے وہاں سے بھاگ نکلتی۔ اس کے کمرے میں کوئی نہ آیا مگر اسے صاف معلوم ہو گیا کہ نریندر اور پریما دوسرے کمرے میں ڈرے ڈرے کیا باتیں کرتے رہے۔ یہ اس نے کیا کر دیا؟ اب کیا ہوگا؟

کانپتی لرزتی، آنکھیں جھکائے جب وہ باہر نکلی تو نریندر جلدی سے اپنے کمرے میں گھس گیا۔ وہ بھی اسے منہ دکھاتے ڈر رہا تھا۔ پریما نے عورت کی پوری بہادری سے اس کا مقابلہ کیا، گویا وہ آج پہلی مرتبہ اس کا بہ حیثیت ایک اجنبی ہستی کے استقبال کر رہی ہے۔ وہ بڑے اخلاق سے بولی اور دونوں نے جا کر مہذب لوگوں کی طرح چائے پینا شروع کی۔ آج نہ کچالوؤں پر جھگڑا ہوا نہ بسکٹوں پر چھینا جھپٹی ہوئی۔ اس کی ہمت نہ پڑی جو رائے صاحب کا نام بھی لیتی۔ پریما بہت تپاک سے اسے پھل وغیرہ دیتی رہی، شمن بھی تکلف سے کھاتی رہی۔ کبھی کبھی اسے پریما آنکھ بچا کر دیکھ بھی لیتی مگر ایسے گھبرا جاتی گویا اسے نہیں پہچان پائی۔ دونوں بے طرح سہمی ہوئی تھیں۔ وہ بے تکلف سہیلیاں ایک دوسرے سے بہت دور غیریت کی کشتی میں جا پڑی تھیں۔ ان کے حواس بے طرح بھٹک گئے تھے، جیسے دو دوستوں کے بیچ میں ریگستان در آیا ہو اور ایک دوسرے کو پکار بھی نہ سکیں۔ شام تک خاموش رہنے کے بعد شمن نے بڑی مشکل سے اس سے بورڈنگ جانے کی اجازت دبے الفاظ میں طلب کی جو ایسی تیزی سے ملی کہ اس کا منہ اتر گیا۔ ڈرائیور تو جیسے تلا ہی بیٹھا تھا۔ آن واحد میں وہ خالی ڈھنڈھار بورڈنگ کی چہار دیواری میں تھکے ہوئے قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس نے بجلی نہیں جلائی اور جوتوں سمیت لحاف میں سکڑ کر لیٹ گئی۔

دوسرے دن لوگوں سے آنکھ ملاتے دہشت معلوم ہونے لگی۔ گو وہ کچھ نہ جانتے تھے پھر بھی جیسے اس کے منہ پر لمبی لمبی سطریں لکھی اس کے گناہ کا ڈھنڈورا پیٹ

رہی تھیں۔ وہ کچھ چھپانا چاہتی اُن متجسس نظروں سے جو اس پر اچانک جا پڑتیں اور وہ جھجک کر دور ہو جاتی۔

تو وہ بدمعاش تھی! پرلے درجے کی آوارہ! اُس نے ایک مقدس انسان کی پاکدامنی پر سیاہ دھبے ڈالنے چاہے مگر خدا نے اُسے بچا لیا۔ یہ مُجھ سے کیا ہو گیا تھا؟ یہ ٹوٹے ہوئے ذرے اب کیسے جڑیں گے؟ اب کیا ہو گا؟

چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہی لڑکیاں لوٹنا شروع ہو گئیں۔ اب پرمیا بھی ایک دن بعد آ جائے گی! پھر کیا ہو گا؟ وہ اس آئینے میں اپنی صورت کیسے دیکھ سکے گی۔ اُس کی وحشت بڑھتی گئی۔

دوسرے دن صبح لائبریری میں لڑکیاں سر جوڑے اخبار پر مکھیوں کی طرح جھکی ہوئی تھیں، کچھ بلند آواز سے پڑھ رہی تھیں۔ جیسے کوئی حادثہ ہو جاتا ہے تو تماشبین لاش کو چاروں طرف سے گھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں اسی طرح ایک کے بعد دوسرا گروہ اخبار پر جمع ہو رہا تھا۔ ”چہ... ہا... بیچاری پرمیا...“ اُس نے کسی کو کہتے سُنا اور اس کے ہاتھ سے لرز کر کتابیں چھوٹ پڑیں۔ مجرم کی طرح نظریں نیچی کیے وہ منتظر رہی مگر پرمیا نے شاید اُسے دیکھا نہیں۔ اُس کی نظریں اخبار کی طرف اُٹھیں۔ لڑکیاں اُسے چھوڑ کر جا چکی تھیں، آہستہ سے وہ بڑھی، احتیاطاً کرسی پر بیٹھ گئی۔ رات کو رائے صاحب ہارٹ فیل ہو جانے کی وجہ سے فوت ہو گئے۔ یہ اُن کی پرانی بیماری تھی جس کا ایک حملہ ہو گیا۔ وہ خاموش میز پر کہنیاں ٹیکے بیٹھی رہی، کسی نے کلاس چلنے کے لیے شانہ ہلایا اور وہ چلنے لگی لڑکیوں کی رَو کے ساتھ۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ ایف اے کلاس نے اُسے اپنی جماعت چھوڑ کر آگے بڑھتے دیکھ کر روکا۔

”ہیں؟“ وہ ٹھٹک گئی۔

”تمھاری کلاس تو پیچھے رہ گئی، یہ اب کہاں جا رہی ہو؟“

”وہ... میں نقشہ لینے جا رہی ہوں، کل سٹنگ روم میں بھول آئی تھی۔“ اُسے

عین موقع پر بات سُوجھ گئی ورنہ غضب ہو گیا تھا۔ وہ یقیناً پکڑی جاتی۔ تیز قدم وہ سٹنگ روم کی طرف چلی مگر وہ کافی دور تھا، اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے اور وہ جلدی سے پلٹ پڑی۔ اپنی کلاس میں گھس گئی۔

نہ جانے اُس نے اس دن کیا پڑھا اور کیا سُنا! آنسو تو اُس کی آنکھوں سے جب ہی خشک ہو گئے تھے جب وہ دن رات متواتر اپنی بدمعاش انا کی یاد میں روئی تھی، چہرے پر کوئی آثار لانا کمزوری کی نشانی تھی، مگر پرنسپا کی خالی کرسی دیکھ دیکھ کر اسے یہی محسوس ہوتا تھا کہ رائے صاحب نہیں پرنسپا مر گئی۔

رائے صاحب مر گئے! اس خیال سے ہی اُس پر ایک نامعلوم سی دہشت طاری ہو جاتی۔ اُن کو جلا دیا گیا! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اُن کے وہ بال۔ وہ سورج سے زیادہ روشن تاج جلایا نہیں جا سکتا! وہ پکے "سونے جیسی رنگت اور سچے موتیوں جیسے مصنوعی دانت۔ ناممکن! وہ خود ہی فیصلہ کرتی۔

راتیں بڑی بھیانک ہو گئیں۔ رائے صاحب اس کے دماغ سے کسی طرح نہ نکلتے تھے۔ اور پھر تو یہ حالت ہو گئی کہ وہ باقاعدہ اُن سے ڈرنے لگی۔ رائے صاحب سے، جن کے قرب کے خیال سے ہی وہ لرز اٹھتی تھی۔ ایک دن اُس نے ایک مہارشی کی ارتھی بڑی دھوم دھام سے نکلتے ہوئے دیکھی۔ مہارشی کو پالکی میں باندھ کر بٹھا دیا گیا تھا، دانت کھلے ہوئے اور منہ پر سیندور، ہلدی اور چندن کے داغ، جلد باسی بینگن کی طرح جھریلا اور سیاہ، اس پر سے ہلکی ہلکی سڑے گوشت کی سی بساند! پھر تو یہ حال ہو گیا کہ مارے ڈر کے دن کو اکیلے کمرے میں جاتے دم نکلتا۔ رات کو معلوم ہوتا وہی پالکی والا مردہ اُس کے سرہانے بیٹھا ہے۔ وہ ہمت کر کے آنکھیں ٹیڑھی کر کے دیکھتی اور وہ جھپ سے پلنگ کے نیچے چھپ جاتا۔ کبھی پٹی کے نیچے سے ہاتھ پھیلا کہ اس کا گلا ٹٹول رہا ہے، کبھی غسل خانے میں اُس کے پیچھے لپک پڑنے نکلتا۔ جاتے جاتے وہ دلیری سے مڑ کر دیکھتی اور ایسا معلوم ہوتا کوئی تیزی سے کھٹنے کی آڑ میں ہو گیا، جھاڑیوں میں دبک گیا، گیلری میں سرک گیا۔ پسینے چھوٹ جاتے اور گھٹنے لرزا کرتے۔

بعض وقت رات کو کھانا کھاتے میں ایسا معلوم ہوتا کہ مردہ اُنگلیاں اُس کے ٹخنے میز کے نیچے ٹٹول رہی ہیں۔ وہ ڈر کر پیر کھینچتی تو وہ ہاتھ بھی ساتھ لٹکا چلا آتا۔ یہ چیخ مار کر الگ کرتی تو معلوم ہوتا کہ وہ خود اُس کی شلوار کا پائنچہ ہے۔

ایک دن وہ پڑھتے پڑھتے میز پر سر ڈال کر سو گئی۔ دیکھا رائے صاحب کے ساتھ بیٹھی تاش کھیل رہی ہے کہ ایک دم وہ اُٹھ کر ناچنے لگے؛ اُن کے بازوؤں کے پٹھے پھول پھول کر اُچھلنے لگے اور بال گز گز بھر کے سانپوں کی طرح کمر پر لہرا لہرا کر جھومنے لگے؛ مصنوعی دانت سُر تال میں بجنے لگے؛ تاشوں کے پتّے مشعل کی طرح جل اٹھے اور وہ دشمن کی طرف بڑھے۔ اُس نے ایک دلدوز چیخ ماری لیکن انھوں نے اس کی آنکھوں میں آگ ٹھونس دی۔ یہ مسلسل چیخیں مارتی رہی اور دونوں ہاتھوں سے مشعل کے شعلوں کو آنکھوں سے دور ہٹاتی رہی۔

"خن خن،، کچھ کہا اور وہ اُٹھ کر بے تحاشہ بھاگی۔ وہ بھاگتی چلی گئی اور شاید ساری رات اسی طرح بھاگتی رہتی اگر ایک دم چوکھٹ اُس کے ماتھے پر اچھل کر نہ لگتی۔ وہ گر پڑی۔ جب آنکھ کھولی تو رائے صاحب اُس پر جھکے ہوئے کچھ ناک میں ٹھونس رہے تھے جو دوزخ کی آنچ کی طرح دماغ کو جلائے ڈالتی تھی۔ اُس نے پھر چیخ ماری اور اُٹھنا چاہا مگر دو تین سفید سفید لمبوتری شکلوں نے اُسے دبوچ لیا۔

"چپ چاپ لیٹی رہو!" یہ پرنسپل کی آواز تھی۔

"میں نے جیسے ہی ٹارچ ڈالی یہ پاگلوں کی طرح نوچنے لگی اور پھر بھاگی" میٹرن خود نہایت خوفزدہ ہو رہی تھیں۔

تو یہ میٹرن تھیں جنھیں وہ رائے صاحب کا بھوت سمجھ رہی تھی۔ ان کے سفید بال کاغذ کی بتیوں میں لپٹے ہوئے روپہلی تاج کی طرح چمک رہے تھے، ٹارچ ہاتھ میں تھی اور وہ خود ہسپتال کے کمرے میں پڑی تھی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ اُسے بجلی بجھ جانے کے بعد بھی میز پر اوندھا پڑا دیکھ کر

انھوں نے ٹارچ ڈالی، بس وہ پاگلوں کی طرح بھاگی۔ حسنِ اتفاق سے اُس کا خواب اور میٹرن کا ہیولا ایک ہی کڑی میں اُلجھ کر دماغی خلل کا باعث ہو گئے۔ صبح تک اُسے زور کا بخار چڑھ آیا اور اسی حالت میں اُسے گھر پہنچا دیا گیا جہاں تین مہینے اُسے ٹائیفائڈ نے جی بھر کر جھنجھوڑیاں دیں۔

(۲۶)

بیماری طویل تھی اور ساتھ ساتھ غیر دلچسپ! حال ہی میں اُس نے ایک کتاب پڑھی تھی جس کی ہیروئن شروع سے آخر تک بیمار رہتی ہے اور اس بیماری کے وسیلے سے اُن کے عاشق صاحب کو اس قدر بہترین موقعے حاصل ہوتے ہیں کہ حد نہیں: جب دیکھو جناب مریضہ کو سہارا دیے دوا پلا رہے ہیں، اُس کے نازک ہاتھوں کی نازک ترین نبضیں ٹٹول رہے ہیں! اُس کے پیاسے لبوں میں انگور کا رس نچوڑ رہے ہیں۔ اس ناول کو پڑھ کر بے اختیار اُس کا دل بیمار پڑنے کو چاہا کرتا۔ وہ اُن رنگین لمحوں کا حسین تصور، جس کے خیال ہی سے اُس کی نبضیں اُچھلنے لگتیں اور حرارت تیز ہو جاتی تھی۔

مگر اب جو وہ بیمار پڑی تو یہ حال کہ تیمار دار تو در کنار مزے سے لوگ اُس کے سامنے چیخ چیخ کر بولتے، جھگڑتے لڑتے اور پٹتے، سامنے برآمدے میں اناج پھٹکے جاتے، ہاون دستے میں ہلدی دھنیہ کوٹا جاتا۔ بارہا ایسا ہوا کہ اُس کی آواز نہ نکلتی، سامنے لوگ لڑا لڑا کر تاش یکسی کھیل رہے ہیں، پانی مانگا تو کون کھیل چھوڑ کر اُٹھے، نوکر کو آواز دی جا رہی ہے اور وہ بھی ایسے چنگھاڑ کر کہ مردے بھی جی اُٹھیں۔ ذرا غنودگی طاری ہو جاتی تو پچی کی "وہ مارا" کے نعرے سے آنکھ کھل جاتی۔

سامنے روز لمبا چوڑا دستر خوان بچھتا، تر مال اُڑائے جاتے۔ شمن کی روح بلبلا بلبلا کر کھانوں پر منڈلاتی، آنکھیں خوان دیکھ دیکھ کر پتھرا جاتیں، قوت شامہ کھانے کی مہک کے حملے سہتے سہتے سُن پڑ جاتی۔ بھائی بہن مزے دار کھانے کھاتے دکھا کر

کھاتے اور اسے چڑا دیتے۔ سب اُس کے ندیدے پن کو اُس کی کمزوری اور فطری پستی پر محمول کرتے۔ اس کی بیماری کی وجہ سے گھر والے پریشان نہیں عاجز ضرور تھے جبھی تو اُس کا ایک دن جیا جب خاندان کے دو بڈھوں کو جنازے کی نماز پر بحث کرتے سُنا۔ وہ دونوں اُس کی طرف منہ کیے ریہرسل سی کر رہے تھے اور اسے یہی معلوم ہوا کہ گویا اُسی کی نمازِ جنازہ پڑھنے کی تاک میں تیاریاں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہر وقت وضو کرتے رہتے تھے مگر اس قدر بدبو جسم سے چھوٹتی تھی کہ دم لوٹ جاتا تھا۔ دوسرے قطعی خبطی تھے۔ یقیناً ان دونوں میں سے کسی کی پڑھائی ہوئی نماز سے جنت میں جانے کی متوقع نہ تھی۔ پھر چند لوگ بیٹھ کر لمبائی چوڑائی پر بحث کرنے لگے۔ دورانِ گفتگو میں وہ کاغذ کے نمونے موڑ موڑ کر تشریح کرتے جاتے۔ بیٹھ موڑ کر اُس نے سسک سسک کر رونا شروع کیا اور جب وہ سب چلے گئے تو اُس نے ڈرتے ڈرتے اُس کاغذی کفن کے نمونے کو دیکھا۔ کس قدر ناکافی تھا یہ لباس خدائے ذوالجلال کے حضور میں جانے کے لیے! بھلا اگر ایک میلا ہو جوڑا خراب ہو جائے گا تو کون سا ایسا ٹوٹا آ جائے گا؟ موت سے اُسے اور بھی ہول نظر آنے لگا۔

مگر موت اتنی بھیانک نہ تھی جتنی موت کی آؤ بھگت۔ معلوم ہوتا سب کو اس کے مرنے کا بڑا اشتیاق انتظار ہو رہا ہے۔ اُسے نفرت ہو گئی۔ سب سے نفرت ہو گئی زندہ یا مردہ وہ اُن کے لیے مر چکی تھی۔ یا شاید کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ یہ کون تھے سب اُس کے؟ مانا کہ سب بھائی بہنوں نے ایک ہی ماں کے شکم میں تکمیل پائی تھی مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ ایک مکان میں ہزاروں کرائے دار آتے ہیں، رہتے ہیں، چلے جاتے ہیں، سڑک پر لاکھوں انسان چلتے ہیں، چھکڑے گھسٹتے ہیں، لاریاں دوڑتی ہیں، وہ کون ہیں ایک دوسرے کی؟ کوئی نہیں! اس نے جواب دیا اور وہ اُسے مل گیا۔

تین مہینے کے بعد بخار تھک گیا لیکن اُسے بھی بُری طرح تھکا گیا۔ ایک تو بیماری

دوسرے اس قدر غیر دلچسپ۔ جب وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے چل کر پلنگ سے کرسی تک جانے کے قابل ہوئی تو بجائے خوشی کے اُسے رونا آگیا۔ بال سب جھڑ گئے تھے، ہاتھ پیر جلی لکڑی کی طرح خشک اور صورت ایسی جیسے مردہ کفن پھاڑ کر نکل آیا ہو۔

اسی زمانے میں نوری بھی ایک ہفتے کے لیے آئی۔ وہ سال بھر سے اپنی ددھیال رہنے چلی گئی تھی۔ بڑی آپا بھی میکے کی روٹیوں سے تنگ آکر وہیں ایک اسکول میں لڑکیوں کو پڑھانے لگی تھی۔ جوانی لہراتے پھنکارتے سانپ کی طرح پلک جھپکتے میں دوڑ گئی، کچھ یونہی سی دھندلی لکیر باقی تھی۔ بوڑھی خرانٹ ساس اُس کے منہ پر بار بار حقارت سے اُس گزرے ہوئے سانپ کا تمسخر اڑاتی۔ وہ خوش تھی کہ بہو جلد از جلد بوڑھی ہو کر خطرے کی حدود سے نکل رہی تھی۔ اسی لیے تو اُس نے کٹھن زمانہ گزارنے کے لیے میکے بھیج دیا تھا، کہ کچھ تو باپ بھیوں کی لاج پیروں میں بیڑیاں ڈالے رہے گی۔ وہ اب اُسے اپنا ہم عمر سمجھنے لگی تھی۔ بات بات پر اُسے گردن توڑ بخار کی طرح چڑھتے ہوئے بڑھاپے کی طرف متوجہ کر کے رہی سہی زندگی بھی پچھوڑ لینے کی کوشش کرتی۔ بڑی آپا ایک زندہ شہید کی طرح سر اُونچا لیے خاموش رہ جاتی۔ اُسے اس ساس سے کافی نفرت تھی۔ یہی تو وہ ڈائن تھی جس نے شادی شدہ زندگی کے تین مختصر سال طعنوں اور اعتراضات سے حد درجہ مکدر بنا دیے تھے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ یہ دنیا اتنی مختصر زندگی لے کر آئے گی! وہ تو سوچتی تھی کہ آخر ایک دن وہ ہوگی اور اُس کا میاں۔ اگر اُسے اس دن کی خبر ہوتی تو بڑھیا کے منہ پر خاک ڈال ان تین سالوں کو کلیجے سے لگا رکھتی۔ بڑھیا اکلوتے بیٹے پر دلوائی تھی مگر جب کبھی وہ بیوی کی طرف زیادہ راغب نظر آتا تو جل کر خاک ہو جاتی:

"اے بھئی یہ ہر وقت کے چونچلے۔۔۔" وہ ناک سکوڑ کر طعنہ دیتی اور بڑی آپا شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ وہ جلدی سے اپنے آپ کو اس کے ترستے ہوئے ہاتھوں سے چھڑا کر بھاگ آتی اور ساگ بینے لگتی۔ دور بیٹھا وہ حسرت سے تکا کرتا، ارمان

بھرے اشارے کرتا، ترسی ہوئی نظروں سے گھورتا، جیسے وہ اس کی جائز بیوی نہیں پرائی عورت ہو۔ مگر وہ نہ جاتی۔

جونہی وہ کالج سے آتا بڑھیا اپنے امراض کا پوٹلا کھیر کر بیٹھ جاتی اور اُسے گھیرے رہتی، جونہی وہ اپنی جان چھڑا کر بیوی کے پاس آتا وہ بہو کو فوراً کسی ضروری کام کے بہانے بلا لیتی۔ بہو صبر کی سل کلیجے پر دھرے بیٹھی رہتی، ہاتھ کام میں لگے رہتے مگر دل میاں کی آدھی کہی بات میں۔

"اے دلہن کام میں جی نہیں لگتا تو جاؤ اسے ہاں نہیں تو۔" وہ اس کے دل کا حال معلوم کر کے نئے طعنے سے اُس کے قدم جکڑ دیتی۔ جب اُسے پکا یقین ہو جاتا کہ بہو دلی ناامید ہو چکی ہے اور بیٹے کا مزاج کافی گرم ہو گیا، چاؤ چونچلے کا خطرہ ختم ہو گیا، تب وہ اسے چھوڑ دیتی۔

میاں کا پارہ اُتارنے میں ساری خوشامدیں، سارے لاڈ، جن کے آسرے میں وہ پہاڑ سے دن کاٹتی، مٹی میں مل جاتے تھے۔ دبے چھپے لفظوں میں شکایت بھی کرتی، معافی مانگتی مگر چڑھا ہوا بھوت یوں آسانی سے تھوڑی اُتر جاتا۔ پھر ماں کو خبر ہو جاتی تو وہ اور جلے پر بھوبل بھونتی۔

"اے ہم نے تو کبھی میاں کی جوتی پہ ناک نہیں رگڑی، وہی بچارے اللہ بخشے ہماری تین سو ساٹھ منّا کرتے تھے، پر آج کل کی لڑکیوں کا تو بس۔۔۔ توبہ ہے! مچی جاتی ہیں خصم پہ۔"

وہ خاموشی سے یہ سب کچھ سُن لیتی اور یہ سوچ کر صبر کر لیتی کہ کبھی تو یہ طعنے قبر کے کونے میں دفن ہو ہی جائیں گے۔ اُسے اُس بڑھیا پر رحم آنے لگتا۔ وہ اسے تختہ غسل پر لا چار دیکھ بس آخری سفر کے لیے تیار دیکھتی۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اس کا تیجہ وغیرہ دھوم دھام سے کرے گی تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ تعلیم یافتہ بہو کے ہاتھوں بڑھیا کی عاقبت بھی مٹی میں مل گئی، حالانکہ اُسے پختہ یقین تھا کہ کتنے ہی اپنے چاہنے والے کیسے جائیں۔ بڑھیا بغیر تاوان دیے اپنی زیادتیوں سے [illegible] [illegible]

بہت تو عذاب بھگتنا ہی پڑے گا۔ اگر یوں نیاز نذر سے کام چل جاتا تو پھر کیا کہنے تھے اور پھر تو وہ فراخدلی سے تیجہ کرتے بھی گبراتی۔

مگر بڑھیا اُس کے گلے میں چکی کے پاٹ کی طرح لٹکی رہ گئی اور خود اس کی راتیں سونی اور دن بھیانک کانٹوں سے بھر گئے۔

نوری اب جوان ہو رہی تھی لہٰذا ساس ہر وقت بہو کو چال چلن سے رہنے کی تلقین کرتی۔ یا تو وہ خرچے کے ڈر کے مارے کسی سے ملتی جلتی نہ تھی یا اب سارے کنبے کے لڑکوں کی بلائیں لینے پر تل گئی۔ ساس اور بہو نے مل کر لڑکا گھیرنے پر کمر باندھی۔ علاوہ نوری کی ذاتی صفات کے اس کی رئیسی کا سارٹیفکیٹ ہر جگہ کارآمد ثابت ہوا اور جلد ہی ایک نہایت مالدار اور اکلوتے لڑکے کو اس پر عاشق کرا لیا گیا۔ اُس کے کنبے والوں نے لاکھ اودھم مچائی مگر ایک نہ چلی۔

نوری جب آئی تو نہایت شرمیلی اور فرمانبردار بن کر آئی۔ بڑی آپا بڑی جانفشانی سے جہیز جمع کرنے لگی۔ اُس نے ایک دم سارے بے خرچے بند کر کے تنگی میں گزر کرنی شروع کر دی۔ نوری بھی پھٹے پرانے کپڑے بڑے شرمیلے فخر کے ساتھ پہن لیتی۔ ہر چیز جہیز کے لیے رکھ دی گئی۔ لونڈا ابھی میٹرک میں پڑھتا تھا اور انگلینڈ جانے والا تھا اور اس طرح نوری کو کم از کم سات سال امیدواری میں گزارنے تھے مگر وہ آنے والی خوشگوار زندگی کے حسین خوابوں کے نشے میں کچھ بھی تو نہ محسوس کرتی۔ وہ ان چیتھڑوں کو چوتھی کے جوڑے کی امید میں کلیجے سے لگا کر پہنتی۔

اُسے اب احساسِ بزرگی بھی ہو چلا تھا۔ اُس نے سارا چلبلا پن چھوڑ دیا تھا اور ایک دم گھروالیوں کی طرح سنجیدگی اختیار کر لی۔ وہ شمن سے اپنے آپ کو کچھ برتر خیال کرنے لگی تھی۔ اُس کا مول اتنی جلدی ہو گیا، اور جس طرح دوکان میں رکھی ہوئی چیزوں میں سے کسی ایک چیز کا مول تول غیر متوقع قیمت پر ہو جائے، کوئی گاہک منھ کا پورا آن پہنچے تو باقی کا مال حقیر پڑا رہ جاتا ہے اسی طرح شمن بھی کچھ متحیر اور حقیر سی رہ گئی۔ اسے ایک ہلکا سا احساسِ کمتری بھی ہونے لگا۔ آخر وہ کیوں زندگی کے ہر شعبے میں پیچھے رہ جاتی

ہے؟ بیماری سے اٹھی ہوئی دُم کٹی مرغی کی طرح وہ بدہیئت اور حقیر، نوری کی رعنائی کے آگے ایک متعفن چیتھڑا معلوم ہوئی۔

اسی عرصے میں کالج سے لوٹتے ہیں اعجاز دو چار روز کے لیے آیا۔ جب اُس کا خط آیا تو کسی کو پڑھ کر سنانے کی مہلت بھی نہ ملی، وہ خود ہی تانگے میں بیٹھ کر گھر تلاش کرتا آن پہنچا لیکن جب لوگوں نے اُسے دیکھا تو اللہ کی شان یاد آنے لگی۔ وہی سوکھا ماڑا بدوضع جانور ایک وجیہہ نوجوان بن چکا تھا۔ اس کا گھٹا ہوا سر چمکیلے بالوں سے آراستہ تھا۔ قیمتی سوٹ کیس میں سجے ہوئے کپڑے دیکھ کر نہیں کبھی متاثر کیے بغیر نہ رہ سکیں۔

اسے دیکھ کر شمن کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ معلوم ہوا دو برسوں کی کھوئی ہوئی پہیلی نہ جانے کس گم نام کونے سے اچھل کر اُس کے منہ پر لگی۔ وہ خود بخود پیچھے سمٹ گئی۔ موٹی جبڑے کے ہارے ہوئے بال اور [illegible] اور سوکھے [illegible] نظر آنے لگے۔ اُس نے اسے دیکھتے ہی ایک دم اپنے خلاف ایک محاذ پیدا کر لیا۔ وہ اپنی پرانی نفرت کو اعجاز کے سامنے جھجکتے دیکھ کر [illegible] بھی چھپا گئی۔

اعجاز بالکل نیا پوا اپنا کر آیا تھا۔ جیسے آپ اور چھپے پن تو کو [illegible] کی موجود ذات سے کسی طرح وابستہ نہ کر سکتا تھا۔ نزاکت پسند، خوش زبان، ہنس مکھ، دلیر۔ آتے ہی اُس نے بڑے تپاک سے شمن کو [illegible] دیکھ کی آنکھیں کس گستاخی سے اس کے آرپار تیرتی چلی گئیں۔

"ارے یہ شمشاد اتنی دُبلی، اور تمھاری چوٹی کیا ہوئی کٹ گئی، بھئی واہ!" اس نے قہقہے لگانا شروع کیے اور شمن جھلا کر رہ گئی۔ لوگوں نے اُسے باتوں میں لگا لیا، کسی نے بھی تو یہ نہ بتایا کہ وہ ابھی بیماری سے اٹھی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ اعجاز کے سامنے اپنی بدصورتی کا کوئی عذر پیش کرنا چاہتی تھی بلکہ یونہی، کیوں وہ غلط فہمی میں مبتلا رہے!

وہ اس کی جان کو ایک بلا بن کر آیا، دن بھر قہقہے لگاتا۔ آیا تو دو دن کے لیے

تھا مگر دو ہفتے بعد بھی بہانے بنا کر رہے چلا جا رہا تھا۔ لوگ اس میں اس قدر دلچسپی لینے لگے تھے کہ روز وہ کسی نہ کسی بہانے سے روک لیا جاتا۔ نوری تو اس سے خوب گھل مل کر باتیں کرتی۔ وہ بھی اُس کے ہونے والے میاں کی باتیں کر کے چھیڑا کرتا۔ وہ سارے کام چھوڑ کر بس اعجاز سے اُلجھا کرتی۔

شمن کا جی چاہتا کوئی اعجاز کو اُس کی پُرانی تصویر دکھا کر اُسے وہ غلاظتیں بھی تو یاد دلائے جو وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ نہ جانے لوگ اپنے ماضی کو کس طرح اس قدر آسانی سے جھٹک کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اُسے ان لوگوں سے سخت نفرت تھی جو پہلے والے غریب، بدوضع اور کم عقل اجّو کو بھول کر اس نئے انسان کی آؤ بھگت کرنے لگے تھے۔ وہ اُسے کیسی کیسی حقارت بھری ٹھوکریں مار چکے تھے مگر آج اُس پر فدا تھے۔ وہی منجھلے بھائی جن کے سامنے وہ ناک پکڑ کر اُٹھک بیٹھک کر چکا تھا اُسے موٹر میں لیے لیے گھومتے، وہی امّاں جو اگر وہ کتّوں کا کھانا چرا لیا کرتا تھا تو صبح کا ناشتہ بند کر دیتی تھیں اب مرغن کھانے اُس کے منہ میں ٹھونسے دیتی تھیں، کبھی وہ دن بھی تھے کہ ذرا دیر تک سوتا رہتا تو اجّو پر پانی کا لوٹا اوندھا کر اُس کی چارپائی اُلٹ دی جاتی تھی۔ اور آج دن چڑھے تک سوتا رہتا پھر بھی لوگ یہی کہتے:

"اللہ رکھے جوانی کی نیند ہے، سونے دو" شمن سلگ کر رہ جاتی۔ لوگ سچ بولتے کیوں ڈرتے ہیں! یہ کیوں نہیں کہتے روپے کی نیند ہے، اس جائداد کی نیند ہے، جو اس کے چچا نے اپنی زندگی ہی میں اُس کے نام کر دی تھی۔ بڑا ذلیل تھا اعجاز، وہ ان کی ٹھوکریں کیسے بھول گیا؟ نیچ کہیں کا! جب لوگوں نے تھوکا جب بھی خاموش اور شاکر رہا اور جب کہ وہی لوگ اپنا تھوکا چاٹ رہے تھے وہ نہایت خوش تھا۔ یہ کیوں اور کیسے؟ مگر شمن اب بھی وہی شمن تھی، وہ اب بھی اعجاز کے وجود پر تھوکنے کو تیار تھی۔ وہ گھنٹوں بیٹھ کر لوگوں کے ساتھ تاش کھیلتا، ہنسی مذاق کرتا مگر شمن اُن سب سے دور کسی نہایت غیر دلچسپ کام میں ڈوبی رہتی۔ وہ اعجاز سے بالکل مخالف سمت چلتی۔ اگر وہ اس سے کبھی کچھ کہنا بھی چاہتا، لیکن

کوئی نہایت معمولی سی بات، تو وہ سنی ان سنی کر جاتی۔

جب سے وہ آیا تھا لوگ نئے نئے پینترے دل سے ہر وقت اُس کی شادی کا ذکر کرتے۔ بڑی آپا بیچاری کے تو ہاتھ کٹ چکے تھے، وہ نوری کے لیے ہاں کر چکی تھیں۔ حالانکہ کئی دفعہ اُس کی نیت بہک بھی گئی۔ سال دو سال میں اعجاز نوکر ہو جائے گا اور وہ ہونے والا داماد نہ جانے کب مل ہیں جو تمنے کے قابل ہو؟ اس کے سادہ اور سارے خاندان کی لڑکیاں اُس کے قدموں میں لا ڈالی گئیں مگر وہ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتا۔

اتفاق کہیے یا قسمت، اُنھی دنوں بلقیس اور حلیمہ اپنی خالہ کے یہاں آئیں۔ زنانہ کلب میں اچانک شمن سے ملاقات ہو گئی۔ بلقیس بال برابر بھی تو نہ بدلی تھی: وہی چلبلاپن، چیخ چیخ کر بولنا اور اونچے اونچے قہقہے۔ شمن سے اس قدر بھینچ کے ملی کہ شانے دکھنے لگے۔ گھل مل کر دونوں میں باتیں ہوئیں۔ بلقیس اپنی خالہ کے یہاں زنانے سے عشق لڑانے آئی ہوئی تھی۔ خالہ کا گھر اچھا خاصا بھرتی کا دفتر بنا ہوا تھا، شہر کے تمام شادی کے قابل یا قابل ہونے والے لڑکے اُن کے یہاں حاضری دیتے تھے۔ تین چار اپنی لڑکیوں کے علاوہ وہ اپنے عزیزوں کی لڑکیوں کے نصیبے کھولنے میں ملکہ رکھتی تھیں۔ اُنھیں اس قدر مشق ہو گئی تھی کہ جس لڑکی کا جس لڑکے سے چاہتیں جوڑ لگا دیتیں، فریقین کتنا بھی چاہیں کچھ بس نہ چلتا۔ نکھٹو اور بدقسمت لڑکے موقع دیکھتے ہی شوہر کی جڑ کی طرح چمن زار سے نکال کر پھینک دیے جاتے۔ اُن کا آنا یکلخت قابلِ اعتراض ہو جاتا۔

بلقیس خالہ کی تمام سہولتوں کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ پڑھائی چھوڑ کر اُس نے کچھ دن سلیقہ اور فیشن سیکھنے کے لیے انگریزی اسکول میں نام لکھوالیا تھا اور وہاں سے ایسی دھاردار ہو کر آئی تھی کہ حد نہیں۔ عجیب بات اس لڑکی میں یہ تھی کہ وہ ہر اُس نسوانی حربے کا، جو مرد کو مارنے کے مصرف میں آتا ہے، فخریہ ذکر کرتی؛ چالاکیوں، خودغرضیوں اور مکاریوں کا بڑی معصومیت سے اعتراف کرتی۔

”عیسیٰ مجھے خاک پسند نہیں پر جب میں نے اسے ستار سنایا تو کمبخت مر گیا۔
جلیس نے دائمن بجایا مگر بیچاری شرما گئی۔“

”منور حد اُلّو ہے، پتہ ہے کل برنارڈ شا میرے لیے نہ جانے کہاں سے ڈھونڈ کر لایا۔ بڑا پڑھاکو ہے، کہتا ہے: پروفیسر بنوں گا۔ اب بھلا شمن کتنے سال لگ جائیں گے! کم از کم چار سال رکھ لو۔ بھلا کون بیٹھا رہنے دے گا مجھے؟ اختر سپرنٹنڈنٹ پولیس ہے، جان کو آ گیا ہے مگر میں نے ابھی تو کسی کو جواب نہیں دیا ہے۔ خدا قسم جو اختر میرے لیے پدما جیسی انگوٹھی بنوا لایا تو کبھی جو کر جاؤں منگنی۔“

”خالہ بی کہتی ہیں اختر خاصا ہے مگر میں کہتی ہوں موٹی کی جائداد حد بڑی ہے۔ پتہ ہے تین موٹریں ہیں اور۔۔۔“

کلب کے بعد وہ شمن کو اپنی خالہ کے گھر لے گئی اور دوسرے دن دونوں بہنیں بغیر کہے سنے آ دھمکیں شمن کے گھر۔ یوں تو گھر اچھا خاصا تھا مگر بے سلیقہ پن اور لاپروائی کی وجہ سے یہ حال تھا کہ دو چار ٹوٹی کرسیاں، میلی دریوں کے تخت اور بان کی کھری چارپائیوں کے سوا کچھ اٹھنے بیٹھنے کا انتظام نہ تھا۔

جھینپ کھسیانی شمن انھیں اپنے کمرے میں لے آئی۔ اس کا کمرہ کہنا بالکل بیجا تھا۔ اسی جگہ کچھ صندوق، چینی کے برتنوں کی الماری لگی تھی۔ ایک طرف چھت میں جڑاول کا سامان جھول رہا تھا۔ کونے میں جالا لینے کا بانس کھڑا تھا جسے کبھی حرکت نہ دی جاتی۔ مکڑیوں اور چھپکلیوں کا پرسکون راج قائم تھا۔

”اپنے کمرے میں چلو نا!“ بلقیس نے چپکے سے اُس کے کان میں کہا اور شرم کے مارے شمن کا جی مر جانے کو چاہا۔ روپے کی کچھ کمی نہ تھی، پنشن ہی اتنی کافی تھی کہ اگر چاہتے تو ڈھنگ سے رہنا مشکل نہ تھا، مگر پنشن سے پہلے کون سے ٹھاٹھ تھے! ویسے گھر میں پندرہ بیس نوکر اور مفت خورے موجود۔ باہر چار چار بھینسیں، گھوڑے، کتے اور مرغیاں وغیرہ بھری پڑی تھیں۔ باہر تو کچھ بیٹھنے کے لیے مونڈھے وغیرہ تھے بھی مگر گھر میں بڑی بڑی بیویاں بھی آتیں تو لشتم پشتم پلنگوں اور تختوں پر جا دبیں

بچھ جاتیں۔ اُس نے کبھی کسی کو اپنے گھر کی حالت نہ بتائی تھی اور بلقیس جلیس سے دو چار دفعہ گپ بھی مار دی تھی۔ وہ تو اس گھر میں پیدا ہو کر پچھتائی تھی۔ کاش وہ کہیں اور جنم لیتی۔ اتنے بہن بھائیوں کے بجائے بس ایک لائق فائق بھائی اور وہ ایک اکیلی لاڈلی بیٹی ہوتی، کوٹھی بنگلہ ہوتا، صوفے اور کرسیاں ہوتیں، چاہنے والے چچا اور قربان ہونے والی خالائیں ہوتیں۔ کاش اس کے گھر میں بھی ایک باغ ہوتا اور وہاں نارنگی اور لوکاٹ کے پھول مہکا کرتے جنھیں توڑنے کے لیے اُس کی اُنگلیاں حسین اور نازک ہو جاتیں۔ مگر یہ تو اُسے خواب میں بھی میسّر نہ ہوا، اس نے خواب بھی سدا بھیانک اور ڈراؤنے ہی دیکھے، بھوتوں اور چڑیلوں کی دنیا کے۔

وہ بلقیس اور جلیس کو لے کر احاطے کے ایک سنسان کونے میں چلی گئی۔ یہ کونا بھی کوڑے کرکٹ، ٹوٹی ہوئی اینٹوں، بوسیدہ ڈلیوں اور ٹوٹی ہوئی ٹھیکریوں سے پٹا پڑا تھا مگر بلقیس بڑی بے تکلفی سے دہلیز پر اخبار کا کاغذ بچھا کر بیٹھ گئی اور جلیس لونڈیوں کے رومان غنچے اور املیاں بیننے چلی گئی۔

گھنٹوں سر جوڑے وہ نہ جانے ایک دوسرے کو کیا باتیں بتاتی رہیں۔ بلقیس نے اُسے بتایا کہ وہ کس طرح شدت سے شادی کی تیاریوں میں لگی ہوئی ہے اور وہ تمام تیاریاں یہ تھیں کہ اتنے ڈھیر سے لڑکوں میں سے ایک زندگی کا ساتھی چننا تھا۔ اتنے جنوں میں سے ایک کو چُن لینا اور باقیوں کو منہ چھلی کے چھلکوں کی طرح تھوک دینا بلقیس جیسی جذباتی لڑکی کے لیے کتنا مشکل تھا۔

"آخر تمھیں محبت کس سے ہے؟"

"محبت جو پوچھو تو مجھے عبّاس سے ہے۔ بچپن سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور پھر ہمارے خیالات بھی ایک سے جیسے ہیں۔"

"چہ... کھوٹی! اپنے لگتی تھی میں انصار پر مرتی ہو۔ بڑا قوم پرست ہے یہ پہنے، وہ ہے۔" شمن نے چڑ کر کہا۔

"ہے تو وہ قوم پرست مگر ابن پٹ تباہ گزرے ہو گئی ہے اس کی ابھی باتیں

یہ ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو مجھے سوسائٹی پسند ہے۔"

"بلقیس حد مکار ہو تم بھی۔ محبت میں تو انسان ان باتوں کو سوچتا بھی نہیں۔"

"مگر اصل میں تو مجھے اختر ہی سے زیادہ محبت ہے۔"

"ہُنہ، اختر سے اُس کی نئی موٹر سے۔"

"چہ، بھئی تم تو ہو بیوقوف۔ موٹر اس کی خاک پسند نہیں۔ خدا قسم مہدی کی موٹر دیکھو تو بس مر جاؤ۔"

"تو پھر محبت؟"

"محبت تو غریبوں ہی سے زیادہ ہوتی ہے مگر۔۔۔"

"مگر؟"

"مگر شادی تو امیر ہی سے کرنا پڑتی ہے۔ کیوں ہے نا بھئی؟"

"کیوں؟ یہ تو بالکل رنڈیوں جیسی بات ہوئی۔"

"ہشت، رنڈیوں جیسی کیوں ہوئی؟ اور اگر ہے بھی تو کیا ہوا؟ شمن ایک ہی تو بات ہے۔"

"تو کیا؟"

"ہاں بھئی، دیکھو۔۔ آپ جیسے۔۔۔۔ اُنہہ بھئی مجھے نہیں معلوم تم تو بحث کرتی ہو۔ پھر تو ہم کیا باتیں کرنے لگے؟ شمن ہمیں نے کل نماز پڑھی تھی۔"

"اچھا؟"

"ہاں، اختر نے کہا تھا میں شلوار قمیص میں بالکل لیلیٰ معلوم ہوتی ہوں۔ وہ جو یہ اِتنا لانسان کا ستاروں والا دوپٹہ ہے میں نے ایرانیوں کی طرح لپیٹ کر اوڑھا تو کہنے لگا۔۔" وہ کچھ رکی۔

"کیا کہنے لگا؟"

"کہنے لگا لاؤ تمہاری تصویر کھینچ کر ولایت میں بھیجوں گا۔ میں نے کہا جائے نماز پر کھڑی ہو جاؤں تو زیادہ اچھی رہے گی۔ مگر شمن کھڑے ہو کر تو حد بڑی لگی تو میں

بیٹھ کر دعا مانگنے لگی۔ تصویر کھینچ کر۔۔۔ ہی۔۔۔ ہی" وہ ہنسی۔

"کیا؟ کیا؟"

"وہی کمبخت پیار کر لیا، بدتمیز کہیں کا!" بلقیس بن کر شرمانے لگی۔

دونوں ہنس رہی تھیں کہ اعجاز خاص معشوقانہ انداز سے ریکٹ گھماتا ہُوا برآمدے میں نکلا۔

"اوہ؛ معاف کیجیے گا" وہ جلدی سے مڑ کر جانے لگا۔

"خدا!"

"کیوں؟"

"کون تھا یہ؟ ہائے بالکل فریڈرک مارچ کی سی شکل ہے" بلقیس نے زور سے شمن کا بازو مسل کر پوچھا۔

"ہے ایک، ہمارا رشتے کا بھائی"

"اچھا؛ بے ایمان کہیں کی!"

"واہ!" شمن مسکرائی۔

"جان ہے خدا قسم، شرطیہ تم مرتی ہو اُس پر"

"ہُنہ، کبھی بھی نہیں"

"ہائے بڑی بد مذاق ہو۔ خدا قسم وہ۔۔۔ وہ دیکھو ادھر ہی دیکھ رہا ہے۔ تمھیں گھور رہا ہو گا" وہ پھر اترائی۔

"چُپ گدھی کہیں کی" شمن نے اُس کے خوب چٹکیاں لیں۔ کوئی غیر مانوس سی چیز دل میں کُلبلائی مگر وہ جھلاتی ہی رہی۔

جب بلقیس اور حلیمہ جانے لگیں تو اعجاز پھر باہر نکل کر کسی نوکر سے فضول باتیں کرنے لگا۔ جب اُن کی موٹر چلی گئی تو وہ شمن کی طرف مڑا، وہ جلدی سے اندر چلی آئی۔

شام کو کھانے کے وقت اعجاز جان بوجھ کر اُس کے پاس گھس کر بیٹھا کہیں بلقیس کی باتیں سُن تو نہیں لیں بدذات نے؟ دو چار میٹھی باتیں بھی کرنے کی کوشش کی مگر

شمن نے کسی بہانے سے اُٹھ کر جگہ بدل لی۔ وہ پان لگا رہی تھی کہ پاس آ بیٹھا:
"ایک ہمیں بھی، پر بھئی منہ نہ کاٹ دینا" وہ اترا کر بولا۔ شمن نے جب پان دیا تو اس نے اُس کی انگلی پکڑنے کی کوشش کی، شمن نے جل کر پان چھوڑ دیا۔ یہ فرسودہ رومان اُسے ایک آنکھ نہ بھایا۔ اسے ان گونگے عاشقوں سے سخت نفرت تھی جن کا رواں رواں بولتا ہے پر منہ سے نہیں پھوٹتے۔

"لاؤ میں پڑھا دوں" اُسے پڑھتا دیکھ کر وہ پاس آن بیٹھا۔

"پڑھ چکی" یہ شمن نے شرارت سے کتاب بند کر دی اور جوتا پہنتی چل دی۔ وہ خوب اُس کی چالوں کو پہچان رہی تھی، وہ آج پھر وہی پرانا بھوکا اچکا معلوم ہو رہا تھا اور اردگرد ایسے منڈلا رہا تھا جیسے گوشت پر چیل۔ شمن جان جان کر اُسے دھتکار رہی تھی۔ بجاز کو پیاسا ہانپتا دیکھ کر وہ دل ہی دل میں تری محسوس کر رہی تھی۔

دو دن تک وہ ترستا رہا مگر شمن نے اسے بولنے کی مہلت نہ دی، مگر رات کو جب سب کچھ کچھ سو چلے تھے وہ باہر سے کسی بہانے سے آیا۔ پہلے تو وہ حسب عادت دکھانے کے لیے کچھ ڈھونڈھتا رہا، پھر پانی پینے لگا۔ رک رک کر اس نے پورا گلاس چڑھا لیا۔ شمن ہنسی دبائے خاموش پڑی رہی۔ وہ مڑا تو شمن نے آنکھ کے گوشے سے دیکھا کہ وہ واپس لوٹا۔

"شمو" اُس نے آہستہ سے پکارا۔

"کیا ہے؟"

"یہاں بیٹھ جاؤں" مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دے اچانک پلنگ کے کونے پر بیٹھ گیا۔

"شمن ایک بات کہوں؟ کئی دن سے..." اس کی آواز اٹک گئی۔ شمن کے ہاتھ پیر سُن ہونے لگے، جملہ حواس ایک لفظ پر جمع ہو کر بھنچنے لگے، اُس نے سانس روک لی۔

"تم جانتی ہو دو سال کی ٹریننگ اور ہے اور پھر کسی اچھی جگہ پوسٹ ہو جاؤں گا۔

چچا میاں کی جائداد بھی کافی ہے مگر بس سوچتا ہوں شملہ پر ایک کوٹھی خرید لی جائے تو..... "

"کوٹھی اور باغ.. نارنگی کی کلیاں .. " شمن کی انگلیاں اینٹھنے لگیں۔

"میرے خیال میں میری حیثیت کا انسان ایک تعلیم یافتہ لڑکی کے لیے ناموزوں تو نہیں.... ٹھیک ہے نا؟"

"اچھا؟" اس نے سانس کو پھیپھڑوں میں گھونٹا۔

"ہاں شمن۔ یہ لوگ تو جاہل ہیں، کچھ نہیں سمجھتے۔ احساس کمتری ہے اور کچھ نہیں۔ تو بس اب تمہارے ہاتھ میں ہے سب کچھ.."

"میرے.... میرے ہاتھوں میں.." شمن نے زور سے مٹھیاں بھینچ لیں تاکہ وہ نامعلوم سی دولت کہیں رینگ نہ جائے۔

"وہ تمہاری دوست ہے نا..."

"ایں؟" شمن نے مضبوطی سے ٹیوب میں ہوا روک دی۔

"ہاں... بلقیس تمہاری پرانی دوست ہے.. تم چاہو تو شادی کروا سکتی ہو۔"

"مگر...."

"بھئی دیکھو بہانے مت بناؤ۔ ہماری بھنو کیسی، خدا قسم جو تم کہو گی... وہ تمہیں ہارڈی کا چمڑے والا پوسا سیٹ پسند ہے نا...."

"مگر..." اس نے اسے روک کر کہا، "بلقیس کا ٹیسٹ بہت اونچا ہے.... معاف کرنا اچھو.." "وہ لسند بولی،" وہ ذرا اور قسم کی لڑکی ہے۔"

"مگر شمن... میں کافی آزاد خیال ہوں...."

"میرا مطلب ہے آجکل لڑکیوں کو آزاد خیالی سے زیادہ کلچر چاہیے....."

"تو..."

"اور وہ خاندان دیکھتی ہیں، معاشرت دیکھتی ہیں۔ بلقیس کے امیدوار زیادہ تر نوابوں ہی کے خاندان سے ہیں۔ دوسرے تم سوچتے ہو یہ تمہاری جائداد بہت ہی

زبردست ریاست ہے کہ۔۔۔"

"میں یہ تو نہیں کہتا۔۔۔" اعجاز کی آنکھوں میں اُسے بھوک اور شکست جھلکتی نظر آئی۔

"فضول بکواس ہے۔"

اعجاز مرجھا کے چلا گیا، وہ خاموش بے حس و حرکت پڑی رہی، کچھ نہ سوچا۔ اُسے تو بس ایک احساس تھا کہ اُس نے نازگی کے جھاڑ میں ہاتھ ڈالا اور کسی زہریلے ناگ نے بھی مار دیا۔ زہر کی طرح کوئی چیز سنسناتی لہراتی اُس کے دماغ کی طرف چڑھتی چلی گئی جسے جھٹکنے کی بھی اُس نے کوشش نہ کی۔

کیا اُسے اجو سے محبت ہو چلی تھی؟ چھ، توبہ کیجیے، اِس واہمے کو سوچ کر وہ ہنس پڑی۔ پھر؟ اس نے اس کا جواب پانا ضروری نہ سمجھا۔

اعجاز کے جانے سے پہلے اُس کی شادی کا ذکر چھڑا، وہ کچھ دل برداشتہ سا رہا چونکہ شمن کے والد نے اُس کی پرورش میں کافی پیسہ خرچ کیا تھا اس لیے پہلا حق تو انھیں کو پہنچتا تھا۔ اِس سے قبل کہ کچھ اعجاز سے کہا جاتا اُس نے نوری سے کہہ دیا کہ وہ اعجاز کے علاوہ ہر جانور سے شادی کر سکتی ہے۔ جھگڑے اُٹھے، کچھ رونے دھونے کے ڈھونگ رچے مگر کالج جا کر اُس نے صاف صاف انکار لکھ دیا اور اس قدر بے حیائی سے کہ یہ سانحہ خاندان میں تاریخ بن گیا۔ اعجاز کچھ کھسیانا اور متحیر سا رہ گیا۔ بلقیس کا ذکر اُس نے کسی سے نہ کیا۔ اور شمن؟ زور لگا کر اُس نے ہر گرفت سے پھسلنا شروع کیا۔ بغاوت! اُس کی رگ رگ غرور سے پھڑک اُٹھی۔ اُسے خود اپنی طاقتوں پر حیرت ہونے لگی۔ اُس نے سب کے منہ پر طمانچہ مار دیا، دل توڑ دیے، امیدیں خاک میں ملا دیں۔۔۔ اوہ! کتنی ظالم تھی وہ؟

(۲۷)

ایلما کو دیکھ کر تو وہ اُس سے لپٹ ہی گئی۔ اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے رکھے تو وہ

دوزخ کی آگ میں سے بھی مسکراتی ہوئی گزر جاتی۔ وہ اس دفعہ ایک تحفہ لائی تھی نا ایلماؔ کے لیے: ایک باغی کی گود میں وہ ایک نیا باغی ڈالنے لائی تھی۔ ایلماؔ نے اپنی جادو بھری آنکھیں اُس کی نڈر آنکھوں میں ڈال دیں اور مسکرا اُٹھی۔

"کیوں؟" اُس نے صرف اتنا پوچھا۔

"میرا دل!" بجائے لمبی چوڑی تفصیل کے نئے باغی نے پر جمائے میدان میں۔

"GOOD" ایلماؔ نے مسرت سے جھوم کر کہا، "ٹھیک کہتی ہو، کسی کو ہم سے 'کیوں؟' کہنے کی جرأت ہی نہ ہونا چاہیئے۔ آؤ چلو۔" گرو نے چیلے کی بانہہ پکڑ لی۔

اُسی دن ایلماؔ نے اُسے یونیورسٹی کے یونین کے صدر اور سیکریٹری سے ملایا۔ بہت تیزی سے شمنؔ نے دنیا کے اُس رُخ کو دیکھ لیا جہاں انسان اپنے گھونگے جیسے خول سے باہر نکل کر اپنے وجود کے سوا بھی کچھ دیکھتا ہے۔

وہ ایلماؔ کے کمرے میں گئی تو ذرا دیر کو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اس کے پلنگ پر یونین کا پریزیڈنٹ افتخار لیٹا ہوا تازہ اخبار دیکھ رہا تھا۔ وہ جھینپ کر لوٹنے ہی والی تھی کہ ایلماؔ سر پر تولیہ کو صافے کی طرح لپیٹے غسل خانے سے نکلی۔ اس نے شمنؔ کا تعارف کرایا۔ گو وہ افتخار سے اچھی طرح واقف تھی مگر بات چیت کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایلماؔ بال سکھانے لگی اور شمنؔ سے چائے بنانے کو کہا۔

"دودھ بالکل نہیں، شکر ایک چمچ۔" افتخارؔ نے تکیہ پر سر گھما کر حکم دیا۔

"یہ سرمای چائے میں دودھ نہیں لیتا بلکہ نیبو نچوڑ لیتا ہے۔" ایلماؔ نے تشریح کی

"نیبو؟"

"جی ہاں، آپ نے کبھی نہیں پی روسی چائے؟" افتخارؔ نے بات اُٹھالی۔

"روسی چائے؟"

"ہاں، روسی چائے میں نیبو ڈالتے ہیں۔ آپ بھی آزمائیے، بڑی مزے دار ہوتی ہے۔" شمنؔ نے جھجکتے ہوئے نیبو اُٹھا کر پیالی میں نچوڑ لیا۔

"اور لوگ تو ابھی تک آئے نہیں، سیتل سیدھا وہیں پہنچ جائے گا۔" یونین کے

آزاد اور ترقی پسند گروپ کی میٹنگ پکنک کی صورت میں کھلے میدان میں ہونا قرار پائی تھی۔

"کیا مس لوگا بھی چلے گی؟"

"لو! مس لوگا نہ چلے گی تو پھر جا ہی کون سکتا ہے۔ مگر کیوں پوچھا تم نے؟"

"یونہی، ایسے ہی۔ بات یہ ہے کہ مجھے کمبخت سے نفرت ہے۔ عورت ہے کہ۔۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا، پھر تیزی سے بولا:

"کیا ہی اچھا ہوتا جو ہم کسی طرح اُسے بھولے سے چھوڑ جاتے۔"

"اسے وہ اپنی موٹر سائیکل پر دندناتی چلی جائے گی۔ تم نے دیکھی نئی موٹر سائیکل لی ہے اُس نے۔"

شمن بڑے انہماک سے چچہ چلا رہی تھی، افتخار نے اسے غور سے دیکھا:

"یہ اب چینی گھل رہی ہے" وہ ابرو سے اشارہ کر کے بولا، "میرا مطلب ہے پیالی کی چینی۔ کب تک چلائیں گی، کچھ دیر میں پیندے میں سوراخ ہو جائے گا۔"

ایلیا نے دانت چمکا کر اپنی مخصوص ہنسی اگلنا شروع کی اور شمن نے جھینپ کر بڑا سا گھونٹ چڑھا لیا، زور سے اُبکائی آئی اور وہ منہ پر رومال رکھ کر ہچکیاں لینے لگی۔

"یہ۔۔۔ یہ چائے ہے؟" نیبو سے دودھ پھٹ کر گدلے رنگ کے لوتھڑے چائے میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔

"خوب! بھئی دودھ ڈالو تو نیبو نہیں نچوڑنا چاہیے۔" افتخار نے اس کے لیے نئی چائے بنائی "یہ روسی چائے پینے کے لیے مذاق ہونا چاہیے۔"

چائے پی کر گروہ کے گروہ شہر کی حدود سے باہر مقررہ مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ تانگوں میں اور کچھ سائیکلوں پر لڑکیوں کو بٹھائے قہقہے لگاتے چل دیے۔ راستے میں مس لوگا اپنی نئی موٹر سائیکل پر رستم سنگھ، کالج کے مشہور کھلاڑی، کو بٹھائے سب کی آنکھوں میں دھول جھونکتی نکل گئیں۔

آسمان گہرا لاجوردی اور شفاف تھا، معلوم ہوتا تھا گاڑھی وارنش

کی ہوئی ہے۔ خشک ہوا موسم خزاں کی، نیم مردہ پتیوں کو ادھر سے اُدھر گھسیٹے
پھر رہی تھی۔ گو ہوا ہلکی پھلکی اور نرم پڑ گئی تھی مگر اُس کا ہر طمانچہ جسم میں زندگی دوڑا رہا
تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ سے پیڑوں کے نیچے بے تکلفی
سے بکھر گئے۔ دو مخالف عناصر کے لطیف اور اچھوتے ملاپ سے فضا میں بہار سی بچھی
ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مردانہ آوازیں زیادہ بھاری بھرکم اور لڑکیوں کے قہقہے زیادہ
سریلے ہو گئے تھے۔

لڑکیوں کی تعداد قدرتی طور پر محدود تھی، لہٰذا ایک ایک لڑکی بطور تبرک
ہر گروپ میں بانٹ دی گئی۔ یوں ایلما سے جدا ہو کر شمن ایک بالکل نئے اور جھینپو قسم
کے [illegible] گروہ کے ہتھے چڑھی۔ قدم پھونک پھونک کر نہایت عالمانہ اور شستہ
گفتگو شروع ہو گئی اور بہت جلد سب کی قابلیتیں جواب دے گئیں بے طرح دم
گھٹنے لگے۔ اُدھر ایلما کے گروہ میں یونیورسٹی کے چُنے ہوئے موتی جگمگا رہے تھے۔
اُن کی آب و تاب دور ہی سے لوگوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ ایک طرف
مس بوگا چند بے فکروں کے جھرمٹ میں اپنی کھردری آواز میں انگریزی کے مزاحیہ
گیت گانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تالیاں بجاتے میں اُن کی بانہوں کا پلپلا گوشت تھل
تھل ہل رہا تھا۔ ایک جھاڑی میں آدھا گھسا ہوا فتح آز سب سے الگ چیونٹیوں
کی قطاروں کو بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا، گویا وہ آیا ہی اس غیر ضروری کام
کے لیے تھا۔ شمن کے ساتھی، جن میں سے اکثر ایلما کے پرستار تھے، بے چینی سے اس
کے قرب میں پہنچنے کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے مگر مجبوراً شمن کو بھگت رہے تھے،
ورنہ اُن کے دل تو ایلما اور مس بوگا کے قہقہوں کے سُر تال پر ناچ رہے تھے۔

شمن کو اس گھٹے ہوئے سکون سے سخت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اُس کا بس چلتا تو
وہ خود بھاگ کر ایلما کے قرب میں پہنچ جاتی یا کم از کم یہی معلوم کرتی کہ فتح آز جھاڑی
میں الجھا ہوا کون سے معمے سلجھا رہا تھا۔ ساتھیوں کی بیوقوفانہ خاموشی سے وہ جی ہی
جی میں سلگ رہی تھی۔ فضا نہ جانے کتنی دیر کند رہتی اگر سینتل اور ایلما میں پرجوش

جنگ نہ شروع ہو جاتی۔ سیتل ایلما کا برابر کی چوٹ کا مقابل تھا گو ایلما اُسے ہر میدان میں ایک قدم پیچھے چھوڑ جاتی تھی، پھر بھی وہ جب بھی مڑ کر دیکھتی اُسے جیتا ہوا پاتی۔ ان دونوں میں قابلِ رشک نفرت تھی۔ اگر ایک دن تھا تو دوسرا رات۔ جتنی ایلما پر اسرار تھی اتنا ہی سیتل چٹیل میدان کی طرح بے لذت۔ ایلما انتہا کی تلخ اور تیز، سیتل حد درجہ بے فکر اور مسخرہ۔ کرکٹ کے علاوہ انگریزی شاعری میں بھی ٹانگ اڑی ہوئی اور یہاں اس کی ایلما سے مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ کہتی تھی کہ سیتل کے بازو گوریلے کے سے اور سینہ گینڈے کا سا لیکن دماغ اُونٹ سے بھی بدتر۔ وہ شاعری سے اتنا ہی دور ہے جتنا ٹیگور گلی ڈنڈے سے۔ اس پر ہر موقعے پر ہر جگہ دونوں ایک دوسرے کی کاٹ کرتے۔ زبانیں دونوں کی تیز تھیں لہٰذا لوگ بے چینی سے اِن دو متضاد عناصر کے ٹکرانے کا انتظار کرتے۔

آج ایلما ہندوستان کی آبائی غلامی اور ناداری کا علاج واحد ایک سرے سے عام تباہی اور قتل تجویز کر رہی تھی۔ اس کی رائے تھی کہ اس کی سسکتی ہوئی قوم کو آبِ حیات نہیں بلکہ زہریلی گیسیں ملنا چاہیے تاکہ ایک بار بالکل نام و نشان مٹ جائے۔ طاعون کا علاج کیلشیم کے انجکشنوں سے نہیں بلکہ لوہے سے داغنے سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ صدیوں کا سمویا ہوا زہر مرہموں سے نہیں بلکہ زہر ہی سے نچوڑا جا سکتا ہے۔

سیتل نپے تلے مہذب جملوں میں اُسے ایک نیم حکیم خطرۂ جان سے تشبیہہ دے رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر نہیں؟ علاج نہ جانے۔

"وہ ڈاکٹر نہیں گدھا ہے جو ایک عضو کے سڑ جانے پر اسے جڑ سے کاٹنے کے بجائے زمبک کی مالش تجویز کرے۔ یہ صدیوں سے بھنبھناتے ہوئے کیڑے! عبث ہے ان میں جان ڈالنے کی کوشش کرنا مٹی کا تیل چاہیے تھوڑا سا۔"

"وہ بے جان تو نہیں، ہاں کمزور ہیں۔"

"تو کرکٹ کھلانی چاہیے ان سب کو۔" ایلما کے حق میں قہقہہ پڑا۔

"ہاں، اور تھوڑی سی شاعری کی خوراک..." سوائے مس اوگانکر کے کسی نے داد نہ دی۔ اُن کی ہنسی میں چنگھاڑ تھی کہ سب کے قہقہے ماند پڑ جاتے تھے۔ ایما انھیں لال چرخ کہا کرتی تھی۔ وہ زندگی کو ہلکے پھلکے غبارے کی طرح ہوا میں لہراتا دیکھنا چاہتی تھیں۔ اب ایک نئے تیسرے مضمون میں ایم۔ اے کر رہی تھیں اور اُن کے رویے سے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بھر کے ہر مضمون کو لے کر ایم۔ اے کر ڈالیں گی۔ مگر ایما کا خیال تھا کہ علم سے زیادہ انھیں کالج کی زندگی کی ایک عادت سی پڑ گئی تھی۔ یونیورسٹی کی چہار دیواری کے باہر اُن کی زندگی صفر کے برابر ہو جاتی تھی۔ سوائے پروفیسروں اور کالج کے لڑکوں کے انھیں کسی سے بات کرنی بھی نہ آتی تھی۔ انھوں نے بہت چاہا کہ نئی زندگی کی عادت ڈالیں، کہیں نوکری کر لیں مگر گاڑی نہ چلی۔ تانگے میں جتنے کا عادی ٹٹو کھلے میدان میں کلیلیں کرنے سے شرماتا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ پیدائشی بدشکل تھیں اور سوائے کالج کے اُن پر کوئی لٹو نہ ہوا بلکہ وہ خود باوجود کوششوں کے کسی پر لٹو نہ ہو سکیں۔ لکچر ہال، لائبریری، ریڈنگ روم، بورڈنگ کا کھانا، آئے دن نئے نئے انسانوں کا داخلہ اور اخراج۔ انھیں اس کی ایک لت پڑ گئی تھی۔ وہ ہر نو وارد پر قابض ہو جاتیں، اُسے ساتھ لیے تمام اصول اور یونیورسٹی کے عجائبات سے دو چار کراتیں بالکل ایک محبت کرنے والی ماں کی طرح وہ ان کی چھوٹی موٹی پریشانیوں کو پرائے اور شریر لڑکوں کی بدمعاشیوں سے بچا لیتیں۔ عباس، ایک بالکل تازہ فرسٹ ایئر فول کو تو وہ بالکل پوٹلے تلے چھپائے رکھتیں۔ لیکن ہر نیا شکار کچھ دن بعد اُن کا شکاری بن جاتا، اُن کے دستِ شفقت کی گرمیوں سے اُکتا جاتا اور اُلٹا انھیں مشقِ ستم بنا ڈالتا۔

جنسی اعتبار سے وہ ایک عجیب و غریب ہستی تھیں۔ سنا ہے جب وہ بائیس برس کی ریسرچ کر رہی تھیں تو پروفیسر نسیم سے اُن کی بڑی راہ و رسم تھی، یہاں تک کہ وہ بارہ بجے تک بیٹھی سائنس کی گتھیاں سلجھایا کرتیں۔ لیکن ایک دن جب مشتاق [illegible] جب انھیں نہایت ہی دقیق گتھی سمجھانے کی کوشش کی تو انھوں نے [illegible] اندھا کرتے کرتے چھوڑا۔ اب تک ننھے سے سہمے ہوئے بچے کی طرح اُس [illegible]

کی تفصیل بیان کرتیں، اور اس بھولپن سے لڑکوں کے ہر سوال کا جواب دیتیں کہ وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے۔ وہ ذرا بھی نہ جھینپتیں اور پروفیسر کی دست درازیوں کی تشریح عملی حرکتوں سے کرتی جاتیں۔

ایلیا کہتی تھی کہ افتخار بھی کسی زمانے میں اُن کا چہیتا تھا پر اُسے اُن سے اس دن سے نفرت ہو گئی جس دن انھوں نے عشق و محبت کا کچھ عجیب بھونڈے اور گھناؤنے پن سے ذکر کیا۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ ورنہ یہی افتخار گھنٹوں اُن کے کمرے میں لیٹا رہتا، وہ سویٹر بنا کرتیں اور افتخار اُن کے زانو پر سر رکھے پڑا رہتا۔ وہ اُس کی دست درازیوں کو غلطیاں سمجھتیں اور اشارے کنائے کو بھولپن۔

آج کل وہ بڑے زور شور سے سینتل پر کرم فرما تھیں۔ وہ سویٹر بُن کر دے چکی تھیں اور وہ دن بھر موٹر سائیکل پر اُڑا دیے پھرتا۔ اس کی ہر بات پر وہ ونڈرفل، اور مار ویلس، کہتیں گو ایلیا سے اچھے خاصے تعلقات تھے مگر سینتل کی ہیڈ تھپکنا اپنا فرض سمجھتیں۔ جب سینتل نے ایلیا کے باغیانہ خیالات کا مذاق اُڑایا تو وہ جوش سے چیخ پڑیں، اور جب ایلیا کوئی چبھتا ہوا جملہ کہہ دیتی تو وہ سینتل کو پٹے ہوئے بچے کی طرح چمکارتیں جس پر اس کا منہ سرخ پڑ جاتا۔ لڑکوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ اسے گود لینے والی ہیں اور جائداد میں جو اُن کے پاپا کی کبڑوں کی ملیں ہیں وہ سب اسی کو ملیں گی۔

سینتل نے ہارتے ہوئے پہلوان کی طرح ٹینٹڑ سے پر حملہ کیا:

"عورت کو سیاست سے کیا تعلق؟ اُس کا تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ۔۔۔"

ایلیا کی آنکھیں نفرت سے چمک اُٹھیں۔ وہ سینتل کے اس حملے کے آگے کچھ بے دست و پا ہو جاتی۔ مگر قبل اس کے کہ سینتل عورت کے اس ایک مصرف کی تشریح کرتا افتخار نے آکر محفل درہم برہم کر دی۔ افتخار کے عروج کے ساتھ ہی ساتھ سینتل کا وجود چاند کی طرح پھیکا پڑ جاتا۔ وہ کبھی افتخار سے نہ اُلجھتا بلکہ فخریہ ہار مان لیتا۔

افتخار نے خوش نہایت تندہی سے آنکھ مچولی کا پروگرام بنا ڈالا۔ ایک لڑکے کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور باقی سب گھیرا بنا کر کھڑے ہو گئے۔ نیا اور شرمیلا لڑکا ذرا سی

دیر میں تختۂ مشق بن گیا۔ گھنٹوں چکراتا رہا کوئی ہاتھ نہ آیا۔ اس عرصے میں مس بوگا مسرت سے چیختے چیختے بالکل بدحواس ہو چکی تھیں۔ تالیاں بجا کر اور ہنس کر وہ کھیل اور تماشا بنائے دیتی تھیں۔ پسینے میں شرابور تازہ سِکے ہوئے کیک کی طرح تمتمایا ہوا تھا، ڈھیلے برہنہ بازو جن پر بھورے سے تل چھاپے کی طرح جمے ہوئے تھے، ہوا میں بات بے بات اُچھل رہے تھے، باڈی کے بند پھسل کر کندھوں پر سے نیچے آ رہے تھے اور ساڑھی اونچی نیچی ہو گئی تھی۔ جب اُن کے بتائے ہوئے داؤں پیچ لگا کر بھی وہ اوکا کسی کو نہ پکڑ سکا تو وہ لوگوں کو جان بوجھ کر چور بن جانے کی رائے دینے لگیں۔

وہ اودا پھٹکار! آنا آگئے گوا تو کیوں دبلا ہوا ہے؟ تھک گیا بیچارا۔ ارے سیتل سنگھ اب بھئی تیری باری، تو بن چور“

جب کسی نے نہ سُنا تو کھیل کے تمام اصول توڑ کر چور سے بغلگیر ہو گئیں۔ چور نے انھیں فوراً بوجھ لیا اور غریب پر اُس معنی خیز قہقہے نے گھڑوں پانی اُلٹ دیا جو اُس کے دوستوں نے اُس کے حالِ زار پر لگایا۔

مس بوگا نے مچل مچل کر پٹی بندھوائی اور تتلا تتلا کر ہر ایک کو پکارنے لگیں لیکن بیچاری کی خوشی نہایت مختصر رہ گئی کیونکہ افتخار نے فوراً آگے بڑھ کر اپنے آپ کو پکڑوا دیا۔ کھسیانی ہو کر وہ اُسے تھپڑوں سے مارنے لگیں اور ہنستی ہوئی پھر تماشبینوں میں آن ملیں۔ کھیل بدمزہ ہو کر مصیبت بن گیا کیونکہ افتخار جب کسی کو پکڑتا جان بوجھ کر اُس کا نام نہ بتاتا اور سزا کے طور پر پھر چور بنتا۔ اگر اُس کے بجائے کوئی اور ہوتا تو نہ جانے کیا گت بنتی مگر لوگ نہایت خندہ پیشانی سے ہنس رہے تھے۔

شمن کھیل سے بے تعلق، نہ جانے کدھر دیکھ رہی تھی اور کیا سوچ رہی تھی۔ کھیل سے ذرا ہٹ کر ایلما کھڑی افتخار کے لمبے چوڑے جسم کو، جو سوکھی ٹہنیوں پر لٹکا ہچکولے لے رہا تھا، ایک عجیب نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سیتل نے کچھ کہا اور ایلما کے زہریلے دانت بھُس کے بھرے ملیدے کی دھاردار کچنیوں کی طرح چمکنے لگے۔ سیتل نے اُس کی تلخیوں کا جواب ایک طنزیہ مسکراہٹ سے دیا اور اپنے بھاری جسم کو ڈھیلی کی طرح

پتیوں پر لڑھکا دیا۔ کراری خشک پتیاں چھوٹی چھوٹی چنگاریوں کی طرح چٹک کر خاموش ہو رہیں۔ ایماؔ نے اس ہتک آمیز لتاڑ سے کھسیا کر زمین سے ایک مٹی کا ڈلا اُٹھایا اور زور سے سامنے پیڑ کے تنے پر کھینچ مارا۔ سیتلؔ نے بروقت قہقہہ لگایا اور اب ایسا معلوم ہوا وہ قہقہہ اُس ڈھیلے میں چھپا بیٹھا تھا اور باریک ذرّوں کی شکل میں فضا میں بکھر گیا۔

شمنؔ زور لگا کر اپنا بازو چھڑانے لگی۔ بے خیالی میں اُس نے دیکھا بھی نہیں اور افتخارؔ نے اُسے پکڑ لیا۔ وہ ایسی بُری طرح بھڑکی جیسے سچ مچ کے چور نے دبوچ لیا ہو۔ افتخار کی انگلیاں رسّی کے پنجوں کی طرح اور مضبوط جکڑ گئیں۔ وہ چھوڑنے والا آدمی نہ تھا۔ غل مچا کر بے انصافی اور بے ایمانی کی دہائی دینے لگا۔ ساتھ ہی مسؔ بوگا پر تالیوں اور چیخوں کا دورہ پڑ گیا۔ شمنؔ کو مجبوراً خاموش کھڑے ہو کر اپنے آپ کو بُجھوانا پڑا۔ حالانکہ افتخارؔ اُسے فوراً پہچان گیا تھا مگر بن بن کر وہ اُسے ٹٹولے چلا گیا؛ ناک کو ہاتھ، ہاتھ کو پیر بتا کر سب کو خوب ہنسایا، خصوصاً مس بوگا تو بالکل ہی پاگل ہو گئیں۔

”ارے سچ بتاؤ یہ ہمارے ہی گروپ کا کوئی آدمی ہے یا۔۔۔“

”بتّی۔۔۔ اپھتکھاری۔ ہی ہی“ مس بوگا اپنی جگہ پہ دونوں پیروں پر پھدک رہی تھیں۔

”ارے مونچھیں! نہیں مونچھیں نہیں۔۔۔ کون ہو سکتا ہے؟ سیتلؔ، عباس، قادری۔۔۔؟ دت؟“ وہ اور بنا اور شمنؔ روہانسی ہو گئی۔ افتخار نے پٹی کھول دی۔

”اوہ آپ؟۔۔۔ معاف کیجیے گا۔“ وہ مضحکہ خیز ادب سے جھکا اور مس بوگا نے پھر ہنسی کی چیخیں ماریں۔

افتخارؔ نے اتنا مذاق کیا کہ شمنؔ کو جیسے گودڑ کی پوٹلی میں سے نکال کر اونچے چبوترے پر کھڑا کر دیا۔ یونین کا صدر معمولی ہستی نہیں، اگر وہ کسی میں دلچسپی لیتا ہے تو کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ واپس لوٹتے وقت دس بیس سائیکلیں پیش کی گئیں، یہاں تک کہ مسؔ بوگا نے اُسے سیتلؔ کے ساتھ ہی بیٹھ جانے کی دعوت دے دی۔

"ہاں، ہاں تم اس کی گود میں بیٹھ جانا" وہ بڑی معصومیت سے رائے دینے لگیں سیتّل نے مسکرا کر شانوں کو ایک استقبالیہ جنبش دی اور شمن کا جی چاہا مس بوگا کے ایک زور کی چپت لگائے، جیسے وہ اپنے بدتمیز چھوکرے کے گندے گلاس میں پانی پلانے پر لگا دیا کرتی تھی۔

رات کو شمن الیما کے ساتھ ہی رک گئی۔ وہ نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتی رہی۔ گھوم پھر کر سیتّل کا ذکر آجاتا اور الیما دانت پیس کر رہ جاتی۔

"مگر جانتی ہو؟" اُس نے بستر پر بیٹھ کر کہا۔

"کیا؟"

"یہ... کہ مجھے سیتّل سے نفرت کیوں ہے؟"

"پتہ نہیں۔"

"دنیا میں متضاد عناصر ایک دوسرے کے قریب ہی بھڑک اٹھتے ہیں: پانی کو قریب پاکر آگ اور بھڑکتی ہے، سیاہی کو دیکھ کر سفیدی اور زیادہ تندہی سے چمکتی ہے۔"

"ہوں۔" شمن سوچنے لگی۔

"کیا مجھے سیتّل سے محبت ہو سکتی ہے! ویسے ہی پوچھتی ہوں۔"

"کیا پتہ ہو بھی جائے۔"

"ہاں شاید، مگر جانتی ہو وہ... وہ محبت کس قسم کی ہوگی؟"

"جانے!"

"اسے دیکھ کر دل میں بڑے ذلیل جذبات متحرک ہو جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہوں، جیسے...."

"کیا؟"

"کچھ نہیں، تم نہیں سمجھو گی۔" تھوڑی دیر وہ خاموش بیٹھی اپنے خیالوں میں ڈوبی آنکھیں کھولتی بند کرتی رہی۔

"شمن... سینتل کو دیکھ کر... بدمعاشی کرنے کو دل چاہتا ہے! ہیں نا؟"
اُس نے ہولے سے کہا۔

"ہٹو... اللہ نہ کرے۔ نفرت ہے مجھے تو" شمن جھجکی۔

"ہاں ہاں نفرت ہی تو ہے... اونہہ، تم نہیں سمجھتیں" وہ کچھ اداس ہوگئی۔

"دیکھو... مگر ہوتا ہے ایسا... دنیا میں کئی طرح کے انسان ہوتے ہیں۔ کچھ تو ایسے جنھیں دیکھ کر سوئی ہوئی ممتا انگڑائیاں لینے لگتی ہے اور کچھ ایسے جن کے ساتھ دو چار باتیں کر کے جی بھر جاتا ہے" وہ شمن سے زیادہ خود کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

"مگر کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ لمبا چوڑا معاہدہ کر کے اُن کے ساتھ لمبا چوڑا سفر کرنے کو دل چاہتا ہے"

"سفر؟... کیسا سفر؟"

"زندگی کا سفر!"

"مگر سینتل؟"

"ہاں ٹھیرو، اور چند ایسے بھی ہیں جن سے ایک بار تجربے کے طور پر—"

"توبہ ہے ایلما!"

"اور پھر اُن کی صورت سے گھن آنے لگتی ہے، اُن کے تصوّر سے جی متلاتا ہے، جی چاہتا ہے پھر اُنھیں اُٹھا کر دور پھینک دیں اور بھول جائیں"

کمرے کی دھندلی روشنی میں ایلما کا سانولا چہرہ اندھیرے غار دل میں چھپی ہوئی کائی کی طرح بے جان ہو رہا تھا، اُس کی آنکھیں اور بھی غیر مانوس اور پُر اسرار ہو رہی تھیں۔

"عجیب لڑکی ہو" شمن نے جیسے خود سے کہا۔

"کیا؟ عجیب لڑکی! ممکن ہے عجیب لڑکی ہوں میں... شاید" وہ چپ ہوگئی۔

"شمن" اُس نے پھر کہا، "جب میں اپنے دل کو ٹٹولتی ہوں تو وہاں بڑے

وحشیانہ خیالات چھپے نظر آتے ہیں، جنھیں میں جلدی سے وہیں بند کر کے لوٹ آتی ہوں؛ میں ڈرتی ہوں کہ کہیں ایک دن وہ باہر نکل کر مجھے دبوچ نہ لیں۔ شمشاد، اگر میں ان بھوتوں کو باہر نکل آنے دوں تو۔ . . "

" کون سے بھوت ؟ "

" یہی . . . یہی جو میرے دل میں اُوٹ پٹانگ ناچا کرتے ہیں۔ مگر بہت برا ہو! بہت ہی برا ۔"

" وہمی ہو تم تو۔ ایلما، پاگل کہیں کی، بھلا یہ بھی کوئی بات ہے! کمبخت سیتل . . ."

" نہیں نہیں، تم ڈرو نہیں۔ میں جو بات کہہ ڈالتی ہوں کبھی نہیں کرتی سمجھیں تم۔ جب ایک بار کچھ سوچ چکی ہوں تو . . . اچھا سو جاؤ تم، تھک گئی ہو۔"

" نہیں نہیں، مجھے نیند نہیں آرہی ہے، کہو تم۔ دیکھو ایلما تم اس کمبخت سیتل کے منہ نہ لگا کرو . . . نہ جانے مجھے کیوں اُس سے ڈر لگتا ہے ؟ "

" ڈر ؟ تو تمھیں بھی اُس سے ڈر لگتا ہے ؟ " ایلما نے اُس کے پاس جھک کر پوچھا۔

" اور کیا بھئی، ایسی کمینی آنکھیں ہیں ۔"

" ارے پگلی وہ ڈر . . . وہ ڈر . . . اب کیسے بتاؤں، اُنہہ، تم سمجھتی کیوں نہیں ؟ " ایلما اُس کی کُند ذہنی سے عاجز آ گئی۔

" اور وہ کیا کہہ رہا تھا! عورت کا ایک ہی مصرف ہے، کیا ہے وہ ؟ "

" اور وہ، یہی مصرف، جو، جو، تم نہیں سمجھتیں، وہ ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ عورت مرد کی دلچسپی کے لیے پیدا کی گئی ہے ۔"

" چہ توبہ! منحوس کہیں کا! تو تمھیں غصہ آگیا تھا ۔"

" ایں ؟ نہیں تو، مجھے اس بات پر غصہ نہیں آیا تھا بلکہ . . . جب وہ لیٹا تھا تو تم نے دیکھا تھا ؟ "

" کیا ؟ "

" اُنہہ، اب تمھیں کیسے بتاؤں! ہائے توبہ اور اُدئی لُوٹی کرنے لگی کی، مثلاً ابھی

اگر میں تمہیں بتاؤں کہ مردوں کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جن کا۔۔۔جو۔۔۔؟"

"کیا۔ آہ؟" شمن نے ڈر کر پوچھا۔

"جنھیں دیکھ کر دل میں ایک عجیب خواہش جاگ اٹھتی ہے۔ مثلاً جیسے افتخار ہے، اب مجھے اس سے محبت نہیں، ہے بھی وہ بڑا عجیب، مگر میرا جی چاہتا ہے کہ میرا پہلا بچہ افتخار کا ہو۔۔۔"

"ایلما!" شمن بیوقوفوں کی طرح سینے میں سانس لانے کی کوشش کرنے لگی۔

"ہاں بیگی، اور کتنا دل چاہتا ہے میرا کہ وہ۔۔۔وہ۔۔۔"

"مر جاؤ۔ خدا کرے۔" شمن بگڑ گئی۔

"لیکن میں ایک لمبے سفر میں افتخار کو نہیں بھگت سکتی۔۔۔ آآ۔۔" اس نے لمبی سی جماہی لی اور لحاف میں پھسل کر لیٹ گئی۔

"تھک جاؤں، میں تو دو دن میں تھک جاؤں۔" اس نے سونے سے پہلے بار بار تھکی ہوئی جماہیوں کے درمیان دہرایا۔

(۲۸)

ایلما کی چیلی بن کر کیلاش ہوسٹل آنا پڑا۔ پرنسپل اس کی گمراہی پر تنبیہہ کر کے ہار گئیں۔ مجبوراً انھیں درس اخلاق دینے کے لیے قوم سے نکالنا پڑا۔ آنے سے پہلے کیا کیا منصوبے باندھے تھے کہ آزادی ملی تو یوں گلچھرّے اڑائیں گے۔ مگر جب چڑیا کے پر ایک بار کتر دیے جائیں تو وہ پنجرے کے باہر بھی قید ہی رہتی ہے اور یہ کاٹے ہوئے پر اس جنم میں تو نکلتے نہیں، نکلے بھی تو ٹیڑھے ٹیڑھے! دوسرے جب انسان پر خود اپنی نگرانی کا بار پڑتا ہے تو وہ بہت کوتاہ نظر ہو جاتا ہے۔ سب چھوڑ دے، جھوٹ اور بہانے سے خود کو دینے میں کیا لطف؟ پکچر میں جانے کا بہانہ کر کے سینما اڑ جانا، اب اس کی ضرورت ہی نہ رہی۔ آزادی سے جلد ہی جی بھر گیا۔ معلوم ہوتا تھا اب کسی کو اس کے چال چلن کی بھی فکر نہیں رہی۔ وہ بلا سے کچھ کہے گی کسی کو کیا؟ ایسا معلوم ہوتا تھا

لوگ اپنے کاندھوں کا بوجھ پھسلا کر آہستہ آہستہ اُس کے سر پر ڈالتے جا رہے ہیں، اوروں کی قید سے چھوٹ کر خود اپنی ذمہ داری کی زنجیروں میں جکڑتی جا رہی ہے۔ اس کی ہستی دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی، ایک محافظ اور دوسری محفوظ!

لائبریری سے نکلتے میں سیتل سے ٹکر ہو گئی! "یقیناً اتنا تو غیر مرئی نہیں ہوں کہ دکھائی بھی نہ دوں" اس نے مصنوعی جھلاہٹ سے کہا۔ شمن نے حال ہی میں عینک لگانا شروع کی تھی، جھینپ کر شیشے رومال سے صاف کرنے لگی۔

"جی ہاں، خوب صاف کر کے دیکھیے۔ ویسے چھ فٹ کی چیز اتنی باریک تو نہیں کہ خوردبین سے دیکھنا پڑے!"

شمن کو ہنسنا پڑا، سیتل بھی ہنس دیا۔ وہ پنسل لینے جا رہا تھا، لیکن اب تو اُس کے قلم سے کام چل جائے گا۔ ایلما سچ کہتی تھی کہ سیتل کے قرب میں انسان گوشت کا لوتھڑا بن جاتا تھا۔ اُس نے نہایت بے تکلفی سے اس کے گریبان سے قلم اچک لیا اور قبل اس کے کہ وہ کچھ بُرا مانتی وہ تیزی سے معافی مانگتا ہوا نوٹ لینے پرلے کونے میں چلا گیا، شمن پٹی ہوئی مشکل لیے دوسرے کونے کی میز پر بیٹھ گئی۔

باوجود کوشش کے شمن سیتل کے وجود کو نظر انداز نہ کر سکی۔ بار بار اُس کی نظر اُسی گوشے کی طرف بھٹک جاتی جہاں وہ کچھ کتابیں اُلٹ پلٹ کر رہا تھا۔ وہ میز پر کہنیاں ٹکائے موٹی سی ڈکشنری کھولے کچھ ڈھونڈ رہا تھا اور سوچ سوچ کر کچھ لکھتا جاتا تھا۔ بار بار وہ قلم کو ہونٹوں پر رگڑ کر کچھ سوچنے لگتا اور کتاب پر جھک جاتا۔ اُس کی پھنسی ہوئی سپورٹ شرٹ کھال کی طرح سینے اور شانوں پر منڈھی ہوئی تھی۔ مضبوط گردن ورزش کی وجہ سے آہنی سانچے میں ڈھلی معلوم ہوتی تھی۔ وہ بار بار پہلو بدلتا۔ اس کا کسرتی جسم بالکل اٹلس کے مجسمے کی طرح کھنچا ہوا اور سڈول تھا۔ بھوئیں زیادہ گھنی اور تکونی آنکھیں از حد پتھریلی اور گہری ہو رہی تھیں۔ جب وہ اپنے ہونٹ روٹھنے کے انداز میں سکیڑ لیتا تو بالکل ضدّی بچے کی سی شکل ہو جاتی۔

شمن نے جھنجھلا کر کتاب بند کر دی اور نہ جانے کس پر دانت پیسنے لگی۔ سیتل کے خلاف یہ اُسے فضول غصہ کیوں آنے لگا؟ دھڑکتے ہوئے دل سے ایلیمنٹ کے الفاظ یاد آگئے، تخیل نے اسے نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، کیا کیا منظر دکھا دیے۔ اندھیرے گوشے، سنسان گپھائیں اور دھندلے دھندلے پیڑوں کے گھنے جھنڈ، خزاں رسیدہ پتیوں کی چُرمُر ٹوٹنے کی آواز۔ مگر نہیں تو، سیتل کے پہلو بدلنے سے میز چرچرائی تھی۔ سیتل، سیتل! سیتل! کیوں، آخر کیوں وہ اُس کے دماغ پر چڑھا چلا آتا تھا؟ بغیر قلم لیے وہ چپکے سے لائبریری سے نکل بھاگی اور کامن روم میں جا کر بیٹھ گئی۔

لیکن پھر وہ خود بخود ہنسنے لگی۔ یہ اُس کی کمزوری نہیں سیتل کی طاقت تھی جو اُسے تھکائے دے رہی تھی۔ وہی طاقت جو ایک حسن فروش بیسوا میں پا کر اچھے بھلے انسان جبیں سائی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس نے اس سے پہلے کسی سے سنا بھی نہ تھا کہ جیسے فاحشہ عورتیں سینہ تانے کمر لچکاتی، ناز و عشوہ کی بجلیاں گراتی لوگوں کے دل مسلتی چلتی ہیں اسی طرح بعض مرد بھی اپنے جسم کی ستی اور چھچھوری نمائش کیا کرتے ہیں! سیتل کی ہر جنبش سے معلوم ہوتا وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے: "لو دیکھ لو یہ مضبوط قہقہے، یہ رانیں، یہ چوڑا چکلا سینہ۔ ہے ہمت نظر بھر کے دیکھنے کی؟" وہ جو بار بار قلم کو ہونٹوں پر رگڑ رہا تھا کیا بھونڈا طریقہ تھا پیغام رسانی کا۔ اُسے گھن آنے لگی۔

کمرے میں بھاری پردے پڑے ہوئے تھے اور عجیب پُراسرار و نرم اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ کبھی کبھی کوئی پردہ ہوا سے لرزتا، روشنی کی ننھی سی کرن سسکیاں بھرتی پھر اُسی خوشگوار تاریکی میں گھل مل جاتی۔ اُس کے دماغ کی رگیں سوکھی پتیوں کی طرح خستہ ہو رہی تھیں، ڈر تھا کہ ذرا بھی دھیان بھٹکا اور ان کا چورا ہو جائے گا۔

"ارے آپ یہاں؟" سیتل ربڑ کے جوتے پہنے بلی کی طرح چلتا نہ جانے کب کرسی کے پیچھے آن کھڑا ہوا۔ شمن اُچھل پڑی، جیسے وہ بے جرم سے نہا رہی تھی اور کسی نے دروازے چوپٹ کھول دیے۔ اُس نے جلدی سے اپنے حواس سمیٹ لیے اور بیٹھ گئی۔

"یہ آپ کا قلم ہے؟" اس نے گال کھجانے کے بہانے اسے گال سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں نے بتا دیا کہ کیوں، قلم دیتے اس کی انگلی ذرا زیادہ دیر تک دب گئی، شمن نے گھبرا کر قلم چھوڑ دیا۔

"ارے ہاتھ جل گیا؟" وہ اپنی پتھریلی آنکھیں جھپکا کر ہنسنے لگا۔

دور لاپروائی سے مڑ کر اس نے ایک پینٹنگ کو دیکھنا شروع کیا، جیسے وہ جاتے جاتے رک گیا ہو۔ پاس رکھے ہوئے اسٹول کا سہارا لے کر دو چار انگڑائیاں لیں اور پھر شمن کی طرف مڑا۔

باہر برآمدے میں نوکر چاکر گھوم رہے تھے، لائبریری بھی دور نہ تھی، لیکن شمن کا دل ایسے دھڑکا جیسے وہ سنسان تنہائیوں میں نامعلوم خوف سے بھاگ رہی ہے مگر سب راستے بند ہیں، بڑے بڑے حشرات الارض لمبے چوڑے دہانے کھولے چاروں طرف سے لپک رہے ہیں۔ اگر سیتل ایک لمبی سی چھری لے کر اس کا قیمہ کر ڈالتا تو بھی اس میں جنبش کرنے کی سکت نہ آتی، مگر سیتل الو نہ تھا، اسے کچے پھلوں سے نفرت تھی۔ وہ نہایت صبر سے پیڑ کے نیچے کھڑا ہونٹوں پر زبان پھرا کرتا اور پھل کے پک کر رسدار ہو جانے کا انتظار کرتا، یہاں تک کہ خود اس کی آغوش میں رس کی بارش ہو جاتی، مجبوراً وہ اسے چکھ لیتا، بالکل زبردستی کی دعوت سمجھ کر۔

سیتل چلا گیا مگر بڑی دیر تک اسے وہ ملاجی یاد آیا کیے جو بہت دن ہوئے جب وہ اور نوری کھڑکی میں بیٹھی گلی سے جھانکا کرتی تھیں اور پھر حواس باختہ ہو کر کھڑکی سے گر جایا کرتی تھیں۔ وہ جلدی سے کامن روم سے بھاگ آئی۔

یونیورسٹی میں دو گروہ تھے: ایک تو پروفیسروں کا چہیتا اور ہر دلعزیز، مگر جس کی حرکتوں پر یونیورسٹی کے منتظمین کے علاوہ حکومت کی نظر بھی رہا کرتی تھی۔ اس گروہ کے سردار ایلما اور افتخار تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ افتخار مفسد اور مکار تھا۔ اس کی زبان اس قدر طرار تھی کہ چند لمحوں میں ساری یونیورسٹی کو بہکا دیتا مگر جونہی حل میں کوئی نیا خیال پیدا ہوتا، بڑے سے بڑے فساد کو ذرا سی دیر میں ختم کر دیتا

اسی لیے منتظمین کو ہر معاملے میں اس کی مدد کی ضرورت پڑتی، یہاں تک کہ یونیورسٹی کے اہم موقعوں پر اسی کی رائے سے مہمان اور صدر چنے جاتے۔ یونیورسٹی کو کوئی بہانہ بھی تو اسے دفع کرنے کا نہ ملتا تھا، ورنہ وہ تو کبھی کا کلرکی کے جوئے میں جتتا نظر آتا۔

صورت شکل سے وہ نہایت معمولی درجے کا انسان نظر آتا تھا۔ عام طور پر ایک قسم کی ناسمجھی اور بے وقوفی طاری رہتی۔ لوگوں کا خیال تھا یہ اس کا اصلی چہرہ نہ تھا۔ اس کا اصلی چہرہ تو بہت تھوڑی دیر کے لیے صرف پرنسپل نے اپنے دفتر کے پرائیویٹ لمحوں میں دیکھا تھا یا کبھی کبھی جب وہ خود کو بھول جاتا تو دیکھنے والے اس کے چہرے سے مکدر خاطر ہو جاتے۔ اس کے ہونٹ حملہ آور بھیڑیے کی طرح ہونٹوں پر سے کھنچ جاتے اور آنکھوں میں صدیوں کی دبی ہوئی غلامی کی خاموش لغاوت سلگنے لگتی۔ اس کی صحت عموماً خراب رہتی تھی اور زیادہ تر کھانستا چھینکتا رہتا تھا۔

قدرتی طور پر شمن کی نظر بار بار افتخار کی طرف اٹھتی۔ گو وہ بہت کم اس سے بات کرتا مگر جب کبھی وہ ملتے ایسا معلوم ہوتا وہ ایک دوسرے کو برسوں سے پہچانتے ہیں۔ وہ اس کی ہر بات پر آنکھ میچ کر صاد کرنا اپنا فرض سمجھ چکی تھی۔ اب وہ مداحوں کے گروپ سے قدم بڑھا کر ممدوح بنتی جا رہی تھی اور نئے انتخاب پر اسے یونین کا رکن بھی بنا دیا گیا۔ آہستہ آہستہ خود اعتمادی بڑھ کر کچھ غرور کی حدود کو چھونے لگی تھی۔ اب ایلما اسے اپنی ہی جیسی مگر زیادہ عقلمند اور ذہین نظر آتی تھی، اب وہ پہلے کی طرح مسحور ہو کر اس کی پُراسرار آنکھوں اور زہریلے دانتوں سے اتنی متاثر نہ ہوئی تھی۔ اسے خود اپنی ہنسی میں ایک غیر مانوس سی جھنکار سنائی دینے لگی تھی۔ ہاں افتخار اور اس کی کھوئی ہوئی سی جھلاہٹ اسے اب بھی متحیر کر دیتی تھی۔

اسی زمانے میں الہ آباد میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کا جلسہ شروع ہو گیا اور پرانے حقداروں کو پیچھے چھوڑ کر نہ جانے کیسے شمن کا انتخاب نمائندہ جماعت میں ہو گیا۔

(۲۹)

گھر کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ نوری کی شادی ہو رہی ہے لہٰذا لوٹتے میں رک گئی۔ نوری اندر کمرے میں مائیوں بیٹھی تھی شمن کو دیکھ کر وہ اُس سے لپٹ گئی۔ نوری اور شمن ہمیشہ ان مصنوعات سے پاک رہی تھیں مگر نہ جانے کیوں دونوں طرف سے پیار ابل پڑا۔ بڑی محبت سے دونوں ایک ہی رضائی میں لپٹ کر سوئیں اور رات گئے تک باتیں کرتی رہیں۔ عام باتیں جو ایک مائیوں بیٹھی ہوئی لڑکی اپنی بچپن کی سہیلی سے کرتی ہے! ہونے والے شوہر کے متعلق سنے سنائے افسانے، ساس نند کے ارمان بھرے دکھڑے، ٹیکے، جھومر اور پازیبوں کا ذکر۔ ماں، دادی اور دوسرے رشتہ داروں کی مدد سے اس نے دور ہی دور سے عشق کر لیا تھا۔ جہیز کی تیاری میں گویا روحانی کورٹ شپ ہو گئی تھی۔ بڑا نکھے پر وہ ہونے والے میاں کا خیال ایک لڑی میں پرو تی جاتی ساس نندوں کا رمنٹک برتاؤ اور بری اور چڑھاوے کے ذریعے سے وہ ہونے والے ساتھی کو بخوبی پہچان چکی تھی، اس کی چھوٹی سے چھوٹی ضد اور عادت وہ اچھی طرح جان گئی تھی:

”انھیں مہندی سے نفرت ہے۔ گہرے رنگ سے تو چڑتے ہیں۔ بڑی خوشامدوں سے تو سہرا باندھ رہے ہیں“ وہی عام پھوپھیوں کے دولہاوں کے نخرے مگر نوری انھیں بے انتہا عجیب و غریب بنا کر سنا رہی تھی۔

”کہتے ہیں گھونگٹ نہیں کاڑھنے دیں گے۔ بھلا میں بھائی میاں کے سامنے کیسے چلوں گی، میرا دم تو نکل جائے گا“ اس نے منگنی کے بعد ہی سے اس کے تمام رشتے داروں سے ناطے جوڑ لیے تھے اور انھیں ناموں سے پکارتی تھی جن سے وہ اُن کا ذکر کرتا تھا۔

”روز صبح شیو کرتے ہیں ورنہ ایسے کھردرے گال ہو جاتے ہیں کہ حد نہیں“ وہ ایسے کہنے لگی گویا وہ برسوں سے ان گالوں کو سہلانے کی عادی ہے۔ تخیل بھی کیا غضب کی چیز ہے! جہاں کسی کی رسائی نہ ہو، پرندہ بھی نہ مار سکے وہاں مزے سے خیالوں کے ہنڈولے میں جھولتے چلے جاؤ۔ منگنی سے پہلے ہی نوری کا پردہ کرا دیا گیا

تھا۔ اب وہ تیس سال انگلینڈ رہ کر آرہا تھا۔ کوئی پوچھے، کم بخت! یہ سب تجھے کس نے بتا دیا کہ اس کی ڈاڑھی کھردری ہے، مونچھیں چبھنے والی ہیں اور ہتھیلیاں چکنی ہیں؟

شمن نے اس سے بالتفصیل نہ پوچھا ورنہ وہ اُسے شادی کے بعد کی اپنی پرسکون زندگی، بچوں کے پیار کے نام، روزانہ گوشت ترکاری کا حساب کتاب سب کچھ بتا دیتی۔ نہ جانے کب سے وہ زندگی کی اس جمع تفریق میں مشغول تھی، اور پھر سب کا خیال تھا کہ نوری ابھی کم سن ہے، بوجھ نہ اٹھا پائے گی۔ یہ بھولی مائیں! اتنا نہیں جانتیں کہ ذرا سی تھی جبھی سے بوڑھی دادی بن چکی تھی۔

نوری کو چھوڑ کر وہ دورِ زندگی کے ہیر پھیر پر غور کرنے لگی۔ یہ لڑکی ذات بھی معمہ ہے۔ چار پانچ سال کی تو پکی نانیوں جیسی۔ جو دیکھے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ ابھی یہ حال ہے تو بڑھ کر آفت کا پرکالہ نکلے گی۔ جہاں دس پانچ سال اور بیتے ایک دم رنگ پلٹا۔ وہ بزرگوں جیسی گفتگو اور طور طریق غائب، اس کی جگہ دوپٹہ کہیں ہے تو پاجامہ کہیں، گریباں چاک ہے تو جوتی پیروں سے نکل بھاگتی ہے، بات کرتے میں سو بار زبان لڑکھڑاتی ہے اور ہزار بار چہرے کا رنگ بدلتا ہے۔ کیا نئے انقلاب اور تازہ مصیبتیں اس شدت سے حملہ آور ہوتی ہیں کہ سدھ بدھ ہی غائب ہو جاتی ہے یا احساسِ شباب ایک پھٹکار بن کر ہوش و حواس کو معطل کر دیتا ہے۔

نوری خوابِ بیداری سے جی بھر کر کے سو بھی گئی مگر شمن نے اس کا سر اپنے بازو سے نہ ہٹایا۔ اس کا نرم گرم جسم، خوابوں سے رنگین چہرہ، اُبٹنے میں بسے ہوئے میلے کپڑے، وہ غور سے اسے دیکھنے لگی۔ عورت! کیا یہی تھی عورت جو حلوے کی مرغن قاب کی طرح سجا کر بنا کر کل ایک نئے مہمان کے سپرد کی جانے والی تھی! اسے نہلا دھلا کر عطر میں بسایا جائے گا کہ اگر تھوڑی بہت بساند ہو بھی تو معلوم نہ پڑے، ایسے ہی جیسے سڑے گلے آلو کی چاٹ بنانے والا تلخی چھپانے کے لیے ڈھیر سا مسالہ چھڑک دیتا ہے، بالکل اسی طرح دلہن کو شیرے میں لتھیڑ کر دولہا کے حلق میں اتار دیا جائے گا اور جب ایک بار نگل گیا تو مہاشیر و بنا ہمیشہ وقتی و بار نش دو چار

گھسوں میں اتر جائے گی اور دلہن صرف بیوی رہ جائے گی! لفظ بیوی کے خیال ہی سے شمن کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ نوری کے نوجوان جسم سے لپٹے ہوئے درجنوں بچے اور ہزاروں حکمریں جونکوں کی طرح چپکی خون چوستی نظر آنے لگیں۔

"عورت کا صرف ایک مصرف ہے..." اسے سینتل کے الفاظ یاد آ گئے۔

دفعتاً اسے الہ آباد کی میٹنگ بھی یاد آ گئی، خصوصاً آخری اجتماع جو تاروں کی چھاؤں میں الاؤ لگا کر کیا گیا تھا۔ چاروں طرف گچھوں کی صورت میں بیٹھ کر کانا پھوسی ہو رہی تھی، دنیا کے اہم مسائل طے کیے جا رہے تھے، لڑکوں کی بھاری اور مدھم آوازوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی مہین بولیاں روپہلی گھنگھروؤں کی طرح بج رہی تھیں، بیچ بیچ میں مونگ پھلیوں کے چھلکوں کی چڑ چڑ، بالکل ساز سنگیت کا لطف آ رہا تھا۔ الاؤ دھیما دھیما ہو گیا تھا، صرف کبھی کبھی جب کوئی گروہ مونگ پھلیوں کی مٹھیاں بھر کر پھینکتا تو ایک آدھ شعلہ لپک اٹھتا۔

اس دن کتنی نگاہیں اسے اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور بجلی نے ان کو جھٹک دینے کے سینے سے لگا کر تھپکیاں دی تھیں۔ اسے سردی لگی تھی تو کتنے کوٹ اور مفلر اس پر برس پڑے تھے۔ ہر ایک خود دکھ اٹھا کر اس کے قیمتی جسم کو بچانے کی فکر میں تھا۔ نہ جانے اس قربانی میں کیا لطف آ رہا تھا کہ ہر ایک تھا جھکا جا رہا تھا۔ اتفاق کہیے یا جو کچھ بھی اس کے ہاتھ میں افتخار کا کوٹ آیا تھا۔ پہلے تو اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ سگریٹ کے علاوہ اور بھی بہت سی پریشان کن خوشبوئیں ایک دم دماغ پر چڑھ گئی تھیں۔ شمن نے اوڑھے ہی کون سے ہزاروں کوٹ تھے جو ان خوشبوؤں کو پہچان سکتی۔؟

اس نے چھپے چوری اس دلچسپ کوٹ کی جیبیں بھی ٹٹول ڈالی تھیں۔ افتخار بڑا لاپرواہ تھا، منوں کوڑا ابھرا پڑا تھا، تمباکو کا چورا، ٹوٹی ہوئی دیا سلائیاں دو چار پنسل کی چھیلن سگٹے ٹکڑے، پروگرام [illegible] دوسری

جیب میں مونگ پھلیوں کے چھلکوں کے علاوہ ایک خط بھی تھا جو وہ الاؤ کی روشنی میں نہ پڑھ سکی اور نہ جانے کیوں اسے اپنی صدری میں اڑس لیا۔ جلسہ بکھرنے لگا تو وہ افتخار کو ڈھونڈنے لگی۔

"کمال کر دیا آپ نے تو، بھئی میں نے سب کی حرص میں دے دیا تھا کوٹ اور آپ قبضہ ہی جما بیٹھیں۔ خدا قسم مرا جا رہا ہوں سردی کے مارے۔ یا تو مجھے بھی لپیٹ لیجئے اسی میں یا۔۔ ۔"

افتخار کو ہذیان بکتے دیکھ کر شمن سہم کر رہ گئی۔

"لیجئے اپنا کوٹ۔" اس نے ہمت کر کے کہا۔

"نہیں، اور آپ؟ مرنے کا شوق ہے؟"

"میں یہ پہنے ہوں، کافی گرم ہے۔"

"اوہو، جل گیا میرا ہاتھ تو۔۔ ۔" اس نے بن کر صدری کا کپڑا چٹکی سے چھوا۔

"اچھا اب بیٹھیے حضرت اور جلدی سے کیمپ میں جا کر بستر میں دبک جائیے۔ نیند جو نہیں آ رہی ہے میں جا کر اپنا کوٹ پہن لوں گی۔ لیجئے۔"

دونوں کیمپ میں آئے اور افتخار نے کوٹ نہ لیا بلکہ اس کی رضائی اوڑھ لی۔ دونوں باہر آ گئے تھے۔

"کاہے کی خوشبو ہے؟" افتخار نے بنارسی رضائی کو ناک سے رگڑ کر پوچھا تھا۔ شمن نے نہ جانے کیا جواب دیا تھا۔ ایک بے تکی خاموشی درمیان میں حائل ہو گئی تھی اور دونوں کو ایک دوسرے کا وجود بری طرح کھٹکنے لگا۔ افتخار نے سگریٹ سلگایا اور پھر جھنجھلا کر مسل ڈالا۔

"ہنہ!" وہ طنز سے غرایا۔

"جی؟"

"آپ چاہتی ہیں میں چلا جاؤں۔ یہ سنبھالیے اپنی رضائی۔"

"ایں؟"

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ مجھ سے نفرت کرتی ہیں . . . میں . . . بلکہ میرا مطلب کچھ بھی نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کندھوں کو بے معنی سی جنبش دی۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے بہت پسند کرتی ہو۔"

"یہ . . . میں؟" وہ چڑ کر مسکرائی۔

"ہاں، اور جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ میں آج تم سے کھل کر باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" وہ اسے روک کر بولا، "میں تم سے بہت بڑا ہوں، دنیا بھر کی ٹھوکریں کھائی ہیں، بہت کچھ سمجھنے لگا ہوں، میں تمہیں پسند کرتا ہوں اس لیے . . . تو . . . خیر جانے دو . . . تو میں کیا کہہ رہا تھا؟" وہ ایک دم گم ہو گیا۔

"ہاں اسی لیے تم سے کچھ کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔"

"کہیے!"

"تم بہت بھولی ہو . . . اس میں کوئی فخر کی بات نہیں۔" اس نے جلدی سے اپنے الفاظ کی تردید کی، "معصومیت ایسی دولت نہیں جس پر کوئی اس دنیا میں ناز کر سکے . . . تو میرے خیال میں . . ."

"تم نے کسی سے محبت نہیں کی؟" وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔ شمن خاموش رہی، نہ جانے کیوں اسے تردید کرنے میں احساسِ کمتری ہونے لگا۔

"اور میری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے۔ میں نے اتنی بار محبت کی ہے کہ یاد بھی نہیں۔ ماں کی محبت سے لے کر مجھے نوکرانیوں، فقیرنیوں اور ان سے بھی گری ہوئی عورتوں کی محبت نصیب ہو چکی . . . مگر تم سے جو محبت . . . لاحول ولا قوۃ!" وہ جھلایا، "کہیں یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تم سے زیادہ کسی سے محبت نہیں ہوئی۔ نہیں، بلکہ تمہیں دیکھ کر میرے دل میں عجیب جذبات موجزن ہونے لگتے ہیں۔

"تم سمجھ بھی تو نہیں سکتیں۔ تم سے لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے . . . جیسے . . . جیسے، یوں سمجھو جیسے میں تمہیں اپنا کوٹ دے دوں اوڑھنے کے لیے تو مجھے یقین ہے کہ وہ محفوظ رہے گا۔" شمن ڈر گئی کہ کہیں اس نے خط نکالتے دیکھ تو نہیں لیا . . .

"تم اس میں سے کچھ نہ چرا سکو گی، برسوں کے لیے بھی اگر میں اپنی محبت مع تمام رعنائیوں کے سپرد کر دوں تو بھی خیانت نہ کرو گی۔ اور یہ اطمینان جتا نہیں سکتا ایک مرد کے لیے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ میرا مطلب اور مردوں سے نہیں خود اپنی ذات سے ہے۔"

"مگر یہ کیوں؟" وہ ایک دم بولا۔

"یہ آپ ہی بتا سکتے ہیں۔"

"میں؟ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ ہُنہ، خود ہی نہیں سمجھتا کہ تم جیسی سیدھی سادی لڑکی مجھے کیا دے سکتی ہے جو مجھے دردر کی خاک چھان کر بھی نہ ملا۔ میں تمہارے ساتھ بغیر تھکے بہت دور تک جا سکتا ہوں ۔ ۔ ۔" شمن کو ایلیا کا لمبا سفر یاد آگیا۔

"مگر ہمارے راستے جدا جدا ہیں ۔ ۔ ۔"

"کیوں؟" شمن نے کسی غیبی ہاتھ سے گلا چھڑا کر کہا۔

"اس لیے کہ ۔ ۔ ۔ کہ تم بالکل چوکور ہو ۔ ۔ ۔ اور دنیا کے گھسے کھا کر میں بالکل گول ہو چکا ہوں۔"

"مگر تراشنے سے ہیرا اور بیش بہا ہو جاتا ہے۔" شمن اپنی زبان کی طراری پر جھینپ گئی۔

"ہیں؟ ۔ ۔ ۔ مگر میں پتھر ہوں ۔ ۔ ۔ تم سمجھ رہی ہو گی کہ میں بن رہا ہوں۔" وہ بگڑا۔

"نہیں تو!"

"ہُنہ ۔ ۔ ۔ جانتی ہو میں نے تمہاری رضائی کیوں اوڑھی؟" شمن کا دل دھڑکا۔

"اسے دیکھ کر مجھے گزری ہوئی زندگی کی باتیں یاد آگئیں۔ تمہیں نہیں معلوم میری ایک بہن بھی تھی۔ ہم دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے ہم دونوں ایسی قوس قزح کی طرح رنگیلی رضائی میں گھس کر ریل ریل کھیلا کرتے تھے۔ آج اس رضائی کو دیکھ کر ۔ ۔ ۔ ہنسو مت! تم ہنستی کیوں ہو؟ ہاں اسے دیکھ کر میرا دل بے اختیار ریل ریل کھیلنے کو چاہا۔ تمہیں دیکھ کر میرا دل ہمیشہ چھیڑنے کو چاہتا ہے، مگر میں رک جاتا ہوں کہ کہیں تم اسے کچھ اور نہ سمجھنے لگو۔ شمشاد، معشوقاؤں کے تو ہم نے ہزاروں چٹکیاں لی ہیں مگر ویسی چٹکی، جو میری بہن پلنگ کے نیچے گھس کر میری پیٹھ میں بھر لیا کرتی تھی،

اس کی یاد آج تک میری رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ میری بہن مر گئی اور پھر مجھے ویسی محبت نصیب نہ ہوئی۔"

وہ تھوڑی دیر تک رضائی پر ٹلکے ہوئے ستارے ناخنوں سے کھرچتا رہا پھر کچھ یاد کر کے بولا:

"ہم صبح ناشتے پر اسد کی کھچڑی کھایا کرتے تھے۔ وہ دبلی پتلی اور بڑی ہلکی سی تھی اور میں پلنگ پر بیٹھ کر کودا کرتا تھا تو وہ لڑھک کر میرے اوپر آن گرتی۔ اسے کھانسی کی وجہ سے گھی کھانے کو منع کر دیا گیا تھا مگر وہ ضد کرتی تو بیوی روئی کی گولی بنا کر کھچڑی پر رکھ دیتیں۔ وہ قطعی نہ سمجھتی اور مزے سے کھچڑی کھا لیتی۔ ایک دن میں نے اُسے بتا دیا۔

"بیّجو یہ گھی تھوڑی ہے، روئی ہے۔"

"روئی؟" وہ حیرت زدہ ہو کر رہ گئی اور جب اسے اماں کی چالاکی معلوم ہو گئی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ مجھے بڑا افسوس ہوا تھا۔ تم نے کبھی اسد کی کھچڑی کھائی ہے؟"

"آں ہاں" شمن کا گلا بھر آیا۔

"اور... اور... ارے یہ میں تم سے کس قدر بے تکی باتیں کر رہا ہوں، لاحول ولا قوۃ! تم سمجھ رہی ہو گی کہ میں بھی نرا چغد ہوں" وہ کھسیا گیا۔

"ارے میں تو بالکل بھی...."

"جھوٹ، تم مجھے قطعی الو سمجھ رہی ہو۔ اور نہیں تو کیا! میں جب تمہیں پسند کرتا ہوں تو بجائے تمہیں آغوش میں لینے کے یہ اسد کی کھچڑی..."

"تو کیا ہوا، آپ مجھے بہن کی طرح چاہتے ہیں؟"

"ایں؟ قطعی نہیں۔ میں ان لوگوں کو پرلے درجے کا مکار سمجھتا ہوں، جو غیر لڑکیوں کو، جو اُن کی معشوقہ بن سکتی ہیں، بہن کہتے ہیں۔ مگر شاید تم کچھ ٹھیک کہتی ہو میں معشوقائیں بناتے بناتے تھک چکا ہوں، یہی وجہ ہے کہ میں لفظ بیوی سے چڑتا ہوں مگر میں تمہیں بہن تو نہیں بنانا چاہتا، لاحول ولا قوۃ!"

"کیوں؟"

"کیونکہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک سرے سے میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتا۔ بہت دفعہ میرے دل میں تمہاری طرف سے ایسے خیال آئے ہیں جو ایک بہن کے لیے نہیں آتے۔ تم ابھی نہ سمجھو گی ایک دن آئے گا جب ان الفاظ کے معنی تم خود بخود سمجھ جاؤ گی۔ تم۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم بھائی نہیں بلکہ دوست سمجھو، ایسا دوست جس سے کسی قسم کا تکلف نہ ہو۔"

"کیوں نہیں۔"

"میری بہن زندہ رہتی تو میں اسے کبھی بھی صرف بہن نہ سمجھتا، اس کی شادی ہو جاتی مگر ہم بہترین دوست رہتے۔"

"آپ شادی نہیں کریں گے؟"

"شادی سے تمہارا مطلب کیا ہے؟ کیا سہرا باندھ کر گھوڑے پر چڑھنا اور ایک لڑکی کو اپنا اسٹامپ لگا کر وصول کرنا ہی شادی ہے؟ تو میں کنوارا ہی بھلا، اور ویسے تو۔۔۔" شمن کچھ جھینپ گئی۔

"تو اس میں کیا ہوا؟" وہ جلدی سے بولا "مرد ہونا کوئی عیب تو نہیں! اگر ہم کہتے نہیں مگر ہماری ماں بہنیں خوب جانتی ہیں کہ۔۔۔ ہم مرد ہیں۔ میں اسے گناہ نہیں سمجھتا۔"

"آپ شادی کے خلاف ہیں، میرا مطلب ہے نکاح کے۔"

"قطعی۔ نکاح ایک وعدہ ہے جو صرف اس لیے پختہ کیا جاتا ہے کہ کہیں وعدہ کرنے والا مکر نہ جائے۔ ذرا سوچیے تو سہی، زندگی کے اتنے اہم معاملے کو کاغذی گواہ کس طرح مضبوط بنا سکتے ہیں؟ شادی ایک فعل ہے قول نہیں۔"

شمن کچھ نہ سمجھی۔

"تو پھر لوگ نکاح کیوں کرتے ہیں؟"

"گدھاپن کرتے ہیں۔"

"واہ" شمن لاجواب ہو کر ہنسی۔

نوری نے کروٹ لی اور اس کا سر بازو سے ڈھلک کر تکیے پر ٹک گیا۔ شمن نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا، شاید وہ آنے والے کل کے سب سے زیادہ رنگین لمحوں کو سمیٹ کر خواب دیکھ رہی تھی، اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور آنکھیں نیم وا تھیں۔ رات کی تنہا خاموشی میں شمن کا جی چاہا! کاش وہ کسی طرح جھانک کر اس کی جگمگاتی دنیا کی ایک جھلک دیکھ سکتی، مگر انتظار کے الفاظ گھوم پھر کر اسے اپنی دنیا میں واپس گھسیٹ لے گئے۔

"اور کیا، گدھاپن تو ہے ہی۔ اگر مجھے کوئی عورت کہے کہ مجھے تمہارا اعتبار نہیں، چار آدمیوں کے سامنے کہو کہ تم مجھے۔۔۔ مجھے۔۔۔" شمن کی گھبراہٹ دیکھ کر وہ رک گیا تھا مگر پھر جلدی سے بولا:

"تو میں اس سے کہوں گا: بیگم صاحبہ چلتی پھرتی نظر آؤ، ہمیں چار آدمیوں کی گواہی کے بغیر ہی کوئی چڑیل جائے تو ہم۔۔۔"

"مگر یہ تو ناانصافی ہے آپ کی!" وہ جلدی سے بولی۔

"کیوں؟"

"کیونکہ جن عورتوں کی زندگی اس طرح خراب ہو جاتی ہے وہ کیا کریں؟"

"کیوں صاحب، عورتوں کی زندگی خراب ہو جاتی ہے تو مردوں کی نہیں ہوتی؟"

"لوگ تو عورتوں کی ہی زندگی دوبھر کر دیتے ہیں۔"

"مردوں کی نہیں کرتے؟"

"مرد پروا جو نہیں کرتے؟"

"تو عورتوں سے کون کہتا ہے کہ وہ پروا کریں؟ کہہ دیجیے سماج۔"

"اور کیا؟"

"اور یہ سماج بنایا کس نے؟ خود انڈا پھوٹ کر نکل آیا؟"

"نہیں تو!"

"جب ہم نے ہی سماج بنایا ہے تو ہم ہی توڑ سکتے ہیں۔"

"مگر اور بھی مصیبتیں ہیں جو صرف عورتوں کو بھگتنا پڑتی ہیں۔" شمن نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"یعنی بچہ وغیرہ؟"

"جی ہاں۔"

"بھئی واہ، کیا عورت ہیں آپ بھی کہ اپنے عظیم ترین فرض کو مصیبت سمجھتی ہیں۔ جبھی تو لوگ کہتے ہیں عورتوں کو زیادہ نہیں پڑھانا چاہیے۔"

"ارے!" اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے، اور وہ اس کی بدحواسی پر زور زور سے ہنسا۔

"مگر جو بچے ہوں گے وہ . . ."

"حرامی ہوں گے وہ . . ."

"حرامی ہوں گے؟"

"ہاں . . ."

"حد ہے۔ بھئی ہمارے اور آپ کے نظریے بہت مختلف ہیں۔ میں حرام، حلال اور حنیفڈ کا سب ایک ہی چیز سمجھتا ہوں۔ قدرت کے اصول کی پیروی کر کے پیدا ہونے والا جاندار انسان بننے کا حقدار ہے۔"

"مگر میرا مطلب ہے . . . اقتصادی مشکلات۔"

"تو یوں کہیے میاں نہیں بنیک کی کتاب چاہیے۔"

"یوں ہی سمجھ لیجیے۔"

افتخار کو کچھ لاجواب سا دیکھ کر شمن کو دکھ سا ہوا، وہ بولا:

"ٹھیک کہتی ہو، یہی تو وہ سوال ہے جس کا جواب میں برسوں سے تلاش کر رہا ہوں۔ ابھی تو نہیں شاید ہماری تمھاری زندگی میں وہ وقت آجائے کہ اس کا جواب مل جائے۔"

دیر ہو گئی تھی اور وہ واپس کیمپ کی طرف چل دیئے۔

"ہاں ایک بات اور، جو تم سے کہنا بھول ہی گیا۔" اس نے رضائی دینے کے لیے

ہاتھ بڑھایا پھر رک گیا۔ "ہاں تم اپنی یہ رضائی مجھ کو دے سکتی ہو؟"

"رضائی؟"

"ہاں، اس کوٹ کے بدلے میں نہیں بلکہ مفت۔"

"لے لیجیے۔" وہ الٹی احسان مند تھی۔

"سلام!" اس نے مسخرے پن سے ماتھے کو ہاتھ لگائے۔

"ایک بات اور، وہ یہ کہ میں سینی ٹوریم جا رہا ہوں، ڈاکٹروں نے مجھے ڈی بی یا دق ہے۔ ارے . . . . ؟" وہ شمن کی گھبراہٹ پر مسکرایا، "جیسے یہ کوئی نئی بات ہے۔ پرانی شکایت ہے، دو دفعہ بھوالی رہ آیا ہوں۔ مگر مگر اب کے شاید جلدی نہ نکل سکوں۔"

"لیکن آپ اتنے بیمار تو نہیں نظر آتے۔"

"نظر تو نہیں آتا مگر تم جیسی نظروں کو، اندیشہ ہے کہ کہیں میرے جراثیم دوسروں کو لگ نہ جائیں، یہ چھوت کی بیماری ہے۔" اس نے معنی خیز قہقہہ لگایا۔ "ہماری مہربان گورنمنٹ نے "بی" کلاس میں میرے لیے پلنگ دلوا دیا ہے، سارا خرچہ یونیورسٹی اور حکومت کے ذمے۔" وہ ہنستا رہا۔

"جب شارع عام پر ایک گڑھا ہو کر اس میں غلاظت بھر جائے جو ہر آنے جانے والے کے منہ پر اچھلنے لگے تو حکومت کا فرض ہے کہ عام صحت کی خاطر اسے دور کر دے۔ شکر کرو کہ پونا جیل سے بچ گیا ورنہ . . . . اوہ، یہ میں کیا بکنے لگا ہوں؟" چلنے سے پہلے اس نے کہا۔

"ہاں ایک وعدہ کرو۔ یہ رضائی تو میں نے لے لی، اب ایک اور بھی قیمتی وعدہ مانگنا چاہتا ہوں۔"

"کہیے" وہ اب بے صبر ہو چکی تھی

"کہ کبھی میں تمھیں کوئی ہدایت کر دوں تو تم اس پر عمل کرو گی۔ میرا مطلب ہے کہ میری وہ درخواست جس سے تمھارے اوپر آنچ نہ آئے۔"

"میں آنچ سے نہیں ڈرتی۔"

"مجھے معلوم ہے، مگر میں تمہیں اتنے تند ور میں نہیں گھسیٹنا چاہتا، میں پختہ وعدہ نہیں چاہتا۔ سوچ لو، اگر تم سمجھتی ہو کہ۔ ۔ ۔"

"آپ نے میری خاموشی کا غلط اندازہ لگایا۔"

"تو۔ ۔ ۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔"

"تو آؤ۔"

قلم اور کاغذ سے کر افتخار نے اُس کی کلائی پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ جب سارا کیمپ غفلت کی نیند سو رہا تھا دو سر پھرے انسانوں نے سر جوڑ کر چند سطور لکھیں۔

"آنکھیں بند کر دو۔" افتخار نے ٹھوڑی پکڑ کر اس کا منہ دوسری طرف پھیر دیا۔

"ہائے!" سوئی کی نوک شاید انگلی میں گہری اُتر گئی۔

"لکھو۔"

"شمشاد!" شمن نے لرزتے ہوئے انگلیوں سے لکھ دیا۔

"خدا حافظ۔" وہ رضائی میں منہ چھپائے تاریکی میں ڈوب گیا۔

شمن جاگ اُٹھی۔ یہ خواب اُس نے لفظ بہ لفظ دہرا لیا۔ بکھرتے ہوئے حواس سمیٹ کر اس نے پھر زنجیر کو پکڑا۔ متحیر آنکھیں پھاڑے جیسے وہ اب بھی کیمپ کے ہلتے ہوئے پردے کو دیکھ رہی تھی۔ آج، آج اسے کسی نے خوب جھنجھوڑیاں دے کر زندگی کے نئے موڑ پر دھکا دے دیا تھا۔ دیر تک حواس رسیاں تڑا کر بھاگتے رہے مگر دُور دھندلی روشنی میں اسے بہت لمبا راستہ اُٹھتا۔ ۔ ۔ ۔ گرتا نظر آ رہا تھا۔ آج اُس نے اپنے خون سے اپنے دیوتا پر عبودیت کا قشقہ کھینچ دیا تھا۔ اُسے معلوم بھی نہ تھا کہ اُس کا خون اتنا سُرخ ہے: اور یہ نام۔ شمشاد۔ سُرخ پرچم کی طرح شفق بن کر کتنی دور تک پھیلا آرہا تھا۔

اُس نے پھر بیاہی دلہن کی طرف دیکھا: کل وہ بھی اپنے دیوتا کے حضور میں ماتھا ٹیک دے گی۔ نوری دھندلی ہو کر ایک آدمی کی عورت رہ جائے گی۔ غرور اور اطمینان

کی لہروں نے ہلکورے لے کر اُسے سلا دیا۔

(۳۵)

شادی کے درمیان میں اُسے معلوم ہُوا کہ وہ اپنے کتنے ہی بزرگوں سے بڑی ہوگئی ہے۔
اُس نے بڑھیوں کو خوب چھیڑا، یہاں تک کہ وہ چل چل گئیں۔ وہی اعتراض، جنھیں سُنکر وہ رو دیا کرتی تھی، اُس نے توڑ مروڑ کر اُلٹے انھی کے سر مار دیے اور اس مسخرے پن سے کہ معترض کھسیا گئے اور لوگ ہنس دیے۔ خصُوصاً ان بڑھیوں کو تو رلا کر چھوڑا!
جو ہر بات پر:

"ہائے ہے، فوج جو ہمارے زمانے کی لڑکیاں ایسی بے شرم ہوتیں!"

"توبہ ہے، گریباں تو دیکھو، سارا آگا پیچھا کھُلا پڑا ہے۔"

"جب دیکھو جب ہٹی کٹی، جب دیکھو دھما چوکڑی، لڑکیاں ہیں کہ گھوڑے۔"

ان لوگوں کو جلا کر اُسے بڑا مزا آیا۔ نہایت ڈھٹائی سے اُس نے اُن کی ہر بات کی کاٹ شروع کر دی، گویا ساری عمر کی ڈانٹ کا آج پُورا پُورا بدلہ لے کر چھوڑے گی۔
اُسے آج معلوم ہُوا کہ بجائے غصّے کے ان بڈھوں پر رحم آنا چاہیے۔ جوانی کہیں ڈانٹ پھٹکار سے دبتی ہے؟ ہار تو ہمیشہ بڑھاپے کی ہے۔ جب قدرت کسی کو خزاں کے بے رحم ہاتھوں سے مسلنا شروع کر دیتی ہے تو وہ دانت کچکچا کر بہار ہی پر چلن اُتارتا ہے۔ مسرّت بھرے قہقہے ہٹی کٹی، عشق، بدمعاشی اور جوانی بے حیائی نظر آنے لگتی ہے جو ان لڑکیوں کی چکنی نرم باہیں اور سڈول جسم دیکھ دیکھ کر بُڑھیوں کو اپنے کھٹائی جیسے چمرخ جسم پر غصّہ آتا ہے، جی پر چھریاں چل جاتی ہیں، یہی جی سے دعا نکلتی ہے کہ کوئی ان کی طرح جوانی کو خزاں کی چادر میں لپیٹ کر ان کے ساتھ ساتھ دفن کر دے تاکہ وہ ان کی طرح مرجھا کر جلد از جلد مردہ اور بے رنگ ہو جائے۔
محفل میں جتنی لڑکیاں نظر آئیں سب بدمذاق اور چھوٹی، دو چار لڑکے دکھائی دیے وہ ڈرپوک اور دبّو سے۔ مگر پھر بھی اُن میں گھل مل گئی تاکہ ایک دفعہ وہ بھی پڑھی لکھی لڑکیوں

کسے اخلاق سے متاثر ہو جائیں۔ چند لڑکیاں پڑھی لکھی بھی تھیں مگر شمن کی طرح لڑکوں سے گھل مل جانے کا موقع نہ ملا تھا۔ اُن کے لڑکے اب بھی رومانٹک، بدمعاش اور بے رحم والے بنے ہوئے تھے جن کی آوازیں سنکر وہ اصطبل میں بندھی گھوڑیوں کی طرح ہنہنانے لگتیں۔ گو زبان سے بیٹھی لڑکوں کو کوس رہی تھیں مگر جان بوجھ کر ایسی جگہ جا رہی تھیں کہ اُن سے ٹکر ہو جائے۔ اور پھر وہاں سے ایسی اترا کر شرماتی لجاتی بھاگتیں گویا کچھ چھن ہی تو گیا۔ پھر گھنٹوں پسینے میں ڈوبی دل دھڑکا یا کرتیں۔

لڑکے بھی بھاگ دوڑ میں جو کچھ نہ کر جاتے کم تھا۔

"کمبخت کہیں کا، میرا کلیجہ اب تک، کانپ رہا ہے۔" وہ اس پُرلذت ٹکر کی گدگدیاں یاد کر کے دوسری ٹکر کی تاک میں لرزا کرتیں۔ اس کے علاوہ کئی لڑکیاں اپنی ہونے والی ساس نندوں سے وہ شاندار عشق چلا رہی تھیں کہ کیا کہنے۔ وہ اُن سے ہونے والے شوہر کا تصور وابستہ کر لیتیں اور اُن سے ایسے شرماتیں جیسے نئی دلہن دولہا سے شرماتی ہے۔ بھلا اس روحانی عیاشی سے کون روک سکتا ہے؟

کہاں یہ رنگین فضا اور کہاں کالج کے کھلے میدان میں پروفیسروں کے زیرِ سایہ ایک دوسرے سے مصنوعی ہنسی طاری کر کے پوچھنا، "آپ کا مزاج کیسا ہے؟" گویا ایک لڑکی کو ایک لڑکے کے مزاج کی تو پڑی رہتی ہے۔

شمن کو محسوس ہوا کہ یہ آزادی ہی تو قید ہے۔ ٹھیک کہتے ہیں یہ بوسیدہ لوگ کہ عورت کو پردے میں رہنا چاہیے۔ سچ تو ہے، کتنے مزے سے پردے میں آنکھ مچولی کھیلی جا سکتی ہے جی چاہا جس سے چھپ گئے اور جی چاہا جسے دکھا دیا۔ بدصورت تو خاص فائدے میں رہتی ہوں گی، جسے ہلکی سی جھلک دکھا دی وہی حسین سمجھ بیٹھا۔ یہ تھوڑی کہ مقابل بیٹھے ہیں اور ہر عیب سامنے رکھا دل دکھا رہا ہے۔

جب ہی تو پچھلے زمانے کا ادب اٹھا کر دیکھو ہر عورت، حسنِ مجسم رکھی ہے۔ عورت حسینہ تھی یا دوشیزہ، اور اب اُسے اُستانی، ڈاکٹرنی، نرس، فقیرنی، بھنگن یا لڑکی کہا جاتا ہے۔ بے پردے سے نکل کر حسینہ سے صرف عورت کیوں رہ گئی؟ وہ اس کے

سارے قتل و غارت کے حربے کیا ہوتے ہیں؟ تیرِ نظر کند اور ابروؤں کی دھار کُند، اَصل بات یہ ہے کہ پردے سے نکل آنے پر غازے، سرمے، مسّی کا راز کھل گیا، سب کو معلوم ہو گیا کہ ابرو نوچ کر کمانیں بنائی گئی ہیں اور آنکھوں سے بجلیاں مسکارہ کی مدد سے گرائی جا رہی ہیں، ہونٹ "ٹنجی" کے صدقے برگِ گل بنے ہوئے ہیں اور گالوں پر روژ کی شفق کھیل رہی ہے۔ گو ویسے ہندوستان میں جتنی حسن کی قلت پہلے تھی اب بھی ہے مگر یہ پردہ ہٹ جانے سے تو نظر کا پردہ ہی اٹھ گیا، عورت بڑے نقصان میں رہی۔

دولہا شام کو گھر میں آیا تو صنفِ نازک بھوکی مکھیوں کی طرح جٹ گئی۔ اچھی بھلی پردے والیاں پل بھر کو ٹھٹکیں پھر وہ بھی مست ہو گئیں۔ مرد ہیں، خواہ وہ دولہا ہی کیوں نہ بنا ہوا ہو، کتنی جاذبیت ہوتی ہے کہ اچھے بھلے دماغ کھو بیٹھتے ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ ساتھ ساتھ دو چار دولہا کے شہ بالے بھی رنگ آئے۔ پہلے تو دو چار ٹوٹی پھوٹی ناکارہ بڑھیوں نے غل مچایا مگر پالا جوان ہی مارے گئے۔ یہ طے ہوا کہ شہ بالے پھر بیٹھ جائیں بشرطیکہ اپنی رشتہ داروں کے دوپٹوں میں منہ چھپانے کا پختہ وعدہ کریں۔ ان کی دوپٹوں میں سے جھلکتی شریر آنکھوں کو دیکھ کر شمن کو بے اختیار بلقیس کی سالگرہ کا دن یاد آ گیا جب کیرم کھیلنے میں رشید کو رومال کا گھونگٹ نکال کر کھیل میں شریک ہونے کی اجازت مل گئی تھی۔

"یہ بھی دولہا کے دُم چھلے کیوں آئے ہیں؟" شمن نے مصنوعی غصے سے پوچھا تو اُن میں سے ایک کبوتر باز دل جیسی آنکھوں والے نے کچھ دانتوں ہی دانتوں میں جواب دیا جس پر اُس کے ساتھی نے کہنی ماری۔

"پاگل ہے بیچارا!" ایک نے شمن سے سفارش کی۔

"پاگل نہیں دیوانہ کہو۔" اُس نے پھر کبوتر باز جیسی آنکھیں چلائیں اور پھر کچھ بڑبڑایا جس پر اُس کے ساتھی نے چپ رہنے کی رائے دی۔

جتنی دیر دولہا دلہن سے آرسی مصحف کی کشتی لڑتا رہا لڑکے دوسری لڑکیوں کے چٹکیاں بھرنے کی تاک میں لگے رہے۔ معلوم ہوتا تھا ایک نہیں چھ رات آرسی مصحف

ہو رہے تھے ۔ لڑکیاں چڑھ چڑھ کر باتیں سنا رہی تھیں مگر ہٹلے کا نام زبیجی تھیں۔ جبی ہوئی مقابلہ کر رہی تھیں۔

رخصت ہوتے وقت نوری کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر روئی، شمن جل گئی۔

"بن کیوں رہی ہو، مری تو جاتی تھیں شادی کے لیے ۔"

"واہ !" نوری کھسیا کر تھو سنبھالنے لگی۔

"یا اس لیے خوشی کے مارے رو رہی ہو کہ اتنی مشکلوں سے شادی ہوئی ۔"

نوری چپ ہو گئی اُس کے آنسو بھی نہ جانے کیسے خشک ہو گئے۔

"کوئی زبردستی ہو رہی ہے تمھاری شادی، کیوں کر لی؟ اب طلاق لے لو!" شمو نے اُسے خاموش دیکھ کر اور جلے کٹے جملے کہے۔

اُسے نوری بالکل گائے بیل کی طرح لگ رہی تھی ۔ ایک دن بازار میں وہ اپنی جوانی کا سودا کر کے ایک مرد کے ساتھ جا رہی تھی ، بیوقوفوں کی طرح نہیں ، پکا کاغذ لکھا کر کہ اگر وہ بعد میں تڑپے تو اور پھندا اُس کے گلے میں تنگ ہوتا جائے ، اور وہ چند بھی ڈھول تاشے سے اُسے خرید کر لے جا رہا تھا ۔ آخر فرق ہی کیا ہے اس سودے میں اور آئے دن جمعہ جاوڑی میں خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے ۔ وہ چھوٹا موٹا بیوپار ہے جیسے کچالو، پکوڑیوں کی چاٹ اور یہ لمبا ٹھیکہ ہے ۔ جب تک فریق خیانت نہ کرے بیوپار چلتا رہتا ہے ورنہ سودا پھٹ !

مگر جب دولہا نوری کو لے کر جانے لگا تو شمن کے دل کے کسی نامعلوم کونے میں ایک عجیب سا شبہ پیدا ہوا، جیسے نوری فروخت نہیں کی گئی بلکہ یہ جو اُسے کلیجے سے لگائے لیے جا رہا ہے اپنی زندگی کے پیروں میں زنجیریں ڈالنے لیے جا رہا ہے ۔ یہی نوری یہ کم عمر الھڑ لڑکی ۔ اس کی ہستی میں ایسے گہرے پنجے گاڑے گی کہ وہ دنیا کو چھوڑ چھاڑ اُسی کے ہاتھ میں لگام دے کر اُسی کے چلائے راستے پر چلتا چلا جائے گا ۔ حیف ہے کہ یہ مرد عورت کو پیر کی جوتی، ناقص العقل اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں مگر جب یہ جوتی اُن کے سر پڑتی ہے تو احساسِ خودی بھی فنا ہو چکتا ہے ۔ اُسے سارے مرد مظلوم

نظر آنے لگے اور ساری سونے روپے میں لدی ہوئی بیویاں ظالم، جو اُن کی کمائی پر بالکل اسی طرح قابض تھیں جیسے خون چوسنے والے سرمایہ دار غریبوں کی مشقّت پر۔ وہ اپنے جسم کی قیمت لیتی تھیں ــــ بجائے درجنوں کے صرف ایک سے۔

پھر یہ مرد عورت کو کمزور کیوں کہتے ہیں؟ شاید اس طرح خود اُن کی کمزوری آڑ میں چھپ جاتی ہے۔ ظالم کبھی پکار پکار کر اپنے ظلم کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتا، بزدل ہی شیر کی طرح گرج کر دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ مگر عورت؟ عورت اس حاکم کی طرح ہے جو پرجا کا چاکر، بن کر انھیں اُلّو بناتی ہے۔ اُس کی چالیں کس قدر خطرناک اور پُراسرار ہیں! بجائے شرمندگی کے اُسے اپنی نسوانیت ایک بلند چیز نظر آنے لگی۔

مراثنیں گا رہی تھیں، اُن کی آواز میں رقّت تھی،

ہم تو بابل تورے کھونٹے کی گیاں
جدھر ہانکو ہنک جائیں!

"کیا کہنے ہیں اس معصومیت کے! گویا گائیں، بیلوں سے زیادہ بھولی ہوتی ہیں۔" شمن نے پاس بیٹھی ہوئی ایک لڑکی سے کہا؛ "اور کیا بہن، گائے بیچاری تو ہوتی ہی سیدھی ہے۔"

کیا گائے سینگ نہیں مارتی؟ ویسے بیل بیچارا زندگی میں زیادہ اُلّو بنتا ہے۔ یہ کولہو کا بیل غریب کس کے سینے میں سینگ مارنے جاتا ہے؟ ہل کے بیل کو کب فرصت ملتی ہے کہ لوگوں سے مذاق کرنے جائے! لیکن یہ گائیں! سوائے گھاس چبانے اور دودھ دینے کے اور کیا کام کرتی ہیں؟ اُن کی بلا سے دودھ بچھڑا پیے نہ پیا آدمی نے کھیر بنا کر کھا لی۔ نہ ہاتھ ہلانے کی ضرورت نہ پیر اور پھر بھی انسان گائے کی پوجا کرتا ہے اور بیل کو پوچھتا بھی نہیں۔

اُس کا اب بھی جی جل گیا۔ مراثنیں بیچارے دولہا کا مذاق اڑا رہی تھیں، جی چاہا جا کر ان کا منہ مسل دے۔ کمبختو، بیلوں میں بھی جان ہے۔

(۳۱)

شادی سے لوٹی تو ایسا معلوم ہوا دو عزیزوں کو دفن کر آئی۔ ایک تو نوری اور دوسرا افتخار۔ نوری کو دوسرے دن سے سوائے دولہا کی شرارتوں کے اور کسی جھگڑے میں دلچسپی نہ رہی، سارا دن بیٹھی وہ ہمجولیوں کو سرگوشیوں میں افسانے سنا سنا کر بے حال کرتی رہی۔ پتہ نہیں ان ہمجولیوں کو سب کچھ معلوم ہونے کے بعد بھی کس چیز کی تلاش تھی یا شاید یہ وہی جذبہ تھا جو لوگوں کو قصّے کہانیوں میں جنسی ذائقے کا متلاشی بنا دیتا ہے۔

اور افتخار؟ وہ الہ آباد سے سیدھا بھوالی چلا گیا۔ انچارج پروفیسر نے تذکرے کے طور پر بتا دیا کہ انھیں بڑا افسوس ہے کہ افتخار اُن کے ساتھ نہیں جا سکتا بلکہ وہ اپنے پرانے مرض کے علاج کے لیے سیدھا سینی ٹوریم چلا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے چند دعائیہ جملے بھی کہے مگر وہ صاف ڈھکوسلا معلوم ہوئے۔ وہ خوب جانتی تھی کہ خواہ اللہ کتنا بھی افتخار پر مہربان ہو، اگر دنیا نہ چاہے تو وہ کبھی بھی بھوالی سے صحت پا کر نہیں نکل سکتا، گو لوگ اس کی موت کا سارا الزام ملک الموت اور نوشتۂ تقدیر کے سر تھوپ دیں گے۔

افتخار کے بعد سیتل خود بخود یونیورسٹی کی باگ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی پشت پر پروفیسروں اور پرنسپل کی شفقت بھی تو تھی۔ نہ جانے کن ہتھکنڈوں کی مدد سے اُسے پریزیڈنٹ بنا دیا گیا۔ ایلما کچھ ششدر کچھ جھلائی سی بے تکی باتیں کرنے لگی۔ اس نے سیتل کی مخالفت نہ کی نہ ہی یونین کے کسی جھگڑے میں دلچسپی لی۔ نہ جانے وہ کس چیز سے کچھ خوفزدہ سی نظر آتی تھی۔ وہ اس کی بزرگی میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کسی نامعلوم دھمکی سے خوفزدہ ہو جاتیں تو وہ بالکل معصوم اور بھولی معلوم ہونے لگتیں، اُس کی ہنسی

میں جھینپ آجاتی اور دانت مصنوعی چینی کے کھٹل ٹکڑے سے بن جاتے ہیں۔

سیتیل کے عروج نے بجائے مرعوب کرنے کے اُسے ڈرا دیا تھا مگر یونین کی ساری مردنی غائب ہو کر نئی جان پڑ گئی۔ ترقی پسند گروہ میں ممبروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ بڑے جوش و خروش سے میٹنگ پر میٹنگ ہونے لگی نئے قواعد بنے، کئی شاخیں بنائی گئیں۔ ڈراما سیکشن، آرٹ سیکشن اور گاؤں سدھار کی سکیم بنی اور ہنگامے شروع ہو گئے۔

چند روز تو شمن کچھ غیر مطمئن سی رہی، سمجھ میں آیا کہ ایک دم سے افتخار کی جگہ سیتیل کو دیکھنے کی کیسے عادت ڈال لے۔ کالج اور یونیورسٹی کی زندگی بھی پانی کا بلبلہ ہوتی ہے جو چند لمحے تیرتا رہتا ہے تو ہزاروں رنگینیاں اس کے خول پر منعکس رہتی ہیں مگر جونہی پھوٹا سب کچھ غائب۔ وہی افتخار جس کا وجود یونیورسٹی میں قطبی ستارے کی سی حیثیت رکھتا تھا آج آسمان سے ٹوٹ کر نہ جانے گمنامی کے کس غار میں جا گرا تھا۔ در و دیوار کو اس کی کمی بھی تو محسوس نہ ہوتی تھی، گویا خاک کا ایک حقیر ذرہ تھا جسے آندھی نے اٹھا کر دور پھینک دیا تو کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ دو چار دن تو غلطی سے لوگوں نے بجائے سیتیل کے افتخار کا نام لیا مگر پھر بہت جلد زبانیں نئے بول کی عادی ہو گئیں اور سیتیل کی خوش بیانی، حسین اور لمبے چوڑے جسم نے افتخار کی یاد کو دلوں سے مار بھگایا۔ سلیما سیکرٹری رہی لیکن شمن کو خزانچی کی کرسی سنبھالنا پڑی۔ نئے عہدے کی دہشت نے اسے کچھ ایسا بدحواس کر دیا کہ سوچے سمجھے بغیر وہ ترقی پسند گروپ کی پُرجوش رکن بن گئی۔

ہیرا جب تک کان کے گمنام اندھیرے میں رہتا ہے بیکار کنکری بنا پڑا رہتا ہے، مشک کو جب تک گھسا نہ جائے تو ذاسد مادے کی ایک گولی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ سیتیل کے سوا کسی نے بھی تو نہ پرکھا کہ شمن کی اس پریشان اور ڈری ہوئی شخصیت کی آڑ میں استقلال اور بغاوت کا لاوا دبا پڑا ہے، اس خاموش چٹیل میدان کے سپاٹ سینے میں آگ کی تندی چھپی سو رہی ہے، صرف جگانے کی دیر ہے اور پھر وہ ساری

اُونگھتی ہوئی طاقتیں پورے جوش سے ابل پڑیں گی۔ شمن کو اپنی ہستی کے اس انوکھے ٹکڑے سے کے وجود کا علم بھی نہ تھا، وہ اس نئی شمشاد کے تخیل کو پہلے تو واہمہ سمجھی مگر پھر اس نے اسے شخصی طور پر دیکھ لیا، وہ خود اس کی جگمگاتی ہوئی لپک سے آنکھوں میں چکاچوند سی محسوس کرنے لگی۔ دور، بہت بلندی پر اُس نے اس نئی چیز کو کھڑے دیکھا۔ بادِ مخالف کے ضدّی تھپیڑوں کے سامنے دشمنوں کی فوج سے مقابلہ کرتی ہوئی یہ مقدّس طاقت اب تک کہاں پوشیدہ تھی: وہ پُرانی شمن اُس کے سامنے کس قدر بودی اور حقیر معلوم ہو رہی تھی!

"کوئی چیز ہے جو عام لوگوں کو چھوڑ کر صرف اسے بخشی گئی ہے!" اور بہت بعد اس نے اپنے آپ میں ایک پراسرار کشش، ایک خاموش دبدبہ اور کھنچی ہوئی شان پائی۔ سیتل کی رائے سے اس نے اس نئی شخصیت کو، جس کا انکشاف اسے بھونچکا چھوڑ گیا تھا، سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کی۔ ادب اور فلسفے کا مطالعہ کرنا شروع کیا، شاعری سے دلچسپی کی اور بہت تیزی سے وہ پرانا خول چھلکے کی طرح چٹخ گیا اور اندر سے ٹھوس مینگ نکل آئی۔ اس بھربھرے چھلکے کو اُس نے مسل کر دور پھینک دیا اور مینگ کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی، مگر جتنا جتنا وہ اُسے پہچانتی گئی معمہ اور پیچیدہ اور خمدار ہوتا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا نئی شمن اس سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہے۔ جونہی وہ اسے چھونا چاہتی وہ ہوا میں تحلیل ہو کر پرے چلی جاتی۔ کبھی تو ایسا معلوم ہوتا اس نے اسے پکڑ ہی لیا ہے مگر قبل اس کے وہ ٹھیک سے اُس کا ناک نقشہ پہچان سکے وہ ہاتھ چھڑا کر شربلہ مار مار جاتی۔ پھر وہ دونے شوق سے اُس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیتی مگر بعض وقت اس دوڑ میں وہ کسی ایسے بھیانک اور سنسان گوشے میں پہنچ جاتی جہاں وہ خود اکیلی رہ جاتی اور وہ تخیل کی شمن واہمہ بن کر گھل جاتی۔ اس بنجر اور غیر مانوس فضا سے اُس پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور وہ اُلٹے پیروں بھاگ آتی ۔۔ جیسے غلط راستے پڑ جانے سے انسان پریشان ہو جاتا ہے اسی طرح وہ بھی وہاں سے کبیدہ خاطر لوٹ آتی

شمن سیتل کو کیا سمجھی تھی اور وہ کیا نکلا! گوشت پوست کے تن اور پہاڑ کی تہوں میں ایک فلسفی شاعر پوشیدہ تھا جس کا دل انسانیت سے لبریز اور محبت میں ڈوبا ہوا تھا،

جس کی اندرونی زندگی قوم اور ملک کے قدموں پر نچھاور ہونے کے لیے بیقرار تھی۔ ظاہر میں وہ دنیادار اور کھیل کود کا شوقین نظر آتا تھا مگر کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ان مسکراہٹوں میں کتنے آنسو جذب تھے، ان قہقہوں میں الجھی ہوئی آہیں صرف سننے والے کانوں کو ہی سنائی دے سکتی تھیں۔ وہ خوف جو شمن ہمیشہ اس کے وجود سے محسوس کیا کرتی تھی قطعی بے بنیاد ثابت ہوا۔ وہ صرف دیکھنے میں بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔ یوں تو کتنے ہی سانپ دیکھنے میں زہریلے معلوم ہوتے ہیں مگر بچے سے بھی زیادہ بے ضرر ہوتے ہیں۔

وہ بدمذاق بھی نہ تھا۔ بعض وقت تو لوگ اس کی باتوں پر ہنستے ہنستے بے تاب ہو جاتے تھے۔ پریزیڈنٹ ہونے کی وجہ سے اسے ہر ایک کو خوش رکھنا پڑتا تھا۔ مس بوگا جو کھلے بندوں اس پر الو کے پٹھے کا عشق برسایا کرتی تھیں اس کے ساتھ بڑی تندہی سے کام کرتیں۔ ہر سنجیدہ اور غیر سنجیدہ مجمعے میں ان کی موجودگی لازمی تھی۔ جب تک موٹی اور مشکل باتیں ہوتی رہتیں وہ فرمانبردار بچے کی طرح خاموش بیٹھی سنا کرتیں۔ نہایت انہماک سے وہ مقرر کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو سننے کے بجائے دیکھنے کی کوشش کرتیں، ذرا سی بھی آہٹ ہوتی تو پریشان ہو کر شش کرنے لگتیں۔ اگر سخت ضرورت سے اٹھنا ہوتا تو اپنی ننھی سی گرگابی کے نازک پنجوں پر لنگڑاتے کوے کی طرح بغیر آواز کیے پھدکنے کی کوشش کرتیں، کوئی بات کہنا ہوتی تو بالکل کان کے سوراخ سے منہ چپکا کر بھی ہوئی پھس پھس دیتیں۔ لیکن ان کی یہ ساری احتیاطیں حاضرین جلسہ کی توجہ کو اور بھی منتشر کرتیں۔ وہ مقرر کے مزاحیہ جملے کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتیں اور جونہی موقع ملتا سب سے پہلے تالیاں اور قہقہہ شروع کر کے سب سے آخر میں بند کرتیں۔ بعض وقت کوئی دلچسپ بات سنائی نہ دیتی یا سمجھ میں نہ آتی تو بچوں کی طرح پریشان ہو کر "اوہ اوہ" کر کے پاس بیٹھنے والوں سے اس کا مطلب پوچھنے لگتیں۔ اس طرح ان کا قہقہہ عموماً ذرا دیر سے چھوٹ پاتا۔ لیکن انہیں بڑے پیار سے جب ٹوکتا تو کم عمر بچیوں کی طرح زبان نکال کر شرمانے لگتیں۔ یونیورسٹی بھر میں بہت سے مذاقیہ لطیفے انہی کی شخصیت سے ایجاد کیے گئے تھے اور ہر چھوٹا بڑا ان سے بے تکلف تھا۔ کچھ دنوں سے وہ فرسٹ ایئر کے نئے لڑکوں

چرط مقرر کرا دی گئی تھیں۔ کتنی ہی فاختائیں مس لوگا سے وابستہ کر کے اڑائی جاتیں۔ کبھی کبھی وہ بڑا مان جاتیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔ روتے میں وہ بڑی تیز انگریزی میں خود اپنی حالت پر رحم کھاتیں اور دوسروں کو شرمندہ ہونے کی رائے دیتیں۔

کچھ دن سے، یعنی انتخاب کے زوال اور سیتل کے عروج کے بعد سے وہ عوام کی نظروں میں کچھ گر گئی تھیں۔ انتخاب کی اور بات تھی، پر سیتل تو ان کا اپنا آدمی تھا اُسے تو اُن کی عزت افزائی کرنا لازمی تھی۔ اُس کے انتخاب میں سب سے بڑی مدد مس لوگا کی تھی۔ ووٹ جمع کرتے وقت وہ ہر ایک کی جان کو آ گئی تھیں۔ اپنے خرچ سے پمفلٹ چھپوا کر بانٹے اور جب اُسے فتح نصیب ہوئی تو کسی کو خاص حیرت نہ ہوئی پر وہ خوشی کے مارے پاگل ہو گئیں۔ لوگ چھیڑنے کو مٹھائی مانگنے لگے تو انہوں نے سچ مچ ہی کھلا دی۔

ترقی پسند گروہ اب اور شدت سے اشتراکی رنگ میں رنگتا گیا۔ ممبروں کی تعداد بڑھ گئی۔ مس لوگا نے ایک دم گجراتی اطلس چھوڑ کر کھدر پہننا شروع کر دیا اور بچاری ہر وقت کھدر اور اپنی پیٹھ پر نکلے ہوئے گرمی دانوں کو انگریزی کی گالیاں دیا کرتیں۔ دیکھنے میں اُن کا جسم بے مصرف گوشت کا لوتھڑا تھا مگر ذرا سی ٹھیس سے چھل جاتا اور فرصت کے لمحات عموماً ہر ایک کو گھاؤ اور پھنسیاں دکھانے میں صرف کرتیں۔ نیز ہزاروں قسم کے پاؤڈر اور مرہموں کے نام انھیں یاد ہو گئے تھے۔ اُن کا جسم تو ایک ہی تھا مگر ہندوستان کے خطوں کی طرح زمین اور آب و ہوا مختلف تھی۔ گر ایک مقام کی پھنسی زمبک سے اچھی ہوتی تو دوسرے حصہ کی کیوٹی کیورہ سے۔ اگر پیٹھ کے دانے ڈسٹنگ پاؤڈر سے سوکھتے تو بغلوں میں بورک چھڑکنے سے شفا ہوتی۔ جتنا وہ دیسی مال کی سرپرستی میں بچا لیتیں اتنا ہی بدیسی دواؤں پر خرچ ہو جاتا۔ بعض لوگوں کی رائے سے انھوں نے نیم کی چھال اور ہندوستانی لیپ وغیرہ استعمال کیے مگر اُن سے اور بھی بدحواس ہونا پڑا۔ اُن کے برخلاف شمشی، ایک نئی لڑکی، ہر چیز دیسی استعمال کرتی تھی، یہاں تک کہ اُس کے برتن خالص گوالیار چینی کے اور کمرے کا پورا فرنیچر کشمیر اور میسور کی صنعت گری کا نمونہ تھا۔ مرشد آباد کی سلک، میسور کی جارجٹ اور ملتا

کی ساڑھیاں پہنتی۔ اُن کا سارا خاندان لیڈروں کا خاندان کہلاتا تھا۔ اس کے تایا جی بڑے پکے قوم پرست تھے اور ہر قومی جلسے میں اُسے ساتھ لے جاتے تھے جہاں وہ مائیکروفون کے سامنے بندے ماترم گایا کرتی تھی۔ اُس کی شادی ہو گئی تھی اور میاں انگلینڈ گیا ہوا تھا۔ باوجود دیس بھگت ہونے کے فیشن گھر میں کافی تھا۔ انگریزی زبان مادری بنی ہوئی تھی، 'ماما'، 'پاپا' اور 'آنٹی'، کا رواج تھا۔ سب لڑکیاں فراک پہنتی تھیں اور بال کٹے ہوئے تھے مگر ایک تار بھی بدیسی نہیں استعمال ہوتا تھا۔ گو روحیں یورپ زدہ ہو چکی تھیں۔ مگر جسم دیسی تھے۔

اُس کے خاندان میں کوئی سرکاری نوکری نہیں کرتا تھا۔ تایا جی نے تو خطاب بھی لوٹا دیا تھا اور کئی بار جیل میں گئے تھے۔ بمبئی میں روئی کا بیوپار ہوتا تھا جس میں خاندان بھر کھپتا چلا جاتا تھا، پھر غلامی کی نوکری کون کرتا؟ دوسرے بیوپار میں بھارت کے مال کی اُنتی بھی ہوتی ہے، گو بعض بد مذاقوں کا خیال تھا کہ لالہ جی کو بھارت کی اُنتی سے زیادہ اپنے بیوپار کی اُنتی کی فکر تھی۔ کھدر کے پرچار سے بھارت ورش کے بیوپاری بیشک وزنی ہو گئے مگر مزدور ویسے ہی ننگے بھوکے رہے۔ وہ پہلے بھی موٹا جوٹا پہنتے تھے اور اب بھی وہی ملتا رہا۔ ہاں ذرا جاپان کے سستے مال نے ریشم پہنوا دیا، غریب بھی اطلس کے مس سے واقف ہو گئے، بھنگی چمار بھی جاپانی کھلونوں سے کھیل لیے چینی کے سیٹ اور شیشے کے گلاس چپراسیوں کی لڑکیوں تک کو جہیز میں ملنے لگے۔ مگر یہ جاپانی مال کب تک؟

ترقی پسند گروہ کی ہر میٹنگ زیادہ دلچسپ ہوتی گئی۔ جتنے ممبر تھے سب ہی ہتھیلی پر جان رکھے 'کام' کو تیار رہتے۔ زیادہ تر ایسے لوگوں کی تعداد تھی جو دل شکستہ اور تقدیر کے ٹھکرائے ہوئے تھے اور زندگی کی تلخیوں سے دو چار ہو چکے تھے۔ احمد کو ایک عیسائی لڑکی سے عشق ہو چکا تھا جو انتہائی بے رحمی سے منہ موڑ کر ایک پروفیسر کی ہو رہی۔ رحمان اپنی چچا زاد بہن کے عشق میں گرفتار تھا جس کے لالچی باپ نے اُسے صرف اس لیے ٹھکرا دیا تھا کہ وہ سرکاری نوکری نہ حاصل کر سکا تھا اور وطن پرستی کا عزم کر چکا تھا۔ تین سال وہ متواتر مختلف مقابلوں میں شریک ہوا لیکن صرف خاندان والوں کی زبردستی

سے، قوم کی خدمت سے اُسے اتنی فرصت نہ ملی جو اِن لغویات کی طرف توجہ دیتا! انور نار۔
کالج کی ایک توبہ شکن لڑکی سے محبت کرتا تھا جس کی خمیدہ زلفوں اور لچکتی کمر نے اُسے
شاعر بنا دیا تھا۔ اُمید کی جاتی تھی کہ بہت جلد وہ اپنے زمانے کا سب سے زیادہ ترقی پسند
شاعر ہو جائے گا۔ اس کی شاعری بالکل انوکھی تھی؛ وہ پرانی روش سے ہٹ کر نئے راستوں
پر گامزن تھی۔ اُس کی رومانی ہیروئن زہرِ عشق، گل بکاؤلی وغیرہ کی فرسودہ محبوبہ سے
بالکل مختلف ایک کالج کی روشن خیال حسینہ تھی جو بجائے ظلم و ستم ڈھانے کے خود
اس پر پروانہ وار فدا تھی مگر ظالم سماج کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک آئی۔ سی۔ ایس
کے پلے بندھ چکی تھی۔ لیکن انور کی شاعری پیش گوئی کرتی تھی کہ انقلاب آئے گا، جب
یہ ساری پابندیاں ٹوٹ جائیں گی، سماج کو میٹ کر رکھ دیا جائے گا، شفق خون برسائے
گی اور زمین و آسمان سرخ ہو جائیں گے اور سرخ آندھیاں چلیں گی۔ پھر اس سرخی کے
شعلوں میں ساری بلائیں بھسم ہو جائیں گی، آزادی کا قرمزی جھنڈا لہرائے گا، مزدور کا
راج ہو گا۔ اس وقت وہ اس لڑکی سے جی کھول کر محبت کرے گا اور رات کی مشکیں چوٹی
کو حسین راتوں کی خاموشیوں میں کھول کر فضا میں خوشبو پھیلا دے گا۔ پھر کیا ہو گا؟ پھر
پتہ نہیں کیا ہو گا! اس کے علاوہ آنند ہمنا جس پر شہر کی کئی طوائفیں عاشق تھیں، وہ
ان کے یہاں مفت جاتا تھا۔ شراب ہر فنکار کے لیے ضروری ہوتی ہے، ورنہ وہ ایک
سچا فنکار تھا۔ اُس نے روسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ کچھ سال تراجم چھپوانے کے
بعد وہ اب طبعزاد کہانیاں لکھنے لگا تھا اور آثار کہتے تھے کہ بہت جلد وہ بلند مرتبہ
مصنفوں کی صف میں آگے آگے نظر آئے گا۔ برکت علی عجب جنونی تھا۔ وہ تاریخ
میں ایم۔ اے کر رہا تھا مگر اس کا زیادہ وقت جنسیات کے متعلق مواد فراہم کرنے
میں صرف ہوتا تھا۔ جیمس جوائس اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس تو اُس کے روحانی دیوتا
تھے جن کا وہ ہر قدم پر حوالہ دیتا اور جنسی آزادی کو سوراج سے بھی زیادہ اہم سمجھنے
لگا تھا۔ اس کی زبان میں بڑی روانی تھی اور عام طور پر لوگ قائل ہو جایا کرتے تھے
شمن کو اس سے کوئی ذاتی عناد نہ تھا اور اتر کے ادیبوں کی بھی کچھ شدت سے

مخالف نہ تھی پھر بھی پتہ نہیں کیوں جب اکیلے میں مختلف نفسیاتی نکات کی تشریح کرتا تو پسینے چھوٹ جاتے:

"انسان جانور ہے بھی گیا گزرا ہو گیا کہ جب تک اُسے مذہبًا، رسمًا اور قانونًا سارٹیفکیٹ نہ دیا جائے محبت ہی نہ کرے۔" لفظ محبت وہ بہت ہی پُر معنی طور پر استعمال کرتا تھا۔ وہ ایسے پھسپھسے عشق کا قائل نہ تھا جس میں ٹھنڈی سانسیں اور شب بیداری شامل ہوتی ہے۔ اُسے تو بس خالص عشق پسند تھا۔ اُسے طوائفوں سے بڑی شدت کی ہمدردی تھی۔ اُن کی زندگی اور رہن سہن، اُن کی مالی مشکلات، گندے مکانات، مختلف انواع و اقسام کی بیماریوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں سناتا تھا کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ کبھی تو شمن کو اس سے گھن آنے لگتی کہ کمبخت نہ جانے کن غلاظتوں میں غوطے مار کر آتا ہے اور کبھی اُسے طوائفوں پر غصہ آتا کہ مردیاں کیوں اتنی گندی ہوتی ہیں، کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں کرتیں۔ ارے بھئی چکی پیسیں، کپڑے سیئیں اور عزت سے رہیں۔ مگر اُسے خوب معلوم تھا کہ یہ طوائفیں اتنی الو نہیں، اگر چکی پیسنا اتنا آسان کام ہوتا تو وہ کبھی کا شروع کر دیتیں۔

"اس کا علاج؟" وہ کبھی ارکت سے پوچھتی۔

"سرمایہ داری کا خاتمہ!"

"وہ کس طرح؟"

"جس طرح روس میں ہوا!" اور وہ دونوں گھنٹوں روس کے انقلاب کی پرچھائیاں ناپا کرتے۔ غرض جو کوئی بھی اس ترقی پسند گروہ میں تھا پہنچا ہوا تھا۔ عشق و محبت، بیوفائی اور جفا کاری، مفلسی اور بے کاری نے سب کو مجذوب بنا دیا تھا۔

شمن ایک دم جو کالج سے لوٹی تو الیما کو پلنگ پر پیر لٹکائے بیٹھے پایا۔

"ارے تم دیر سے بیٹھی ہو؟" اس نے کچھ خجل ہو کر پوچھا اور پاس بیٹھ گئی۔ اُس کا ضمیر الیما کو خاموش دیکھ کر ملامت کرنے لگا۔ انتخاب کے جانے کے بعد ویسے کیسے دونوں میں عہد و پیمان ہوئے تھے مگر اس نئے انتخاب کے اثر دونوں کے درمیان فاصلہ

پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا اور اب تو یہ حال تھا کہ یہ سڑک کے اس کنارے پر تو وہ دوسرے پر کبھی بھولے بھٹکے نگاہیں ملیں بھی تو جلدی سے بچالیں گویا دیکھا ہی نہیں، یونہی وہم ہوا تھا مگر آج نہ جانے کیوں شمن نے اس کے گرد باہیں لپیٹ کر چمٹا لیا اور دیر تک اس کے چہرے کو تکتی رہی۔

یہ الیما کو کیا ہو گیا تھا؟ وہ الیما ہی نہ تھی۔ آنکھیں اور زیادہ بوڑھی ہو گئی تھیں جیسے ان پر سیلولائڈ کا غلاف چڑھا دیا گیا ہو، گالوں کی ہڈیاں زیادہ ابھر آئی تھیں اور بال پہلے سے بھی زیادہ گھنیرے معلوم ہو رہے تھے۔ بجائے جھنجھلاتے ہوئے قہقہے لگانے کے وہ خاموش تلخی سے مسکرائے جا رہی تھی جو بجائے دلی حالات کی آئینہ داری کے بالکل ایک مصنوعی خول کی طرح منڈھی ہوئی تھی۔ اس مسکراہٹ میں نہ کڑواہٹ تھی نہ مٹھاس، اور نہ کوئی طنز پوشیدہ تھی۔

پھر وہ باتیں کرنے لگیں۔ دیر تک ایک دوسرے کے قریب لیٹی وہ وقت سے غافل بکواس کرتی رہیں: افسانے، شعر، کالج کی باتیں، جلسوں کی باتیں اور نہ جانے کیا کیا۔

”بعض وقت ہمارا ہر اپنا سٹانڈ ہی پڑتا ہے۔“ الیما ایک دم سے بولی۔

”کیا کہا تم نے؟“ شمن نے اس کے قریب جھک کر پوچھا۔

”میں نے کہا، ہم کیا سوچتے ہیں اور کیا کرتے ہیں!“

”کیا مطلب؟“

”شمن؟“

”ہاں!“

”کیا میں کچھ بدل گئی ہوں؟“

”کیوں! نہیں تو!“ شمن نے الیما کو سر سے پیر تک دیکھا، ایک دھوکا سا ہوا مگر مٹ گیا۔

”مگر ڈاکٹروں کا خیال ہے میں امتحان میں نہیں شریک ہو سکتی۔“ وہ اور پھیل گئی۔

”تم... تم... الیما؟“ وہ ہکلا گئی۔

"ڈرو مت، میری بیماری چھوت دار نہیں، وہ تمہیں نہیں لگ سکتی۔" الیمانے طنز بھرا قہقہہ لگایا۔ وہ اس طرح سے ہنسی، صرف ایک بار ہنسی اور یہ قہقہہ ایسے کھڑکھڑاتا ہوا شمن کے کانوں میں گونجا جیسے کسی نے بہت سے پتھر ٹین کے خالی ڈبے میں ڈال کر جھکول دیے۔ اس کے دانت بالکل زہر میں بجھے ہوئے کیلوں کی طرح چمکے اور آنکھوں میں سے گھٹا ہوا دھواں اٹھنے لگا۔ اب شمن کو معلوم ہوا کہ اس کے رخساروں کی ہڈیاں کیوں ابھر آئی تھیں اور بال چہرے کی مناسبت سے زیادہ گھندار معلوم ہو رہے تھے۔

"تم مجھے کچھ نہ بتاؤ گی؟" اس نے بہت کچھ جان کر پوچھا۔

"بتانے کو ہے ہی کیا، میرے پیٹ میں بچہ ہے۔" شمن ایسی بری طرح جھجکی جیسے اس کے سر پر چھت آن پڑی مگر فوراً ہی کھسیانی ہو کر سنبھل گئی۔ نہ جانے کیوں سماجی اصولوں کے آگے قدرت کے بنائے ہوئے اصول کمزور اور ناقص ہو جاتے ہیں۔ اور بنظر غور دیکھا جاتا تو قدرت کی طرف سے ماں بننے کی مکمل آزادی تھی مگر سماج اس سے پروانۂ راہداری مانگتا تھا۔ شمن کو خود اپنی روشن خیالی پر ناز تھا مگر روشن خیال بننے سے پہلے ہمیں عادت ڈالنی پڑتی ہے۔ شمن جلد ہی سنبھل گئی، اس کے خیالات جنگلی ہرنوں کی طرح قلانچیں بھرنے لگے۔ اب سے بہت پہلے جب پکنک سے واپس آکر دونوں سہیلیوں نے باتیں کی تھیں اس وقت شمن اور بھی بیوقوف تھی مگر اب تو وہ ان الفاظ کے معنی خوب سمجھتی تھی۔ پھر اسے کیمپ کی وہ رات یاد آگئی جب اس نے ایک نئے موڑ کی طرف قدم اٹھائے تھے۔ افتخار کے کوٹ کی خوشبو کوشش کرنے سے وہ دوبارہ دماغ میں کھینچ لا سکتی تھی۔ اور پھر اسے اپنی وہ رعنائی یاد آئی جو افتخار نے اس سے مانگ لی تھی۔

"مجھے معلوم ہے تم کیا سوچ رہی ہو۔" الیمانے ہولے سے کہا۔

"میں؟"

"ہاں، تم سوچ رہی ہو کہ میں بڑی بدنصیب ہوں، میں نے پاپ کیا ہے۔ یہ بات نہیں، میں اسے پاپ نہیں سمجھتی، مگر —" اس کے چہرے پر پھر وہی بے معنی مسکراہٹ لوٹ آئی، "تم نہیں سمجھ سکتی — میں نے واقعی پاپ کیا ہے۔"

"ایلما!"

"میں نے بہت بڑا پاپ کیا ہے۔ میں نے اپنی روح کو دھوکا دے کر جسم کا پیٹ بھر دیا۔"

"کیا بک رہی ہو ایلما؟ کیا مطلب؟"

"ہیں؟ نہیں، میں بہک گئی تھی۔" وہ تھوڑی دیر کو چپ ہو گئی، پھر بولی: "تم نہیں سمجھتیں، تم بھول گئیں، میں نے تم سے کہا تھا نا کہ...."

"ہاں تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم افتخار کا..."

"ہاں ہاں، یہی تو مصیبت ہے، اگر ایسا ہوتا تو..." وہ پھر کچھ سوچنے لگی۔
"اگر ایسا ہوتا تو میں اس کی امانت اپنے سینے سے لگا کر رکھتی۔" وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اونچی آواز سے بکنے لگی:

"اس وقت جو شیطان میرے جسم میں سانس بھرنا سیکھ رہا ہے وہ سینتیل کا تحفہ ہے اور ــــ میں نے اپنے جسم کی آرزو پوری کر دی مگر میری روح ابھی بھوکی ہے۔ میں اسی ہفتے بنگلور جا رہی ہوں، وہاں آپریشن کرا دوں گی۔"

آنکھیں پھاڑے، سانس روکے شمن سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ "کیوں؟"

"تم ان باتوں کو شاید عجیب سمجھ رہی ہو مگر میں کہتی ہوں۔ کیونکہ مجھے سینتیل سے نفرت ہے اور اُسے مجھ سے، ہم کبھی سمجھوتا نہیں کر سکتے۔ بھلا تم ہی سوچو میں اس کا گناہ کیسے برداشت کر سکتی ہوں؟ آپریشن کے ذریعے سے میں اپنی انتہائی نفرت کا ثبوت دے سکتی ہوں کہ اس کا بیش قیمتی تحفہ ٹھکرا دوں۔"

"بھلا اس کمبخت کو کیا رنج ہوگا۔"

"اوہ، یہی تو تم نہیں جانتیں۔ فرض کرو تم نے میری دعوت کی، میرے منہ میں تر نوالہ دیا، اب اگر میں اُسے تمہارے منہ پر تھوک دوں تو کیا حال ہوگا تمہارا؟"

"اوہ، ایلما!"

مگر ایلما نے وہی زور زور کے قہقہے لگانے شروع کر دیے۔

"مگر — تمہارا ابھی تو کچھ حصّہ ہے اس میں۔"

"ہاں ہاں، مگر جب کوئی چیز زمین پر گر کر مٹّی میں لتھڑ جائے تو اسے پونچھ کر کھانے کی ضرورت نہیں بلکہ اپنے نقصان پر صبر کر کے اسے پھینک دینے ہی میں مصلحت ہے۔"

"سیتل کو معلوم ہے؟" تھوڑی دیر خاموش رہ کر شمن نے پوچھا۔

"ہاں، جب اسے معلوم ہوا تو دل کے ہیرو کی طرح دوڑا سینہ چوڑا کر کے، — کہنے لگا: مجھ سے شادی کر لو۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا: میں تم سے چار پیسے کا سودا کرنے کو تو تیار نہیں پھر بھلا زندگی بھر کا پٹا کیسے لکھ دوں۔ پھر وہ اور وعدے کرنے لگا تو میں نے کہا میں بنگلور آپریشن کے لیے جا رہی ہوں، بیچارے کا منہ اتر گیا۔" وہ دل کھول کر ہنسی۔

ایلما چلی گئی۔ شمن دیر تک بیٹھی سوچتی رہی۔ سیتل کا مزاج کچھ دن سے بگڑا ہوا تھا، کچھ جھنجھلایا سا رہتا۔ اس کا بے اختیار جی چاہا کہ جا کر اس کے دل کی باتیں پوچھے۔ سیتل جیسے لاپروا اور بے رحم انسان کی واقعی ایلما کے رویے سے کچھ ہتک محسوس کر رہا تھا۔ شادی بیاہ کو چھوڑ کر تخلیق انسان کا پہلا فرض ہے۔ خدا نے انسان کو یونیورسٹی میں ڈگریاں لے کر دفتروں میں جھک مارنے کے لیے تو یقیناً نہیں پیدا کیا ہوگا۔ تخلیق، خواہ وہ کسی صورت میں ہو، انسان کی بہترین کمائی ہے۔ تو شاید اپنی کمائی کو ضایع کیا جاتا دیکھ کر اسے کچھ دکھ ہو رہا تھا! عیش و عشرت اور آوارہ گردی کا زبردست حامی ہوتے ہوئے بھی وہ خصلتِ انسانی کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا۔ شاید اگر ایلما عام عورتوں کی طرح رو تی بیٹھی تو اس کے احساسات کچھ مختلف ہوتے۔ تھوڑا سا قانون اور سماج کا بھی ڈر ہوتا اور پھر وہ خود ہی یہ تجویز ایلما کے سامنے پیش کرتا مگر اب تو وہ اس کی حقارت بھری بے رحمی پہ جھنجھلا رہا تھا۔ ویسے اسے اپنے حصّے کے ضائع ہو جانے کی پروا نہ ہوتی مگر لیول ایک بد دماغ لڑکی کو اسے ذلیل کرنے کا کیا حق تھا؟ یہ نہیں کہ اس امکانی شے سے اسے کچھ اُنس ہو گیا تھا یا اس کی آئندہ نسل کا انحصار اسی کی ذات

سے وابستہ تھا، پھر بھی وہ خوش نہیں تھا۔ شاید ایلیما کی جگہ مس بوگا ہوتیں تو اُس کی اس قدر بے قدری نہ ہوتی اور پھر شاید وہ اس قدر حساس بھی نہ ہوتا۔

دو تین دن بعد ایلیا جنوبی ہند روانہ ہو گئی۔ شمن کو اُس کی جدائی کا بڑا رنج ہوا۔ واپسی کے متعلق اُس نے نہایت مبہم سے جملے کہے۔ نہ ہاں نہ نا، وہ عجیب فلسفیانہ جواب دے گئی۔ چلتے وقت اسٹیشن پر اُس نے شمن کو بھینچ کر بڑے جوش سے پیار کیا۔

"میں اب افتخار سے تو مل نہ سکوں گی۔ اگر اتفاق ہو ملنے کا تو یہ پیار تم میری طرف سے پہنچا دینا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میں اب زندہ نہیں رہوں گی۔"

"کیا بکتی ہو!"

"پگلی میرا مطلب یہ نہیں، جسمانی طور پر تو میں واقعی ابھی بہت دن زندہ رہوں گی مگر میری روح مر چکی ہے!"

"تمہارے خیالات اور اتنے تاریک!"

"میں جانتی تھی تم اسے بکواس کہو گی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم ہندوستانی ایک مقررہ حد سے آگے بڑھتے تو ہیں مگر فوراً دھکا کھا کر لوٹ آتے ہیں، یہ تاریکی ہمارے خون میں رچی ہوئی ہے جہاں تک تخیل کی دوڑ کا سوال ہے کوئی ہماری گرد پا کو بھی نہیں پہنچ سکتا، خوابوں میں تو ہم بڑی آسانی سے پاتال تک کو فتح کر لیتے ہیں لیکن جہاں عمل کا سوال آیا ہم پیچھے گر پڑے۔ یہی دیکھو! افتخار کتنا جوشیلا، کتنا سچا ہے! مگر صرف وہاں تک جہاں تک گفتگو ہی کا سوال ہے۔ وہ جو کچھ سوچ سکتا ہے کاش اس کا تہائی بھی عمل کی صورت میں ظاہر کر سکتا تو وہ ہندوستان کا سچا رہنما ثابت ہوتا، نہ جانے کیا ہو جاتا لیکن اگر اُسے معلوم ہو کہ میں نے . . ."

"افتخار روشن دماغ ہے!" شمن نے کیمپ کی آخری ملاقات کو یاد کر کے کہا۔

"کتنا بھی روشن دماغ ہو، یہ سیاہی ایک دفعہ تو وہاں بھی اندھیرا کر دے گی۔ میری زندگی میں رہ بھی کیا گیا ہے، صرف اپنے ضمیر کی ملامتیں۔"

"قوم کی خدمت جس کا تم بیڑا اٹھا چکی ہو۔"

"اس پر لے سے بھی منہ جل گیا۔ کچھ نہیں، دنیا میں ہر چیز ذلیل ہے ہم لوگ ایک چیز بڑی شان سے شروع کرتے ہیں مگر جلد ہی آپس کی پھوٹ، خود غرضیاں، پست خواہشات اور چھچھورے خیالات درمیان میں آکر سب کچھ میٹ دیتے ہیں۔ سوائے زبانی بکواس اور تالیاں پیٹنے کے ہمیں کچھ بھی تو نہیں کرنا آتا۔"

"لیکن اس کی کوئی تو وجہ ہے؟"

"وجہ؟ ہماری آبائی توہم پرستی۔ ہم خواہ کہیں چلے جائیں، کچھ سیکھ جائیں، اپنے خون سے اس لیست مادّے کو دور نہیں کرسکتے جو جنم جنم سے ہماری تمام تباہیوں کا باعث بنتا چلا آرہا ہے۔ ہم پیدا ہی غلامی اور دوسروں کو سجدہ کرنے کے لیے ہوئے ہیں۔ گاندھی نے ہمیں غلامی سے آزاد کرنے کی کوشش کی ہم نے اُلٹا اُسے مہاتما بنا کر پوجنا شروع کر دیا، سارا قومی جذبہ ایک دیوتا کی مہمل پرستش بن کر رہ گیا۔" پلیٹ فارم پر ٹہلتے ٹہلتے ایلما فلاسفر بن گئی، شمن حیرت سے جزبز خاموش رہی۔

"جب ہم ایک دیوتا کو پوجتے پوجتے اکتا جاتے ہیں تو دوسرا بنا لیتے ہیں، ہماری بلا سے اُس کا رنگ سفید ہو یا سیاہ۔ اگر کوئی ہم سے دنیا میں بغیر دیوتا کے رہنے کو کہے تو ہم کبھی تیار نہ ہوں۔ میں نے تمہارے مذہب کے بارے میں بھی پڑھا ہے۔ مگر مشرقی اور مغربی مذہب میں بھی فرق ہے، اتنا ہی جتنا دیسی اور فرانسیسی شراب میں، ایک سلجھی ہوئی فلاسفی کا خمار ہے تو دوسرا ٹھرّے کا جنگلی نشہ، ایک میں عقل ہے تو دوسرے میں سانڈ کا جوش۔ یہاں ہندوستان میں کوئی مذہب سلامت نہیں رہ سکتا، اس پر ڈراؤنی بھوانی میّا اور راکشسوں کی حکومت شروع ہو جاتی ہے۔"

"مگر تم لوگ تو.... عیسائی؟"

"سب واہیات۔ ہم، تم، وہ۔ سب ایک ہی ناؤ میں جھولتے چلے جا رہے ہیں۔ بڑے جوش سے میلے کپڑے اتار کر نیا جوڑا پہنتے ہیں مگر دم بھر میں کیچڑ میں مچل جاتے ہیں۔ ہم ہر نئی چیز پر جھپٹتے ہیں، خود نیا بننے کے لیے نہیں بلکہ اُسے بوسیدہ بنانے کے لیے۔ ہم بالکل مکڑی کی طرح ہیں جو حسین سے حسین پروانے کو اپنے جالے میں لپیٹ کر فنا کر دیتی

ہے، ایسے کہ پہچانا بھی نہیں جا سکتا۔ نمک کی کان ہے یا جو کچھ بھی گر جائے نمک بن جاتا ہے۔

"تو تمہارے خیال میں ہندوستان کا مرض لاعلاج ہے؟"

"مرض تو کوئی علاج نہیں۔" وہ تھوڑی دیر سوچ کر بولی۔ "مگر ہمارے طبیب ابھی تک مریض کے سرہانے کھڑے مرض کی تشخیص کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی نے گنٹھیا تجویز کی ہے، کوئی کہتا ہے صرف فسادِ خون ہے۔ ہاں یہ سچ بھی ہے۔ یہ خون۔ ہندوستانی خون۔ بہت ہی سیاہ ہو گیا ہے!" وہ اپنی سادھوؤں جیسی آنکھوں سے نہ جانے کس سمت گھورنے لگی۔ گو ایلما کی صحت گر رہی تھی مگر جسم پر پھل دار درخت کی سی بھری بھری کم لطافت چھائی ہوئی تھی۔ شمن اسے خاموش پا کر غور سے دیکھنے لگی، نہ جانے کیوں اس کا گلا بھر آیا۔ اگر ایک درخت قدرت سے جنگ شروع کر دے تو وہ کتنے دن زندہ رہ سکتا ہے! آم بور لگتے ہی مچل جائے اور پھل پیدا کرنے سے انکار کر دے تو؟ مگر ایسا ہو ہی نہیں سکتا، اس بغاوت کا حق تو صرف اشرف المخلوقات ہی کو حاصل ہے کہ اگر وہ قدرت کی ضدیں پوری کرنے کو تیار نہ ہو تو کوئی اُسے مجبور نہیں کر سکتا۔ مگر یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ بغاوت اُس نے سیکھی کہاں سے!

ایلما کی ٹرین روانہ ہو گئی تو ہزاروں سوال اُس کے دماغ میں گورکھ دھندوں کی طرح الجھتے سلجھتے رہ گئے۔ دل ایک بھاری سے بوجھ کی شدّت سے دھنسنے لگا۔ وہ پُرحسرت بوسہ جو ایلما انتظار کے لیے اس کے ہونٹوں پر چھوڑ گئی تھی، انگارے کی طرح دہکنے لگا۔ اس کی امانت محفوظ رہے گی؟ کاش انسان اتنا بزدل نہ ہوتا!

واپسی پر اس نے لان کی بنچ پر ٹیسیل کو بیٹھے پایا۔ وہ گھاس کے درمیان جھلکتی ہوئی خشک زمین پر کسی گزرتے ہوئے کیڑے کے نقشِ پا ڈھونڈ رہا تھا۔

"گھاس کی جڑ تک کھا جاتے ہیں یہ کیڑے!" اُس نے زنجیر نما لہرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"کیا بوٹنی کا مطالعہ شروع کر دیا ہے؟" شمن نے آواز میں طنز کی جھنکار پیدا کر کے

جواب دیا۔

”نہیں نہیں، ابھی میں نے مالی سے پوچھا ٹینس کورٹ کیوں گنجا ہوتا چلا جاتا ہے تو... مگر شمن کے چہرے پر پر درد ہانسی مسکراہٹ دیکھ کر وہ چپ ہو گیا۔

”اُسے پہنچا کر آرہی ہیں؟ یہاں بیٹھ جائیے۔“ اُس نے ایسے لجاجت سے کہا کہ شمن کو ہنسی آگئی۔ یہ مرد بھی کتنے معصوم ہوتے ہیں! آگ کو ہمیشہ منہ بولی بہن دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہنسی ہنسی میں جیسے کانچ کا گلاس توڑ کر بیٹھا منہ بسور رہا ہو۔ شمن اُس کے پاس بیٹھ گئی۔

ظالم اور مظلوم کا فرق بھی بالکل دہم کی سی نوعیت رکھتا ہے۔ اگر ایما بھی سیتل کو مقررہ سزا دے دیتی تو وہ یوں خود اپنے ضمیر کی جوتیاں نہ کھاتا۔ اس کی بے نیازی نے تو خاموش گھٹن کو اور بھی بڑھا دیا۔ کاش سزا پر طمانچہ مار دیا جائے تاکہ احساس تو ٹھوکریں کھانے سے بچے!

”میں نے اس سے کہا بھی کہ میں تیا جی کی دھمکیوں کی پروا نہیں کرتا۔ میری ماتا کی جائیداد کافی ہے۔“ وہ شکایتاً بولا اور شمن کو اس پر ترس آگیا۔ لوگ ابھی تک جائیداد اور والدین کی دھمکیوں کو اس قدر اہمیّت دیتے ہیں گویا پیسہ ہی تو ضمیر کا مول ہے۔ مگر سیتل یہ عذر شمن کے سامنے کیوں پیش کر رہا تھا؟ شاید خودداری مظلومیت کی پناہ میں شکست خوردہ ریزہ دل کو دوبارہ جوڑنا چاہتی تھی۔

”ٹینس نہیں کھیلیں گی؟“ اُس نے شمن کو اُٹھتے ہوئے دیکھ کر روکا، جیسے اُسے تنہائی سے خوف آرہا ہو۔

”میرا ریکیٹ تو کمرے پر ہے۔“ گو وہ ارادہ کر کے آئی تھی کہ سیتل کی جی بھر کے گت بنائے گی مگر نہ جانے ماتا کی کون سی رگ پھڑک اٹھی کہ وہ بالکل ہی پگھل گئی۔ روتے کو اور کیا جھڑکنا!

ٹینس کے تین سیٹ ختم کر کے جب وہ ہلکی پھلکی کمرے پر پہنچی، تو اُس کا ضمیر اُس پر پھٹکار برسانے لگا۔ حیف ہے کہ وہ اپنی سب سے پیاری سہیلی کے دشمن کی دلجوئی کر رہی

تھی۔ وہ رُوہانسی ہو کر بیٹھ گئی، جیسے ایمانی چتا پر ناچ کر آ رہی ہو۔ خوفزدہ ہو کر اُس نے منہ پر ٹھنڈے پانی کے خوب چھینٹے دیے۔ آئندہ سے وہ سیتل سے بات بھی نہ کرے گی۔

لیکن یہ اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ یونین کی اتنی اہم عہدہ دار ہوتے ہوئے اُسے سیتل سے نجات پانا مشکل تھی۔ وہ جب چاہتا اُس سے ضروری معاملات کے متعلق مشورہ کرنے آن دھمکتا۔ کلاس میں، کلاس سے باہر، لائبریری میں، ٹینس لان پر، کھانے کے کمرے میں اور یونیورسٹی کے ہر کونے سے سیتل نے اُس پر بادلوں کی طرح اُمڈنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ایک ننھے سے نکتے میں بھنچتی چلی جا رہی ہے۔ یہ گیدڑ اس کا دم کیوں گھونٹے دیتا ہے؟ قوتِ مقابلہ اتنی سست اور بدمست کیوں ہوتی جا رہی ہے؟ سیتل نے تین گھنٹے لائبریری میں اُسے لغو شاعری سنائی اور وہ سنتی رہی!

وہ پیر سکیڑے آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھی بڑھتی ہوئی تاریکی کو آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری اُجلی کرنیں کمرے کو مسحور کن رنگ میں ڈبوئے ہوئے تھیں کہ اچانک اُس کے دماغ میں فینائل اور لونڈر میں ملی جلی ایک شیریں بسانڈ نے چونکا دیا۔ وہ اس لیسلی لپیٹ سے دماغ کو چھڑا کر پیچھے مڑی۔ سیتل ٹینس کے بعد پسینے میں نہایا ہوا اُس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ اُس کے لمبے لمبے بال بھرے بازو عریاں تھے اور پنڈلیاں پسینے سے چمک رہی تھیں۔ نہ جانے کیا ہوا کہ شمن کا دم گھٹنے لگا، معلوم ہوا کسی نے اُسے گوشت پوست کے انبار میں لپیٹ کر جکڑ دیا۔ بڑی لمبی سانسیں بھر کے وہ سنبھلی اور بدحواسوں کی طرح بھاگی۔ غسل خانے کے نل سے اس نے گٹ گٹ کر پانی پیا اور دیوار سے لگ کر بکھرے ہوئے ذرّوں کو سمیٹنے لگی۔ دیر تک ایک اُبکائی کا سا احساس اُس کے دماغ میں پھنسا رہا اور وہ نڈھال پلنگ پر پڑی رہی۔

کھانے کی میز پر باوجود سیتل کے شدید اصرار کے وہ وہاں سے اپنے بھاگنے کی کوئی معقول وجہ نہ بتا سکی۔ نہ ہی اُسے کچھ معلوم تھا۔ اس کے وجود نے بھاگنا

چاہا اور بغیر کہے سُنے بھاگ نکلا۔ کہتے ہیں بہت سے حیوان طوفان کی آمد سے پہلے پناہ گاہوں کو بھاگ نکلتے ہیں۔

اور افتخار؟ اُس کے خیال ہی سے عذرے اس کا سر بھاری ہو جاتا۔ کیا بات تھی جو افتخار میں سیتل سے مختلف تھی؟ جس نے اُس کے وجود میں اس بلا کی کشش پیدا کر دی تھی؟ جہاں تک صورت شکل اور دولت کا سوال تھا وہ سیتل سے میلوں ہارا ہوا تھا پھر بھی سوائے مس بوگا کے اس سے سب لڑکیاں چڑتی تھیں۔ کیا عجب جو الیما نے بھی سیتل کے جسم میں افتخار ہی کی جستجو کی ہو اور نا اُمید ہو کر لوٹ پڑی۔ امتحان سر پر آ گئے اور سیتل کی ساری نفرت، خوف اور کشش کو بھلا کر اُس نے کتابیں سنبھال لیں۔

(۳۲)

امتحان کا نتیجہ آنے سے پہلے سستی اور بیکاری کے لمبے چوڑے دن گپ بازی میں کاٹنے دشوار ہو گئے۔ بورڈنگ میں رہتے رہتے اُسے گھر پرائے معلوم ہونے لگا تھا۔ بی۔ اے کے بعد ایک طرح تعلیمی جنکشن پر اتر کر ذرا اِدھر اُدھر نگاہ ڈالنے کی فرصت ملی: گھر میں بچوں کی تعداد چوگنی ہو گئی تھی، بھائی کمانے میں جٹے ہوئے تھے اور بھاوجیں پود بڑھانے میں مشغول۔ معلوم ہوتا تھا زندگی کو ٹوٹے ہوئے چھکڑے کی طرح ہر ایک آگے گھسیٹنے میں مشغول ہے۔ کوئی بھی تو مرمت کے لیے دم نہیں لیتا۔ چولیں ڈھیلی، پھٹے بھاگ نکلنے کو تیار، چھت غائب، پیندے میں چھلنی جیسے چھید مگر بیل کی گردن پر جُوا مضبوط اور لاٹھیوں کے ٹھوکے جاری جو کسی سے روک کر پوچھنا چاہو کہ "بھئی کہاں کا قصد ہے؟" تو ہکا بکا ہو کر جواب ملتا ہے: "کہیں کا نہیں! اس دنیا میں ایک دفعہ آنے کے بعد سوائے قبر کے اور کہاں جا سکتا ہے ہم گرتے پڑتے سب ایک ہی نشان کی طرف دوڑتے چلے جا رہے ہیں اس امید میں کہ وہاں جنت ملے گی۔ دفتر سے بے فکر مزے سے گزرے گی، حوریں ملیں گی اور

جواہرات کے محل۔ جو کچھ سمیٹا جاسکے وہیں سے لے اٹھا لو۔ ٹھونس ٹھاس ایک بار وہاں پہنچ جائیں تو پھر وارے نیارے ہیں۔ اگر جنت کی تاک میں دنیا دوزخ بنتی ہے تو کچھ پروا نہیں۔

چھٹیوں میں انور، برکت، عباس اور سیتل کے خط آئے۔ افتخار اور ایلما خاموش رہے۔

ششی کامیاب انگلینڈ سے مغربی بنیا بن کر آگیا۔ مس لوگانے فلسفے میں ریسرچ شروع کر دی اور ششمن؟ نتیجہ سننے کے بعد اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس ششمن کا کیا کرے؟ زندگی کی گاڑی گھسٹوانے کے لیے کئی وضعدار پھٹے ساتھ دینے کو موجود تھے مگر کسی کا دھرا کمزور، کسی کا ہال ڈھیلا۔ ڈپٹی کلکٹریاں محدود، پولیس کا دائرہ مقرر، جنگلات میں پالہ لبریز۔ زمانے کی افراتفری کو دیکھتے ہوئے مس شمشاد نے ایک قومی اسکول کی سرپرستی قبول فرمالی۔

اسکول کی عمارت ایک دریا دل رئیس کی بے کار کوٹھی تھی جو انہوں نے بدزبان لوگوں کی بکواس سے بچنے کے لیے اپنی منہ چڑھی طوائف کے لیے آبادی سے ہٹ کر بنوائی تھی اور جہاں سے ہر کرایہ دار چمگادڑوں اور مچھروں سے تنگ آکر بھاگ چکا تھا۔ اسکول کا باقی سامان کسی اور بگڑے دل رئیس کی ناٹک کی بنچوں اور نیلام کی میزوں پر مشتمل تھا۔ ایک اور رئیس، جن کے باپ دادا کو ادب سے لگاؤ تھا، لائبریری مہیا کرنے پر تل گئے تھے۔ چونکہ کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لیے کوئی کنواں میونسپلٹی کی زیادتی سے دستیاب نہ ہو سکا اس لیے دنیا بھر کی واہیات اور لغو کتابیں، جنہیں مصنف کے بعد شاید کاتب نے پڑھا ہو، اپنی تمام بھیانک ضعیفی کے ساتھ آن موجود ہوئیں۔ جتنی لڑکیاں رجسٹر میں درج تھیں اس کی نصف تو شاید کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔ چار اسسٹنٹ معلمات تھیں جنہیں بیس روپیہ مہینہ دے کر تیس روپیہ کی رسید لی جاتی تھی۔ بیچاریاں غربت اور بیوگی کی لعنت میں گرفتار تھیں ورنہ محکمہ تعلیم سے ان دکھیاریوں کا تو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ دو چپراسنیں تھیں جو خوشحال دنوں میں نائکہ کی لطیف خدمات بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے چکی تھیں۔ ایک چپراسی تھا جو منیجر صاحب کا باورچی، بیرا، فراش اور بچوں کی گورنس کی خدمات کے علاوہ انسپکٹرس کے آنے پر بھورا کوٹ اور سفید صافہ باندھ کر مودب کھڑا کرنے کے کام بھی آتا تھا۔ اسکول کی تمام کارآمد کرسیاں اور میزیں خالی اوقات میں منیجر

صاحب کے ڈرائنگ روم کو زینت بخشی رہتی تھیں۔ چاروں استانیاں زیادہ تر اُن کے بچوں کی مرغیاں، لحاف اور ململ کے کرتے سیا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ اُنہیں کشیدے کے کام سے بہت لگاؤ تھا اور یہ استانیاں بچیر لگے ڈوروں سے اُن کے غلافوں پر سویٹ ڈریم، اور گڈ نائٹ، بہت صفائی سے کاڑھا کرتی تھیں۔

ان میں سے ایک استانی رضیہ بیگم کو تیس روپیہ کی رسید پر پینتیس روپے تنخواہ ملتی تھی۔ ہر ماہ منیجر صاحب یہ زاید پانچ روپے اپنی جیب سے ادا کرنے کی دھمکی دیتے مگر پوری نہ کرتے۔ ان کی آمد پر مسز منیجر نے فینائل اور منیجر آلوڈین وغیرہ پینے کی عملی دھمکیاں دی تھیں۔ رضیہ بیگم بھاری جسم کی ادھیڑ عمر بیوہ تھیں۔ قرآن شریف کے علاوہ اُردو اور رسمی فارسی سے بھی واقفیت رکھتی تھیں۔ کبھی خاصی قبول صورت ہوں گی مگر برص کے سفید داغوں نے ذرا بدہیئت کر دیا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ داغ پرانے تھے مگر مسز منیجر کا خیال تھا کہ یہ اُن کے وظیفوں اور اُن کے پیر کی دعاؤں کا ہی ردِ عکس تھا جو رضیہ بیگم پر پھٹکار بن کر برس رہا تھا۔

رضیہ بیگم سے سوائے ٹرانٹ چپراسنوں کے سب ہی مرعوب تھے۔ یہ چپراسنیں اُن کی گزشتہ زندگی کی بہترین رازدار تھیں۔ اُن سے بہت بے تکلفی تھی اور بڑی والی بڑھیا تو اُنہیں رجّو بی ہی کہا کرتی تھی۔ رجّو بی کا زیادہ وقت مونگ پھلیاں ٹونگنے اور منیجر صاحب کے سویٹر بننے میں صرف ہوتا تھا۔ یہ سویٹر وہ اس قدر پیچیدہ نمونوں کے بنا کرتی تھیں کہ دماغ اُلجھ کر رہ جاتا۔ پڑھاتی خاک تھیں، لڑکیاں اُٹھتی یا تو اُون سلجھایا کرتیں یا اُن کے سر میں چٹکیاں بھرا کرتیں، اور چپراسنیں اُٹھتی اُنہیں محلے ٹولے کی عاشقیوں کے قصے سنایا کرتیں یا بڑی استانی جی، یعنی شمّن بی کی بدحواسیوں پر مباحثہ کیا کرتیں۔ شمّن سے پہلے بھی دو ہیڈ مسٹریسیں میٹرک پاس آئیں مگر تین تین مہینے بعد بھاگ نکلیں۔ شمّن کی آمد پر نہ جانے کیوں مسلم گھرانوں کی توجہ تعلیم کی طرف تیزی سے مبذول ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو عیسائی عورتوں کا اضافہ ہو گیا، داخلے بھی تیزی سے ہونے لگے۔ ایک گریجویٹ ہیڈ مسٹرس کا لانا یہ رنگ لایا کہ منیجر صاحب اعلیٰ خاندان کی لڑکیاں بھی پھانس لائے۔ مگر یہ اعلیٰ خاندان

صاحبزادیاں دوائوں، اناؤں اور ایسی ہی گھسی گھسائی بڑھیوں کی نگرانی میں کالج کے گلاس بن کر آتیں، چاروں طرف اخلاقی پہرے ہیں اور پھر اُن کی موٹریں، بگھیاں آجاتیں اور وہ چل دیتیں۔

شمن کی آمد سے پورا انقلاب آگیا: آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے منیجر صاحب اُسے عجوبۂ روزگار بنائے لیے پھرتے۔

"صاحب مسلمانوں میں ہیں کہاں تعلیم یافتہ لڑکیاں؟" اور لوگ بھی اُسے ایسے گھورتے گویا اس کے منہ پر سونڈ لٹک رہی ہے۔ کام کی بات یہ ہوئی کہ انسپکٹرس شمن کے کالج کی پرانی طالبہ نکلیں اور یہ رشتہ اس قدر مؤثر ثابت ہوا کہ گورنمنٹ کی گرانٹ بڑھ گئی اور منیجر صاحب گھنٹوں برآمدے میں سونگھنے کے بجائے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے لگے۔ مگر وہاں بیچارے حد درجہ بدحواس رہتے اور انسپکٹرس یا اُن کا کتا آجاتا تو ہڑبڑا کر کھڑے ہو جاتے۔ ویسے بھی اس کی قوم پرستی کی دھاک بیٹھ گئی۔

آن واحد میں دنیا بدل گئی۔ اسکول میں نیا فرنیچر، نقشے اور تصویریں نظر آنے لگیں۔ ٹاٹ پر بیٹھنے کی عادی لڑکیاں بنچوں پر اکڑوں بیٹھنے کی مشق کرنے لگیں اور شمن نے برباد شدہ مدرسے کی عمارت کو پیوند پارسے لگا کر درست کرنا شروع کیا، چھپکلیوں کے خلاف جہاد بول دیا۔ مس ٹامس اور مس الگزنڈر نیلی اور سُرخ روشنائی تھیں۔ بیچ بیچ کے ٹیبل بنائے گئیں۔ لائبریری کی بھربھری بوسیدہ کتابوں کی سنبھال سنبھال کر ٹانکہ زنی کی گئی۔ دو چار دن تو بہ جبر بیٹھنے پر پیر رکھ کر پھر بھی مقررہ بنچوں پر بیٹھی طوطوں کی طرح جمی رہیں، رضیہ بیگم نے بھی مونگ پھلیاں ڈیسک میں چھپا دیں اور جب اسی نے دفعتاً دروازے کے بیچ میں لٹکے ہوئے گھنٹے کو پیٹ دیا۔ گھنٹہ بجاتے وقت شدتِ احساس سے اس کے کان سرخ ہو جاتے اور گاڑی والے اپنی گپ بازی اور چلمیں چھوڑ کر ٹوٹے ہوئے موٹر خانے سے اُسے بغور دیکھ کر مسکرانے لگتے۔ مگر کچھ دن بعد ہی ان بندشوں کا جادو فنا ہو گیا۔ رضیہ بیگم کرسی پر ہی پالتی مار کر منیجر صاحب کے بیہودہ سویٹر بننے لگیں، چپراسنیں حسبِ معمول دہلیز پر پھسکڑا مار کر بیڑی لگا بیٹھیں، گھنٹہ

بجانے کی موگری نقشے کی کیل ٹھوکنے لے جائی گئی اور پھر قرآن والی استانی جی کے کمرے میں اُن کی چھالیا کی ڈلیاں توڑنے کے لیے محفوظ ملی۔ شمن نے مغربی بردباری اور رنجیدگی سے بکھرتے ہوئے شیرازے کو سمیٹنے کی کوشش کی مگر وہاں تو جیسے نمک ستیہ گرہ شروع ہوگئی : ہر چیز اُس کی آنکھ بچتے ہی پھسل پڑتی اور مچل کر قابو سے باہر ہو جاتی۔ کرسیاں اور میزیں اور گملے منیجر صاحب کے یہاں دعوت میں مستعار گئے اور پھر لوٹ کر نہ آئے۔ چپراسی پھر باقاعدہ اپنے پرانے عہدے پر واپس چلا گیا اور دونوں عیسائی اُستانیاں پڑوس کے قومی اسکول کے ماسٹروں سے روز بروز زیادہ مانوس ہوتی گئیں۔ لائبریری کی کل جاندار کتابیں مسز منیجر اور اُن کی سہیلیاں پڑھنے کو لے گئیں جو پھر اگر واپس آئیں تو چیتھڑے اور دال سالن میں لتھڑی ہوئی۔

رضیہ بیگم نے تو ایک مستقل محاذ قائم کر لیا جس میں دونوں چپراسنیں بڑے جوش و خروش سے شریک ہو گئیں۔ لڑکیاں دن بھر آم اور بیر کے درختوں کے نیچے کشتیاں لڑتیں اور شمن کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی غیبی ہاتھ اس کے بنائے ہوئے گھروندے کو ڈھانے پر مصر ہے۔ جتنی جتنی اُس نے سختی برتی عملہ بپھرتا ہی گیا۔

رضیہ بیگم اور اتحادیوں کی کوشش نے اُسے بدحواس کر ہی رکھا تھا کہ مسز منیجر مع اپنے غلیظ اور نامعقول بچوں کی فوج کے اسکول کے معائنے کو آن دھمکیں۔ پتہ نہیں اُنھیں یہ عہدہ کب اور کیوں دیا گیا تھا۔ اصل وجہ کچھ اور ہی تھی۔ اُنھیں بڑے معتبر ذریعے سے معلوم ہوا کہ لڑکیاں کچی امیاں بڑی بے رحمی سے کھانے میں مشغول تھیں یہ قیمتی امیاں علاوہ اچار چٹنی کے اُن کے گھر کا سال بھر کا کھٹائی کا اسٹور مہیا کرتی تھیں اور خود منیجر صاحب کو ان کی حفاظت کی فکر گھن بن کر کھائے جاتی تھی۔

"یہ تو ہونے سے رہا کہ میں لمبا سا بانس لے کر نگرانی شروع کر دوں۔" اُس نے اُن کا دکھڑا سن کر رکھائی سے کہا، "بچیوں کو تو میں نے منع کر دیا ہے مگر استانیوں کو کیا کہوں؟ جو کھٹائی سکھانے کے لیے توڑتی ہیں؟"

"ہاں بہن یہی تو مصیبت ہے۔ میں نے کتنی دفعہ کہا ان کمبختوں سے مگر نہیں مانتیں۔

یہ رضیہ بیگم تو سب سے پیش پیش ہیں۔ بھلا تم ہی بتاؤ بہن، بھلا ان کی عمر اب کچی امیوں کی ہے؟ بڈھی گھوڑی!"

"میں نے منع کیا تو انہوں نے کہا وہ آپ کے لیے اچار بنا رہی ہیں"

"خاک میرے لیے اچار بنا رہی ہے، اس کا بس چلے تو میرا ہی اچار بنا دے۔۔۔ آپ کو نہیں معلوم۔۔۔" وہ رازدارانہ انداز میں پاس سرک آئیں۔

"بہن کیا بتاؤں؟" بڑی حسرت سے بولیں "یہ اسکول کا تو اللہ مارا بہانہ ہے۔ چھ بچوں کے باپ مگر گن دیکھو تو اللہ توبہ۔ اس رضیہ کے پیچھے دنیا زمانے کے غنڈے لگے پھرتے ہیں اور اللہ کے بندے نے اُس کے سپرد شریف بچیوں کو کر رکھا ہے۔ میں نے تو کہہ دیا ایک دفعہ کہ پڑھنا وڑھنا تو خاک نہیں ہاں دو چار آنکھ لڑانے کے گر بیشک سکھا دیں گی۔" شمن ہنسی دبائے ان کی باتیں سنتی رہی۔ امیوں کی رکھوالی کا پختہ وعدہ لے کے مسز منیجر چلی گئیں تو دیر تک شمن رضیہ بیگم ہی کے متعلق سوچتی رہی۔ اُن کی جوانی ڈھل چکی تھی پھر ان میں ایسی کون سی خطرناک ادا باقی رہ گئی تھی جس نے مسز منیجر کو بدحواس کر رکھا تھا۔ اگر کوئی جوان لڑکی ہوتی تو خیر ایک بات بھی تھی مگر اپنی ہم عمر اور نسبتاً بدصورت عورت میں انہیں کہاں سے خطرہ نظر آ رہا تھا۔

"اچار میں بھی خاصا ڈالتی ہوں مگر انھیں تو اسی مردار کے ہاتھ کا پسند ہے، اُسی کی چٹنی پہ دم جاتا ہے۔ دیکھ لینا ایک دن ان کی چٹنی نہ بنا کر رکھ دے تو نام پلٹ کے رکھ دینا۔" وہ کس وثوق سے کہہ گئی تھیں۔ تو کیا منیجر صاحب رضیہ کی چٹنی پر عاشق تھے؟ شمن کو ہنسی آگئی۔ یقیناً عشق نرالا تھا اور چٹپٹا بھی۔ یعنی اچار چٹنیوں کے ذریعے بھی عاشق پھنسائے جا سکتے ہیں۔ چٹنی کھاتے وقت اسے کبھی شبہ بھی نہ ہوا تھا کہ اس کا اتنا رومان انگیز مصرف بھی ہو سکتا ہے۔

شمن کا کمرہ اسکول سے ملحق ذرا جاندار حصے میں تھا۔ سامنے اُس نے چھوٹا سا باغیچہ بنا لیا تھا جہاں وہ شام کو آرام کرسی پر لیٹ کر سامنے میدان میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھا کرتی تھی۔ بازو کے برآمدے سے گزر کر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جو رضیہ بیگم

کو دے دی گئی تھی۔ ایک پراسن دوسراہیٹ کے لیے اُن کے ساتھ رہتی تھی۔ اسکول کے بعد وہ کوٹھڑی کے سامنے پلنگڑی پر بیٹھ کر منیجر صاحب کے تکیوں کے غلاف کاڑھا کرتیں۔ نہ جانے انہیں اتنے غلافوں کی کیوں ضرورت پڑتی تھی، ضرور بیوی یاد کر دیتی ہوں گی۔ رضیہ بی۔ کے کاڑھے ہوئے "سویٹ ڈریم"، سے اُن کی بیچاری کی اپنی نیند اڑ جاتی ہو گی۔ اب جیسے آموں کا موسم شروع ہوا تھا وہ امیاں چھیل کر چٹنیاں پکایا کرتی تھیں۔ کتاب اور اخبار کو بھول کر شمن اُن کے افسانے کو پڑھنے کی کوشش کرتی۔ رضیہ بیگم صورت سے کافی ہوشیار اور تجربہ کار معلوم ہوتی تھیں۔ اُن کی زندگی کچھ معصوم نہ گزری ہو گی کاش کوئی اُن کی کتابِ زندگی کے دو چار ورق الٹ دیتا۔ منیجر صاحب کو وہ بھائی جان کہتی تھیں مگر اس سلیقے سے کہ لفظ "جان"، پر بیچاری مسز منیجر کی جان ہی تو نکل جاتی۔ کہتے ہیں عورت عورت کو پہچان لیتی ہے، مگر پھر یہ کیا چیز تھی جو انہیں ڈرائے ہوئے تھی اور شمن کو مبہم معلوم ہوتا تھا۔

داخلے اور روزانہ حاضری کے رجسٹر بنانے کے لیے اُسے کسی مددگار کی ضرورت ہوئی تو منیجر صاحب نے اپنے جان پہچان والے دو ماسٹروں کو بھیج دیا جو روز شام کو آ کر اُسے اور دونوں نئی عیسائی استانیوں کو جمع تفریق کی مشقیں از سرِ نو کرانے لگتے۔ ضرورت سے زیادہ بیکار خانے نکتوں سے بھرنا، مہینے بھر کی حاضری جوڑ کر اُسے سال بھر کی حاضری میں سے گھٹانا اور پھر دنیا بھر کی الابلا کو گڈمڈ کر دینا۔ کتنی لڑکیاں ڈرائنگ لیتی ہیں اور کتنی فارسی، چونکہ یہ دونوں مضمون اسکول میں سکھائے جاتے تھے اس لیے یہ خانے نکتوں سے پُر کرنا۔

کبھی تو حبیب اور اکرم دونوں آتے اور کبھی حبیب اکیلے۔ اور جب رجسٹروں کا جھگڑا ختم ہو گیا تب بھی کسی نہ کسی بہانے سے پھیرا لگاتے رہے۔ کچھ کتابوں وغیرہ کا لین دین شروع کر دیا۔ ان کی ضرورت کی کتاب ساری لائبریریوں کو چھوڑ کر صرف شمن کی لائبریری ہی میں ملتی۔ حد یہ کہ حبیب کی توجہ ناقابلِ برداشت حد کو پہنچ گئی لہٰذا آہستہ آہستہ اُن کے پیچھے ڈھیلے کرنے شروع کیے ایسے کہ وہ محسوس نہ کریں مگر انہوں نے تو ہرا دیا

کی صفت اختیار کر لی اور جتنا اکھاڑا جمتے ہی چلے گئے۔ وہ آتے اور ہکلائے ہوئے بدحواس سے بیٹھے رہتے۔ اُن کی اس قابل رحم گھبراہٹوں پر شمن مسکرایا کرتی۔ ضرورت سے زیادہ جھینگے سنگھار کر کے آنا شروع کیا اور شمن کی رکھائی پر مکمل مریض عشق بن گئے۔ مگر خاموش اور مسکین ایسے کہ مجسم سوال ہیں مگر زبان بند۔ یہ بوکھلاہٹ بھی کچھ کم مضحکہ خیز نہ تھی۔

اس میں اُس بیچارے کا کیا قصور تھا: جاہل خاندان کا تعلیم یافتہ، عمر میں شاید پہلی مرتبہ ایک غیر اور شریف عورت سے آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو کرنا۔ ویسے لڑکیاں بہت دیکھی تھیں مگر تاک جھانک کر، اب جو یہ جیتی جاگتی، بولتی چالتی مورت دیکھی تو سوائے عاشق ہو لینے کے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ سیدھے سادے آدمیوں کو چلتا پھرتا دیکھ کر حیرت نہیں ہوتی لیکن نٹ کو بانس کی نوک پر قلابازی لگاتے دیکھ کر ششدر ہونا ہی پڑتا ہے۔ تو شمن نے بیچارے کو بازیگر کی طرح مسحور کر کے گنگ کر دیا تھا۔ اس الجھے ہوئے جذبے کو وہ عشق سمجھ رہا تھا اور اس بظاہر معقول وجہ کے عاشق ہو جانے سے شمن کو جبلتِ جنسِ مخالف ہونا معشوقہ بننے پر تو مجبور نہیں کر سکتا اور نہ ہی ہر مرد کو عورت پہ عاشق ہونے کا حق ہے۔

شمن کو اس پر ترس بھی آتا اور غصہ بھی۔ اُس نے تخیل ہی میں اس کی آئندہ زندگی:
ایک مختصر مکان میں معمولی سی بیوی اور غیر معمولی تعداد میں بچے غربت کی گود میں پلتے دیکھ لیے۔
یہ لوگ بس زندگی میں ایک بار اپنے طبقے کو چھوڑ کر عشق رچا لیتے ہیں خواہ وہ یک طرفہ چیز ہو۔ مگر ناکامی لازمی نتیجہ ہے اور شاید ایسا عشق کر کے ناکام ہونا ہی اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔
یہ درمیانے طبقے کا کم حیثیت لڑکا چھانٹ کر اپنے آسودہ حال پروفیسروں کی لڑکیوں جس سیٹھ کے دفتر میں وہ چالیس روپیہ کا نوکر ہو اس کی اکلوتی لڑکی پر عاشق ہو بیٹھتا ہے۔ اگر اچانک کبھی ایسے عشق میں کامیاب ہو جائے تو بھونچکا سا رہ جاتا ہے۔ اسے بھگا کر لے جانے سے بھی خواب چورا چورا ہو جاتا ہے۔ دریا میں ڈوب کر بھی پیاسا رہ جاتا ہے۔ وہ تو عشق صرف نام رہنے کے لیے کرتا ہے تاکہ اُس کے قصے اپنی نئی دلہن کو ٹھنڈی

سانسیں بھر بھر کر بسایا کرے۔ رنڈی کو اپنی بیوی کا رقیب بنانے میں وہ ہتک محسوس کرتا ہے۔ نچلے طبقے کا ہوتے ہوئے بھی وہ عشق جیسے بلند جذبے کو بلندی ہی پر رکھنا چاہتا ہے۔ اپنی بیوی سے کبھی محبت نہیں کرتا مگر اُس کے جنے ہوئے کیڑوں کی پرورش میں انسان سے چرخا بن جاتا ہے، اس کی بیماری پر ہاتھ پیر پھلا لیتا ہے اور ذرا روٹھ جاتی ہے تو ہاتھ جوڑ کر منا لیتا ہے۔ اپنی محبوبہ کا رتبہ بہت بلند سمجھتا ہے مگر اُسے اپنی بیوی سے کم معصوم اور پارسا جانتا ہے۔ اس محبوبہ کو وہ روحانی تمازت کے لیے اپنی شخصیت میں چھپا لیتا ہے۔ اگر اصلی نہیں تو خیالی ہی سہی، وہ ہر طرح اس سے لطف اندوز ہو لیتا ہے۔ جب بیوی حاملہ ہوتی ہے یا میکے چلی جاتی ہے تو اُسے بڑی احتیاط سے نکال کر عشق حقیقی سے جی بہلاتا ہے اور یہی خیالی رقیب وہ بکھری ہوئی بیوی کے سینے میں رشک کی آگ بھڑکا کر اس کی محبت کو اور بھی پختہ کر دیتا ہے۔

جی گھبرا اٹھا تو وہ ٹہلتی ہوئی آم کے پیڑوں کی طرف نکل گئی۔ رضیہ بیگم پان کے پلنگ پر کھڑی چھڑی سے آم جھاڑنے میں مصروف نظر آئیں۔ نہ جانے کیوں وہ اس ادھیڑ عمر عورت کو بوالہوس لومڑی کی طرح کچی امیوں کی تاک میں پھدکتا دیکھ کر چڑ گئی۔ سچ کہتی تھیں مسز ملیجر کہ کچی امیاں کھانے کی بھی ایک بالپن کی عمر ہوتی ہے۔ واقعی بڑھی گھوڑیوں کو ایسے ملک کر آموں پر ٹوٹ پڑنا زیب نہیں دیتا۔ لیکن فوراً ہی اُسے یاد آگیا کہ وہ تو منیجر صاحب کی چٹنی بنانے کے لیے توڑ رہی تھیں!

شمن کو دیکھ کر وہ سوئے ادب پلنگ سے اُتر آئیں اور کنواری لڑکیوں کی طرح جھینپ کر سر ڈھانکنے لگیں۔ ان کی بہ چہرے پر کے آثار پیدا کرنے والی ادا کا مطلب اب تک اُس کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ اتنی بڑی تھیں مگر بہت کم عمر اور چھوٹی سی بن کر رہتیں۔ دیکھیے، کر کے اٹھلانے لگتیں اور گھبرا گھبرا کر بار بار سر ڈھانکتیں اور نیچی نظروں سے شرما کر مسکرانے لگتیں۔ ان کی اس ادا سے آگ لگ اُٹھتی مگر شاید ان کی یہی ادا منیجر صاحب کے کلیجے پر چھری چلا گئی ہو۔

بڑے پیار سے انہوں نے گری ہوئی کیریاں جمع کیں اور اپنی کوٹھڑی کی طرف

چلی گئیں۔ رضیہ بیگم بڑی سگھڑ تھیں۔ یہ محسوس ہوتا کہ ہر چیز اُن کی صفائی اور خوش مذاقی کا نمونہ بنی رہتی۔ سامنے در کے اُوپر گلابی پھولوں کی بیل چڑھا رکھی تھی۔ کیاریوں میں ساگ، اور دھنیا پودینہ اُگا لیا تھا۔ دو چار گملے بھی رکھے تھے۔ شام کو چھڑکاؤ کر کے ننھی ملنگڑی پر بیگم کی طرح صاف ستھرے کپڑے پہن کر بیٹھتیں اور چپراسن سے محلّے کی خبریں سنا کرتیں۔ گو وہ فیشن ایبل نہ تھیں پھر بھی اپنی حیثیت سے زیادہ نئی تراش کے جمپر پہنتیں، پاجامہ ٹخنے ہی رہتا مگر کُرتے کے بجائے قمیص یا جمپر پہنتیں۔ تندرستی اچھی تھی کپڑا خوب کُھلتا تھا۔ عموماً ہلکے خوشگوار شیڈ کے لباس پہنتیں۔ ان کے برخلاف مسز منیجر بیچاری حد درجہ کی پھوہڑ اور ہمیشہ بدحواس رہتیں۔ ایک نہ ایک بچہ کسی نہ کسی صورت میں ان پر چڑھا رہتا۔ نہ تو انہیں کرتوں کے بجائے جمپر پہننے کی مہلت اور نہ اچار چٹنیاں بنانا چاہتیں۔ شادی کے بعد سے وہ خود ایک مستقل اچار بن کر رہ گئی تھیں۔ گھر جیسے گودڑ کی پوٹلی جس میں طرح طرح کے چیتھڑے اور الجھے ہوئے تاگے ٹھنسے تھے۔ گو منیجر صاحب نہایت اعلیٰ قسم کے بدذوق انسان تھے مگر پھر بھی کبھی کبھی گھبرا اُٹھتے اور اسکول کی عمارت کے معائنے کا بہانہ بنا کر رضیہ بیگم کی صاف ستھری پلنگڑی پر آن بیٹھتے اور اپنے حسابوں کی شاندار کلب کا لطف اُٹھا لیتے۔ رضیہ بیگم اُن سے پردہ نہ کرتی تھیں مگر عجب معشوقانہ انداز سے ہمیشہ کسی چیز کی آڑ سے ایسے کھڑی ہو کر بات کرتیں کہ نصف نظر آتیں، پھر کپڑوں کی بھینی خوشبو بھی تھوڑی بہت پہنچ سکتی۔ منیجر صاحب نہایت کھرے اور اپنی صاف گوئی کی بدولت بڑے غیر مقبول تھے مگر انہیں دیکھتے ہی مذاقیہ پھبتیاں کسنے شروع کر دیتے :

"کہیے کیا حال ہے آپ کی بدمزاجی کا؟" وہ ہمیشہ اسی طرح ان کی مزاج پرسی کرتے۔

"کوئی تازہ جھڑپ ہوئی مہترانی سے؟"

"میری کیوں جھڑپ ہوتی؟ وہ ہے ہی آپ کی منہ چڑھی، میری تو بات بھی نہیں سنتی۔"

اسکول کی عام صفائی رضیہ بیگم کے سپرد تھی۔ منیجر صاحب کہتے تھے کہ جب اسکول بڑھ جائے گا تو بورڈنگ کی منتظمہ رضیہ بیگم ہی بنائی جائیں گی۔

"وہ آپ کے کرتے تیار رکھے ہیں، چپراسی کو دے دوں یا آپ خود لیتے جائیں گے؟" وہ اٹھلا کر پوچھتیں۔

"نہیں میں خود ہی لے جاؤں گا۔" وہ نہ جانے کیوں ٹھٹک جاتے۔

"وہ اچار دانی آپ کے گھر میں توڑ ڈالی گئی، اب اگر اچار کھانا ہو تو گھر سے برتن بھجوائیے۔"

"ہاں وہ بچوں نے توڑ ڈالی، میں دوسری بھجوا دوں گا۔"

"پرانا سویٹر بھیج دیجیے گا، ادھیڑ کر نیا نمونہ ڈال دوں گی۔"

"ہیں بنا بنایا ادھیڑ دو گی!" وہ حیرت سے مسکراتے۔

"تو کیا ہوا، کام ہی کیا ہے اور مجھے؟" وہ ٹھنڈی سانس کھینچ کر کہتیں حالانکہ چند روز پہلے شمن نے اُن سے لائبریری کی کتابوں پر نمبر لگانے کو کہا تھا تو کام کی زیادتی کی شکایت شروع کر دی تھی اور آج کس مزے سے سویٹروں کی اُدھیڑ بُن کو تیار تھیں! ادھر حبیب کا رویہ صبر آزما ہو گیا۔ اب اگر وہ ٹال دیتی اور مل نہ سکتا تو پرچہ ہی دے جاتا۔ آہستہ آہستہ اس پرچے کی صورت چند لائنوں سے صفحوں میں تبدیل ہو گئی اور علاوہ دستی آنے کے ڈاک سے بھی آنے لگے۔ کئی بار کی شدید کوششوں کے بعد اگر کبھی ملنے کا موقع بھی ملتا تو عجیب بدحواس اور مبہوت سا بیٹھا رہتا۔ شمن کو اس سے کوفت ہونے لگی۔ نہ جانے دل کے کس کونے کی خوشنودی کے لیے اُسے لٹکا رکھا تھا۔ اُس سے کسی قسم کا لین دین کرنے کا قصد نہ تھا مگر اس کے وجود سے ایک طرح کی قلبی طمانیت ضرور حاصل تھی۔ جب وہ آتا تو نہ ہی اس کا دل اُلٹا سیدھا دھڑکتا اور نہ خون میں سنسنیاں پیدا ہوتیں پھر بھی بعض وقت تو اُسے ملاقات سے محروم کرنے کے لیے ہی اُس کا انتظار کرتی۔

"کہہ دو آرام کر رہی ہیں۔" وہ آتا تو کہلوا دیا جاتا۔ اگر وہ پھر بھی انتظار میں ٹھہرنے کی دھمکی دیتا تو وہ جل کر خاک ہو جاتی۔ اسے یہ ربڑ کی گیند کی طرح ہر بار چوٹ کھا کر لوٹ آنے والی خاصیت سے اور بھی نفرت تھی۔ اُسے چاہیے تھا کہ فرمانبرداری سے

سر جھکا لیے۔ پھر اس کی حماقت کی سزا وہ یوں دیتی کہ اُسے بٹھا کر دوسرے دروازے سے سینما یا خرید و فروخت کو چل دیتی۔ وہاں سے آتے ہی وہ سب سے پہلے یہ معلوم کرتی کہ جمیل کتنی دیر انتظار میں بیٹھا رہا۔ اگر اُسے معلوم ہوتا کہ بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں، ہاتھ پیر سُن ہو گئے تھے تو وہ اطمینان سے مسکرا کر دو چار پیار بھری ملامتیں اپنے آپ کو سنا لیتی، ورنہ بات ہی ٹال جاتی۔

ایک دن چپراسی نے آکر کہا کہ کوئی صاحب ملنے آئے ہیں۔ وہ حسبِ معمول کہنے ہی والی تھی کہ کہہ دو نہیں مل سکتیں کہ چق ہٹی اور ہاتھ میں کمبل کی تہہ پکڑے افتخار کھڑا تھا۔ نہ تو وہ چونکی اور نہ ہی حیرت کے بے پناہ طوفان کو اپنے کسی انداز سے ظاہر ہونے دیا۔ اس زبردست بھونچال کے جھٹکے کو اس نے ایک معمولی لرزے کے ساتھ سہہ لیا۔

افتخار پہلے سے زیادہ دبلا اور بدصورت ہو گیا تھا۔ اس کے بال روکھے اور بے تکے پن سے بکھرے ہوئے تھے۔ جسم پر گھسی گھسائی قمیص اور ردنا کی ہرسی تھی۔ گلے میں ایک میلا سا مفلر لپٹا ہوا تھا۔ بہت بدل چکا تھا مگر اس کے جاننے والوں کے لیے پہچاننا اور بھی آسان ہو گیا تھا۔ اُس نے اب وہ چھلکا اپنے چہرے پر سے اُتار پھینکا تھا جو یونیورسٹی میں مجبوراً چڑھائے رکھنا پڑتا ہے۔ اس کے نقش و نگار دلی جذبات کا عکس بن کر رہ گئے تھے۔ وہ باغی آنکھیں اب کھلے بندوں تلخیاں بکھیرتی تھیں اور ہونٹ مستقل طنز بھری مسکراہٹ میں ڈوب چکے تھے۔ نسبتاً زیادہ بیمار اور چڑچڑا معلوم ہوتا تھا۔ ہنسی میں کڑواہٹ کے ساتھ ساتھ دیوانگی بھی برسنے لگی تھی جسے وہ قطعی چھپانے کی کوشش نہ کرتا۔

"تم اب بھی ویسی ہی ڈرپوک اور دبّو ہو" اُس نے بزرگانہ انداز سے پوچھا "میرے کپڑوں میں بدبو آ رہی ہے اور شاید جوئیں بھی ہوں، تمہارے پلنگ پر بیٹھ جاؤں" مگر وہ بغیر اجازت ہی بیٹھ گیا۔

"آپ کب آئے پہاڑ سے؟"

"ایں؟ پہاڑ سے؟ لاہ... ہاں بھولا۔ میں پہاڑ پر ہی اپنی صحت درست کرنے گیا ہوا تھا نا۔ ہاں..." وہ ہنسا، "تو تمہیں کچھ نہیں معلوم؟"

"نہیں!"

"مگر مجھے تمہاری ہر بات معلوم ہوتی رہی۔" وہ کچھ جز بز ہو کر بولا، "میں نے اخبار میں تمہارے یہاں آنے کی خبر بھی سن لی۔ سوچا چلو تم سے ہی مل آؤں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ اب ہمارا پہاڑ پر نہ میں قائم ہو گیا ہے جہاں دل میں چھ گھنٹے چکی چار گھنٹے۔۔۔"

"ہیں؟ آپ جیل میں تھے؟"

"اور کیا ہوتا؟ خان بہادری کا خطاب ملتا!"

"اور سب کا کیا ہوا؟"

"سارا گروہ پکڑا گیا۔"

شمن حیرت سے منہ پھاڑے رہ گئی۔ کیسا گروہ؟ کیوں گروہ پکڑا گیا؟ یہ اسے ٹھیک طرح معلوم نہ تھا مگر خودداری نے اسے پوچھنے بھی نہ دیا۔ اتنا وہ جانتی تھی کہ افتخار اشتراکی تھا اور شگفتہ، مگر یہ اسے آج معلوم ہوا کہ وہ دہشت پسند بھی ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ کو اس کی بزدل فطرت دہشت پسندی کے تخیل سے جھجک گئی مگر پھر فوراً اس کی بھاگتی ہوئی ہمت لوٹ آئی۔ افتخار اپنی قوم اور ملک کی خاطر مٹ رہا تھا۔ اس نے اپنی جوانی اور زندگی کی بازی لگا کر آزادی چھین لینے کا عہد کر لیا تھا۔ اس کے ہم خیالوں کا حلقہ بولن بدلن بڑھتا جا رہا تھا۔ اور یہ مختصر حلقہ سارے ہندوستان کو اپنی آغوش میں لینے کو تیزی سے پھیل رہا تھا۔ بیداری بڑھتی جا رہی تھی، کسان اور زمیندار کا پرانا رشتہ نیا چولا بدل رہا ہے، اس کے سارے خواب عملی جامہ پہنتے جا رہے تھے مگر اس قدر سست رفتاری سے جیسے جوں کی چال۔ یہ ہندوستان کی ہر چیز رینگنے کی کیوں عادی ہے؟ صدیاں چاہییں ایک طرف سے دوسری طرف گردن پھیرنے کے لیے!

کہ اسے پر افتخار نے بڑی تیزی سے سونگھ سونگھ کر تکنے اور پہچاننے کی کوشش کی مگر اس کی کھوپڑی کسمسا کر رکی تھی۔

"یہ کیا ہے؟"

"معلوم گم شدہ۔۔"

"شلجم ؟ اور مجھے یاد ہے کہ کبھی یہ میری پسندیدہ غذا تھی۔ میری اماں تانبے کی رکابی میں موٹی گھی لگی روٹی کے ساتھ دیا کرتی تھیں۔ ہم چولہے کے پاس بیٹھ کر کھایا کرتے تھے اور جب گھی جمنے لگتا تھا تو چولہے میں سے سلگتا ہوا اُپلے کا ٹکڑا نکال کر اس پر رکابی رکھ لیا کرتے تھے۔ میری بہن کو نیبو بہت پسند تھے۔" وہ گزرے ہوئے زمانے کی سوئی ہوئی یادوں کو جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"نیبو منگواؤں ؟"

"نہیں نہیں مجھے نہیں، میری بہن کو پسند تھے۔" پھر وہ خاموش ہو کر بڑے بڑے نوالے نگلنے لگا گویا جلدی جلدی نیبو منگوا لینے سے وہ مٹا ہوا زمانہ تو واپس نہیں لایا جا سکتا۔ بنّو قبر کی مٹی سے ہم آغوش ہو گئی، اب شلجم اور نیبو کیا کر سکتے تھے۔

"ایلما نے کوئی خط لکھا ؟"

"نہیں تو۔"

"وہ ایک اسکول میں کچھ الٹا سیدھا پڑھانے پر نوکر ہو گئی ہے۔ پہلے نیا گیٹ اسکول سے کچھ الٹی سیدھی تعلیم دینے کی وجہ سے نکال دی گئی تھی۔" وہ مسکرایا۔ "پیٹ کی پکار اتنی تیزی کے ساتھ ساتھ دماغ کو بھی توڑ پھوڑ دیتی ہے۔ جب تک کالج میں رہے والدین کے پیسے یا تعلیمی وظیفوں سے پیٹ اٹا۔ ایسے پھر یا تو کلرکی کر دیا بھوکے مرو۔ ساری ہیکڑی ختم ہو جاتی ہو۔ لیپ کہاں گیا ؟ پکڑا گیا اور اب اسی وائسرائے کے دفتر میں نوکر ہے جس کی موٹر پر بم پھینکنے کی کوشش کی تھی۔ جب وائسرائے کی موٹر گزرتی ہے تو وہ جھنڈیوں کے نشانوں اور ڈھول کو سلامی دیتا رہ جاتا ہے، مگر یہ نہ سمجھو کہ یہ خاک اس کی بغاوت کو دفن کر سکے گی۔ نہیں، یہ جذبہ اندر ہی اندر جلتا رہے گا، جب وہ مر جائے گا تو یہ نامکمل آرزو اُس کی اولاد میں خصلت بن کر باقی رہ جائے گی۔ محبوب کو اس کے باپ نے نہ جانے کیسے بچا لیا اور اُسے سرکاری وظیفے سے بیرونِ جات بھیج دیا گیا۔ وہاں سے وہ پروفیسر بن آیا ہے اور کسی کالج میں پروفیسر ہے۔"

"کچھ مس لوگا کا حال معلوم ہے ؟"

"اوہ، ہاں اصول گیا، انہوں نے نرسنگ کا کورس کنگ جارج ہاسپٹل میں لے رکھا ہے۔ جیل کے ایک حسین تحفے کے سلسلے میں مجھے بھی پندرہ دن ہسپتال میں رہنا پڑا۔ ذرا بھی نہیں بدلی ہیں، بڑی تندہی سے کورس پورا کرنے میں لگی ہیں۔"

"سنا تھا شادی کر رہی ہیں؟"

"ایں؟ شادی، ارے وہ شادی نہیں کرے گی جب تک۔۔"

"کیا؟"

"کچھ نہیں، یہی کہ جب تک کوئی رحمدل اُن کا کنوارپن نہ ختم کر دے۔"

"توبہ؟" شمن جھینپ گئی۔

"ہاں ہاں تم نہیں سمجھتیں، وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ بڑی عجیب چیز ہے۔ وہ اُن عورتوں میں سے ہے جو پیدا ہوتے ہی ماں بن جاتی ہیں مگر شادی سے کانپتی ہیں۔"

"ارے! یہ کیسے؟" شمن کچھ نہ سمجھی۔

"ماں بننے سے میرا مطلب ہے کہ جذبۂ مادری ان میں شدت سے موجود ہوتا ہے مگر شادی کو ایک گھناؤنا فعل سمجھتی ہیں، جب تک کہ۔۔۔"

"اچھا چھوڑیئے، نہ جانے کیا لے کر بیٹھ گئے، یہ بتایئے کیا پروگرام ہے؟"

"شام کی گاڑی سے چلا جاؤں گا، جب تک کے لیے تم ہی بنا دو پروگرام!"

"سنیما چلیے گا؟"

"کہہ تو دیا کہ جیسی تمہاری مرضی۔ مگر سنیما سے ذرا کم دلچسپی ہے۔ سوائے جذبات کو بھڑکانے کے اور تو کوئی مصرف نہیں اُن کا۔ میں ویسے ہی گرم مزاج ہوں۔"

"مگر آج نہ جانے کیا ٹھان کر آئے ہیں جی میں۔"

"بھئی ٹھیک تو کہہ رہا ہوں۔ بھلا خود ہی سوچو کسی کو عشق لڑاتے دیکھ کر مجھے کیا طمانیتِ قلب حاصل ہو سکتی ہے۔ سچ پوچھو تو کامیڈی دیکھ کر غصہ آتا ہے۔ وہ سالا ہیرو کوڑی کام کا نہیں، مگر عیش اُڑا رہا ہے اور ہم ہیں کہ۔۔"

"خیر چلیے ٹریجڈی ہی دیکھ لیں۔۔۔ دلیپ داس پسند ہے؟"

"ادبیات، ٹریجڈی پر تو اور بھی جھنجھلاہٹ آتی ہے، اور دیواس کو تو تھوکنے کو دل چاہتا ہے۔"

"یا اللہ یہ کیوں؟"

"لیچڑ کمبخت، بھاگ جاتا لڑکی کو لے کر۔"

"اونہہ، تو نہ جائیے، یہ کیوں نہیں کہتے۔"

"یہاں ایک پارک بھی تو ہے۔"

"ہاں۔"

"اگر تمہارے ساتھ میرے جانے سے تمہیں اسکول سے نکال نہ دیا جائے تو چلو ذرا کھلی ہوا لگے گی، نہ جانے کب سے مقبروں میں رہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔"

"مگر ایک فائدہ تو ہے ان فلموں سے۔"

"شکر ہے کہ کچھ تو ملا آپ کو۔"

"ہاں ہمارے پوشیدہ امراض کی دواؤں کی تو خوب ترقی ہو رہی ہے۔ یہ دیکھو کہ ہر فلم کے اشتہار کے ساتھ اس کی دوا موجود ہے۔۔ نہیں سمجھیں؟" شمن کے اکتائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہنسا، "تم لوگ بنتی ہو یا واقعی بے وقوف ہو۔"

"جو کچھ بھی سمجھ لیجیے۔"

"ارے بھائی فلم کا آخری شو دیکھ کر جوتی کا ٹھرا چڑھانے کے بعد سڑک کے کنارے نالیوں میں کیا ہوتا ہے۔ مزے سے لیٹ کر فلمی ڈراما دہرایا جاتا ہے۔"

شمن چپ رہی۔

"بعض خوش نصیب تو بازار حسن میں اپنی سادھنا اور رما ڈھونڈ نکالتے ہیں اور بعض۔۔"

"کیا؟"

"کچھ نہیں، تمہیں کراہت آئے گی یہ جاننے سے ان باتوں کو۔ دوسرے یہ باتیں یا تو ضرورت سے زیادہ مقدس ہیں یا فحش کہ ان کا ذکر معیوب سمجھا جاتا ہے۔ نہ جانے ہم

اپنے عیوب کا ذکر سن کر اس قدر چراغ پا کیوں ہو جاتے ہیں؟ اونہہ، جانے دو... ہاں بتاؤ کچھ اپنے اسکول کا حال، استانیوں پر بڑا رعب گانٹھتی ہوگی۔"

"نہیں تو، بیکار۔ اترانے کی مجھے عادت نہیں۔"

دھیمی دھیمی چاندنی پھیلی ہوئی خاموشی کو اور بھی پراسرار بنا رہی تھی۔ پارک میں چاروں طرف زندگی کا احساس موجود تھا مگر خاموش اور دھندلا ایسا معلوم ہوتا تھا نیم خفتہ روحیں سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ چاندنی اور خاموشی نے مل کر آوازوں کو بھاری اور دھیما کر دیا تھا۔

"تمہیں تعجب ہوگا؟" فضا سے مسحور ہو کر افتخار نے کہا۔

"کس بات پر؟"

"اگر میں کہوں کہ مجھے تم بہت پسند ہو۔"

"نہیں!" شمن نے قلابازیاں کھاتے ہوئے دل کو دبوچ کر کہا۔

"اور کیا یہ بھی ضروری ہے کہ میں تمہیں بتاؤں کہ تم پہلی لڑکی ہو جس نے مجھے اس حد تک متاثر کیا ہے؟"

"لیکن یہ سب کیوں؟"

"پتہ نہیں!" وہ متحیر سا تھا، "پتہ نہیں میں یہ سب کچھ کیوں کہہ رہا ہوں تمہیں معلوم ہے کہ میں نے ایک بار نہیں ہزار بار محبت کی ہے، کم از کم یقین تو یہی کیا ہے اور یقین دلانے کی کوشش بھی کی ہے مگر تمہیں؟ تمہیں میں کچھ یقین نہیں دلانا چاہتا۔"

"اور نہ ہی مجھے کچھ یقین کرنے کا حق ہے؟" شمن کو خاموش دیکھ کر بولا۔

"شاید۔"

"اور یہ بھی ایک وہم ہی ہو۔"

"ہو سکتا ہے!"

"تو پھر میں جیل سے چھوٹ کر سیدھا تمہاری طرف کیوں بھاگا؟ جیسے میرے پھپھولوں کے سارے جلتے زخموں کا مرہم تمہارے ہی پاس ہے، تم سے ملتے ہی شفا ہو جائیگی۔

"شاید یہ بھی وہم ہوا"

"اُونہہ، مجھے جلاؤ مت۔ شمن خدا کے لیے مجھے سمجھنے کی کوشش کرو اور کچھ سمجھ میں آجائے تو مجھے بھی سمجھا دو۔ میں کیا ہوں اور کیوں ہوں؟" وہ بھولے بچوں کی طرح التجا بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ شمن کا دل بھر آیا۔ وہ کیا دے سکتی ہے اُسے؟ اس کے پاس انتشار کے دکھوں کا علاج کہاں ہے؟ وہ اس سے کچھ مانگ بھی تو نہیں رہا۔ اُس کی حالت۔ لاوارث بچے کی سی ہے جو گھر سے بھٹک آیا ہو اور والدین کا نام و نشان بھی نہ دے سکے۔ کون کر سکتا ہے ان گم شدہ لوگوں کی رہ نمائی!

"شمن، نہ جانے کیسے میری آرزو ہے میں کسی سے محبت کروں، جی بھر کے محبت کروں۔ مگر میرے دل سے ہر چیز کا اعتبار اُٹھ گیا ہے، مجھے کسی چیز پر یقین نہیں رہا اور خدا کے وجود پر ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ محبت سے مجھے گھن آتی ہے اور خدا پر غصہ کہ وہ کیوں ہے؟ اُس کی کیا ضرورت ہے؟ مانا کہ یہ دنیا اُس نے بنائی، تو ہم پر کیا احسان کیا؟ اُسے سجدے کرانے کا اتنا کیوں شوق ہے؟ اور جو نہ کرو تو دوزخ میں جلانے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ سچ بتاؤ یہ کبڑی بھینگی دنیا تمہیں پسند ہے؟ کہیں اونچائی ہے تو ضرورت سے زیادہ پستی ہے تو انتہا سے زیادہ، پانی ہے تو پانی ہی چلا گیا ہے اور پھر خشکی ہے تو وہ کمبخت بے تکی۔ جی چاہتا ہے اس دنیا کے گولے کو دونوں ہاتھوں سے گوندھ ڈالوں اور پھر اتنی سبک اور نفیس دنیا بناؤں کہ لوگ پیدا ہو کر بھی خوش ہو جائیں۔" شمن کو اس کے بچپن پر ہنسی آئی۔

"مگر آپ تو کہتے تھے ہر مرض کا علاج ہو سکتا ہے۔ آپ اشتراکی ہو کر ہمت ہار چلے ہیں۔"

"میں اشتراکی تو ہوں مگر میری روح تو فاشزم کی عادی ہو چکی ہے۔ اشتراکیت ابھی ہم سے اتنی دور ہے جتنا یہ آسمان زمین سے۔"

"کیا یہ فاصلہ کبھی کم نہ ہو گا؟"

"ممکن ہے کسی دن ہو جائے مگر میں کہاں زندہ رہوں گا۔"

"ارے تو وہ آپ کی اسکیم؟"

"دو چار بم پھینکے، تین چار ریلیں لڑائیں، وائسرائے کی موٹر میں پنکچر ہوتے ہوتے بچ گیا۔" وہ زور سے ہنسا، "نصف سے زیادہ کام کرنے والے جیل میں چکیوں پر جٹ گئے اور کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ یہ گٹھے دیکھو۔" اس نے ہاتھ پھیلائے۔

"چچ۔ ارے ہے، نہ جانے کیوں جاتے ہیں جیل میں۔"

"کہتے ہیں بغیر جیل ہو آئے عوام کو قوم پرستی کا یقین نہیں ہوتا۔ جیسے یونیورسٹی کی مہر کے بغیر سرکاری نوکری نہیں مل سکتی، اسی طرح جب تک جیل کا سارٹیفکیٹ نہ ہو تو لیڈری کے اسٹیج پر نہیں ناچا جا سکتا اس لیے بعض وقت تو بڑی کوششوں سے جیل جانا پڑتا ہے۔"

"چچ۔ بیکار ہیں!"

"جی ہاں بیکار کا ڈھکوسلہ۔ بات یہ ہے کہ ہمارے لیڈروں کے پاس سوائے جیل جانے کے کوئی عملی ثبوت ہے بھی تو نہیں قوم پرستی کا۔ اب یہ نکھٹو دو چار مہینے کی جیل نہ کاٹتے تو عوام الو تھوڑی ہیں اور ان پر پھین ہار کی بارش کیسے ہو۔"

"مگر سب تو نکھٹو نہیں۔"

"ہاں، اور ان کے پاس کوئی حربہ بھی تو نہیں جسے استعمال کریں سوائے سڑک پر جیل جانے کے اور اس کی سزائیں اعمال جانے، کوٹھڑی میں بند کر دیتی ہیں۔ ارے یہ باتیں زبانی نہیں سمجھی جاتیں، سمجھنا ہے تو آ جاؤ میدان میں۔ پر کھدر پہننا ہوگا۔ یہ ململ نہیں چلے گی۔" وہ اس کی ساڑھی کے آنچل کو جھٹکنے لگا۔ "آبلے پڑ جائیں گے۔"

آبلوں کے ذکر سے اسے مس لبوگا یاد آ گئیں۔

"یہ مس لبوگا نرس کیوں بن رہی ہیں؟"

"دل کی بھڑاس نکالنے کو، میاں اور بچے نہ سہی مریض ہی سہی۔"

"ہٹیے۔ وہ تو پاک محبت کی ہمیشہ سے قائل ہیں۔"

"پاک محبت سے تمہارا کیا مطلب؟ ماں اور بیٹے کی محبت۔" آج افتخار لیکچر بازی پر تلا ہوا تھا۔

"نہیں، بلکہ دوستی، ایک دوسرے سے ہمدردی!"
"دوستی کوئی چیز نہیں، ایک عورت اور مرد کی صرف ایک مقصد کے لیے دوستی ہو سکتی ہے اور وہ ...."
"اونہہ جانے بھی دیجیے۔ دنیا میں ہر عورت کو بیوی نہیں بنایا جا سکتا!"
"تم سچ کہتی ہو... ہر عورت کو بیوی تو نہیں بنایا جا سکتا... مگر..." وہ الفاظ ڈھونڈنے کے لیے بالوں کو انگلیوں سے سلجھانے لگا۔ "مگر مس بوگا کی محبت نہیں۔ نہ تو اس میں ماں کا سا معصوم پیار ہے اور نہ محبوبہ کی پرجوش گرمی۔ وہ تو ایک بجھے ہوئے شعلے کی بے حقیقت گرمی بھی نہیں، برف کی طرح ٹھنڈی اور مٹی کی طرح بے جان ہے۔ کچھ بوسیدہ اور گھسی ہوئی سی وحشت ہے۔" وہ ایک دم چپ ہو گیا۔
"اور میری... میری محبت کس قسم کی ہے؟" اس نے سرگوشی میں خود سے پوچھا۔ "یہ میں کس قسم کی محبت کرتا ہوں؟ یہاں کس قدر حسین اندھیرا ہے، تم جو اور میری صدیوں کی پیاسی روح مگر ایک لمحے کو بھی میں یہ گوارا نہ کر سکوں گا کہ تم کو اس بلندی پر سے گھسیٹ کر نیچے لے آؤں جہاں میرے تخیل نے تمہیں بٹھا رکھا ہے۔ کیا میں اتنا شریف ہوں؟ ہنہ!" اس نے لفظ شریف کو حقارت سے تھوکا۔
"یہ آپ اپنی ہر خوبی کو کمزوری اور طاقتوں کو غلطیاں کہہ کر گویا بڑا بھاری انصاف کرتے ہیں۔"
"لاحول ولاقوۃ، مگر میں شرافت کو لیے لیے تو نہیں پھرتا ہوں۔ کیا سمجھتی ہو میں تم سے اپنی پارسائی کا سارٹیفکیٹ لینا چاہتا ہوں۔" وہ واقعی جھلا اٹھا، "ابھی یہاں اس سنسان کونے میں اگر میں چاہوں تو..."
"آپ کچھ نہیں کر سکتے۔"
"کیوں؟" افتخار کا منہ اتر گیا۔
"اس لیے کہ آپ اتنے برے نہیں جتنا آپ کے وہم نے بنا رکھا ہے۔"
"کیوں؟"

"اطمینانِ قلب کے لیے۔ آپ اُن لوگوں میں سے ہیں جنھیں خود پر پھٹکار بھیج کر یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس طرح اُن کے گناہ دُھل گئے۔"

"گناہ؟ مگر کون بیوقوف گناہ و ثواب کا قائل ہے؟"

"آپ کا ضمیر!"

"ہشت، غلط۔ ضمیر ایک غلط فہمی ہے اور کچھ نہیں۔ میں جو کچھ کرتا ہوں..."

"بُرا سمجھ کر کرتے ہیں اور اچھا ہو جاتا ہے۔"

"ایں؟" وہ چونکا۔

"آپ مانیں یا نہ مانیں، مگر آپ دل کے بُرے نہیں۔"

"یعنی زبردستی۔"

"جی ہاں، اگر مجھے اس کا یقین نہ ہوتا تو اس وقت میں آپ کے ساتھ کبھی نہ بیٹھتی۔"

"بڑا ہی تنگ خیال ہوا!"

"جو کچھ بھی سمجھ لیجیے۔ اچھیے اب خنکی بڑھ رہی ہے، آپ کو کچھ ہو گیا تو..."

"تمہاری بلا سے!"

"جی نہیں۔ آپ کی زندگی میری نظر میں اتنی سستی نہیں جتنی آپ نے بنا رکھی ہے۔ ابھی آپ کو دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے، اور دنیا کے لیے مجھے آپ کو زندہ رکھنا ہے۔"

"ہوں، دنیا کے لیے؟ اور کسی لیے نہیں۔" وہ مردہ دل ہو گیا۔ "دنیا کے لیے جیتے جیتے تو اب دل اُچاٹ ہو چکا ہے۔ تمہیں کیا غرض مجھے دنیا کے لیے جلانے کی؟"

"میں بھی تو دنیا ہی میں ہوں۔" شمن کو اپنی ہمت پر سخت حیرت ہوئی۔

"اوہ!" وہ دیر تک خاموش سر جھکائے کچھ سوچنے اور یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا افتخار چلا گیا تو وہ دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ اُس نے امتحان کے دو پلڑوں میں افتخار اور سیتل کو تولنا شروع کیا۔ ایک کے تخیّل ہی سے پیچھے کو دھکا لگتا تھا اور دوسرا ایک مست کن غبار کی طرح چاروں طرف سے اُسے مسحور کرتا جا رہا تھا۔ اتنی دیر ساتھ بیٹھی مگر ایک مرتبہ بھی تو اُسے دو نیم وحشیانہ احساس نہ ہوا جو آخری

مرتبہ سیتی سے مل کر ہوا تھا۔ یہ کیا تھا جس نے اس کی زندگی میں اتنی خاموش ہلچل مچا رکھی تھی۔ یہ نامعلوم سی بے چین کسک، جو بیک وقت شیریں بھی تھی اور تلخ بھی۔ وہ اس کے ایک اشارے پر سب کچھ دے ڈالنے کی زبردست آرزو! اس کا ہر لفظ بھوکے کی پکار بن کر دماغ میں پہنچ کر گڑ جاتا، ہر سانس فقیر کی صدا بن کر گونج اٹھتا تھا۔ یہ سب کیوں؟ کیوں؟ وہ کوئی جواب نہ پا سکی!

(۳۴)

اسکول کے بکھرے ہوئے شیرازے کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹنے کی کوشش میں وہ پاگل سی ہو گئی۔ دوپہر کو جو لڑکیوں کے گھروں سے کھانا آتا [illegible] ادھ کھائی بوٹی بھری پڑیں نکال کر چرا لیتیں، باقی میں [illegible] منہ لٹکاتیں، [illegible] دیکھا کرتیں۔ پہلے تو چپراسنوں نے سینہ زوری کی، پھر جو بھوک ہو گئی تو ایک دن [illegible] چپکے [illegible] کہہ دیا ’’حضور! جو پورا کھانا لے جائیں۔ ہمارا حصہ ضرور بچتا تھا۔‘‘ لیکن یہ بات بھی زیادہ دن نہ چھپ سکی اور ایک دن چپراسنوں کے مظالم کی جو کسی نے شکایت [illegible] چپراسنوں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

’’کیا کریں مس صاحب، چھ روپیہ اور تین بچے، ایک [illegible] ماں اور نکھٹو بھائی کیسے گزر ہو، یہ اللہ مارا پیٹ بھی نہیں مارا جاتا۔‘‘

’’جیسے تیسے تو ہم پڑھا رہے ہیں اپنی بچیوں کو، [illegible] پیٹ نہ بھرے تو ان چپراسنوں کا کہاں سے گلہ کریں؟‘‘ لڑکیوں کے والدین نے دہائی مچائی۔

’’بیس روپے میں مکان کا کرایہ [illegible] اپنا اور بچوں کا [illegible] کیسے پورا کریں؟‘‘ استانیاں جنہیں۔ شمن کو ایسا معلوم ہوا اسکول نہیں [illegible] دنیا بھر کے بھوکے ننگوں کا ایک مستقل یتیم خانہ ہے [illegible] ایک ڈھال ہے۔ اس نے دونوں چپراسنوں کو اپنے پاس سے دو دو روپیہ دینا شروع کیے، جب کبھی ممکن ہوتا استانیوں کی دعوت کر دیتی، ہر ماہ دو چار غریب لڑکیوں کی فیس بھی ادا کر

دیتی۔ مگر اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جتنا جتنا وہ پیٹ بھرنے کی کوشش کرتی بھوک بڑھتی جاتی۔ ایک نیند کو سہہ دسے دو تو دس اور ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جو نہ دو تو بعض شوقین مزاج گالیوں پر بھی اتر آتے ہیں۔ غرض اس دریا دلی کے بدلے بجائے سرخروئی کے جوتیاں ملیں۔ ہر جمعرات کو اچھا خاصا بچے ٹوسے میں بھیک ہی مانگ لاتیں۔ استانیاں نہ بچاری تھیک مانگنے کی ہمت اور نہ لڑکی کے پیچھے کے لائق۔ گھر نہ بار، سدا سے اسکولوں کی خیرات کے سوا کیا وسیلہ زندگی گزارنے کا ہوتا؟ ہر وقت ایسے لرزتیں جیسے قصائی سے گائے۔

مگر رضیہ بیگم بالکل چنگیزی پالیسی کی قائل تھیں۔ باوجود کوششوں کے انہوں نے لڑکیوں کو ایک لفظ بھی پڑھا کر نہ دیا۔ بس ہر وقت بیٹھی منیجر صاحب کے لیے کشیدہ کاری کا جال تیار کیا کرتیں۔ شمن نے ان کی رپورٹ میں شکایت کی مگر وہ رپورٹ انسپکٹرس کے پاس پہنچنے سے پہلے منیجر صاحب نظر ثانی کر دیے گئے اور ان کی شکایت ہی گول مال کر دی۔ رضیہ بیگم شدت سے حاوی ہوتی گئیں۔ شمن کا الٹا وہ چھوڑ کر دہ استانیوں پر قابو پانے لگیں۔ بحالی اور ترقی کی کامیاب سفارشیں ہونے لگیں۔ آمدنی کی کمی کے ساتھ انہوں نے اسکول کی بھی بیماری شروع کر دی۔ شمن کو معلوم نہ ہوا اور وہ منیجر کی آڑ لے کر اس کی ملیدہ میں ڈنک مارنے لگیں۔ اس کے نتیجے میں ان کی رپورٹ پہنچ گئی اور منیجر صاحب فوراً پھٹی پر تل گئے۔ اس کے لباس اور طرز رہائش سے انہیں شریف خاندانوں کی لڑکیوں کا اسکول سے ہٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ وہ فوراً ذرا سی بات کی خبر پا جاتے۔ سکے بجائے اٹھتی ہے کب، وہ کیا کرتی، کیا کھاتی ہے اور کیسی لگتی ہے:

"کس نے کہا آپ سے؟" وہ حیرت زدہ ہو کر پوچھتی۔

"مجھے رعایت کی خبر رکھنا پڑتی ہے صاحب۔" وہ نہایت پراسرار مسکراہٹ چہرے پر طاری کر کے کہتے۔ گویا اسکول کے منیجر کیا۔ آئی۔ ڈی کا کام بھی کرنا پڑتا ہے مجھے عوام کے قومی جذبے کو اس کر کے ... جمع کرنا ہے، بہترا استانیوں کا چال چلن ..."

لفظ چال چلن پر شمن چڑ گئی۔ پتہ نہیں لوگ چال چلن کو کیا سمجھتے ہیں۔ چال

چلمن جیسی کوئی مقدس مقبرہ ہے کہ اس کے آگے ماتھا ٹیک کر نجات کی امیدیں لگا بیٹھیں۔ اگر ایک انسانی زمانے بھر کی آوارہ ہے مگر کام ٹھیک کرتی ہے تو اس مقدس مٹی کی بنی ہوئی معلمہ سے ہزار درجے غنیمت ہے جو خود تو مجبوراً نیک چلن ہے مگر لڑکیوں کا حال اور مستقبل تباہ کرنے میں مصروف ہے۔

"دیکھیے صاحب سنا ہے لڑکیوں کے پاس چٹھیاں آتی ہیں۔"

"کیسی چٹھیاں؟" شمن نے ضبط سے کام لیا۔

"اجی یہی خرافات پرچے غنڈے بھیجتے ہیں۔ آپ ایک کام کیجیے۔ ایسی سب لڑکیاں جن کے پاس خطوط آتے ہیں، جمع کر کے انہیں ڈانٹیے۔"

"مگر یہ کیسے معلوم ہو کہ چٹھیاں کس کس کے پاس آتی ہیں۔ پکڑی جائیں تب نا۔"

"تو صاحب پکڑ لیجیے۔" "گویا چٹھیاں کچھ کبوتر ہیں کہ جب چاہا پکڑ لی جائیں۔ دوسرے یہ چوری ہماری تجربے سے آتی ہے۔ ایسے خطوط ڈاک سے نہیں آتے بلکہ لڑکیاں ہی ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں۔ اپنے بھائی بندوں کی پرچہ بازیاں جاری کرنا ایک عام بات ہے۔ بیس روپیہ پانے والی استانیاں اور کچھ روپیہ کمانے کے لیے رجسٹر پر بیٹھا کر اگر پانچ کا خرچہ اس پرچہ بازی سے نکالیں تو اور کیا کریں۔ اگر لڑکیوں کو ڈانٹو تو والدین چڑھ دوڑتے ہیں۔ بھلا اُن کی معصوم بچیاں یہ ہتھکنڈے کیا جانیں! اور یہ ان معصوموں کا پکڑ پانا بھی معمولی کام نہیں، حد درجے کی ہوشیار ہوتی ہیں۔ کم از کم وہ گروہ ان کی رہنمائی میں یہ فعل کرتی ہیں، معصوم نہیں ہوتے۔ ہزاروں چالیں چل کر خط لائے جاتے ہیں۔ عموماً تو لڑکی کی طرف سے لڑکی کے نام ہوتے ہیں جن پر بازپرس کرنے کے لیے غیب دان ہونا پڑتا ہے۔"

ساتھ ہی امتحان آ گئے۔ بنچیں لگوانا اس چالاکی سے کہ لڑکیاں ایک دوسرے کی نقل نہ کر سکیں۔ کاپیاں لگوانا اور پھر سے دل چوکیداری کرنا۔ انسپکشن کا زمانہ بھی آ گیا۔ اب یہ دیکھنا کہ سارے رجسٹر ٹھیک ہیں، کیسی بھی فضول معلومات سے پُر ہیں یا نہیں۔ لائبریری کی کتابوں اور گشتیہ دستکاری کے نام سے روپیہ نکال کر جب ہیڈمسٹریس صاحبہ اپنی

ساس کا قرضہ اتار دیا اس رقم کی پیپا پوتی میں کون سے گرُ استعمال کیے جائیں۔ منیجر صاحب بھی کچھ ملکدر سے رہ گئے۔

"اچھا صاحب یہ کیجیے کہ لکھ دیجیے رجسٹر میں ... کہ گملے اور پھولوں کے بیج خریدے گئے۔ چلیے چھٹی ہوئی" رائے دینے لگے۔

"مگر ہیں کہاں گملے اور بیج۔ انسپکٹرس نے معائنہ کیا تو؟"

"کہہ دیجیے گا کچھ بچیوں نے توڑ ڈالے اور کچھ میں جنگی کے افسر سے کہہ کر خالی ٹوٹے گملے منگوا لوں گا۔ باغ عام میں بہت بیکار پڑے ہیں۔ کچھ میرے یہاں ہیں وہ بھیج دوں گا، اور آپ ... آپ نے بھی تو کچھ لگا رکھے ہیں؟"

"اپنے تو میں نے تقسیم کر دیے۔ کون چھٹیوں میں رکھوالی کرتا"

"اے لیجیے غضب کر دیا آپ نے تو ... خیر کوئی مضائقہ نہیں"

اور بیج؟"

"اوہ، لکھ دیجیے اُگے نہیں، خراب تھے۔ اور یہ کمبخت ہوتے بھی ہیں گھٹیا واہیات۔ کہیے تو میں کچھ پنساری کے یہاں سے منگوا دوں؟"

"مگر یہ پورے روپیہ کا تو حساب نہ ہوا"

"کچھ بننے کاڑھنے کا سامان میں مکان سے بھجوا دوں گا"

"بہت اچھا"

"اور کچھ کتابیں بک اسٹال سے منگا دیتا ہوں، خراب نہ ہونے پائیں، نہایت احتیاط سے واپس کرنا ہوں گی۔ کچھ چائے پانی کا انتظام ہے؟"

"وہ تو خیر ہو جائے گا، مگر وہ بورڈنگ، اُس کا کیا ہوگا؟ اس کے لیے باقاعدہ رقم ملتی ہے!"

"آپ فکر نہ کیجیے۔ ایسا ہے کہ اس کا میں نے پہلے سے انتظام کر لیا ہے۔ وہ جو مشرقی بازو کے تین کمرے ہیں اس میں پندرہ بیس چارپائیاں ڈلوا دوں گا، بستروں کا بھی انتظام گھر میں سے کر دیں گی۔ کچھ فاضل چادریں اور تکیے ہوں تو آپ دے دیجیے گا۔"

"مگر یہ تو سراسر دھوکا دینا ہے۔ اس طرح فریب دے کر انسپکٹرس کی نظروں میں کیا وقعت رہ جائے گی۔ اگر اُسے کسی طرح پتہ چل گیا؟"

"اب صاحب پتہ چلنے کی کوئی راہ تو ہے نہیں سوائے... خیر... آپ اسکول کی مائی باپ ہیں مجھے امید ہے کہ اسکول کی بہتری کے لیے آپ کو خود فکر لگی رہتی ہے کیا کیا جائے صاحب مجبوری ہے۔ یہ دیکھیے آپ کہ اگر گورنمنٹ سے گرانٹ لینی ہے تو سبھی کچھ کرنا پڑے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں، میں سب کچھ بھگت لوں گا۔ بس جس وقت آئیں تو آپ... ارے ہاں وہ نظم؟"

"نظم؟"

"جی ہاں نظم... تیار کی آپ نے؟"

"میں نے؟ کیوں؟"

"لیجیے صاحب۔ ابھی وہی انسپکٹرس کی شان میں... بخدا بھول گیا۔ دیکھیے جب وہ آکر بیٹھ جائیں تو کسی پیاری سی ڈالی سے گلے میں ہار ڈلوا دیجیے گا۔ عمدہ صاف کپڑے ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی نواسی ٹھیک رہے گی، میں اسے صبح ہی سے بلوا لوں گا۔"

"مگر وہ تو یہاں پڑھتی نہیں۔"

"اجی سب چلتا ہے، کوئی نام بہ نام تھوڑی ایک ایک لڑکی دیکھی جاتی ہے۔ آپ یہ کیجیے گا کہ صبح سے بلوا لیجیے گا... ہاں!"

"جیسی آپ کی مرضی!"

"اور وہاں پھر ہار وغیرہ پہنا کر لڑکیوں سے نظم... چہ، لاحول ولا قوۃ، آپ نے نظم تو تیار نہیں فرمائی۔"

"میں نے عرض کیا نا کہ مجھے نظم لکھنی نہیں آتی۔"

"چہ توبہ، ایسی مشکل ہی کیا ہے! پچھلی مرتبہ رضیہ بیگم نے بنا دی تھی، اگر مل جائے تو وہی چلا دیجیے۔ دو چار لفظوں کا ہیر پھیر کرنا ہوگا... ورنہ پھر دیکھیے میں ہی کچھ سوچوں گا۔" اور وہ چہرے پر شاعرانہ جذبات طاری کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ "ایں؟... ہیں؟"

اُنھیں سوجھ ہی گئی۔ "وہ دیکھیے پاس جو قومی ہائی اسکول ہے اس میں جو جلسے ہوتے رہتے ہیں وہاں ہزاروں نظمیں پڑی ہیں، منگواتا ہوں۔ ہیں.... اسے نقصے.... اور.... ... سلسلے... اوہ معاف کیجیے گا... دیکھ بے ذرا مسعود صاحب کے پاس تو جا لپک کر، کہنا منیجر صاحب نے سلام کہا ہے اور نظمیں مانگی ہیں۔"

"نظمیں ؟"

"اے ہاں گدھے... کہیو... چہ اُلو ہے تو... معاف کیجیے گا... خیر میں خود ہی سے آؤں گا... اور کل تک پہنچ جائے گی، آپ اس میں ردّ و بدل کروا لیجیے گا۔ اسکول میں ایک دن پہلے سے بھجوا دوں گا۔ اور امتحان پرسوں سے شروع کروا دیجیے گا۔ اُس روز پرچہ رکھ دیجیے گا۔" انسپکٹرس کو اردو نہیں آتی تھی تعلیمی انسپکشن سے بچنے کی یہی ایک صورت تھی۔

انسپکٹرس کی آمد کی خوشی میں پاس پڑوس کے جتنے گملے تھے آ گئے، کُرسی میں پودینہ تو کسی میں ہری مرچیں مگر برآمدہ ہرا بھرا ہو گیا۔ کتب فروش نے دس روپئے کرایہ لے کر چار پانچ سو کتابیں بھیج دیں۔ استاد دیکھنے کی کسے فرصت یا فکر تھی کہ ان میں زیادہ تعداد ایسی کتابوں کی تھی جو لڑکیاں چھوڑ کسی کے بھی پڑھنے کے قابل نہ تھیں۔ زیادہ تر سستے بازاری ناول: "میاں بیوی"۔ "شادی کی راتیں" اور مستند کوک شاستر تھے جنھیں بڑی شان سے الماری میں چن دیا گیا۔ ساتھ ساتھ اور ادھر اُدھر کا کوڑا جمع کر دیا گیا۔ پہلے پرانے میگزین، جنتریاں، ٹیلی فون ڈائریاں اور پرانی فہرستیں نہایت صفائی سے کاغذ چڑھا کر ایسے مقام پر رکھ دی گئی تھیں جہاں سے دیکھنے والا کتاب کی ضخامت سے متاثر ہو کر رہ جائے۔ نیز اس کاغذ چڑھانے والی چال کو سلیقہ سمجھے۔ کواڑوں اور کھڑکی ہوئی چوکھٹوں پر تیل اور پانی چڑھا گیا، جگہ جگہ تصویریں اور کیلنڈر وغیرہ چپکا کر دیواروں کی مفلسی پر پیوند لگائے گئے۔ لڑکیوں سے کہہ دیا تھا کہ صاف اور ثابت کپڑے پہن کر آنا تو وہ بڑی کے جوڑے نکال کر پہن آئیں۔ حجابخش چوڑیوں کی جھنکار سے اسکول اندر سبھا کا اکھاڑا بن گیا۔

ایک اور ہوشیاری کی گئی: وہ یہ کہ امتحان کی کاپیوں پر آدھا آدھا پرچہ استانیوں نے بورڈ پر لکھ کر پہلے سے کروا دیا تاکہ اگر انسپکٹرس لڑکیوں کی قابلیت کا اندازہ لگانے پر تلی بیٹھی ہوں اور کسی کو ساتھ لے آئیں تو ان میں ادیب فاضل کی لیاقت کے جوابات حل کیے ہوئے پائیں۔ ان انسپکٹریسوں کے سارے ہتھکنڈوں سے اسکول والوں کو واقف رہنا پڑتا ہے، کوئی چال ان کی نہیں چل سکتی۔

اس کے علاوہ وہ میز پوش اور رومال جن پر "لڑکیوں کی کشیدہ کاری" کے نام سے بازار سے خریدی ہوئی چیزیں اور کچھ مانگے تانگے کے جہیزوں کے میز پوش، پاندانوں کے کور، سلمہ کا بنا ہوا تاج محل اور قریب قریب سارے نمونے رفیعہ بیگم کے کاڑھے ہوئے، سویٹر، ڈریس اور رنگ برنگے فیتے سجا دیے گئے۔ ان میں سے بعض چیزیں تو مشین کی بنی ہوئی اور بیرونِ خانہ کی صنعت گری کا نمونہ تھیں مگر ایسے پیٹرنوں سے یہ سب سامان رکھا گیا کہ صرف رنگوں کی قوس قزح بن کر رہ گیا تھا، نگاہ آنکھ سے دور تھا۔ یہی نہیں کچھ نامکمل چیزیں بھی تھیں جو پاس کے اسکول سے منگا کر سجا دی گئی تھیں۔

بورڈنگ سا بھی نہیں تھا۔ چارپائیوں پر خالی غلافوں میں الا بلا ٹھونس کر تکیے لگا دیے گئے۔ اوپر سے چادریں اور پلنگ پوش ڈال دیے گئے۔ باقی دو چار میزوں پر کتابیں سجا دی گئیں، پیچھے کمرے سج گئے۔ رہیں لڑکیاں تو دو تین چار کلاسوں سے چن کر مقرر کر دیں کہ جب انھیں بلایا جائے تو حاضر ہو کر انسپکٹرس کو سلام کریں۔

خدا خدا کر کے برات کی طرح زور شور سے انسپکٹریس آئیں۔ گیٹ کے پاس جھنڈیاں، لمبا چوڑا خوش آمدید اور کتبہ بنا لگائی ہوئی تھیں۔ ہیڈ مسٹرس نے مع چپراسی اور دو عیسائی استانیوں کے خوش آمدید کہا۔ یہ انسپکٹریس بھی دنیائے تعلیم میں خدا کا سا درجہ رکھتی ہیں، بے تحاشا لاٹ صاحب کی سوا ان کا کام صرف دھوم دھڑکے سے آنا اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا ہے۔

"یہ جالا کیوں؟ یہ اینٹ کیسی؟ یہ گردا کس لیے؟" اب ان سے کوئی پوچھے سال میں دو مرتبہ اگر آئیں اور جالے اور گردھوں میں پھنس گئیں تو کون سی قیامت آ گئی۔

سیدھی طرح آؤ، ہار پھول پہنو، تعریفی نظمیں سنو، تازہ تازہ پھل اور مٹھائیاں جو ہیڈ کے لیے منگا رکھی ہیں، وہ چکھو، کچھ تمہارے ساتھ چپکے سے باندھ کر گھر پہنچا دیں گے، وہاں اطمینان سے چکھنا۔ بس اس سے زیادہ دخل در معقولات کی فہرست میں داخل! کیا فائدہ بری رپورٹ سے! چیف انسپکٹرس کب کب آتی ہے اور کتنی دیر کو آتی ہے! اس سرسری معائنے کی سرسری ہی رپورٹ ہو، ورنہ خواہ مخواہ تمہارا ہی حلقہ بدنام ہو جائے گا۔ اول تو ہم ہندوستانی ہیں، بدانتظامی، دھوکا، جعلسازی ہمارا پیدائشی حق؛ دوسرے ہمارا شمار پسپت اقوام میں ہے۔ اب تو چپڑاسی اور دو دو! تم بیکار مغز پاشی کر رہی ہو۔ تمہاری بلا سے جو رسیدوں پر جھوٹے دستخط ہیں، جو منیجر صاحب نے خود اُلٹے ہاتھ سے کر لیے ہیں اور فرضی انگوٹھے تنخواہ کے رجسٹر میں لڑکیوں اور چپراسنوں سے لگوا لیے ہیں۔ تم کیوں پڑتی ہو ان جھگڑوں میں!

اس پر بھی جو تم نہ مانیں تو مقامی قومی اخبار کے ذریعے تمہارے چال چلن، خفیہ رشتوں اور سیروں کا پول کھول کر رکھ دیا جائے گا، تم فرقہ پرست الگ مشہور کر دی جاؤ گی۔ زیادہ نہیں چار پانچ روپے کا خرچ ہے، سحرالبیان ایڈیٹر تمہاری سات پشتوں تک کی دھجیاں بکھیر کر پھینک دیں گے۔ ہم جو جھالے تم کو دے رہے ہیں بس علین مین یہی لے کر اپنے افسروں کے سامنے رکھ دو۔ اس معائنے کے اچھے شکریے کے انعام میں جو ہم یہ چاندی کا بکس علاوہ مٹھائی کے دے رہے ہیں اس میں سے کچھ اپنے افسر کے بکس میں پہنچا دو۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب کی نواسی کے ہاتھوں ہار پھول پہن کر انسپکٹرس نے ذرا ٹیڑھا راستہ اختیار کیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" پیار سے پوچھا۔

"اول، ہٹ!" لاڈلی نواسی نے جواب دیا اور منیجر صاحب کی روح قبض۔

"اوہو ہو... شرماتی ہے... بولو... بیٹی نام بتاؤ... بولو" بیچارے مدد کو دوڑے۔ اصل میں وہ خود بچی کا نام بھول گئے تھے۔

"وحیدہ!" کسی نے سہارا دیا۔

"کس کلاس میں پڑھتی ہو وحیدہ!"

"بولو... بولو بیٹی وحیدہ... بچ... ہاں ڈرو مت... ڈرتی کیوں ہو؟" حالانکہ بچی نہایت گستاخی سے انسپکٹرس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہی تھی اور ادھر مارے خوف کے دراصل منیجر صاحب پیلے ہوئے جا رہے تھے مگر بچی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"ابھی یونہی آتی ہے۔ کلاس ولاس میں تو کچھ نہیں... بڑے آدمی کی لڑکی ہے، یہ اسکول آتی ہے تو عوام کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔" منیجر کو تمام گر یاد تھے۔

چائے اور ناشتے سے صاف انکار! یا خدا! ضرور کسی نے کان بھر دیے ہیں۔ گزشتہ سال جو انسپکٹرس آئی تھی بچاری کتنی اچھی تھی۔ مزے سے میٹھی نظم سن سن کر گائے کی طرح چارہ سا جگالی کرتی رہی، پر یہ تو پوری دہ تھی۔

"ہیں ہیں ہیں۔ آپ کو پسند ہوں تو بنگلے پر پہنچوا دوں.... جی..." منیجر اپنے سوکھے ہاتھوں کو دھونے کی نقل میں ایک دوسرے کے گرد لپیٹنے لگے۔

"یہ چنگی کے گملے ہیں!" صاف تاڑ گئی۔

"ہیں چنگی! چنگی واللہ!" منیجر صاحب مصنوعی حیرت اور خوف کے ملے جلے حملے سے اور بھی زرد اور نڈھال ہو گئے اور لڑکھڑاہٹ چھپانے کو گملے کے پیندے میں لگے ہوئے نمبر کو بغور پڑھنے لگے۔ کمبخت چپراسی نمبر مٹانا بھول گیا!

"اوہ! جی ہاں چنگی کے تو ہیں ہی" وہ اطمینان کا سانس بھر کر بولے، "سکریٹری صاحب نے امداد کے طور پر عطا فرمائے ہیں" تیجیے ایک مد اور رجسٹر سے کم ہو گئی دوسری مفت کی رہی۔

شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ نہ جانے کس پُراسرار طریقے سے رجسٹر میں گملوں کی مد کے آگے لکھا تھا: ابھی آئے نہیں ادائیگی پیشگی ہو گئی، مگر انسپکٹرس تو آج خود ان ہی کے منصوبے کا نتیجہ آئی تھی۔

روپیہ گملے کافی سے زیادہ ہیں، اور ضرورت نہیں —— روپیہ واپس لے لیا جائے۔"
اُس نے گملوں کی باڑ پر چھری پھیر دی۔

یہ ہوتا ہے کہ اگر پہلے ہی وار میں انسپکٹرس کو گھیر کر بدحواس کر لو تو بھیگی بلی کی طرح ہر بات پر میاؤں کر دالو۔ اگر ہاتھ اوچھا پڑا اور نکل گئی پھسلتی سے تو بس مست ہاتھی کی طرح گرجتی برستی سب چیزوں کو روند کر کھلیان کر دے گی۔ اور یہ نئی انسپکٹرس تو بالکل تازی گھوڑے کی طرح چاروں طرف ٹاپیں ڈاٹنے لگی، مگر منیجر صاحب بڑے بڑے جن کھلا چکے تھے۔ نہ جانے کدھر سے کتابیں اڑا دیں، کچھ رہ گئیں، وہ ایسی کہ وہ قیمت کا اندازہ ہی نہ کر سکی۔ دستکاری اس نے باوجود شدت سے التجا کرنے کے نہ دیکھی۔ امتحان کا وار بھی کچھ اوچھا پڑا۔ پہلے تو دو چار کاپیاں دیکھیں، منشی سے کھسر پھسر کی، پھر کہہ دیا کہ چونکہ امتحان ہو رہا ہے تعلیمی معائنہ پھر ہوگا۔ کس دن؟ یہ مقرر نہیں، بے کہے گولہ آن گرے گا۔

اس کے بعد اُس نے قطعی ہلاکو خاں والی پالیسی اختیار کی۔ جیسے لڑکیوں سے فی الحال استانیوں کا امتحان لے لیا جائے تو خوب رہے گا۔ منیجر صاحب کے پیروں تلے کی زمین سرک گئی اور سر پر مصیبت ٹوٹ پڑی۔ مارے بوکھلاہٹ کے بدکے ہوئے اونٹ کی طرح چاروں طرف دوڑنے لگے۔ اس گھبراہٹ میں کئی گملے، جو سجاوٹ کے خیال سے نہایت خطرناک جگہوں پر نازک سہارے سے ٹکا دیے تھے، پھسل پڑے اور وہیں لکم، مع تمام بانسوں اور تختوں کے اُن پر سے نچھاور ہو گیا۔ رضیہ بیگم کا پیٹ کی خرابی کا پرانا مرض اُبھر آیا اور وہ نڈھال ہو کر اپنی پلنگڑی پر جا پڑیں۔ دوسری استانیاں بھی ادھر اُدھر نڈ ہو گئیں۔ صرف عیسائی استانیاں پھنسیں، مگر وہ تھیں بھی غنیمت۔

اسی عرصے میں باہر گنوار کے منیجر صاحب نظم خوانی کے لیے لڑکیاں بلا لائے۔ شاید ڈھول تاشے سے معاملے کی ٹریجڈی کچھ کم ہو جائے۔ کہتے ہیں سنگیت میں بلا کی طاقت اور جادو ہے، بجھی ہوئی شمعیں جل اٹھتی ہیں، بدمست ہاتھی ماتھا ٹیک دیتے ہیں۔ مگر غضب ہو گیا۔ نظم کے بند بغیر تبدیلی کیے لڑکیوں کے سپرد کر دیے گئے اور تعلیمی جلوس

کا ہاتھی اپنے بدلے صوبے کے کمشنر کی شان میں نظم سن کر اور بھی بدمست ہو گیا، مگر بجائے غصہ ہونے کے وہ بڑے زور شور سے قہقہے لگانے لگی۔ مینجر صاحب جو اب تک بے تالی ٹوٹی ٹانگوں کو صرف قوتِ متخیلہ کے ذریعے روکے ہوئے تھے بے طرح لرزنے لگے اور خود بھی بدحواس ہو کر ہنسنے لگے۔

"کوئی دوسری چیز گاؤ،" رسانیت سے حکم ملا۔

"ہاں ہاں کوئی دوسری چیز سناؤ۔ وہ گاؤ، لب پہ آتی ہے... چلو کمبختو منہ کیا دیکھ رہی ہو، شروع کرو۔" مینجر صاحب لڑکیوں کی صف کے آگے پیچھے دوڑ دوڑ کر بتا بات دینے لگے۔ "گاؤ... ہاں، لب پہ!" مگر لڑکیاں مبہوت اور شرما گئی ایک دوسرے کی پیٹھ میں گھسنے کی کوشش کرتی رہیں۔

"یہ... یہ دیکھیے مس صاحب، میں تو ہار گیا ان سے۔ آپ کو نہیں معلوم، آپ نہیں جانتیں ہماری قوم کس قدر پستی میں گری ہوئی ہے۔ یہ سب غریب اور نچلے طبقے کی بچیاں ہیں جن کے گھروں میں کوئی الف کے نام بے نہیں جانتا۔ میں تو تھک گیا سمجھا سمجھا کے۔ اوہ... ارے خدا کے واسطے..." لڑکیوں نے ان کی رقت آمیز آواز سے غور کر کے "لب پہ آتی ہے" شروع کی مگر باوجود کوششوں کے کچھ بھی لب پہ نہ لا سکیں۔

"اچھا، یہی گاؤ، سارے جہاں سے اچھا... چلو شروع کرو۔"

جھٹ بڑے جوش سے ایک لڑکی نے پنچم سر کو گھسیٹ کر سُر کی رسے پر گلے کی آخری جھنجھنا ختم کر دی۔ سُر بہت اونچا تھا، ایسا معلوم ہوا جیسے انڈا چھوڑ کر اڑتی اور منڈلا کر دلیں گر پڑی۔ پھر لاکھ خوشامدوں کے بعد ایک دوسرے کے کہنیاں مار کر دوپٹوں میں ناکیں چھپا کر ایک لڑکی نے از سرِ نو تان کھینچی اور کھرج سروں میں ہندوستان کے سارے جہاں سے اچھے ہونے کا گلا گھونٹنا شروع کیا، دم بلبلا اٹھا۔

"بس کرو۔" انسپکٹرس اُٹھ کر چلنے لگی۔ دل شکستہ اور شرمندہ لڑکیاں چوٹ کھائی ہرنیوں کی طرح بنچوں میں الجھتی گرتی بھاگیں۔

"ہم جانتے ہیں آپ کا یہ اسکول کیا ہے اور کیوں قائم ہے لیکن ہمیں جان بوجھ کر پست

اقوام کے ساتھ رعایت کرنی پڑتی ہے، سرکار کی یہی پالیسی ہے ورنہ یہ اسکول دو دن بھی قائم رہنے کا حقدار نہیں۔" رپورٹ پر اس نے "اطمینان بخش" لکھ کر حقارت سے کہا اور منیجر صاحب نے کھل کر سانس لی۔ خیر سے بلا ٹلی، اور بڑی نہیں ٹلی۔ جلدی سے اعزول نے گلاب جامنوں کی پوٹلی سنبھال لی جو انسپکٹرس نے چھوئی بھی نہیں تھی۔

"اجی یہ اُجڈ کیا جانیں ان لقموں کا مزہ!" انہوں نے پیار بھری نظروں سے مٹھائی کو دیکھا اور چل دیئے۔

شمن سارا دن کچھ مردہ دل رہی۔ رعایت؟ آخر کیوں؟ ان نیچے لوگوں کے ساتھ ہر ایک کو دیا ہی سوجھتی ہے۔ کم زور ہیں، جاہل ہیں، ناکارہ ہیں اس لیے خیرات کے حقدار ہیں۔ تو پھر ان لیپت قوموں کو دنیا پر سیاہی اور عفونت پھیلائے رکھنے کا حق ہی کیا ہے؟ کیوں نہیں انہیں بھی ملک کے پیڑ کی جڑ میں لگے ہوئے خطرناک کیڑے کی طرح سپرٹ ڈال کر جلا دیتے۔ لیول نیچا رکھ کر اور پستی میں گراتے جانا تو سراسر حیوانیت ہے۔ کہتے ہیں اگر بھاری طوفان اور آندھیاں آئیں تو وہ سارے کوڑے کرکٹ کا خاتمہ کر جاتی ہیں۔ یا خدا تو پھر یہاں وہ طوفان کب اُٹھے گا جو ساری پستیوں کو کچے رنگ کی طرح بہا کر کیچڑ کے ساتھ بہا لے جائے گا۔ پھر لوگ لیول پستی کو اور پستی کی طرف ڈھکیلنا تو چھوڑ دیں گے۔

(۳۴)

انسپکٹرس نے رپورٹ تو نہایت معصوم دے دی مگر کچھ زبانی گفتگو ہوگئی کہ گرانٹ ملنے میں مہینے لگ گئے۔ نئے معائنوں کی آئے دن دھمکیاں آنے لگیں، منیجر صاحب کا دوڑتے دوڑتے برا حال ہوگیا۔ اس سال جبڑا اور دل بھی بچتوں کی نہ بنی، بیوی نے لاکھ خوشامد کی کہ چولہے میں ڈالو یہ قومی خدمت اور وہی اپنی پرانی وکالت سنبھالو، جو کچھ آئے گی تنگی ترشی سے گزر تو ہو جائے گی، یہ تو نہیں کہ اپنے بچے ویران، سوانگ، دوسرے لوگ چاروں طرف سے بوٹیاں نوچ رہے ہیں: استانیوں کی چار ماہ کی تنخواہ چڑھ گئی، چپراسی

نے ایک دم بغاوت کر کے استعفا دے دیا اور پیشہ ہی بدل کر انیٹیں ڈھونے پر نوکر ہو گیا، چوکیدار، مہتر اور دوسرے چھوٹے موٹے کام کرنے والا نوکر بھاگ ہی نہیں گیا بلکہ کچھ فرنیچر بھی غائب کر گیا۔ وہ لے دے بچی کچھ تو پہلی مینجر صاحب بیچارے ہکا بکا چاروں طرف منہ پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگے، جیسے جنگلی چڑیوں کی ہٹی یکا یک کھل جائے تو چڑیمار کبھی ادھر اور کبھی اُدھر جھپٹتا ہے اور جب ایک بھی چڑیا ہاتھ نہیں آتی تو تھک کر نہایت اطمینان سے پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہے اور مزے سے اُن کی پرواز دیکھتا ہے۔ "اُڑو، میری بلا سے جہاں جی چاہے اُڑ جاؤ اور مجھے بھی اُڑا لے جاؤ۔" مینجر صاحب بھی تھک کر رفیعہ بیگم کی پلنگڑی پر لیٹ گئے اور مزے سے اسکول کی بربادی دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر تو شمن اس طوفان کی بدحواسی پر بھونچکی کھڑی سمت ٹٹولتی رہی گو اُس کے لیے اس سے بہتر اسکول بہتر مشاہرہ لیے موجود تھے مگر جہاں ایک ہی بار سرائے ہی کی طرح تھوڑی دیر کو قدم رکھا وہاں سے آگ لگتے ہی بھاگ نکلنا انتہائی بزدلی معلوم ہوئی۔ اُسے کچھ معلوم بھی نہ تھا کہ کیا کرنا چاہیے اور کیونکر کرنا چاہیے، بغیر سوچے سمجھے وہ الٰہ آباد ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ چل دی۔

محکمۂ تعلیم کی عظیم الشان عمارت سے ذرا سی بھی علم کی ضوپاشی نظر نہ آئی۔ تعلیمی کا ہے کو کوئی کاروباری ڈپارٹمنٹ ہے۔ ایک حصے پر ہسپتال کا شبہ ہوتا تھا۔ گیلری میں ایک قطار سہمی ہوئی عورتوں کی بیٹھی تھی جو کسی نوکری یا وظیفے کی امیدواری میں آئی تھیں۔ سب کی سب نہایت لاغر، بیمار، دکھیا اور نادار نظر آ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر شعبے میں ناکام ہونے کے بعد پیٹ پالنے کا آخری سہارا محکمۂ تعلیم ہی میں ملتا ہے۔ یا تو بدصورتی اور غربت کی وجہ سے میاں نہ ملا یا بیوہ ہو گئیں اور جن پر جا کے پڑیں انہوں نے نکال دیا، بال بچوں کی خاطر یہ پیشہ کر رہی ہیں۔ چاہے تعلیم کا رتی بھر شوق نہیں، دماغ گوبر ہے، پڑھانا تو درکنار پڑھنے ہی کی طاقت نہیں مگر چلی آ رہی ہیں۔ اِدھر محکمۂ تعلیم کو بھی کسی نہ کسی طرح تعلیمِ نسواں کو ترقی دینا ہے، پہلے گمان میں یہ انسانی میل کچیل اور کوڑا ہی سہی اچھا مال بھی آنے لگے گا۔

ان میں سے ایک بیٹھی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھیں اور اُدھر اونچی آواز میں اپنے سسرال والوں کے دکھڑے سناتی جا رہی تھیں جنھوں نے اُنھیں کچھ کے دیے دیے کہ اس کام پر مجبور کیا۔ دوسری بیٹھی اپنے بچے کی اصلاح کر رہی تھیں اور پاس بیٹھی ہوئی تیسری عورت سے زمانے کی تنگیوں کا دکھڑا رو رہی تھیں۔ تین چار اونچی آوازیں ملنے والی نوکری میں بھی میکھ نکال رہی تھیں۔ اور یہ سب استانیاں بننے آئی تھیں۔ اور دوسرے معنوں میں آنے والی نسلوں کا نقشہ کھنچا ہوا تھا۔ کچھ ہو جائے، کیسی بھی تعلیم دی جائے، برسوں ٹریننگ پلائی جائے، یہ گھٹی میں پڑی ہوئی چھوٹی چھوٹی کمزوریاں نسلاً بعد نسلاً چلتی جائیں گی۔ شمن کا جی چاہا ایسی تعلیم کے لیے کوشش کرنے سے تو بہتر ہے کہ لوٹ چلے، گھر جائے اور شادی کر کے ننگوں بھوکوں کی تعداد بڑھانے لگے جو اُس کا قومی ورثہ ہے، کیا حاصل اس مغز پاشی سے؟ جب بیج ہی گھنا ہوا ہے تو پودے کے اُگنے اور پنپنے کی آس لگانا فضول ہے... مگر....

وہ اتنا ہی سوچنے پائی تھی کہ چپراسی نے آکر اسے چلنے کو کہا۔ کئی گھنٹے کی [illegible] کے بعد یہ طے ہوا کہ اسکول کو گورنمنٹ اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے، ہیڈ مسٹریس وہی رہے باقی اسٹاف بدل دیا جائے۔ سوال یہ تھا کہ منیجر صاحب جو اتنا روپیہ قومی اسکول کی ترقی کے لیے لگا چکے تھے اس کا کیا کیا جائے۔ رسیدوں سے تو ان کا کافی روپیہ نکلتا تھا۔ خیر یہ سوال بعد کے لیے اُٹھا رکھا گیا، اسکول پر سے قومی ٹھپہ ہٹا کر گورنمنٹ کا بنا دیا گیا۔

اسکول نیا چولا پہن کر جو اُٹھا تو تھوڑی ہی دیر میں لوگوں کی توجہ بھی اُس کی طرف مبذول ہوئی۔ داخلہ بڑھا، منیجر صاحب عرصے تک اپنا روپیہ وصول کرنے کے پیچھے بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ عجیب کشمکش میں پڑ گئے معلوم ہوتا تھا اُن سے کوئی کام نہیں ہو سکتا، بیوی نے اور زندگی تلخ کرنا شروع کی۔ اسی مدّوجزر کی رَو میں گرتا پڑتا کر انہوں نے رضیہ بیگم سے نکاح کر کے دو مستقل محاذ قائم کر لیے جہاں انہیں آم کی چٹنی سے بھی زیادہ چٹپٹی زندگی سے دست و گریباں ہونا پڑتا۔ پھر سنا ان پر مالیخولیا کے مرض کے خفیف سے حملے ہونے شروع ہو گئے۔

اسکول میں ہندو اور عیسائی لڑکیوں کی تعداد بڑھ گئی مگر مسلمان لڑکیاں اور کم ہو گئیں۔ اسکول جب تک اسلامی نہ ہو اسلامی پانی کی طرح اس کی طہارت پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

استانیوں کا نیا گروہ کچھ اس شان سے وارد ہوا کہ پتہ تو سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کالی ہیں یا جینت، اچھا پڑھا سکتی ہیں یا نہیں؟ کیونکہ یہ استانیاں گرگ باراں دیدہ تھیں۔ ایک ایک محکمے میں بیس بیس سال سے جمی ہوئی تھیں۔ ایک چھوٹی بڑی لڑکیوں کا بیس سال کا ریکارڈ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ کسی اسکول میں گزارہ نہ ہو سکا۔ چونکہ گورنمنٹ کا معاملہ دھینگا مشتی ہی ہوتا ہے، بس ایک اسکول سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں، اور جو وہاں بھی بہت جوتم پیزار ہوئی تو چوتھے اور پانچویں میں۔ ایک جگہ جم کر رہنے کی نہ تو عادت اور نہ شوق باقی رہ گیا تھا۔ جب ایک اسکول میں ہیڈ مسٹریس سے لے کر چپراسن تک سے مار کٹائی تک نوبت پہنچ جاتی، اور مفت سوا دو دینے والے اور ... جینا دوبھر کر دیتے تو یہ دو ایک انسپکٹرس کے پاس پہنچتیں اور تبادلہ کروا لیتیں۔ بھلا دشمن کو کون گنتی میں شمار کرتی ہے!

ان میں سے ایک باقری بیگم تو بس معلوم ہوتا تھا کہ چھوٹی دو نمبری عمر کی لگی تھیں اور کئی اسکولوں میں چکر لگا چکی تھیں۔ کسی کا کہا مانتا تک نہ سمجھتی تھیں اور پابندیوں کو جھٹکا رکھی زیادتیاں۔ بہت جلد انہوں نے کئی لڑکیوں اور استانیوں سے کہلا دیا کہ اگر ذرا بھی چوں چرا کی تو اسکول سے جڑ سے اکھاڑ دیں گی۔ انہیں اپنی قسم پر بڑا ناز تھا اور سب کو یقین تھا کہ ان کی کھائی قسم پوری ہو گی۔

دوسری مس سائمس عجیب بٹی ہوئی رسی تھیں۔ ادھیڑ عمر عورت تھیں۔ ذرا سی بات پر بھوت کی طرح چڑھ بیٹھتیں اور پھر گھنٹوں منانے کو چاہتیں۔ ایک دوست مسز ٹرپاٹھی ان کے ساتھ رہنے کی خدمت انجام دیتی تھیں۔ مسز ٹرپاٹھی ادھیڑ عمر کی لطیفہ گو عورت تھیں۔ یہ دونوں ہمیشہ انگریزی میں ایک دوسرے سے پیار محبت کی باتیں کرتیں اور لڑتیں بھی انگریزی میں۔ جونہی لڑائی شروع ہوئی مسز ٹرپاٹھی مس سائمس کو غصہ دلا دیتیں کہ فوراً کھانے پینے کا خرچہ دینے کی دھمکیاں دیتیں اور مسز ٹرپاٹھی روتیں۔ دنیا

ہیں معلوم ہوتا تھا ان دونوں کا کوئی اور نہ تھا۔ ساری محبت اور غصہ ایک دوسرے پہ اُتار رہیں۔ ان لڑائیوں کے چرچے دور دور پھیلے تھے اور محبت بھی کچھ کم مشہور نہ تھی۔

باوجود ان تمام باتوں کے اسکول کا رہٹ رُوں رُوں ایک لطیف نغمے کی روانی سے چل رہا تھا۔ داخلہ اطمینان بخش، نتیجہ اطمینان بخش، تعلیم اطمینان بخش۔ اس اطمینان بخش فضا نے دل میں ایک نہایت ناقابلِ اطمینان تکان، سستی اور مُردہ پن پیدا کر دیا۔ معلوم ہوتا جیسے پرشور زندگی، دوڑتے دوڑتے سیدھے اور سپاٹ میدان میں رینگنے لگی ہو! اس گھسٹتی ہوئی دنیا میں سب آنکھ بند کیے عمر کی لکیر پر خاموش چلتے جا رہے ہیں، ایک دوسرے سے ٹکر ہوگئی تو بھی کاندھا بچا کر آگے گھسٹ گئے۔ زندگی دھیرے دھیرے کھسک رہی ہے، وہی نیم خفتہ ٹنن ٹنن۔ گھنٹہ وقتِ مقررہ پر جاگ کر انگڑائی لیتا ہے، اور پھر اونگھ جاتا ہے اُس کی ہر کروٹ دو قدم آگے یا دو قدم پیچھے گھسیٹ لاتی ہے۔ وہ اُداس سویا ہوا زہر جس پر جمائیاں لیتی ہوئی استانیاں، جن کا بس نہیں چلتا کہ اس سست رفتار گھنٹے کو جھنجھوڑ کر جلدی جلدی دوڑنے پر مجبور کر دیں۔ یہ منٹ کی سوئی اتنی کاہل کیوں ہے! کیا عاقبت کا توشہ ساتھ لیے جاتا ہے! اور اگر یہ سیکنڈ کی سوئی ذرا لپک کر چلے تو دنیا اس کے ٹھوکروں سے جاگ اٹھے۔ یہ وقت اس قدر ہولے ہولے چوری چھپے نہ چلتا تو انسان اتنا کاہل کبھی نہ ہوتا۔ ٹک ٹک وہ بھی جلدی جلدی مشین کے پرزوں کی طرح چلتا۔

اور فضا بھی تو بھاری بھاری ہے! جیسے کوئی خوفناک طوفان تلا کھڑا ہے، ٹھیس لگی اور بند ٹوٹا۔ پھر کوئی نہیں جانتا کہ امرت برسے گا یا شعلے مگر ایک خاموش بے اختیار سے انتظار نے ہر ایک کو تھکا رکھا ہے۔ ایک نامعلوم بوجھ سے کندھے ٹوٹے جا رہے ہیں۔ کیا ہوگا؟ کب ہوگا؟ اور کیوں ہوگا؟ یہ کسی کو نہیں معلوم! مگر ہوگا ضرور کچھ نہ کچھ۔ کپڑا سستا، اناج کوڑیوں کے مول۔ مگر کوڑیاں خون کے مول بھی نہیں! یہ آخر دنیا میں پیسہ اتنا کم کیوں ہوا جاتا ہے؟ یہ جو گھروں میں تانبے کی پتیلیاں ہیں انہیں گلا کر پیسہ بنایا جا سکتا ہے!

دنیا سستی، انسانیت سستی، حیوانیت سستی پھر بھی یہ کنگالوں کی تعداد میں کمی کیوں نہیں آتی؟ معلوم ہوتا ہے اناج کے ہر دانے کے ساتھ دس بھوکے پیٹ ہوئے زمین ہی سے اُگ آتے ہیں اور ان کی ساری عمر اسی ایک دانے کی چھینا جھپٹ میں بیت جاتی ہے۔ اتنا وقت کہاں جو کسی اور چیز کے لیے بھی ہاتھ پیر ہلائیں۔ کہتے ہیں اور لوگ لوٹ کھسوٹ، زر، جواہر اور عزت کی خاطر خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں، مگر یہاں تو عزّت تو چھوڑ اپنی کیچڑ بھی نہیں جس کے لیے یہ بھوکے کبھی کسی سے لڑیں۔

فضا کی گھٹن اور بڑھ گئی۔ لوگ ہوا کو سونگھ سونگھ کر عجیب انداز میں سر ہلانے لگے۔ جیسے طوفان کی بو پا کر کیڑے مکوڑے پناہ گاہوں کو بھاگ نکلتے ہیں، اسی طرح بازار میں بھگدڑ سی پڑ گئی۔ بنیوں نے سونا چاندی سمیٹ کر دھرتی ماتا کی چھاتی میں چھپانا شروع کر دیا۔ طوفان کا دھماکا اتنا گہرا نہیں ہوگا کہ ماتا ان کی امانت بھی اگل دے۔ آسمان پر سرخ ستارہ یکایک تازہ زخم کی طرح پھوٹ نکلا۔ لوگوں نے اس میں سے لہو ٹپکتا دیکھا۔ چاروں طرف سے غیر مرئی گھٹائیں امڈنے لگیں اور خاموش گرج نے دل و دماغ ہلا دیئے۔

پکّا پھوڑا پھوٹا اور مواد کا ریلا بہ نکلا۔ دیکھنا ہے اپنی رَو میں کس کس کو گھسیٹتا ہے اور کون بچ رہتا ہے۔ جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ بنیوں نے جلدی جلدی گلّے اور سونا سمیٹنا شروع کر دیا۔ کچھ کہا نہ سنا یہ بیٹھے بٹھائے جرمنی کے دانتوں تلے کیوں کھجلی اٹھ کھڑی ہوئی؟ فرانس اور انگلینڈ، کمزوروں کے طرفدار، صلح کے پرچم لے کر دوڑ پڑے۔

"آج سے ہماری تمہاری کُٹّی" جرمنی کو صاف صاف بتا دیا۔ مگر وہ تو جیسے ہوا سے بچے کی طرح پھسلتا ہی چلا گیا۔ ادھر روس کی بھی پسلی پھڑکی اور خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہو گیا۔ میاں ہٹلر کو بغل میں دنیا نے پوچ کر رکھ دیا۔ دیکھتے دیکھتے دونوں ندیدے بچوں نے پولینڈ کو میٹھی ٹکیا کی طرح بانٹ کھایا، جیسے چٹنی ہوتی۔

جرمنی نے پولینڈ پر قبضہ کر لیا۔ اور یہ تو بڑی پرانی بات تھی۔ دنیا بھر کا [illegible]

ہو گیا۔ یہ لوگ قصداً کرتے ہیں کہ اتنے کیوں شوقین ہیں حالانکہ یہ بالکل اچھی بات نہیں۔
گلوب پر کتنا حصہ گلابی ہے، جیسے تازہ تازہ کوڑھ ابھرا ہو۔ اب یہ جرمنی کمبخت نار کا ڈبہ سا کر
چلا ہے نہ جانے یہ لوگ ٹیپ ٹاپ کر اس گول مول نارنگی کا کیا حال کریں گے!

اور پھر کیا ہوگا؟ پولینڈ بھی غلام بن جائے گا۔ ہندوستانی تو خیر صدیوں سے غلامی
کرتے آرہے ہیں۔ بھوکے رہنے سے روح بڑھتی ہے اور موسم کے اثرات جسم کو توانائی
بخشتے ہیں۔ یہ چپٹی چپٹی آنکھوں والے منگول کے کتنے نہیں ہو پاتے، جاگیر کی مٹی کر دی اور فاقہ
کشی کو پیشہ بنا دیا ہے۔ یہ تو ابھی ہیں مسکین ہیں۔ گوشت پوست تو بیکار کا قصہ
ہے اصل چیز ہے ہڈی اور اُسے سمیٹے رہنے کو اور پھر کھال کا غلاف۔ یہ انسانی
پنجر سیاہ اور ٹیڑھے جنگلی بجلی اور پتھریلیوں سے لپٹے ہوئے ہوتے ہیں جنہیں قدرت
نے اپنے دست خاص سے گھڑا ہے۔ اور پھر جلتی دھوپ اور لو کے تھپیڑوں سے دبکا
کر خاک اور دھول نے لتھیڑ کر کچی فرنچ امیٹ کی طرح مستحکم کر دیا ہے۔ ان پر
غلامی کیا اثر نہیں کر سکتی۔ مگر یورپ کے وہ کومل بدن جو ذرا سے تکے بھی کھا جاتے ہیں،
وہ کیسے تاب لا سکیں گے ان مظالم کی؟

دفتر کے بیکار کاموں سے بیزار ہوتے وقت شمن کے خیالات دور دور بھٹک جاتے۔
کھڑکی میں نیلی زری کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ بیٹھنے والوں کی نظر بازیوں سے بچاؤ کے
لیے تو ہے تھا مگر اس کے نیچے سے چلنے والوں کی ٹانگیں نظر آتیں اور وہ گھنٹوں
بیٹھی ان ٹانگوں کی رفتار دیکھا کرتی۔ کالی پیلی، ٹیڑھی اور خشک ٹانگیں۔ کچھ میلی
چیکٹی دھوتیوں میں لپٹی ہوئی دبلی ٹانگیں، کیچڑ اور مٹی میں لتھڑی ہوئی کمزور ٹانگیں
اور کبھی بھاری توند کے وزن سے کراہتی ہوئی بوجھ تلے ٹانگیں اس کی کھڑکی کے نیچے سے
گزرا کرتیں۔ کبھی کبھی چکنے پتلون اور اُجلے موزوں میں لپٹی ہوئی بھی ٹانگوں کی ایک
آدھ جوڑی گزر جاتی مگر بہت کم۔ بیٹھے بیٹھے وہ اکتا جاتی۔ دنیا بھر میں ٹانگیں ہی کر اسی
کھڑکی کے نیچے چلتی رہتی۔ ہنسی ان پر ترس آتا۔ تھک نہیں جاتیں یہ؟ کب سے چل رہی
ہیں، اور نہ جانے کتنے دن اور چلیں گی۔ انہیں ٹھنڈے ٹھنڈے میں کوئی نہیں ڈھکتا، یا مے

ہے کوئی نہیں بچاتا، دھوپ کی آنچ سے کوئی نہیں ہٹاتا۔ یورپ میں تو شوقین مزاجوں نے ننگے کلب بنائے ہیں اور یہاں تین چوتھائی مخلوق جنم سے ہی برہنہ رہنے کا بندوبست کر کے آتی ہے۔ ایسے بھی ملک ہیں جہاں مفید خوراک مہیا کرنے والے محکمے قائم ہیں پنیر، مکھن، دودھ، اور گھی نے جو انسانوں کو چربی کی پوٹلیوں میں تبدیل کر دیا ہے، اس کا کچھ تو علاج ہونا چاہیے۔ دولت کا جتنا حصہ گوشت اور چربی ٹھونسنے میں صرف ہوتا ہے کم از کم اس کا نصف تو ایسی مشینیں ایجاد کرنے میں صرف ہونا چاہیے جو موٹاپے سے عاجز بچاروں کو ذرا ہلکا کر دیں۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ دنیا کے ایک حصے میں گوشت اور پوست کی اس قدر قلت ہے دوسرے حصوں میں ان ہی عناصر کی زیادتیوں کو کل پرزوں سے چھیل چھیل کر دور کیا جاتا ہے۔ کاش کن خوش نصیب انسانوں کے جسم کی چھیلن ہی ان انسانی ڈھانچوں پر منڈھ دی جائے جو یہاں گھوم رہے ہیں تو ترازو کے دونوں پلڑوں میں کچھ تو توازن پیدا ہو جائے۔

روز دوپہر کے بعد ٹانگوں کا نیا طوفان بہنا شروع ہو جاتا۔ یہ طوفان پاس کی گلی سے اٹھا کرتا تھا اور شہر کی طرف بہہ جاتا۔ یہ بدبودار، شریر اور سڑتی ہوئی راب میں سنی ہوئی ٹانگوں کا تھکا ہارا ریلا اپنی انتھک نڈھال روانی سے دوڑ بہا کرتا۔ چھٹی ہونے سے ذرا پہلے ایک میلی، تنہا ٹانگ ایک لکڑی کی ہمراہی میں رکتی تھمتی کانپتی تھرتھراتی گزر جاتی۔ شمن کا معمول تھا کہ وہ اس ٹانگ کی مدھم لکڑی کی مسلسل ٹھک ٹھک کو قریب آتا سن کر ایک پیسہ کھڑکی سے نیچے ٹپکا دیتی اور منتظر رہتی کہ ایک سوکھے ہوئے مردے جیسا سیاہ ہاتھ اسے کس صفائی سے غلاظت کی نالی میں سے نکال لیتا ہے، جیسے اسے نالیاں ہی ٹٹولتے بیتی ہو۔ اور پھر وہ سست اور لڑکھڑاتی ٹانگ کو دور جاتا دیکھتی رہ جاتی۔ کیوں؟ آخر کیوں پیدا ہوتی ہیں یہ بھیانک ٹانگیں اور کالے سیاہ ڈھانچے! پھر اسے خیال آتا اگر یہ ڈھانچے اتنے سوکھے نہ ہوتے تو تاج محل دنیا کا آٹھواں عجوبہ کیسے نظر آتا، اگر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اتنے فقیر اور مکھیاں نہ بھنبھنائیں تو شاہانِ مغلیہ کی شان و شوکت کا ثبوت کیسے ملے؟

اگر خدا نخواستہ جرمنوں کا دماغ چل نکلے اور وہ پولینڈ کی طرح ہندوستان پر بھی ناخون تیز کرنے لگیں تو شاندار عمارتیں، یہ نادر الوقت مقبرے اور یہ مقدس مٹی، جہاں ہم صرف بونے کے شوق کو پورا کرنے کے لیے ہری بھری کھیتیاں سجاتے ہیں، یہ لمبی لمبی سڑکیں جنہیں ہم موٹروں کی دھول پھانکنے کے لیے خون پسینے کی نمی پہنچا کر کوٹتے ہیں، کہاں جائیں گے، کارخانے سے نکل کر گرما گرم کباب اڑانے کے لیے یہ جامع مسجد کی سیڑھیاں کہاں غیب ہوں گی! اور جب بادل امڈ گھمنڈ کر آئیں گے، ابرِ رحمت رم جھم برسنے لگے گا، کوئلیں پکار اٹھیں گی اور پپیہے ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگیں گے تو زناری پریم کی پیاس بجھانے انھیں عظیم الشان مقبروں کی آغوش میں چھپ جائیں گے، لیکن یہ فاسسٹ ہماری ان حسین گاہوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیں گے۔ ہمارے باپ دادا کی مقدس ہڈیاں اکھاڑ کر لے جائیں گے، وہ ہڈیاں جن کی خاطر ہم جنم جنم سے خون کی ندیاں بہاتے آئے ہیں؛ وہ مانک موتی سے بھی زیادہ انمول ہڈیاں جن پر ہندو کو ناز ہے۔ ہر ہندی کا فرض ہے کہ ان کی حفاظت میں خون اور پانی ایک کر دے۔ یہ ہڈیوں کا پجاری خود بھی تو ہڈیوں کی ایک مالا ہے اور مرنے میں یہی مالا اپنے بچوں کو بخش جاتا ہے۔ جیتے جی تو کچھ نہیں مگر مرنے کے بعد اُس میں اتنی شکتی پیدا ہو جاتی ہے کہ بانجھ کو بیٹا اور مردے کو زندگی بانٹنے لگتا ہے۔ گو زندگی بھر جسم کا کوئی کونہ مستور نہ رہ سکا مگر مرنے کے بعد اطلس و کمخواب کی چادریں چڑھائی جاتی ہیں اور صندل مل کر عرق گلاب اور کیوڑے سے غسل کرتا ہے۔ زندگی بھر جو میل کی پپڑیاں اور جوئیں اُس پر چھائی رہیں اُن کا کچھ تو بدلہ مل ہی جاتا ہے۔ زندگی میں جسم کو نہ سہی مرنے کے بعد ہڈیوں کو ہی سہی!

یہ ہڈیاں! کیا مرنے کے بعد ان ہڈیوں میں دل نہیں رہتا! کاش دل بھی ہڈی کا مضبوط ٹکڑا ہوتا جو صدیوں زندہ رہ سکتا۔ تو اگر ہندوستان کی زمین پر جنم لینا ہے تو روحوں کو چاہیے ہڈیاں بن کر جنم لیں اور اگر جینے کی خواہش ہو تو جتنی جلدی ہو سکے مر جائے۔ اس قبرستان میں زندگی کا کوئی مصرف نہیں۔

پولینڈ کا لقمۂ تر اڈنٹے کی داڑھ میں زیرہ ہو کر رہ گیا اور فرانس کی حسینہ بھی

جھپیٹ میں آگئی۔ شرم نہیں آتی ان حیوانوں کو عورت ذات پر ہاتھ اُٹھاتے۔ رانی جھانسی بھی تو عورت تھی کس قدر نسوانیت تھی اس جی دار حسینہ میں بجھی ہوئی چتا کی آخری چنگاری! مگر ابرِ رحمت نے ایک بار ہی برس کر اُسے بھی ٹھنڈا کر دیا۔ اس ہڈیوں کے دیش میں ان چنگاریوں کا کیا کام؟

گھٹائیں برسیں اور خوب برسیں۔ بند کھل گئے، سوتے جاری ہو گئے لیکن یہ ہندوستان کیوں خشک پڑا ہے؟ کیا ہندوستانی خون کی لو ابھی تک اژدہے کی ناک میں نہیں پہنچی؟ یہ سیاہ خون ہے ابھی بہت لبساندہ۔ گو سفید ذرات نے مل کر کچھ خاکی حسن پیدا تو کر دیا ہے، مگر ابھی اسے بہت سے انجکشنوں کی ضرورت ہے۔ یہ "سارے جہاں سے اچھا، ہندوستان" سوا ستفادرسکے چکر سے کیوں بچا ہوا ہے؟ ہر قوم کو اس پر پیار آچکا ہے۔ سب ہی کو اس کے سدھار کی فکر نے ستایا۔ سیاہ دراوڑوں کو انسانیت سکھانے آریہ آئے، سکندر تک کی پسلی پھڑکی، ایران و افغانستان کو محبت چرائی، تاتاریوں نے دانت کچکچا کر بوسے لیے، مغلوں نے عشق و محبت کے میدان گرم کیے اور پھر یورپ کے بلیوں کی ترازو کے پلڑے جھولنے لگے۔ ہندوستان کی مہمان نوازی ہر ایک کی خدمت میں خوانِ نعمت بچھا، ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی، "یہ سب کچھ حاضر ہے، کھاؤ پیو اور تھوڑے سے کا حصّہ باندھ کر لے جاؤ۔ ہم بھوکے سو رہے ہیں یہ تمہاری کتّی بھر جائے! ہمیں تو بس اتنی اجازت دے دو کہ تمہارے پیرسے اور آپا کا عہدہ پا کر تمہاری سفیدی کے آگے اپنی سیاہی کا ماتھا ٹیک دیں۔"

موسم بدلنے لگا۔ شمن جی پر خفقان سا اُٹھنے لگا۔ یہ الجھی الجھی فضا جس نے دم گھونٹ رکھا تھا کچھ اور بھی غلیظ ہوتی جا رہی تھی۔ جی بُری طرح گھبراتا۔ غصّہ آتا کس پر؟ یہ اُسے نہ معلوم تھا۔ استانیوں کی سُستی پریشانی میں بدل گئی تھی۔ کون جانے کیسی ہوا چلے، کدھر سے چلے ... اور کس کس کو اُڑا لے جائے۔ بے چین بھاگم بھاگ شروع ہو گئی تھی۔ جنگ کوسوں دور تھی مگر خطرہ دلوں میں چھپا ہوا تھا۔

گھبرا کر اُس نے پندرہ دن کی چھٹی لی اور کہیں دور جانے کا ارادہ کر لیا۔ کہاں؟ یہ اُس نے اسٹیشن پر پہنچ کر بھی فیصلہ نہ کیا۔ سب سے پہلی ٹرین مدراس کلکتہ تھی۔ اُس نے وہی پکڑ

لی۔ کہاں جارہی ہے؟ کس کے پاس؟ یہ اُس نے سوچنے کی ضرورت ہی نہ محسوس کی۔ کیا ضرورت تھی کسی منزل کی! جب جانا ہی ٹھہرا تو پھر کیا حاجت ہے کسی مقررہ لکیر پر چلنے کی! اُس کے پاس تیسرے درجے کا ٹکٹ تھا۔ ایک ہندوستانی کے نقطۂ نظر سے سفر کو مکمل کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ کافی سامان ہے۔ ریل کی افراتفری نے تھوڑی ہی دیر میں سفرِ آخرت کا مزا چکھا دیا۔ بیمار ٹوٹے پھوٹے بے ہنگم انسان میلے اور بدبودار چیتھڑوں میں اُلجھے ہوئے پتہ نہیں کہاں اور کیوں جارہے تھے؟ شاید انہیں بھی منزل کا پتہ نہ تھا۔ اُسے غصہ بھی آرہا تھا اور ہنسی بھی۔ کیا حماقت ہے سفر کرنا اور وہ بھی تھرڈ کلاس میں! کبھی تو اُکتا کر جی چاہتا لوٹ پڑے یا اتر کر ریل کی پٹری پر لیٹ جائے تاکہ ایک بار ہی یہ لمبا چوڑا تھکا دینے والا سفر ختم ہو جائے، مگر پھر سوچتی اس میں بات ہی کیا ہے؟ آواگون کا کیا ٹھیک! عجیب اُوٹ پٹانگ سا سلسلہ ہے۔ دنیا میں بار بار تھوڑی ریل کے دھکے، یہ چیتھڑے یہ مرتے بلبلاتے اور بدبو سونگھنے کو آنا نصیب ہوگا۔ جو کچھ بھی ہے، جیسا بھی ہے اسی زندگی میں دونوں ہاتھوں سے لپک لو۔

گاڑی بدلنے میں بھی ایک دنیا سے دوسری دنیا میں جانے کا لطف آگیا کیونکہ تھرڈ کلاس والوں کے لیے بیلوں کے باڑے سے بھی بدتر جگہ مشکل سے ملتی ہے۔ اُسے پلیٹ فارم پر بیٹھے بیٹھے تک کر چار لمبے آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے گھنٹے گزارنے پڑے۔ سیکنڈ کلاس کے مسافر خانے میں تالا پڑا ہوا تھا اور فرسٹ میں کوئی انگریز ٹھہرا ہوا تھا۔ سوائے اسی ایک سفید انسان کے باقی سارے کالے پیلے نیلے جانور تھے اور پلیٹ فارم پر بکھرے ہوئے تھے۔ یہ پلیٹ فارم بھی ایک قسم کی گورنمنٹ ہوتی ہے جہاں چند فرسٹ کلاس انسانوں کے علاوہ ساری رعایا گوڈر ہی نظر آتی ہے حالانکہ آمدنی اسی تیسرے درجے والے سے ہوتی ہے مگر آرام کبھی کبھی مجبوراً سفر کرنے والا اوّل نمبر ہی لے جاتا ہے۔

ہر سودے والا اسانا سودا اُسی کے ہاتھ بیچنے پر تل گیا جسے منع کرتے کرتے بھی تھک گئی۔ فقیروں کے علاوہ یتیم خانوں، بیوہ آشرموں اور گئو رکھشا کا چندہ کرنے والوں نے بھی ہلّہ بول دیا۔ وہ جل اٹھی۔ یتیم خانوں میں جاؤ تم یتیم آنکھ میں لگا کر گھوما کرتے پر بھی

نہیں ملتے اور موجودہ آشرم اتنے مردوں کی موجودگی میں حدِ فاصل سے زیادہ نہیں۔ اور ان پناہ گاہوں کی ضرورت کبھی کیا ہے! جب تک یتیموں کے لیے کوٹھے موجود ہیں ان بیکار جھگڑوں میں پڑنا ہی حماقت ہے۔ اچھا یہ گائیں تو جب بچوں کے لیے مائیں اور مٹھائی میں ڈالنے کے لیے گھاس کا گھی اور سنگھاڑے کا آٹا موجود ہے تو پھر یہ گائیں کس کی چربی بڑھانے کو پالی جائیں؟

بار بار اس کی نظر ایک بچے کی طرف بھٹک جاتی جو بڑے غور سے کبھی ان کیلوں کو تک رہا تھا جو اس کی ٹوکری سے دلکش بیسواؤں کی طرح جھانک جھانک کر لبھا رہے تھے اور کبھی ان کتوں کو جو چاروں طرف نہایت ضروری کام سے دوڑتے پھر رہے تھے۔ بچہ نہایت چلبلا تھا۔ اس کی بوڑھی آیا قابو میں کرنے کے لیے بڑی یاس سے کشتی لڑا رہی تھی۔ بار بار اس کی مٹھی سے ڈورا رہی تھی جو نہ جانے کس کام کو نکلی ہوئی تھی مگر بچے میں بلا کی پروا نہ کرتا۔ بیٹھے بیٹھے اچھل کر پورٹ لگاتا اور پاس کبھی ہوتی ہر چیز کو جھنجھوڑ ڈالتا۔

"وہ بری بات بابا!" آیا کہتی اور وہ تھوڑی دیر کے لیے ٹھیر جاتا مگر پھر اس کے جسم میں روانی کی لہریں اٹھتیں، پہلے ٹانگوں کو اینٹھتے کرتا، پھر ہتھیلیاں گھٹنوں سے چھونے لگتیں، سر کوک بھرے کھلونے کی طرح آگے پیچھے، دائیں بائیں مٹکنے لگتا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ ننھا سا جیتا جاگتا بھونچال بن جاتا۔

کیلوں کو وہ پیار بھری حسرت سے تکتا۔ "بری بات" کی مہر نے انہیں اور بھی دلکش اور جاذب نظر بنا دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے شربتی اور لذیذ کیلوں کی پاک خواہش میں "بری بات" جیسی تلخی کہاں سے آ سکتی ہے۔ وہ جانتا تھا آیا سدا کی چڑچڑی ہے اور ہمیشہ اسے اسی ناگوار حکم چلانے دبا کرتی ہے۔ کتنی ہی بار وہ دوڑ دوڑ کر انجن کی طرف گیا۔ یہ گو گو کرتا دیو ہیکل بھوت، اتنی بہت سی گاڑیوں کو گھسیٹے جاتا ہے۔ اسے نیا بیاہتا جوڑا ابھی بہت جاذب نظر معلوم ہو رہا تھا۔ آگے آگے دولہا اور اس کے پیچھے دوپٹے کے کونے سے بندھی ہوئی عورت۔ اگر آیا اجازت دیتی تو وہ ایک بار ذرا اس دوپٹے کے جھولے میں دو ایک پینگیں لے کر دیکھتا۔ آیا نے اسے وزن کرنے کی مشین پر بھی نہیں

کو دے دیا اور صندوقوں کی قطار پر لفنٹ رائٹ کرنے پر بھی معترض ہوئی۔ ہار تھک کر کبھی وہ ساکت ہو کر آنے جانے والوں کے منہ تکنے لگتا اور بے خبری میں اُس کا منہ اُن کی نقل میں نئی نئی شکلیں بناتا۔

"کیلا لوگے؟" شمن نے تنہائی سے اکتا کر بچے سے پوچھا۔

"نہیں!" اُس نے چپکے سے آپا کی طرف دیکھ کر کہا، "پرائی چیز بری ہوتی ہے۔ ہیں نا آپا!" وہ جوش سے بولا اور کیلوں کی طرف اٹھتی ہوئی نظر ڈال کر فوراً اپنی توجہ پاس رکھے ہوئے سامان کو بکھیرنے میں لگا دی۔

کتنی ہی دیر سے کئی وقت مارے نوجوان گنگناتے لطیف اشارے کرتے شمن کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ دبی کچلی خواہشات ننگی ہو ہو کر اُن کے چہروں پر ناچ رہی تھی۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے وہ ایک دوسرے کو قطعی ناممکن العمل گالیاں دے رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر کئی برقعہ پوش گٹھڑیاں بیٹھی اُن کے مفلوج دماغوں سے فٹ بال کھیل رہی تھیں۔ پاس ہی ایک قبول صورت چنچل سی دلہن گھونگٹ کاڑھے اُن پریم باری میں مصروف تھی۔ ایک مجروح شکل لڑکا ایک انگریزی کا کوک شاستر اس رخ سے لیے بیٹھا تھا کہ شمن کی نظر بار بار اس کے باتصویر عنوان پر پڑتی۔ گھنٹہ بھر سے وہ اسی ایک تصویر کو حفظ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پاس بیٹھی ہوئی عورتوں کو وہ یہ تصویر نہایت انجان طریقہ پر دکھاتا اور جونہی کسی سے نظر مل جاتی عجیب برہنہ سی مسکراہٹ آنکھوں میں پیدا کر کے نڈھال ہو جاتا۔ اسی خاموش لاسلکی پیغام کے ذریعے وہ ساری گٹھڑیوں سے بھی راز و نیاز میں مشغول تھا۔ جواب بھی مل رہے تھے؛ کچھ پریشان، کچھ نفرت میں ڈوبے اور کچھ حد درجہ متحیر! اُس چلبلی دلہن کا منہ تو چھپا ہوا تھا مگر تھکن سے نڈھال انگڑائیاں توڑ رہی تھی۔ بچے کی معصوم آنکھیں جو کیلوں سے عشق لڑانے میں مشغول تھیں اُن نوجوانوں جیسی فحش اور گستاخ ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ جھنجھلا جھنجھلا کر پیر پٹخ رہا تھا اور غصے سے زمین پر تھوک رہا تھا۔ کئی بار اُس نے آپا پر تھوکا اور پھر اُسے جلانے کے لیے خوب ناک میں انگلیاں کھنگھولیں، سوٹ کے بٹن چبائے اور جوتے کے بند کھول ڈالے۔

منّے نوجوانوں میں کسی بات پر کشتم کشتا شروع ہو گئی۔ گالیوں کی جدت میں ترقی ہو گئی۔ کیلوں کی ٹوکری اور کئی صراحیاں لپیٹ میں آگئیں اور بدحواس ٹانگیں مختلف زاویوں میں پھیلنے لگیں۔ بچّہ یہ ہنگامہ دیکھ کر پہلے تو ششدر رہ گیا پھر اُس کی آنکھیں جگمگا اُٹھیں، گال سُرخ ہو گئے اور چیخ چیخ کر ہنسنے لگا۔

”کیلے کیلے ۔ ۔ ۔ آہا کیلے ۔ ۔ ۔ !“ وہ چھلے ہوئے کیلے دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور کشتی میں حصّہ لینے دوڑا، مگر آیا نے اُسے پکڑ کر بستر پر بٹھا دیا۔

جب ذرا سکون ہوا اور بچّہ بستر پر اوندھا ہو کر لیٹ گیا تو پلیٹ فارم بھی سونا ہو گیا۔ شمن نے ڈبہ کھول کر کچھ چاکلیٹ اور بسکٹ نکالے۔

”بری بات !“ بچّہ بغیر ملاسئے چلایا۔

”آیا بچے کو میرے پاس لے آؤ۔“ شمن نے حکم دیا۔

”میم صاحب بڑا ناٹی ہے۔ اس کا ممی شاپنگ گیا۔ بولا دو کلاک سے آئے گا۔ پن کون جانے کبی آئے گا ؟“ جبراً آیا نے بچے کو آنے دیا۔

”کیا نام ہے تمہارا ؟“ شمن نے بہت سے چاکلیٹ اُس کے دونوں ہاتھوں میں بھر دیے۔

”میم صاحب اکھا دن مستی کرتا ۔ ۔ ۔ پڑھتا کوچھ نئیں ۔ ۔ ۔ ناٹی ۔ ۔ ۔ ویری ناٹی۔“

بچّے نے چاکلیٹ کھائے نہیں بلکہ انہیں صندوق پر قطار میں جما کر تالیاں بجانے لگا۔ آیا اس کی شرارتوں کا رونا روتی رہی۔ شمن بغور بچے کو دیکھتی رہی۔ چاکلیٹ کی برجیاں بنا کر زور سے ایک تھپڑ مار کر بکھیر دیتا اور اپنی اس فاتحانہ تخریب پر قہقہے لگانے لگتا۔

”جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو کیا بنو گے ؟“ شمن نے ایک ٹیچر کا مرغوب ترین سوال بچے سے پوچھ ہی لیا۔

”ہم ۔ ۔ ۔ ہم سپاہی بنیں گے !“ اُس نے کانسٹبل کی طرف دیکھ کر کہا جو تھوڑی دیر ہوئی فساد فرو کر کے مزے سے کھنبے سے پیٹھ لگائے دوسرے فساد کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اگر یہ فساد نہ ہوں تو دنیا کتنی سونی ہو جائے۔ یہ بہادر ۔ ۔ ۔ یہ کھمبے

سے پیٹھ لگا کر اونگھنے کے کیا کریں گے۔ اگر بچہ چاکلیٹ کی برچیاں بنا کر نہ ڈھائے تو سوائے اسباب کی توڑ پھوڑ اور آیا پر تھوکنے کے اور کیا کرے۔ کاش ان کانسٹیبلوں اور بچوں کو بھی کچھ کام ہوتا۔

"تمہیں ممی مارتی تو نہیں؟" نہ جانے اُسے کیوں خیال آیا کہ بچے کو پٹنے کی اشد ضرورت ہوتی گئی۔ کئی بار اُس کا خود جی چاہا اُس کے پیارے پیارے سُرخ گالوں میں چٹکی بھر لے اور بے اختیار اُسے بھینچ ڈالے۔ یقیناً وہ بڑا گدگدا اور گرم ہوگا۔ اس کی آغوش میں اُسے جکڑ لینے کی ناقابلِ بیان تھکی ہوئی سی خواہش جاگ اُٹھی۔ بچے نے ممی کے نام پر فکر مند ہو کر تیوریاں چڑھا لیں۔

"وہ بڑی نائی ہے... ممی!" بچے نے جھلا کر کہا تو اُسے ایسا معلوم ہوا وہ اس بچے کو بہت دن سے جانتی ہے۔ اُس نے پہلے بھی اُسے کہیں دیکھا ہے۔ اس کے ہونٹ کتنے شگفتہ تھے۔ بعض انسان پھلوں اور مٹھائیوں سے کتنے مشابہ ہوتے ہیں! دیکھتے ہی بھنتے ہوئے چنوں جیسی سوندھی سوندھی خوشبو نتھنوں میں آنے لگتی ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو تازہ انگوروں اور انناس کی قاشوں کی طرح مہک دیتے ہیں۔ یہ دلکش گوشت کا لطیف کھلونا جسے دیکھ کر بے اختیار نارنگی کی پھانک کی طرح چکھنے کو جی چاہنے لگا!

"ہمارے پاس نیا ورق ہے۔ بستر میں لیٹے دی آیلنے، دیکھو گی؟" بچے نے مستعدی سے بستر پر حملہ کیا۔

"نا ہیں۔ نا ہیں بابا بیڈ ٹائم کیسے کر کے کھولنے کا" انگلش کھٹہ لگی ہوئی آیا نے بغاوت کی۔

"ہم پھاڑ ڈالیں گے" بچے نے آنکھیں نکالیں۔

"کیسا پھاڑے گا؟ ممی تم کو اتنا کر کے مارے گا کہ بس!"

"ہم ممی کو گولی سے مار دیں گے... ٹھائیں" شکست خوردہ سپاہی نے سرخ گالوں کو پھلا کر کہا۔

"چھہ... بری بات!" شمن نے چمکارا۔ بچے نے اس پر بھی ایک بے اعتباری کی

نگاہ ڈالی۔

"تم بھی نانی ہو... ممی اور آپا سب نانی... ہم سب کو ٹھائیں ٹھائیں مار دیں گے" بچے کے غصے پر شمن کو پیار آگیا۔ اتنا سا بچہ اور اتنے دشمن! بچہ بیچارا! کاش یہ ٹھائیں ٹھائیں مارنے کی دھمکی میں کچھ اصلیت رہے اور یہ جذبہ پروان چڑھ سکے۔

"آئی ایم سوری!" بچے کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ آنے والی خاتون کو اس نے ڈانٹ کر کہا اور غصے اور لجاجت کا ننھا منا دیوبستر پر سر بلند ہو کر ڈٹ گیا۔

"ہیں! تم!" بہت سے پلیٹ فارم پر دوبارہ اس سہیلیاں شنٹ کیے ہوئے ریل کے ڈبوں کی طرح ایک دوسرے کی آغوش سے ٹکرا گئیں۔

"الما! تم!"

"تم کہاں جارہی ہو؟" دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

"چھٹی گزارنے، اور تم؟" شمن نے پوچھا۔

"گھر جارہی ہوں... تو چلو میرے ساتھ...."

"میرے خطوں کا جواب..." اتنے میں ریل آگئی اور لشتم پشتم دوڑنا پڑا۔ ایک گارڈ سے کہہ کر شمن الما کے ساتھ انٹر میں بیٹھ گئی۔

بچھڑی ہوئی سہیلیوں نے بالکل ننھی بچیوں کی طرح بہت سا وقت ایک دوسرے سے سوال پر سوال کرنے میں صرف کر دیا۔ جواب سننے کی کسے مہلت تھی! الما بانکی پور جارہی تھی۔ شمن نے چھٹیاں وہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ ریل میں نہ اتنی فرصت اور نہ کہانیاں اتنی مختصر کہ سنانے والا سنائے اور سننے والا جی بھر کر سنے۔

چٹاخ سے الما نے بچے کے گال پر تھپڑ لگایا، وہ کپڑے بدلنے میں بیر بیر لیے کر رہا تھا۔ ایک بار زور سے اس نے منہ پھاڑ کر دھاڑ نکالی اور چپ ہو گیا۔ ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ سرخ انگاروں جیسی دہکتی ہوئی آنکھوں سے اس نے ایک بار نہایت گستاخ آنکھوں سے کچھ کہا۔ شدت ضبط سے نتھنے پھڑکنے، کان سرخ ہوئے مگر دودھ ابلتے ابلتے ختم گیا۔ خاموش اس نے کپڑے اتروا لیے مگر گویا کوئی اس کی کھال اتار رہا ہو۔

شاید کھال اُتارتے ہیں بھی اتنی شدّت سے جذبات نہ دکھتے ہوں گے۔

"ہمیں بھوک لگی ہے" بچّے نے ڈانٹ بتائی۔

"آپا بسکٹ دے دو"

"ہم بسکٹ پھینک دیں گے، چاول کھائیں گے" دانت کچکچا کر ایلما نے پھر تھپڑ اٹھایا مگر شمن نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیوں مارتی ہو؟"

"تم... تم نہیں جانتیں.... یہ... یہ..." ایلما کا گلا گھٹ گیا اور وہ پٹے ہوئے بچّے کی طرح بسور دی۔ شمن نے کچھ نہ کہا۔ خاموش سر موڑے کچھ سوچتی رہی اور ریل فراٹے بھرتی رہی!

(۳۵)

"تم کہتی ہو میں اُسے کیوں مارتی ہوں؟" ایلما نے سونے سے پہلے اپنے مختصر کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ بچّہ آپا کے پاس سوتا تھا۔ گھر صاف ستھرا تھا مگر نہ جانے کیوں قید خانے کا سا حبس تھا۔ کمرے کچھ پرانے اور برسوں سے بند پڑے تھے۔

"میں اسے مار ڈالنا چاہتی ہوں۔ جانتی ہو میں نے اُسے ختم کر دینے کی پوری کوشش کی۔ اسے پھینکنے کی کوشش میں اپنے آپ کو کئی بار موت کے کنوئیں میں دھکیل دیا مگر میری تندرستی سخت جانی بن کر آڑے آگئی۔ میں نے ایک گھناؤنے مرض کی طرح اسے شکم میں برداشت کیا۔ ہر لحظہ میں نے اس کے وجود پر پھٹکار دی اور بدہضمی کی قے سمجھ کر جنم دیا" وہ بڑے جوش سے بکتی رہی۔ اُس کی آنکھیں اب بھی اتنی دہکتی ہوئی اور سیاہ تھیں مگر ان پر ہلکا سا تکان کا پردہ پڑا تھا جو بہت غور سے کبھی کبھی ایک جھلک سی دکھا جاتا تھا۔ جسم ذرا بھاری ہو گیا تھا۔ اور جیسے جیسی کھنچی ہوئی کمر بھدی پڑ گئی تھی، وہ سبک شاخِ گل اب پھل اتری ڈالی ہو گئی تھی۔ وہ بے رونقی کے دھندلے نقوش جو مٹ کر بھی لکیریں چھوڑ جاتے ہیں! پھر بھی اُس کا دماغ اُبھ...

اور کنوارا رہنا چاہتا تھا گو جسم ماں بن چکا تھا۔

"میں نے اس ہتھوڑے کے پودے کو سینچنے سے انکار کر دیا مگر وہ دھڑ کی زیادتی سے اندیشہ پیدا ہو گیا اور جبراً ... اوہ ..." وہ سہم کر شمن کے بالکل قریب بیٹھ گئی جیسے اُس کی آغوش میں پناہ لینا چاہتی ہو۔ "یقین، اِن شمی بہن نے نرک کے دکھ بھوگ لیے، جیسے سانپ کو چھاتی سے لگا لیا۔ کہتے ہیں کہ جب بچے کے پوتر ہونٹ ماں کے جسم کو چھوتے ہیں تو سورگ کی اپسرائیں رشک کی آگ میں جل جاتی ہیں کہ وہ ماں نہیں بن سکتیں ... مگر شمی لوگ بڑے بھولے ہیں۔ جیسے اس سپولیے کے پیٹ کی آگ میں نے بجھائی، میں ہی جانتی ہوں۔ جتنے دن یہ میرا خون چوستا رہا میری آتما جہنم میں بھڑکتی رہی!"

"اتنی پریشان نہ ہو پگلی!" شمن نے پیار سے اُسے پاس گھسیٹ لیا۔

"تم نہیں جانتیں ... اوہ تم نہیں جانتیں!"

"الیما تم اتنی پریشان ہو ... کیا یہ سب کچھ اس لیے کہ وہ ناجائز ہے؟"

"ہشت پگلی! اگر سیتل کا بچہ دیوتا ڈل کے اپنے ہردے کی جلائی ہوئی آگ سے بھی پوتر ہو کر آتا تب بھی مجھے سولی جیسا دکھ دیتا۔ کوئی منتر کوئی پوجا اسے پاک نہیں کر سکتی ... جب میرا ضمیر ایک حیوان کے جسم سے چوٹ کھا گیا تو ..."

"مگر اس میں معصوم کا کیا قصور ہے؟"

"قصور؟ ہنہ، تم نے دیکھا نہیں، یہ وہی ہے!" — وہ خوفزدہ ہو گئی "وہی، بالکل وہی سانپ!" اور شمن کو یاد آیا کہ بچے کو دیکھ کر جو اُسے دھوکا ہوا تھا کہ وہ اُسے کہیں دیکھ چکی ہے وہ وہم نہیں تھا۔ بچہ بالکل چھوٹا سا سیتل تھا۔ وہی تنومند جسم اور مستانہ چال، وہی زندہ دل اور کشش! تو پھر الیما حق بجانب تھی۔ قدرت اُسے چڑا رہی تھی۔ اگر بچہ الیما سے مشابہ ہوتا تو شاید خود پرستی کام آ جاتی مگر وہی شخص جو ہمیشہ اس کی نفرت کی آماجگاہ بنا رہا غیر اختیاری طور پر ایسا چھایا کہ اس کے خون میں بھی بس گیا محبت اور نفرت اپنی بلندی پر پہنچ کر ایسی صورت اختیار کر لیتی ہیں کہ انہیں پہچاننا مشکل ... دیوتا اور شیطان دونوں کی پرستش ایک نکتے پر جا کر ٹک جاتی ہے کتنا

تخیل کی نگاہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔

"لیکن ایلیما، تم تو بڑی ترقی پسند ہو اور اگر سماج ایک ایسے بچے کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے تو تم اُسے ظالم کہو گی؟"

"سماج ایسے بچے کو صرف اس لیے بُرا سمجھتا ہے کہ وہ بیاہ کے منتروں کے چھینٹوں میں نہائے بغیر دنیا میں آجاتا ہے اور میں . . . ."

"نہیں، سوسائٹی کی اجازت بغیر دنیا میں آجاتا ہے۔ تمہیں رولی سے اس لیے نفرت ہے کہ وہ تمہارے حکم بغیر دنیا میں آیا۔ اسی طرح سوسائٹی کو بھی . . . ."

"مگر کیوں؟ سوسائٹی کو کیا مطلب؟"

"اس لیے کہ ایسے انسانوں کی تعداد دنیا میں نہ بڑھے جو بن وارث کے ہوں . . . . تم جانتی ہو عورت ہی تنہا ذمہ دار رہ جاتی ہے۔ باپ کے منہ پہ کوئی مہر نہیں پڑتی . . . . اب ذرا سوچو اگر شادی کا اسٹامپ نہ لگایا جائے تو عورت، جس کی اقتصادی حیثیت صفر کے برابر ہے، کیا کرے . . . "

"ہوں تو تمہاری رائے میں ناجائز بچے صرف مالی مشکلات کی وجہ سے دو بھر معلوم ہوتے ہیں؟"

"اور کیا، خود سوچو ایک ماں قدرت کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق آنے والے بچے سے کیوں نہ محبت کرے؟ کیا وہ اُس کے جسم کا ایک ٹکڑا نہیں؟ دینے والے نے نعمت دی اور لینے والے نے پائی۔ پھر باپ کیوں ڈرے اور ماں کیوں تھرائے؟ صرف اس لیے کہ اُس کا پالنا پوسنا "دردِ سر" ہے۔"

"اور شادی کے بعد؟"

"تب مرد اُسے اپنا فرض سمجھ کر برداشت کر لیتا ہے۔"

"سوسائٹی کا باندھا ہوا فرض۔"

"ہاں . . . مگر اس کا اب وہ اس درجے تک عادی ہو چکا ہے کہ اس بار کو اپنا سمجھتا ہے لفظ 'اپنا'، اُس کی خود پرستی کے جذبے کو تسکین دینے کے لیے کافی ہے۔"

"اور ناجائز کو اپنا نہیں سمجھتا؟"

"مجبور نہیں... قانوناً بھی تو وہ اُس کا نہیں... قانون کے بغیر اس کی ماں بھی غیر ہوئی"

"لیکن ماں۔ ماں کیوں نفرت کرے؟"

"کیونکہ وہ کوئی کمانے والا ساتھ نہیں لاتا، اُس کی پرورش کا بار اُس کی زندگی کے پیروں میں بیڑی بن کر اُلجھ جاتا ہے؟"

"ہشت، یہ سب واہیات ہے۔ مائیں ایسے بچوں کو صرف ایک وجہ سے فنا کر دینا چاہتی ہیں کہ وہ اُس کے لانے والے سے نفرت کرتی ہیں۔ اس نفرت کا انتقام وہ اُس کی گردن مروڑ کر لیتی ہیں۔"

"توبہ توبہ۔ میں تو ایسی عورت کو حیوان سمجھتی ہوں!"

"تم بیوقوف ہو.... حیوان اتنے بے رحم نہیں ہوتے اور نہ بیوقوف۔ اُن کے یہاں نہ بھادریں پڑتی ہیں اور نہ بیاہ رچے... سنا ہے تم نے کسی گدھے کو سہرا باندھے؟"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں، سیاہ بادل چھٹ گئے۔

"ایلما تم بھی سڑن ہی ہو... وہ کسی کا ہو، ہے تو اتنا پیارا!"

"خاک! دماغ تو ہے ہی نہیں بس جیسے گوشت کا دھمہ۔ میں تو اس کی پڑھائی کی طرف سے نہیں دیکھتی۔ نہ جانے کیا جھک مار کر آتا ہے۔"

"کیا ارادہ ہے تمہارا اُس کے مستقبل کے بارے میں؟"

"میرا ارادہ..." اس کی آنکھوں میں پھر آگ سلگی۔

ایک فلک شگاف چیخ بچے کے کمرے سے آئی اور پھر پے در پے آمادل سے سنسان گھر گونج اُٹھا۔ دونوں لپکیں، ایلما آگے اور شمن پیچھے۔

"نہیں... نائیں..." بچہ مسہری پر اوندھا لیٹا رہا تھا۔ بے بسی سے ایلما نے اُسے اُٹھا لیا۔ تھوڑی دیر کو شمن کو شبہ ہوا کہ اُس کی آنکھیں نرم نرم ریشمی سے چمکیں مگر فوراً ہی ایک دردناک چیخ مار کر اُس کے بازوؤں سے پھسل پڑا۔

"آئی ایم سوری... سوری..." وہ ہیبت زدہ ہو کر چلانے لگا۔ ایک عجیب قسم کی پریشانی

ایلیا کے چہرے پر آئی اور غائب ہو گئی۔

"چپ... خاموش... چپ" اُس نے پتھروں کی بارش کر دی اور اُس کا گلا گھوٹ دیا ہوتا اگر شمن اور آیا اُسے دھکیل کر کمرے سے نہ لے جاتیں۔ شدتِ جذبات سے وہ دیر تک لرزا کی۔ معلوم ہوتا تھا ایک بچے سے نہیں کسی دیو سے کشتی لڑ کر آ رہی ہے۔

"میں ایک دن اُسے ختم کر دوں گی۔ میں موت سے نہیں ڈرتی مگر یہ عمر قید... میری زندگی..." جھلائی ہوئی شیرنی کی طرح وہ بل کھا کھا کر مختصر سے کمرے میں ڈگ بھرنے لگی۔ بگڑ بگڑ کر وہ اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں جکڑ لیتی اور پھر خود ہی اس گرفت سے زور آزمائی شروع کر دیتی۔ معلوم ہوتا اُس کے دماغ کے گرد بھی کسی نے جال بن دیا ہے ایسے کہ جتنا جتنا وہ زور لگاتی ہے بندش کستی ہی جاتی ہے۔

"مگر اس بچے کا..."

"یہ بچہ نہیں ہے..." اُس نے بلند آواز سے کہا، "یہ وہ خود ہے... مجھے آزار پہنچانے تباہ کرنے کے لیے وہ خود جنم لے کر آیا ہے۔ اس نے اسی ذلت کو کافی نہ سمجھا اور مجھے ایڑی تلے مسلنے..."

"تم پاگل ہو گئی ہو، تم اُس کی ماں ہو۔"

"نہیں، میں اُس کی ماں نہیں۔ اگر جنم دینے سے ماں ہو جاتی ہے تو... تو... ہرگز نہیں۔ اگر چنبیلی کی بیل سے حقو ہر کا پودا لپٹ جائے تو تم اُسے بھی حقو ہر کہنے لگو گی؟...... اگر اس گلدان میں کہیں سے سانپ گھس آئے تو وہ پانی بن جائے گا؟" اُس نے آتش دان پر رکھے ہوئے گلدان کو دونوں ہتھیلیوں سے بھینچا۔ "تم نہیں سمجھ سکتیں میرے دکھ کو" وہ زور سے مڑی اور گلدان ایک غمگین چھناکے سے زمین پر آ رہا۔ ایلیا وحشت زدہ ہو کر اُن پریشان کرچوں کو دیکھنے لگی جو اس میں سے نکل کر چاروں طرف کونوں میں پناہ لینے بھاگ گئے۔

"نہیں، نہیں، یہ نہ ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا" اس کی حالت بالکل دیوانوں جیسی ہو گئی اور گھبرا گھبرا کر گلدان کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے لگی۔ شمن کو اس سے ڈر معلوم ہونے لگا۔ اُس نے چاہا اُسے گھسیٹ کر پلنگ پر بٹھا لے مگر وہ بگڑ گئی۔

"اس طرح ریزہ ریزہ ہونے سے پہلے میں اسے خاک میں روند کر پھینک دوں گی۔"
آہستہ آہستہ دانت بھینچ کر اس نے کہا۔ اس کی شکل بالکل مکار چڑیلوں جیسی ہو گئی۔
شمن کو اس سے کراہت آنے لگی۔

"تم بن رہی ہو ایلما!" اس نے حقارت سے کہا۔

"ایں؟" وہ غصے سے مڑی۔

"ہاں، تمہیں ایکٹنگ میں مزا آ رہا ہے، تم جھوٹ بولتی ہو۔"

"شمن!"

"بس اتراؤ مت۔ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم اور میرے سامنے ایسی عجیب باتیں کرو گی۔ تمہیں اپنے بچے سے محبت ہے اور مجھے الو بنا رہی ہو۔"

"کیا؟ محبت؟" ایلما بپھری۔

"مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔ اتنی سی دیر میں مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ تمہیں رونلڈ سے شدید محبت ہے مگر اسے جھوٹی نفرت کے بھیانک روپ میں لپیٹ کر دکھانا چاہتی ہو۔"

"تم!"

"چپ رہو۔ میں تمہیں اتنا کم ہمت نہ سمجھتی تھی، افسوس تم نے میرے سارے حسین خوابوں کو آج اس گلدان کے ریزوں کے ساتھ چکنا چور کر دیا۔ تم بزدل اور دھوکے باز۔ بڑی روشن خیال ہو، ناجائز کو جائز کہہ دیا لیکن تیل کے جلائے ہوئے ڈھکوسلے کی آڑ لینے لگیں۔ مجھ سے جھوٹ بول بول کر اپنی عزت اور کم نہ کرو۔ سچ بتاؤ تم نے اپنی ممتا کو سیرا ہمیں بنا ڈالا۔ بڑی آئیڈیل وال بنتی ہو مگر یہ تمہارا آئیڈیل، تمہارا...
تمہارا ضمیر، تمہاری ذہانت، تمہاری ممتا کے آگے مات کھا رہے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ تمہیں کبھی بھی سیتل سے نفرت نہ تھی!"

"شمشاد......"

"بکو مت۔ تم اس کی پرستار تھیں لیکن تمہاری خود پرستی نے کبھی تمہیں اقبال نہ کرنے دیا۔ تمہارا یہ فلسفہ بالکل بے بنیاد اور لچر ہے کہ جسم اور روح جدا جدا ہیں۔ یہ

کیسے ہو سکتا ہے کہ سنتّیل کو تمہارے جسم نے چاہا اور روح نے نفرت کی۔ پگلی دل و دماغ دھوکا کھا سکتے ہیں مگر جسم دھوکے میں نہیں رہتا، وہ وقت آنے پر سچ بول دیتا ہے مگر تم نہیں مانتیں کہ تم سنتّیل سے محبت کرتی تھیں اور اب بھی تمہاری آتما اس کی خواہش میں تمہیں یہ سزا دے رہی ہے۔ کیونکہ وہ تمہیں نہیں ملتا اس لیے اس فراق کی جلن تو اس کے بچے سے انتقام لے کر بجھانا چاہتی ہو اور یہ بھولنا چاہتی ہو کہ یہ تمہارا بھی ہے۔ اری دیوانی ذرا خود تو کر اس طاقت کے مظاہرے میں کتنی کمزوریاں پوشیدہ ہیں۔"

"مجھے کسی کا ڈر تھا جو محبت کو چھپاتی؟" الیما کی آواز شکست خوردہ ہو کر بھرا گئی۔

"خود اپنا۔ الیما جتنا تم اپنے آپ سے ڈرتی ہو کسی سے نہیں ڈرتی۔ تم کو خود اپنے سامنے سچ بولنے کی ہمت نہیں۔ اس کے علاوہ تمہاری ایک اور زبردست کمزوری ہے جسے تم کبھی تسلیم نہ کرو گی... تم ویسے بڑی مضبوط بنتی ہو مگر... تم سماج سے بھی ڈرتی ہو۔"

"ہنہ، تم کہو اور دنیا مان لے۔" الیما نے وثوق سے کہا۔

"تم جھوٹ بہت بولنے لگی ہو۔ زندگی کو جنتر منتر بنا رکھا ہے۔ سچ بتاؤ تم نے بچے کا کیا نام لکھایا ہے اسکول میں؟"

"رولف... کیوں پوچھا تم نے؟"

"نہیں پورا نام بتاؤ۔"

"کیا کرو گی؟" الیما کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"دیکھا باپ کے نام پر کھسیا گئیں!"

"مطلب کیا ہے، یہ میری نجی باتیں ہیں!"

"بالکل، اور مجھے دخل دینے کا کیا حق، معافی چاہتی ہوں، اب کچھ نہ کہوں گی۔"

"اس کا باپ اس لائق نہ تھا... دوسرے..."

"دوسرے تمہارے پاس اُس کے نام کا سرٹیفکیٹ بھی تو نہیں تھا۔"

"ہاں!" الیما کچھ خوفزدہ سی خاموش ہو گئی۔

"بس اسی کا سارا غصہ ہے۔" آگئیں نا اپنی اصلیت پہ۔ دیکھا اپنے آئیڈیل کا حشر؟

تھوڑی دیر بے تکی خاموشی چھائی رہی جس میں دبے سہمے ہچکیوں کی تھکی ہوئی سانسیں گونجا کیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا دونوں تھک گئی ہیں۔ باہر دریچے میں سے چاند ایک بادل کے نیچے سے گھسٹ گھسٹ کر نکل رہا تھا اور ہوا ٹہنیوں میں سرسرا رہی تھی۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ صرف دور، بہت دور جنگلی سیار خواب آلودہ قہقہے لگا رہے تھے۔

"ہم ہمیشہ سے بزدل تھیں، جبھی تو ہر ایک پر عزا کر جھپٹ پڑتی تھیں۔ اور بچے کے متعلق جو تمہارے خیالات ہیں یہ کچھ نہیں سوائے تمہاری مفلوج مامتا کے انتقام کے۔ تم اس جذبے سے زور آزمائی نہ کرو، بُری طرح شکست کھا جاؤ گی۔"

پلنگ پر خاموش بیٹھی ایلما اپنے ہاتھوں سے کشتی لڑتی رہی۔ اُس کے تھکے ہوئے چہرے پر کرب اور لاچاری طاری ہو گئی۔ سادھوؤں جیسی گیانی آنکھیں لہو بہتے ہوئے زخموں کی طرح رو پڑیں۔ بیساختہ پھولے گالوں پر سے لمبے لمبے خاموش آنسو جھلملاتی ندیوں کی طرح بہنے لگے۔ عضلات کی کھینچ تان سے اُس کا بالائی ہونٹ دانتوں پر سے سرک گیا۔ وہ اب بھی اتنے ہی دھاردار تھے مگر زہریلے نہیں!

"اِس وہم کو دماغ سے نکال دو۔" ایلما کا سر تکیے سے لگا کر اُس نے کہنا شروع کیا۔ "اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ رولف کتنا پیارا بچہ ہے۔ میں تو کبھی سوچتی بھی نہیں کہ اُس کی تخلیق میں کچھ سٹیل کا بھی حصہ ہے۔ مجھے تو وہ میری پیاری ایلما کا ننھا منا کھلونا معلوم ہوتا ہے۔ سنو ایلما—"

مگر ایلما سننے والی دنیا سے بہت دور گہری نیند میں غرق تھی۔ شمن کی لوری نے اُس کی برسوں کی اُچاٹ نیند کو بلا لیا اور وہ معصوم بچے کی طرح ایک ہی جھپکی میں غافل ہو گئی۔ مگر شمن کی نیند اُچاٹ ہو گئی۔ آہستہ سے اُس نے ایلما کے پیر سیدھے کیے اور خود جا کر دیوان پر لیٹ رہی۔ خیالات کے گھوڑے لگامیں تڑا کر بھاگ نکلے۔

ایک ہی بچے نے ایلما کو بوڑھا کر دیا تھا، ایک ہی پودے کی سینچائی میں وہ سب کچھ لٹا بیٹھی تھی۔ کمر کے وہ خم، جسم کا وہ ٹھوس پن مرجھا چکا تھا۔ شمن نے اپنے جسم پر نظر ڈالی۔

مہکتے ہوئے تیار انگوروں کی تیز خوشبو اس کے نتھنوں میں بھر گئی اور اُسے وہ انگور یاد آ گیا جو بہت دن ہوئے ایلما نے اُس کے گال پر کھینچ مارا تھا تو اُس کا سارا منہ نہا گیا تھا اور ایلما! اُس نے گردن گھما کر دیکھا، جیسے چوری ہوئی تھی! اُس نے اپنی کیا گت بنا لی تھی! دو چار انگڑائیاں لے کر اُس نے سونے کی کوشش کی مگر پکے انگوروں کی خوشبو نے اُسے بے چین رکھا۔

اُسے سلیں کا خیال آیا جب وہ پکنک میں سوکھی ہوئی پتیوں پر اینڈ رہا تھا، اور پھر اُس نے ایلما کے مرجھائے ہوئے گالوں کو دیکھا۔ اُس کا جی دکھ گیا۔ چاہا چپکے سے اُٹھ کر ان شبنم میں ڈوبے اُداس گالوں کو چوم لے۔ سوتے میں وہ ایلما، جس پر جاگتی ہوئی ایلما ہر وقت بھتنی کی طرح قینچی سی چلاتی رہتی تھی، کتنی معصوم لگ رہی تھی۔ ابروؤں کا طنز آمیز کھنچاؤ ڈھیلا پڑ گیا تھا اور بجائے اتورا کی دیوداسی کے وہ بالکل معمولی عورت لگ رہی تھی۔ اُس کا سیدھا سادا سینہ معصوم بالشت سے دھڑک رہا تھا۔ شاید وہ خواب میں اِس بچے کو چوم رہی تھی جس پر بیداری میں خود اُس نے اپنے دھرم کا پاسبان بٹھا رکھا تھا۔

صبح اُٹھ کر شمن نے رونلڈ سے دوستی شروع کر دی۔ بچہ بلا کا ذہین تھا اور شاید ایلما کو جلانے کے لیے اُس کی ذہانت چرا لی تھی۔ بات کرتے میں وہ بالکل اُس کی طرح بھویں چڑھا کر گہری گہری آنکھوں سے دیکھنے لگتا۔ ماں کا ٹھکرایا ہوا بچہ شمن سے پورے جوش سے لپٹ پڑا۔ ایلما کی طرح وہ بھی جھکی تھا اور جس بات کے پیچھے پڑ جاتا عاجز کر دیتا۔ ایلما خاموش کن انکھیوں سے اُسے دیکھتی مگر محبت جتاتے ایسی شرماتی جیسے بھرے بازار میں ننگی ہو گئی ہو۔ چار سال کی دبی ہوئی کونپل زرد اور بےجان ہو چکی تھی۔

آہستہ آہستہ شرم بھی ٹوٹی۔ بچہ پہلے بے اعتباری سے بھڑکا اور غصے ہوا پھر متحیر ہو کر مانوس ہو گیا۔ ندی کا بند ٹوٹ چکا تھا۔ اُمڈے ہوئے طوفان کو، جسے برسوں کی روک نے اور بھی شہ زور بنا دیا ہو، روکنا آسان کام نہیں۔ دن بھر ایلما کی آنکھیں چھپے چوری رونلڈ کے پیچھے بھاگتیں اور ذرا دور جاتا تو اُس کی تلاش میں بھٹکنے لگتیں۔

جب شمن دو دن چھٹیوں کے علاوہ رہ کر چلنے لگی تو ایلما اُس سے لپٹ کر رو دی۔ وہ بڑی نرم دل ہو چکی تھی۔ ندی کا دھارا جب خشک زمین پر چھوڑے تو رستے گرتا ہے تو

اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکھیر دیتا ہے۔ ایلما کی پیاسی ممتا پر یہ محبت کا دھارا اس شان سے گرا کہ کنواں بن گیا اور وہ اُس کی گہرائیوں میں ڈبکیاں لگانے لگی۔ ماں بیٹے اسٹیشن تک اُسے الوداع کہنے آئے۔ جب ریل چل دی تو شمن نے اطمینان سے سانس بھری۔ وہ خوش تھی اُس نے دو روتے ہوئے بچوں کا میل کرا دیا تھا۔

(۳۶)

گرمی شباب پر تھی۔ معلوم ہوتا تھا سورج گھومتے گھومتے راستہ بدل کر قریب آتا جا رہا ہے، دنیا چکرائی جا رہی ہے۔ جرمنی نے فرانس کو بھون کر رکھ دیا۔ صدیوں سے آزادی کا جھنڈا لے کر بڑھنے والی حسینہ کان میں کوڑی ڈال کر جھک گئی۔ ادب اور فن کی دیوی زہرہ پر نازی عقاب پنجہ پھیلا کر ٹوٹ پڑا۔ یہ کیسی مجنونانہ تھی کہ الٹی اپنے پیروں میں بیڑی بن کر الجھ گئی۔ وہ تکیہ جس سے پیٹھ لگائے مزے سے لیٹے تھے الٹا دم گھونٹنے لگا۔ غلام فرانس کو نازی چنگل میں سسکتا چھوڑ کر آزاد فرانس انگلستان میں جا بیٹھا۔ جتنے ملک نازیوں کے پنجے کے نیچے دبتے گئے اُن کے آزاد واہمے انگلستان میں جمع ہوتے گئے۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو یہ فرزندِ دلبندِ دولتِ انگلشیہ، یہ ہندوستان بھی ایک بار اس جان چھڑکنے والی ماں کی گود سے چھوٹ کر آزادی کی انگڑائی لے سکے اور اس کے کسی کونے میں آزاد ہندوستان پیدا ہو جائے۔

اسکول کے ریٹائرمنٹ سے عاجز آ کر اُس نے کلب جانا شروع کر دیا مگر وہاں بھی جی کچھ اُکھڑا اُکھڑا سا رہتا۔ سکونِ قلب نہ جانے کہاں جا کر سو رہا تھا۔ عمر اونگھتی کھسیانی بیتی جا رہی تھی۔ اسی زمانے میں اُس کی ملاقات منصور صاحب سے ہو گئی۔ منصور کھاتے پیتے رئیس تھے مگر دل میں قوم کا درد بھرا تھا۔ کھدر پہنتے تھے اور شہر میں کئی کھدر کی دکانیں تھیں۔

اُن کے ساتھ کچھ گاؤں سدھار کے سلسلے میں جانے کا اتفاق ہوا، پُرلطف پکنک کا مزا آ گیا۔ زمیندار صاحب خود ترقی پسند تھے اور منصور کے پکے دوست۔ شکار کی دُھت دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ گاؤں والے متحیر آنکھیں پھاڑے اپنے مکتی دلانے والوں کو

جوق در جوق دیکھنے آنے لگے۔ مارے عقیدت کے بدحواس ہو گئے تھے، جیسے انہیں یقین نہ آ رہا ہو کہ سدھار بھی کوئی چیز ہے۔ اس کی ضرورت انہیں کسی طرح محسوس ہی نہ ہوتی تھی، جیسے رسائی کی کچھ ایسی عادت پڑ چکی تھی کہ احساس بھی سُن ہو گیا تھا۔ یہ کسان، جن کی دولت ہل ہے اور بیل، جو دھرتی کا سینہ چیر کر اناج نکال لیتے ہیں اپنے پیٹوں کے لیے نہیں بلکہ غاروں میں جھونکنے کے لیے۔ یہ تو بس بھگوان کے قائل ہیں اور دیوتاؤں کو خوش رکھنے ہی میں مکتی ہے۔

لیکن یہ بھولے بھالے گنوار بھی عجیب حصلت رکھتے ہیں۔ یہ بہت جلد ایک بات سے اُکتا جاتے ہیں اور جب ایک رُخ سے ناک رگڑتے رگڑتے گھس جاتی ہے تو سانس لینے کو دوسرے دیوتا کے آگے دوسرے رُخ سے ناک گھسنے لگتے ہیں جبھی تو ان کی ناکوں میں اتنی کھرڈی دھار ہے۔ انہیں رتی بھر بھی تو احساس نہیں کہ جرمن پھٹے کا چکر گھوما تو کیا ہو گا۔ پٹتے رہنے کی عادت نے انہیں بالکل نڈر بنا دیا ہے۔ انہیں ذرا بھی تو نہیں معلوم کہ جرمنوں نے انگلستان پر بمباری شروع کر دی ہے۔ سکھ چین کے عادی نازک طبع کیسے تھمیں گے اس آگ کی بارش کو؟ کیا حال ہو گا ان کا جب انہیں معلوم ہو گا کہ دنیا میں آرام دہ کمرے ہی نہیں سورج کی تپش، برف کی ٹھنڈک اور ہوا کے تھپیڑے بھی رہتے ہیں مگر یہ ننگے بھوکے فقیر کسی کے نہیں۔ ہندوستان کی دولت اور دولت مند فتح کیے جا سکتے ہیں مگر اس کے سسکتے ہوئے گداگر اور ان کے خاموش متنفر دل کوئی نہیں جیت سکتا۔

شام کو سرکار کی طرف سے سارے گاؤں کو سرکار کی جیت کی دعائیں مانگنے کا حکم ملا۔ مندروں میں گھڑیال جھنجھنا اُٹھے اور مسجدوں میں اذانیں گونجیں مگر ان مردہ دل کسانوں کے دل خاموش رہے۔ وہ کیا کسی کے دشمن کو کوسیں جو خود اپنے دشمنوں کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگتے آئے ہوں۔ رات کا کچھ نایاب لطف رہا۔ زمیندار صاحب نے شکار کھیلوا لیا تھا اور تازہ گھی لگی روٹیاں موجود تھیں۔ رات گئے تک گراموفون بجتا رہا اور صبح ہوتے ہی واپس لوٹ آئے۔ پہلی قسط قوم سدھار کی بُری نہ رہی۔

تنہائی نے اخبار کو رفیق بنا دیا۔ ویسے اخبار ہو بھی تو گئے تھے دلچسپ۔ یورپ میں جو لکھا رہا، جمتا جا رہا تھا اُس کے بارے میں چھوٹی سی خبر بھی ہلچل مچا دیتی۔ جرمنی کے بلبے جوڑے دہانے میں ملک پر ملک پھسلتے جا رہے تھے۔ سرکار کی گلابی افشاں پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔ ہٹلر کی ہوس بڑھتی جا رہی تھی۔ دنیا کی یہی خواہ سرکار گھبرا رہی تھی۔ اتنے برسوں میں جو کچھ کیا دھرا تھا اُس پر پانی پھرتا نظر آ رہا تھا۔ کسی کا بھروسہ نہیں۔ یہی جرمنی جس سے بیس بائیس سال پہلے حق پرستوں نے ناک رگڑ ڈالی تھی آج مست ہاتھی کی طرح روندتا چلا آ رہا تھا۔

سہ ماہی امتحان سر پر آ گئے۔ نہ جانے یہ امتحانوں کا سلسلہ کس نے شروع کیا۔ طالب علم اور ممتحن دونوں کو بندھی مار دینے کا آسان طریقہ۔ اور کچھ نہیں بس پندرہ بیس دن کی پڑھائی اور کاغذ کی ڈھیریوں کا ستیاناس لگ جاتا ہے۔ کیسے بلو پنجے کچھ نہ کچھ لکھنا ان کا فرض اور اس پر نمبر دینا ممتحن کا کام۔ نہ جانے ان نمبروں کی لین دین کا مقصد کیا ہے!

امتحان کے کمرے میں چکر لگاتے لگاتے پیر سوج گئے۔ اِسے پانی پلاؤ، تو اسے سیاہی لا کر دو۔ ایک قلم بھول آئی تو دوسری کا نب ٹیڑھا ہو گیا۔ سارے وقت مسطر، چاقو، جاذب اِدھر سے اُدھر پہنچاؤ۔ یہ ادھار مانگنے کی عادت بھی خوب ہے۔ تعجب ہے، لوگ قلم دوات، کاغذ پنسل کے ساتھ ساتھ آنکھ کان ناک اُدھار نہیں مانگ لیتے۔

دسمبر کی چھٹیوں میں گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ شام کو اپنا سامان درست کر کے آرام کرسی پر جماہیاں لیتے لیٹ گئی کہ کب شام ہو اور کب چڑیا لیے لیے اُڑ جائے۔ اس دفعہ گھر کی یاد کچھ زیادہ ستا رہی تھی۔ پورا سال گزر گیا تھا۔ نہ جانے گھر کا کیا حال ہو گا! اماں کے کتنے دانت اور ٹوٹ گئے ہوں گے؟ مصنوعی لگ سکتے ہیں تو چھٹی ہو۔ منجھو بی کے کتنے بچے ہوں گے۔ چھٹا تو شاید لڑکا تھا یا لڑکی۔ چار سال کی بات تھی کسے یاد۔ اور نہ جانے اتنے میں تعداد کہاں سے کہاں پہنچی ہو۔ منجھو تھی بھی تو ملا کی زرخیز۔ منجھلی نے کیسے جتن کر ڈالے پر مے کا بچہ بھی نہ جن سکی۔ اب تو اس کا میاں بھی سوکھ کر ہڑ بن گیا ہے۔

بھاوج بھی کسی سے کم نہیں۔ میاں سے گھڑی بھر کو نہیں بنتی پر بچوں کا سلسلہ ذرا دیر کو نہیں رکتا! خیر آج کل تو بچوں کی ضرورت بھی ہے۔ جنگ کا زمانہ ہے لڑکے سپاہی بن کر گھائل تیار کریں گے اور لڑکیاں ان گھائلوں کی مرہم پٹی کریں گی۔ نہ جانے اس توڑ پھوڑ اور مرمت میں کیا لطف آتا ہے انسان کو۔

چپراسی نے ایک تار لا کر دیا اور شمن کے خیالات منتشر ہو گئے۔

"آن ملو۔

افتخار"

بے اختیار دل دھڑکا۔ دو لفظوں نے دفتر کے دفتر کھول کر سامنے بکھیر دیے۔ کئی بار پڑھا کہ کوئی لکیر کوئی نقطہ نظر انداز تو نہیں کر دیا۔ جی جل گیا۔ پیاسے کے منہ پر چھینٹا اور وہ بھی اس بخل کے ساتھ کہ اور پیاس بھڑک اٹھی۔ اسی شام کو وہ بھوپال روانہ ہو گئی۔

وہ کہاں جا رہی ہے؟ وہ بہت جلد بھول گئی۔ پتنگ کی ڈور کھنچ رہی ہے اور قدرت کے ہاتھ کی ٹھمکیوں پر لہراتی وہ چرخی سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ چھپی ہوئی آرزوئیں اور بندھے ہوئے خواب رسیاں تڑا کر طرارے بھرنے لگے۔ ان چند سالوں کی خشک زندگی نے اس کے جذبات پر کاروباری سیمنٹ کی ایک تہ چڑھا دی تھی۔ سوائے سادہ بھدی ساری اور بد وضع جمپر کے اس نے لباس بھی تو کوئی نہیں رکھا تھا۔ لڑکیوں کی اخلاقی حالت کو برقرار رکھنے کے لیے وہ فیشن سے پرہیز کرنے لگی تھی۔ اس کی زندگی مسلسل اداسی اور خشکی میں ڈوب گئی تھی مگر آج اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سیمنٹ کی تہہ کو توڑ کر ایک دبا دبایا کلّہ سر اٹھا رہا تھا، مرجھائی ہوئی زرد رو کونپل ایک نئی حرارت کے احساس سے چونک رہی تھی۔

گزشتہ چند ماہ میں اس نے افتخار کو کچھ رقم اور گرم کپڑے بھیجے تھے، کچھ طاقت کی دوائیں جن کا ذکر اس کے خط میں بے خیالی سے کر دیا گیا تھا اور اپنے ہاتھ کا بنا ہوا سویٹر تو حال ہی میں بھیجا تھا۔ اسے وہ وقت یاد تھا جب افتخار کی پھانسی کے

دھماکے اُس کے دماغ میں گونج اُٹھتے تھے۔ اُس کے مرجھائے ہوئے جسم کو گرم کرنے کے لیے اگر ممکن ہوتا تو وہ اپنی کھال اُتار کر دے دیتی۔ اب تو ایک جسم کا خون دوسرے جسم میں آسانی سے پہنچایا جا سکتا ہے، اس نے طے کر لیا کہ اس مرتبہ وہ پوری کوشش کرے گی کہ تھوڑا سا اپنا خون اس کے جسم میں پہنچا دے۔ اور آنکھیں بند کر کے تخیل میں افتخار کی نسوں میں خون بن کر بھاگنے لگی۔ شرماتی ہوئی سرخ پوش دلہن! وہاں کس آزادی سے وہ یک جان ہو سکتی تھی۔ یہ خونی جوڑا پہنے دلہن دبے پیر اُس کے دل میں رینگ جاتی، پھیپھڑوں میں پھیل جاتی اور گالوں کو چھوتی ہوئی ہونٹوں پر ناچ اٹھتی! افتخار کتنا مہذب تھا! اُس نے کبھی اُس کا ہاتھ بھی تو نہ چھوا۔ ایک مقناطیسی کشش سے وہ اپنی طرف کھینچتا ضرور تھا مگر صرف اتنے قریب کہ دھیمی دھیمی مدہوش کن آنچ لگے پر داغ نہ پڑنے۔ اور پھر ڈھیل دے دیتا ایسے کہ کھینچنے والا دھکا کھا کر پرے جا گرتا۔ اگر وہ بھی دست دراز ہوتا اور ریشیل کی طرح اُس کا جسم بھی طاعون بن کر چھا جاتا تو وہ گردن پھیر کر بھی اُس کی طرف نہ دیکھتی۔ یہ مد بھرا امرت کا گھڑا اُس کے اوپر پلٹ دیا جاتا تو پھر یہ خمار کہاں سے آتا!

کتنا مقدس تھا ان دونوں کا ناطہ! اس دن الہ آباد کے کیمپ میں جب اپنی ریشمی رضائی افتخار کو سونپی تھی تو اس کے ساتھ ساتھ اپنے خوابوں کی دنیا کو بھی لپیٹ دیا تھا۔ تنہائی کی ٹھٹھکتی راتوں میں چاروں طرف سے عجیب آوازیں پکار پکار کر قہقہے لگاتیں اور کہتیں "اکیلی" "اکیلی" تو وہ اپنی ٹھٹھرتی ہوئی لاوارث روح کو چپکے سے دور اس رضائی میں سرکا دیتی۔

اُس کے پاس افتخار کی ایک پرانی تصویر تھی جس میں وہ دور کہیں غیرفانی بلندیوں کی طرف گھور رہا تھا۔ بالائی حصہ روشن تھا اور داہنا رُخ تاریکی میں تھا۔ اس کے ہونٹوں پر استقلال ناچ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا تاریکی کا تھپیڑا اُس کا منہ موڑنا چاہتا ہے مگر وہ استقلال سے دھارے کے بہاؤ سے مقابلہ کر رہا تھا۔ یہ تصویر ہمیشہ اس کے بہت قریب ہوتی۔

ابھی حال ہی میں افتخار نے اُسے چند اشعار بھیجے تھے۔ جلتے جلتے باغیانہ اشعار کے ساتھ اُس کا دل محبت کے شیریں نغمے بھی گا اٹھتا تھا۔ اُن رنگین اشعار میں اُس نے شمن کی اُس بسنتی ساری کو لہراتا دیکھا تھا جو اس کے دل و دماغ پر ایک رنگین خواب بن کر چھا گئی تھی، جس میں مصوّر نے قوسِ قزح کو بکھیر کر واپس ایک نقطے پر سمیٹ دیا تھا اور اس دن سے سونی سونی راتوں میں وہ اپنے غمگین دل سے باتیں کیا کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ اس کے خوابوں میں نور برساتی آ چکی تھی۔ یہ گیت اُس نے اتنی مرتبہ گنگنائے تھے کہ لوحِ دماغ پر گہری گہری لکیروں کی طرح کھنچ گئے تھے، کاغذ اُس کے دھڑکتے ہوئے سینے کی نمی سے بھربھرے ہو گئے تھے۔ اسکول کی اس خشک اور چٹیل فضا میں یہ آبِ حیات کے چند چھینٹے اُس کونپل کو تازہ دم بناتے رہے جو ناقدری سے مرجھا چلی تھی۔ افتخار کے خطوں نے اُس کی نسوانیت کو جلائے رکھا ورنہ وہ تو کبھی کی ایک کامیاب معلمہ بن چکی ہوتی جس کے رعب سے دوسری استانیاں لرزتیں اور لڑکیاں کانپ اٹھتیں۔ کامیاب معلّمہ وہی ہے جو مؤنث اور مذکر کے سوال بھول کر لکیریں کرنے کا مسطر بن جائے۔ اقلیدس کے اس غیر شاعرانہ آلے کو دیکھ کر ہنسی لڑکھڑا جائے، چہرے مؤدب ہو جائیں اور کندھے نہ جھکیں، قلم دوڑنے لگیں اور کاپیاں سیدھی ہو جائیں، ہر چہار طرف فوجی نظام قائم ہو جائے اور قواعد حکمراں ہو جائیں۔ مگر ان گیتوں کی دھیمی دھیمی پھوار نے پودے کو سوکھنے سے بچا لیا۔

کسی تہوار یا میلے کی وجہ سے ریل کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ تیسرے درجے میں قیامت جیسی بھیڑ اور غل تھا۔ لوگ مکھیوں کی طرح چھتّے کے چھتّے بنا کر لٹکے ہوئے تھے۔ ریل ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ تھی اور بالکل گھریلو حساب کتاب سے چل رہی تھی۔

سینی ٹوریم کے روشن برآمدے میں افتخار اُس کی دی ہوئی رضائی پیروں پر ڈالے اور اُس کا ہی بنا ہوا سویٹر پہنے بیٹھا تھا اور بہت سے کاغذ اُس کے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ نہایت تکلف سے اُس نے شمن سے ہاتھ ملایا۔ یہ پہلی گستاخی تھی جو نہ جانے آج کس رَو میں اُس نے جائز سمجھی۔ جلدی سے اُس سے ہاتھ چھڑا کر وہ پاس

ہی بیٹھ گئی اور کاغذ دیکھنے لگی۔

"تمہارے کام کے نہیں۔" شمن نے دیکھا وہ ہسپتال کے بل اور نسخے ہیں۔

"کیوں؟"

"کہتے ہیں عورتیں چوہوں تک سے ڈر جاتی ہیں۔"

"میں اُن عورتوں میں سے نہیں۔"

"مگر ان میں چوہیاں نہیں اژدہے ہیں۔" مگر شمن نے نہ سنا۔

"ہاں بھئی وہ نیا ٹیل اوور کوٹ آ چکا ہم اسی بیچارے پرانے دوست کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔" افتخار نے پیار سے پُل اوور کو سہلایا۔ یہ وہی سویٹر تو تھا جس کے ایک ایک پھندے کے ساتھ شمن نے اپنے ہزاروں سپنوں کو بن دیا تھا کس شان سے اس کے سینے سے چپکا ہوا تھا۔ وہی سوکھا مارا نحیف سینہ، پیار اور لطیف جذبات کا لبالب خزانہ، جس کے قریب کے وہم سے ہی اس پر کپکپاہٹ طاری ہو جاتی تھی۔

"تھوڑا اون کم ہو گیا ہے۔ یہاں سے جا کر پارسل کر دوں گی۔"

"دق کے مریض کی چھوئی ہوئی چیز نہ کھانا نہیں چاہیے مگر یہ پھل بالکل تازہ ہیں، تم خود اُٹھا لو سب مجھے بھی دو۔ چاقو دراز میں ہوگا۔"

"میں اس قدر وہمی نہیں۔ اگر آپ کو مہمانوں کی خاطر کرنی نہیں آتی تو رہنے دیجیے۔"

"اچھا، تو آپ مہمان ہیں!"

"جی۔"

"ہونہہ!" اُس نے اُٹھ کر میز سے چاقو نکالا اور نہایت دھیمی آواز میں کہنے لگا، "جو ہر لمحہ دل و دماغ پر سوار ہیں، خوابوں میں بھی پیچھا نہ چھوڑیں، نیندیں اڑا دیں موقع ملے تو کیا مزے سے مہمان بن بیٹھتے ہیں۔ نفرت ہے مجھے ایسے مہمانوں سے!" افتخار نے مصنوعی غصّے سے کہا اور شمن کا دل اچھل پڑا۔

"میں نے ایک کہانی میں پڑھا تھا کہ تازہ پھل کھانے کا مزا تو جب ہے کہ انہیں دانتوں سے بھنبھوڑا جائے اور دونوں کے بجائے چار ہونٹ ایک ساتھ رس چوسیں۔"

انتخابات آج شاعری پر تلا ہوا تھا۔

"سنا کچھ؟"

"کیا"

"ہٹلر نے کتنے ملک ہڑپ لیے، اب ان کی باری آنے والی ہے۔"

"توبہ ہے، انسان انسان کو چبائے ڈالتا ہے۔"

"یہی ہوگا، اگر شیر کو بھوکا رکھا جائے گا تو موقع پاتے ہی پہلے اپنے سدھانے والے کو چبائے گا۔ یہ نازی شیر منہ پھاڑ پھیلا پڑنے کے انتظار میں تھا، اب موقع آگیا ہے!"

"مگر بیچارا پولینڈ۔"

"گیہوں کے ساتھ گھن کو بھی پسنا پڑتا ہے۔ مگر اب ان کا وقت آگیا ہے۔ ان کی دنیا بھی ہلی کا تو وہ نہ بنا دے تو بات نہیں۔ بہت پیس لیا ہے گناہوں کو اب ذرا چکی کے دور کے گڑھے خود بھی آزمالیں۔ وہ جھوبل جو سالہا سال سے یہ اوروں پر برساتے آئے تھے قدرت نے جمع کر کے آتشیں گولوں کی صورت میں انہیں کو لوٹا دینے کا فیصلہ کرلیا تو بزدل بکروں کی طرح بلوں میں گھسے جا رہے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ ہمیں دکھ ہو، ان سے ہمدردی ہو، ان کے دشمنوں کو کوسیں۔ ارے ہم اپنے ہی دشمنوں کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگتے آئے ہیں، تمہارے دشمنوں کو کیا کوسیں گے۔ مگر نہیں، ہمیں کوئی نہیں جانتا، ہم بہت جلدی ایک مالک سے گھبرا جاتے ہیں۔ اور اب ہسٹری نئے فرمان بنا رہی ہے، نئے سرے سے حصے بانٹے جائیں گے۔ جو بویا ہے اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ اوروں کے خون سے ہولی کھیلنے والے ذرا خود اپنے خون کی سرخی بھی تو دیکھ لیں۔ اس مغرور سر کو بھی تھوڑی سی نکیر بہانی پڑے گی۔"

"مگر یہ کمبخت بڑے طاقتور ہیں!"

"خاک نہیں، شیخی خورے خالی ڈینگیں مارتے ہیں۔ ننگے بھیڑیے جیسی تو چچا جی کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ دیکھ لینا ناکیں رگڑ دیں گے ایک ایک ڈالر پر۔ اور چچا بھی معصوم نہیں، چچا بھتیجے مل بھگت سے تو یہ راج قائم ہیں اور جب تک یہ زندہ

ہیں بھوکے اور بلکھتی رہیں گے۔"

"ابا کے یہ مدد نہیں کریں گے۔"

"ارے کریں گے کیسے نہیں آخر کو بنیے ہیں۔ روئی کا بیوپار نہیں ہوا تو شورہ کا ہی سہی۔ دوسرے چپکے سے خوف سے خود ان کی ہستی گم ہے۔"

"ہے یہ کیا رکھا ہے جاپان میں۔ کمبخت کوئی چیز بھی تو ڈھنگ کی نہیں بناتے۔"

"ارے تو تم اس جاپانی مال سے ان کی طاقت کا اندازہ لگا رہی ہو۔ دیوانی۔ تو ہندوستانیوں کے لیے ہے۔ وہ بہت ہے ان بچاروں کے لیے۔ تم نہیں جانتیں کیا حال ہے...." وہ چاقو سے سیب کے چھلکے کا قیمہ کیے لے رہا۔

"اور تم دیکھنا آخر میں مزدور کا پھاوڑا ہی جیتے گا، اور یہ پھاوڑا اس مجبور غلام کو جینا دوبھر کر دے گا۔ بے گناہوں کا خون ضائع نہیں ہوا۔ اس خون سے اگی ہوئی روئی جا کر سرخ قوم پیدا ہوگی، سکوں کا دامن چاک ہو جائے گا، ایک ہنگامہ برپا ہوگا، سینۂ گیتی شق ہو جائے گا اور پھر کیا ہوگا! اس کا جواب میرے پاس نہیں لیکن شاید کبھی میں اس کا جواب دے سکوں۔" جوش کی شدت سے افتخار کا زرد چہرہ جی اٹھا۔

"ظلم کے علمبردار آج تہذیب اور انصاف کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی جلد یہ سنہ ۵۰ء میں کسی حسینہ کی گود میں سو رہا تھا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے! اور ہٹلر فولاد ہے۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے ان کی طاقت...."

"شیر کے آگے گیدڑ کی بھبکیاں! صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے یہ۔ تم خود دیکھ لو گی۔"

"مگر ہندوستان کو کیا واسطہ ان باتوں سے! یورپ والے تو ہمیشہ ہی بات بات جوتی پیزار میں مشغول رہتے ہیں ہم تو کیا؟ ہم تو ویسے ہی غلام کے غلام ہیں"

"ٹھیک کہتی ہو، ہمیں کیا ہم کیوں بیچ میں ٹانگ اڑائیں لیکن تم تو بیوقوف ہو۔ وہ ہم غلام ہیں اور آقا کے ساتھ بلکہ آقا سے پہلے ہمیں اپنے حقوق کی حفاظت کرنا ہوگی۔ لیکن وہ دن جلد آنے والا ہے جب لفظ غلامی ہمیں لغت میں بھی نہ ملے گا۔ میں نے تمہیں کس لیے بلایا ہے۔ یاد ہے وہ کیمپ والا معاہدہ یا بھول گئیں!"

"اتنی کند ذہن نہیں ہوں۔"

"معلوم ہے مجھے، جبھی میں نے سب سے پہلے تم ہی کو چنا تھا۔ تم نہیں جانتیں کہ تمہاری قربانی کی ملک کو کتنی ضرورت ہے۔ اور تم میں ہمت بھی ہے اور ذہانت بھی۔ تم مضبوط دل و دماغ کی مالک ہو۔ بولو کیا دے سکتی ہو؟"

"میرے پاس ہے کیا؟"

"جو کچھ بھی ہے ایک پیسہ ایک پھوٹی کوڑی۔ ہماری جماعت کو فنڈ کی ضرورت ہے چاروں طرف پرلے میں ہے۔ کام جو تیزی سے جاری تھا بکھرتا جا رہا ہے مگر ڈر ہے کہ رک نہ جائے۔ کانپور سنٹر سخت مصیبت میں ہے، تمام کاغذات ضبط کر لیے گئے ہیں۔ ہمارے بہت سے کام کرنے والے جیل میں سڑ رہے ہیں مگر پھر بھی جو آزاد ہیں چمگادڑوں کی طرح کھنڈروں، کونوں کھدروں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ جانتی ہو سب سے بہتر پناہ گاہیں کہاں قائم ہیں؟"

"نہیں!"

"رنڈیوں کے کوٹھوں پر۔ تم بڑی معتبر ہو رہی ہو۔ کسی شریف عورت میں نہ ایسے ملزموں کو چھپانے کا سلیقہ ہے اور نہ ہمت۔ رنڈی کے کوٹھے پر شراب میں دھت انسان کو کون پہچان سکتا ہے! لوگ سمجھتے ہیں غنڈا ہے پرلے درجے کا۔"

"لیکن نقشہ کیا ہو گا آپ کے کام کا؟"

"یہ ایک شاندار راز ہے۔ میں جو یہاں چھپا بیٹھا ہوں کس لیے۔ یہاں کسی کی نگاہ نہیں پڑتی۔ میری خیریت پوچھنے میرے ساتھی بہ آسانی آ سکتے ہیں۔ میرے رشتہ دار... معاف کرنا میں نے تمہارا نام بھی رشتہ داروں میں لکھا دیا ہے، گستاخی تو نہیں ہوئی؟"

"بس بنیے مت۔"

"شکریہ، اور فنڈ کی قلت کی وجہ سے یہ بل..." وہ ایک دم چپ ہو کر کاغذات چھپانے لگا۔

"آپ میری ہتک کر رہے ہیں!"

"کون ہیں؟"

"جی!"

"توبہ ہے، چہ... ارے بابا کھال ادھیڑ دو مگر ایسی ٹیڑھی نظروں سے نہ دیکھو"
شمن ہنس پڑی۔

"تو لایئے وہ کاغذات۔"

"تمہارے کام کے نہیں ہیں" فتحیار نے ٹالنا چاہا مگر شمن نے چھین لیے۔ پورے
دو سو چھپتر روپے کا بل اگر ادا نہ ہوا تو چوبیس گھنٹے کا نوٹس۔

"اب پتہ چلا آپ مجھے کیسا رشتہ دار سمجھتے ہیں۔"

"تو بھئی..."

"رہنے دیجیے، مجھے آپ کے اوپر اعتبار نہیں۔"

"کیا یہ آخری فیصلہ ہے؟"

"جی" شمن نے اس کی دھیمی آواز کی تپش سے پگھل کر زبردستی کہا۔

"کچھ جرمانہ نہیں ادا کیا جا سکتا۔ کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر ہم نے بھی فیصلہ کر لیا۔ پوچھو کیا؟"

"نہیں پوچھتی۔"

"چہ... جی چاہتا ہے مالش کی دوا پی کر اس جھگڑے کو ہی ختم کر دیں۔"

"بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں بچے بنتے!"

"تم مذاق سمجھ رہی ہو مجھ سے دنیا خفا ہو چکی ہے اور اب... اب اس نئی دنیا
کی خفگی... تمہیں بتاؤں ایک بیکار انسان لوگوں کی نفرت کی آماجگاہ بن کر کیوں
ٹھونس ٹھاس جیسے جاتے۔"

"تو... پھر آپ نے مجھ سے کیوں چھپایا۔"

"غلطی ہوئی... بس" کان کی لو امیٹھ کر کہا "معاف کر دو"

"ایک شرط پر۔"

"ہو ہو! کوئی شرط ایسی بھی رہ گئی ہے تمہاری جسے ماننے نہ ماننے کا اختیار میں نے غصب کر رکھا ہے!"

"جی ہاں، ورنہ یہ کاغذ میرے تجسس سے چھپائے نہ جاتے بلکہ اگر آپ مجھے اپنا سمجھتے ہیں تو آپ کو چاہیے تھا مجھے بل پکڑا کر حکم دیتے کہ انہیں ادا کردو۔"

"اوہ!" افتخار نے بھنچے ہوئے گلے سے کہا۔ اس کا سر جھک گیا اور باوجود ضبط کے آنکھوں میں نمی جھلکنے لگی۔ "لیکن۔۔۔"

"پرائشچت؟"

"سنو تو۔"

"جی نہیں۔۔۔ آداب عرض۔" شمن جل کر اٹھی اور جانے کو مڑی۔

"بیٹھو۔۔۔ بخدا اس تیکھے پن پر کہیں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔۔۔" افتخار نے بہکی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "تم آگ سے کھیلنے کی کیوں اتنی شوقین ہو۔ کہیں خود ایک آدھ چرکا نہ کھا جاؤ۔" افتخار نے جلدی سے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ شمن بے سہارا ہو کر واپس کرسی پر گر پڑی۔ ایک دم بے تکی خاموشی چھا گئی جسے دو دلوں کی دھڑکن توڑتی رہی۔

نوٹ نوٹ کے چند نوٹ شمن نے لفافے میں ڈال کر میز پر سرکا دیے۔

"میرا قرض رہا، مع سود واپس کر دیجیے گا۔"

"اچھا تو یہ سلسلہ بھی چلتا ہے؟"

"کیوں نہیں، آپ جیسوں کو کیوں چھوڑا جائے۔"

"جو نہ ادا کر سکا تو؟"

"تو حشر کے دن ایک کے ستر وصول کر لوں گی۔"

"مذاق نہ کرو۔۔۔ میرا کام اور پھر یہ بیماری۔"

"للہ اس کمبخت بیچاری کو چھوڑیے۔"

"میں اسے بہت چھوڑنا چاہتا ہوں پر یہ بھی مجھے چھوڑے۔ ہوٹلوں کے لحافوں اور فٹ پاتھ پر سونے کا اس سے زیادہ حسین تحفہ اور کیا مل سکتا ہے۔" اس کی مرجھائی ہوئی آنکھوں میں پھر وہ پرانی سلگتی ہوئی بغاوت چھا گئی۔ "انتقام۔ انتقام" اس کے چہرے کی کرخت سلوٹیں پکاریں۔ اٹھیں۔ سنبھل کر اس نے دوا پی اور سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"یہ کمبخت جراثیم، قدم قدم پر بیڑیاں۔۔" اس نے حسرت سے شمن کے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا، "اب کب آؤ گی۔ ویسے تو مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ تمہاری عنایت کا محتاج نہیں" شمن کا منہ اتر گیا، "کیونکہ جب چاہوں تخیل کے زور سے گھسیٹ لاتا ہوں۔ اور اس وقت نہ تم اتنا جھجکتی ہو اور نہ مجھے جراثیم کا خطرہ ہوتا ہے۔"

وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔

(۲۷)

واپسی پر اسے ایک تار ملا: "فوراً آؤ"۔ ایلما نے لکھا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی ڈاک کے متعلق کوئی ہدایت نہیں دے گئی تھی، ارادہ تھا بھوآلی سے لوٹ کر سامان لیتی ہوئی گھر روانہ ہو جائے گی، تار کئی دن دیر سے ملا۔ پھر بھی وہ فوراً روانہ ہو گئی۔ روولف کے لیے اس نے ایک بندوق، رنگین گولیوں کا ڈبہ اور تھوڑے سے چاکلیٹ لے لیے۔

وہ برآمدے ہی میں تھی کہ بوڑھی آیا نے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر روک لیا۔

"اندر جانے کا نہیں، ابھی کر کے سویا ہے۔"

"سویا ہے تو سونے دو میں اسے جگاؤں گی نہیں۔ میم صاحب کہاں ہیں؟"

"او ہی سوتا۔۔۔ اکھا دن ایسا کرتا۔" آیا غم کا مجسمہ بن گئی۔ یقیناً بڑھیا سٹھیا گئی تھی۔ ایلما سے کہہ کر نئی آیا کا انتظام ہونا چاہیے۔ وہ آگے بڑھی۔

"بولتا کہ بائی نہیں جانے کا۔"

"کیوں؟"

"کیوں؟ اوہ کیوں؟" اندر سے مردہ آہوں میں ڈوبی ہوئی آواز آئی، "کیوں؟"

یہ سب آخر کیوں؟" پردہ ہٹا کر الما باہر آگئی۔ عجیب وحشیوں کی سی حالت آنکھیں پھٹی ہوئی، بال بکھرے مردے سے بدتر، بخار میں جل رہی تھی۔

"الما کیا ہوا؟" پہلے تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ لیکن شاید اب بھی دماغ کی کوئی رگ سلامت تھی۔

"تم! تم آگئیں؟ اُسے بھی لے آئیں... میں نے اُس کے لیے دودھ ابال دیا ہے اور..."

"کیا ہے الما!"

"چہ چہ... بولا تمہارے کو... کیسا پھر نیڈ ہے... ڈاکٹر آوے تبی بیوے گا ہم اُس کو..." آیا نے پھر ڈانٹنا شروع کیا۔ "بابی کو شوک لگ گیا۔" اس نے کان میں چپکے سے کہا۔

"تم کیوں لے گئیں میرے روکی کو؟ چلو ادھر لاؤ، بڑی شریر ہو تم" الما شرما کر مسکرائی۔

"ایں؟" شمن چکرائی۔

"اُو ہو... بندوق بھی لے آئیں اُن کی... اچھا کیا... بچارا روتا..."

"ڈیتھ ہوگیا بے بی کا!" آیا نے رونالسی آواز سے کہا اور سر ہلانے لگی۔

"کیا... روڈلف!"

"جھوٹ... بالکل جھوٹ... یہ سب جھوٹے ہیں... دھوکا دیتے ہیں مجھے... میں ان سب پر کیس چلا دوں گی... ہٹائیں... ہٹائیں... وہ مارا!" ہوائی بندوق داغ کر وہ کلکاریاں مارنے لگی۔

"ملونیا ہوئے... تین روز میں... کھلاس!" چندھی بجو جیسی آنکھوں والی بڑھیا اپنی سکڑی ہوئی ناک چڑھا کر بسور دی۔ "ادھ تک ا میم صاحب ایک دم پاگل بری کا ہوگیا۔ ہم بولا کوئی جبردستی نہیں۔ فیبومیبی کا جھیڑا۔ اِدمے بلالیا۔ پن ہم کو تو دھکا مارتے۔ بولتے جاؤ نہیں مانگتا تمہارے کو... ہم بولا کہاں پی جائے

پو، ما تبا بی نہیں.. ہیں؟... بولو کون دسرا ہے اپنا... صاب بھی مر گیا...

"اور جو بابا جو میم صاحب رہتا... بولا میج پال ان لگی... ایکدم کہ کے ان لگی..."

"اوتیرہ... ذرا جا کر اسباب اتروا دو... آیا" شمن نے آیا کی بکواس سے جھلا کر کہا اور الیما کو گھسیٹ کر اندر لے گئی۔

"لاؤ نا، کہاں چھپا دیا ہے اسے" اُس نے شرارت سے مسکرا کر کہا۔

"الیما..." شمن کا جی چاہا اُسے کلیجے سے لگا کر جی بھر کے رو دے۔

"تم بولتی کیوں نہیں؟ دیکھو مجھ سے کوئی چال مت چلنا، ورنہ یاد رکھو میں نے وکیل کر لیا ہے اور سب کے اوپر کیس چلاتا... اوہ..." وہ کچھ سوچ کر رک گئی اور منہ پر ہاتھوں کا کٹورا دھک کر پکارا۔

"آ... یو... آ... یو..."

"آتا میم صاحب!

"آیا... بیوٹ واٹر مانگتا۔ بے بی کے واسطے ایک دم اچھا ہونا... گسل ہونا۔"

"کیا میم صاحب بولتا! بے بی کا گسل کر لیا۔ اب..." اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"اس کو اینجل ہی واٹر کا گسل دیتا۔ بپتسمی..."

"غارت ہو کمبخت... چلو یہاں سے" الیما نے ڈانٹا اور بھتیجی اس پر بکھرا آیا تھا لاپروائی سے کھڑی تکتی رہی۔ "ایسا ایسا کیا چلاتا میم صاحب... ہم ڈاکٹر کو بلانے مانگتا۔"

"چپ رہو آیا... الیما صبر کرو یہ کیا حال بنا لیا ہے؟" وہ پیار سے اُس کے بال سنوارنے لگی۔

"تو پھر لاؤ اُسے" الیما نے بچے کی طرح آس بھری آواز میں التجا کی۔

"کون مانتا... ہم کتنا کتنا بولتا پن... جب بے بی مر گیا تو کیا ہوتا پن اگلا دن... ہم ماری کرتا..."

"جھوٹ جھوٹ!"

"اب نیسوسی کی بات کو جھوٹا بولتا... کیا ہونا ایسے!"

"آیا..."

"لیسو کا گسہ..."

"باہر چلو... نکلو..." شمن نے اُسے زبردستی باہر گھسیٹا۔

"ہمارا بابا جاتا تو... پن یہ دیکھنے کا کہ اپنے کو لیسو بلا دے تو... اور میم صاحب کو آیا پتہ کو چھ میں... کتنا باپ گسہ ہوتا۔" شمن نے دروازہ بند کر لیا۔

"یہ نہیں، او لہو کھلائے دیتی ہے۔ یہ کیا حال بنا لیا ہے تم نے؟..."

"سب کہتے ہیں آیا لد چلا گیا۔ تم سے کہہ گئی ہو؟"

"نہیں"

"اچھا! ان سے!" الیما سہم گئی۔

"یہ دوائی پی لینے کا... پن ہم بولتا ڈیتھ کا کوئی دوائی ہی نہیں ہے" آیا دوا کی شیشی کے جلانے پھر اندر آ گئی۔ بڑھیا کو دہشت ہو رہی تھی اور تنہائی سے خوفزدہ ہو رہی تھی۔

"کیسی دوا ہے؟"

"ڈاکٹر دیتا... فرسٹ کلاس ڈاکٹر... ہم بڈوا لُف کا کام کیا اُس کے انڈر۔ ایک دم جیسے آنکھی بگڑا۔ ہم بولا ہمارے کو دکھائی نہیں۔ بولا آیا تم اب کوئی اور کام کرو۔ ہم بولا ڈاکٹر کیسا کام کرتا! بولا نرس کا کام ہونا۔ بیبی کا نرس۔ ہم بولا کوئی بات نہیں جو ضرورت کرتا۔ بولا ایسے یہ بیبی۔ جو ڈیتھ ہوا نا... ہسپتال میں دو روج لیبر ہوا... ایسا... ایسا بالکل لکڑی کے مافک ٹیڑھا بیبی۔" آیا اپنے چپکے ہوئے پیٹ پر آڑے بچے کا نقشہ کھینچنے لگی۔ "ایکدا ارٹ کلاس۔ ایک دم ڈسچارج!"

"ارے ہے چپ رہ کمبخت بڑھیا۔ چل باہر بیٹھ، میں دوا پلا دوں گی۔" دوا پلا کر شمن نے الیما کو کمبل اڑھا دیا اور وہ بخار سے بیہوش ہو کر سو گئی۔

آٹھ دن الیما موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار رہی۔ نویں روز بخار ٹوٹا مگر کمزوری دیر تک باقی رہی۔ دونوں نے بیتے ہوئے حادثے کا جان بوجھ کر ذکر نہ کیا حالانکہ

سارے وقت انہیں احساس رہتا کہ وہ دونوں ایک ہی چیز کے متعلق سوچ رہی ہیں۔ ایلیما نے اُسے وجود میں لا کر پالا پوسا تھا مگر شمن کو بھی اس سے کچھ کم محبت نہ تھی۔ گزشتہ دسمبر کی چھٹیوں میں دونوں نے بڑے جوش و خروش سے مل کر اس کے لیے تعلیمی کھلونے خریدے تھے۔

"ہولو... آنٹی کہو" ایلیما اُسے ڈانٹتی۔

"نیئیں... چمن!" وہ شرارت سے آنکھیں جھپکاتا اور دور بھاگ جاتا۔ اس کے ہونٹوں سے "چمن" سن کر اسے رائے صاحب یاد آجاتے۔ وہ بھی تو ایسے ہی ذہین تھے اور شریر بھی۔ یہ چھپے انسانوں سے خدا کو کیوں اتنا بیر ہے!

جب سے ماں بیٹے میں ملاپ ہوا تھا ایلیما نے اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ بچے کی غلاظت کو بھول کر پودے کی جڑ میں حسرت تھی۔ اس کی ہزاروں تصویریں خود کھینچی اور کھنچوائی تھیں جن کی ایک کاپی شمن کو ملی تھی۔ دور رہ کر بھی وہ اس کی پرورش میں حصہ لے رہی تھی۔ جہاں کوئی مفید کتاب یا کھلونا نظر آجاتا فوراً خرید کر پارسل کر دیتی۔ خاص اسی کی خاطر بچوں کی نفسیات پر کتابیں پڑھ ڈالیں۔ دونوں گھنٹوں بیٹھی اُسے دلچسپ پہیلی کی طرح بوجھنے کی کوشش کر کے لطف اندوز ہوتیں۔

اور جب تک اس کلنک کو مٹا دینے کی کوشش کی بال بیکا نہ ہوا لیکن جونہی اُس سے چاہنا شروع کیا اُس کی ممتا کا خون کرنے کے لیے وہ روٹھ گیا۔ بخار اترا تو ایلیما کی وحشت بھی کچھ دب گئی۔ رولف کی زندگی سے ناامید ہو کر اس نے شمن کو پکارا تھا۔ اُسی نے تو رولف سے ملایا تھا۔ سمجھتی تھی وہ اُسے موت کے چنگل سے بھی چھین لے گی۔ کہتے ہیں ناجائز بچے بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔ تو پھر رولف کیوں ہوا کے ایک جھونکے کی طرح آیا اور گم ہو گیا؟ کوئی دوسری ولدیت ہوتی تو تسلی دی جاتی کہ صبر کرو خدا اور دے گا مگر ناجائز بچے کی ماں کے لیے تو گالی ہو گئی۔

"ایلیما شادی کر ڈالو" شمن نے سمجھانے کی کوشش کی

"اُونہہ، نئے رولف پیدا کرنے کے لیے۔ تم کیا جانو اپنے جسم سے گوشت

کا ٹکڑا کاٹ کر یوں پھینک دینا مذاق نہیں۔ اُوہ شمن وہ دکھ جو اسے جنم دینے میں میں نے سہا آج اس کی موت سے دس گنا ہو گیا۔ اُف وہ موت سے بڑھ کر دم گھونٹنے والا دکھ۔۔۔"

"شاید تمہارا دکھ اس لیے بہت معلوم ہوا کہ تمہاری پوزیشن اور ماؤں سے مختلف تھی۔ اگر کسی کا بچہ محبت بھری نگرانی میں جنم لیتا تو شاید اتنا دکھ نہ ہو۔۔"

"ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے ایسا وقت آئے اور میں اتنا نہ ڈروں۔ ہاں ایک پروفیسر میرے پیچھے بہت دن سے پڑے ہیں۔ انہیں رولف کا حال معلوم ہے بچارے اُسے بہت پیار کرتے تھے اور بڑے روشن خیال ہیں۔ ویسے میں ایسی بزدل نہیں جو طعنہ نہ سہار سکوں اور نہ ہی اب مجھے رولف کی ماں بننے میں شرم آتی تھی۔۔۔" وہ پھر خاموش ہو گئی۔

"تو پھر کیوں شادی نہیں کر لیتیں۔"

"اس لیے کہ مجھے ڈر تھا کہ میں رولف کے ساتھ پھر ناانصافی نہ کرنے لگوں۔ ماں بن کر میں نے ڈائن کے سے سلوک کیے، مگر تمہارے قول اپنے کو قبول کر، اب دوبارہ میں یہ بھول نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے پھر بھی اسے اتنا نہیں دیا جتنا اس کا حق تھا۔"

ایلما سے رخصت ہو کر وہ سیدھی گھر روانہ ہو گئی۔ اتنے دن دور رہنے کی وجہ سے وہ بالکل غیر ہو کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی آنے والے مہمانوں کی طرح اس کی بھی آؤ بھگت کی جاتی مگر کوئی خاص جگہ اس کی مقرر نہ تھی۔ یہ دو مہینے کی چھٹیاں وہ اُٹھنے بیٹھنے کے کمرے میں گزار دیتی۔ وہ جو گھر کی سہولتیں ہوتی ہیں وہ نہ مل سکتیں۔ اپنے حسابوں تو وہ بیاہی جا چکی تھی۔

یہ کمرہ بھی بالکل ویٹنگ روم معلوم ہوتا۔ اُس کی چیزیں عجائب روزگار سمجھ کر دیکھی جاتیں اور بالکل شارع عام پر رہنے کا لطف آجاتا۔ ہزار بندشوں کے بعد بھی وہ خلوت نہ نصیب ہوتی جس کی وہ عادی ہو چکی تھی۔ لوگ بھی اسے عارضی رکاوٹ سمجھ کر اپنے دلوں پر جبر کرتے اور اپنی عادتوں کی لگام روکنے کی کوشش کرتے۔ اُس کا وجود بار

کبھی گھر رہتا تو بالکل مہمان سمجھ کر برداشت کر لیتے۔ قدرتی طور پر اس کا کمرہ گھر بھر میں سب سے غنیمت ہوتا لہٰذا بچوں کی ساری دلچسپی اسی طرف مبذول رہتی۔ کوئی مہمان آتا تو اسی کے کمرے میں مہمان نوازی کی جاتی، اسی کے پیڈ، لفافوں اور قلم سے گھر بھر کی حاجتیں پوری کی جاتیں۔ دنیا اتنی ترقی کر گئی تھی مگر اس کے گھر میں وہی افراتفری مچی تھی۔ قسمت سے سب سجاد جیسی بھی ایسے ہی گھرانوں کی بچی تھیں جہاں کھانے کی میز پر بچوں کے پوتڑ جاسے سکھائے جاتے ہیں اور کھانا باورچی خانے میں اکڑوں بیٹھ کر کھایا جاتا ہے، غسل خانوں میں اناج کے مٹکے رکھے جاتے ہیں اور انہی پہ پردہ ڈال کر غسل کیے جاتے ہیں۔ نشست و برخاست کا کمرہ اس کی غیر موجودگی میں ٹوٹی چارپائیوں، ردی کی بیلوں، بے کار مونڈھوں اور ڈگمگاتے اسٹول رکھنے کے کام آتا۔ الماریوں میں چینی کے برتن اور جالیاں وغیرہ بھی یہیں رکھی جاتیں۔ جب وہ آتی تو جھاڑ پونچھ کر دو چار تختے کرسیاں بیٹھنے کے قابل بنا لیتی۔

جب سے باوا کی پنشن ہو گئی تھی گھر کی ہر چیز صرف استعمال کے لیے رہ گئی تھی۔ جونہی بیکار ہو جاتی کوئی مرمت نہ کرتا اور ردی بنا کر کوٹھے پہ جمع کر دی جاتی۔ ان پنشن یافتہ چیزوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ سب ہی کا گھر کوڑا خانہ بنا ہوا تھا۔ ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر اسے ہندوستان کی عام حالت کا اندازہ ہو سکتا۔ جیسے سرکاری راج میں دفتروں میں چارپائیاں ڈالے افسر گپیں مارا کرتے ہیں، میزوں پہ دہی بڑے کی چاٹ، پکوڑیاں اور چائے کے خوان لگتے ہیں، سالن اور گھی کے دھبے لگے اوٹ پٹانگ رجسٹر، سوکھی ہوئی دواتیں، ٹوٹے نب، مڑے تڑے ہولڈر جن سے لکھنے سے زیادہ ازار بند ڈالنے کی خدمت لی جاتی ہے۔

ادھر جرمنی نے دنیا کو خون سے نہلا کر پوتر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پولینڈ کا بٹوارہ تو ہو گیا، رہ گئی باقی کی دنیا تو کتنے دن کی ہے۔ یہ مثلث بھی پرکار کے ایک چکر میں سما جاتا ہے۔ بڑے بڑے لوگ ملاقاتیں کرتے رہ جائیں گے۔ ہندوستان ٹوٹے پیالے سا لم ہے، بات ہی کیا ہے۔ اس عالم دنیا میں کیا کم بھیڑ ہے۔ کبھی تو جی چاہتا کوئی بڑی ہی موٹی سی گر اس ٹکولے کے پرخچے اڑا دے اور ان کے بھی ایسے ہی ذرے بکھر جائیں جیسے

برطانی جزائر اور جاپان کے۔

خود اُس کے گھر کو ایک زبردست چوٹ کی ضرورت تھی۔ یہ ایک انوکھا خاندان نہ تھا جہاں کھانے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی اور کمانے والے تھک کر بوڑھے ہوتے جا رہے تھے۔۔ امان روز بروز ڈھیلا اور بیکار ہوتا جا رہا تھا۔ سیڑھیاں خطرناک حد تک ٹوٹ گئی تھیں اور سیمنٹ جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔ کاش اس کھنڈر کے کاہل باسیوں کو کوئی سائز گھسیٹ کر لق و دق صحرا میں لے جا پٹختا جہاں اس گھر کی اندھیری پناہ سے آزاد ہو کر وہ خود اپنے ہاتھوں سے نئی پناہ گاہیں بنانے پر مجبور ہو جاتے۔ ہر چیز کو تخریب کی ضرورت تھی۔

جرمنی نے لندن پر آگ برسانی شروع کر دی۔ ان بھوکوں کا خون نچوڑ کر یہ شاندار شہر سجایا گیا تھا۔ اُن کے کچلے ہوئے دلوں میں مسرت کی لہر آگ کے شعلوں کی طرح دوڑ گئی۔ آہا! کیا مزا آ رہا ہوگا۔ یہ جو پربت جیسی اونچی اور جنت جیسی حسین عمارتیں نظر آتی ہیں بھوسے کی کٹھریوں کی طرح بکھر جائیں گی۔ نازک اندام میمیں اور پھول جیسے بابا لوگ قصائی کی دکان سے پھینکا ہوا ملغوبہ بن جائیں گے جنھیں کتے بھنبھوڑیں گے اور گدھ نوچیں گے۔ آسمان سے خدا کا قہر برسے گا اور زمین لاوا اُگلے گی۔ بڑی بڑی سڑکیں ریگستان اور ہوٹل کھنڈر بن جائیں گے۔ نشہ کا خون چھلکے گا۔ اور یہ سیاہ خون اندھیرا بن کر چھا جائے گا۔

ہٹلر بھی تو آرین ہے! وہی آرین جنھوں نے ہندوستان بنایا۔ اب پھر وہی آریہ یہاں آئیں گے۔ جیسے ہنومان جی دم میں آگ لگا کر لنکا کو پھونکنے گئے تھے اسی طرح یہاں بھی آگ برسے گی جس میں سارے راکھشس بھسم ہو جائیں گے اور دیوتا سونے کی مورتیوں کی طرح تپائے ہوئے نکل آئیں گے۔ پھر ہندو مسلمان ایک دوسرے کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالیں گے۔ ہندو مسجدوں کو پوجیں گے اور مسلمان مندروں کو سجدہ کریں گے۔ دو بھائی گلے مل کر جی کا غبار نکالیں گے۔

اس بمباری سے گھبرانا کیسا؟ قحط اور بیماریوں کے ساتھ مفلسی اور لاچاری کی مار

بیٹھے ہوئے کیڑوں کے سامنے ان پٹاخوں کی کیا حقیقت ہے۔ آئے دن موٹروں ہی سے اتنے کچل کر خاکِ راہ میں گم ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ راکھ مردہ نہیں بگولے بن بن ایک بے قرار روح کی طرح برسوں رقصاں رہے گی اور دنیا کی آنکھ میں کھٹکے جائے گی کتنی بار یہ ہندوستان کا مثلث فتح ہوا لیکن اس کٹے دکھے ہوئے مفلس دل کسی کے نہ ہو سکے۔ یہ دل اُن جی حضوریوں کے سینے میں نہیں جو حاکموں کے دربار میں اُن کی اُترن پہنے تجابت سونگار بنے بیٹھے ہیں، یہ دل ان سڑی بسی جھونپڑیوں میں ہیں جو آریوں کے راج میں پستی رہیں، مغلوں کی حکومت میں بھی روئیں اور اب بھی اُن میں ان گنت سوراخ ہیں۔ ان تھگلیوں میں کوئی جال نہیں لگا سکا۔ یہ دل کیا متاثر ہوں گے کسی چوٹ سے جنھیں صدیوں کی ٹھوکر خوردگی نے بے حس چٹان بنا دیا ہے۔ اب تو انھیں یہ بھی فکر نہیں کہ ٹھوکر سلیم شاہی جوتی سے زیادہ لگتی ہے یا فرنگی بوٹ سے۔ دکھ کا اثر ہی زائل ہو چکا ہے۔

سیاسی الجھنیں زندگی پر خاموش جنگ بن کر چھا گئیں مگر اس شدت سے نہیں کہ برسوں کی رچی ہوئی عصبی غنودگی سے جگا سکیں۔ جب مغرب ٹینکوں کی جھنکار اور توپوں کی گرج سے گونج اُٹھا ہندوستان نے اہنسا کا ڈراما کھیل دیا۔ جی جلانے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے کہ کوئی گلا پھاڑ پھاڑ کر جگائے اور سونے والے افیم کا انٹا نگل کر کروٹ بدل لیں۔

اسکول کا میدان بھی سیاسی اکھاڑہ بن گیا۔ آپس میں بحث مباحثے ہوتے پھر بیٹھ کر ایک دوسرے کو کوسا جاتا اور آنسو بہائے جاتے۔ ہندو لڑکیاں دل و جان سے اہنسا کی قائل، عیسائی ایسی پریشان گویا اسلام اور ہندو دھرم کے ساتھ ساتھ اب ان کی صلیب کو بھی خطرے میں پڑنا آ گیا۔ اگر سرکار کا ساتھ نہ دیا اور یہ سفید راج اُڑ گیا تو کیا ہوگا! صرف رنگ ہی کا تو فرق ہے ورنہ یہ کالی پیلی بھی یسوع مسیح کی بھیڑیں ہیں اور ویسے بھی لباس، رہن سہن کے ساتھ ساتھ بچے ماما، پاپا، آنٹی اور سسٹر کتنی شستہ زبان میں بول لیتے ہیں۔ ہندوستانی کسی کو آتی کب ہے۔ خواہ تھیلوں کی شکل کی ہوں مگر ہیں تو فراکیں۔ کالی بکری جیسی ٹانگوں میں پھسلے ہوئے نیلام کے جوتے ہیں مگر اونچی

اڑی موجود ہے۔ مانگیں ٹیڑھی اور بیچے ہوئے گھونگر علین میں مغربی! فرق ہی کیا ہے اگر صاحب لوگ کو ہندوستان سے جانا پڑا تو پھر یہ بیرا لوگ اور آیا لوگ کو کیا کریں گے؟ بھلا کالا آدمی اتنی اونچی تنخواہ دے سکتا ہے! وہ تو باورچی خانے ہی میں پھسکڑا مار کر لنچ اور ڈنر نگل لیتا ہے اور بچے نانیاں دادیاں پال لیتی ہیں۔ دو چار رئیس ہیں سو وہ بھی ایسا جی کھول کر نہیں دیتے۔ دوسرے جب یہ چلے جائیں گے تو نہ جانے کون آئے پھر؟ بیرے اور آیا کا فیشن رہے نہ رہے؟ یہ چرخے کی بات اور بھی ٹیڑھی کھیر ہے۔ کہتے ہیں گاندھی جی سب کو ایک ایک بکری اور چرخہ پکڑا کر کہہ دیں گے: جاؤ سوت کاتو اور دودھ پیو۔ نہ ٹی نہ چاکلیٹ اور نہ بسکٹ!

مسلمان لڑکیوں کو نہ بکری سے دلچسپی اور نہ چرخہ کاتنے کا شوق، اُن کا تو پاکستان الگ بننے والا تھا۔ مع تاج محل، موتی مسجد اور لال قلعے کے ساری پاک دنیا روپہلے چاند کے سنگ مرمر سے روزے نماز میں غرق جنّت کی طرف کھسکتی چلی جائے گی۔ کوئی دم میں حصّہ بخرہ ملنے ہی والا تھا۔ پٹیل کی رپی، تو ہر پان والے کی دکان پر بکنے ہی لگی تھی، بس خاموش بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔

مگر یہ کانگریسی حصّہ دینے میں بخل کر رہے تھے۔ اگر پاکستان کی حرص میں سکھستان مہاسبھستان بھی بن گئے تو چٹاخ سے بھارت ورش کے ٹکڑے ہو جائیں گے اور یہ ہمالیہ کے ماتھے پر لٹکا ہوا انکونا جھومر موتی موتی ہو کر بکھر جائے گا۔ اور پھر کہیں پاکستانی اُدھر سے خان بھائیوں کی دعوت کر کے پھر محمود غزنوی جیسی چھیڑ خانیاں شروع کر دیں!

زمانہ تیزی سے ترقی کا پرچم لے کر آگے دوڑنے لگا۔ جلسوں میں نیا جوش پیدا ہو گیا۔ پروگرام بنے، پُرجوش نظمیں پڑھی گئیں، کھانے اور شرابیں اڑیں، ترقی پسند اخبار، ترقی پسند انجمنیں، ترقی پسند مضمون نگار اور شاعر پیدا ہوئے اور پورے زور شور سے انقلاب ہونے لگا۔ آزاد زندگی اور آزاد محبت، آزاد موت اور آزاد پیدائش کے حقوق کی حمایت ہونے لگی۔ پرانے بندھنوں کو توڑ کر نئی راہیں اور نئے زاویے کھینچے گئے۔ ہر وہ انسان ترقی پسند بن گیا جس کے بال بے تکے اور آنکھیں وحشت انگیز ہوں،

لباس ذرا انوکھا اور رنگیلا ہو، ہاتھ میں اٹیچی کیس جس میں پھڑکتی ہوئی نظمیں اور سلگتے ہوئے
افسانے، دہکتے ہوئے مضامین اور لطیف فوٹو۔ کچھ معصوم یادگاریں اور شربتی خطوط
ہوں۔ بات کرتے میں کچھ کھو سا جائے، لڑکیوں سے انتہائی بے تکلفی، قدرے لاپروائی
اور سختی سے بات کرے، چھوٹتے ہی پیار کا نام لینے لگے، بھولے سے زنانہ کپڑوں پر ہاتھ
ڈال دے۔ پھر ان کو ایسے دیکھے گویا عمر میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہے، پھر معنی خیز مسکراہٹ
کے ساتھ جھینپ جائے۔ ان کی ساخت اور اہمیت پر گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر
کرے۔ اس کے علاوہ ہر قابلِ ذکر لڑکی کا ذکر کرتے وقت اس کی جنسی کشش اور جسمانی
ساخت پر روشنی ڈالے، اس کی لطیف جنبشوں پر نچھاور ہو چکا ہو، اس کے تمام گزشتہ
سے پیوستہ عاشقوں کی تعداد، اس کے جائز و ناجائز تعلقات اور اس کے ادھورے
اور سالم بچوں کی تفصیل جانتا ہو۔ تمام انقلابی روسی، فرانسیسی، امریکی ادیبوں کے
نام اور ان کے تراجم ازبر ہوں۔ ان کے تراجم پیش کر کے ادب کی خدمت بھی کر چکا ہو
لازم ہے کہ وہ خود بھی فنکار ہو، یعنی شاعر یا مضمون نگار ہو۔ نام کو جوڑ توڑ سے گھما
پھرا کر لکھتا ہو۔ احساسِ کمتری، جس نے نپولین اور ہٹلر جیسے مدبر پیدا کیے، بخوبی رکھتا
ہو۔ ساتھ ساتھ لازمی طور پر دکھی ہو، بھوکا اور حساس ہو۔ دوستوں کے خرچ سے
پیٹ بھر شراب اور نفیس کپڑے پہنتا ہو۔ ڈھٹائی سے میزبانی پر مجبور کرتا ہو اور
ان خیالوں اشتراکی ہو کہ "جو کچھ تمہارا وہ میرا اور جو کچھ میرا وہ تمہارا..... نہیں!"

یہی نہیں ملکہ گاؤں کی لڑکیوں کے بھولپن اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کی مکاری
کا بھی تجربہ رکھتا ہو۔ مٹی ہوئی عورت، جوتیوں میں مسلی ہوئی رنڈی کا طرفدار ہو۔ دولتمند
شریف زادیوں کے جسم میں تھوکے مگر انھی رئیس زادیوں کے عشق میں ناکام رہ کر مجذوبیت
کا درجہ پا چکا ہو۔ والدین کی ناسمجھی اور غلط طریقۂ تعلیم کی وجہ سے کوئی ڈگری نہ حاصل
کر سکا ہو۔ زندگی کی تلخیوں سے تنگ آکر مفت پینے اور نالیوں میں گرنے کا عادی ہو چکا ہو۔

ایک اور شاخ بھی ترقی پسندوں کی ہو سکتی ہے۔ وہ بیچارے جو مجبوراً لمبی چوڑی
جائدادوں کے مالک بنا دیے گئے ہوں۔ تمام مقابلوں اور انتخابوں میں باوجودکی

سفارش کے ناکام رہ گئے ہوں سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کیا کریں، کیسے وقت کاٹیں۔ باپ دادا کے بنائے ہوئے محلوں میں جبراً رہنا پڑے، اعلیٰ قسم کا فرنیچر استعمال کرنا پڑے، بڑے بڑے سرکاری اور غیر سرکاری جلسوں کی شرکت لازمی ہو جس کے لیے بیش قیمت لباس کو چھوڑ کر مغربی درزیوں کے ہاتھ کا سلا ہوا سوٹ پہننا پڑے۔ وقتاً فوقتاً عالیشان ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ٹی کے چاندی کے سیٹ میں چائے پی کر انتہائی انقلابی ادب اور ادیبوں اور شعرا کی پرورش کرتا ہو۔ ان کی ضیافت کر کے اُن کی بدحواسیوں سے لطف اٹھائے۔ مشاعروں اور ادبی جلسوں میں حسین لڑکیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے اور انقلاب کے برسنے کے انتظار میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔

زندگی کی دوسری گاڑیوں کی طرح یہ انقلاب کا چھکڑا بھی اکیلے بیل سے نہیں گھسٹتا صنفِ نازک کا وجود لازمی ہے۔ کوئی آزاد خود مختار خاتون جو دنیا کی بکواس کا خیال نہ کرے۔

یہی وجہ تھی کہ شمن پر ہر چہار طرف سے ترقی پسند برس پڑے۔ گو اُس نے اب تک کوئی کارہائے نمایاں نہیں کیے تھے پر نہ جانے اس کی قوم پرستی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے چیونٹیاں مٹھاس کی خوشبو سونگھ کر پہنچ جاتی ہیں اسی طرح قومی جذبے کی مہک چھپائے نہیں چھپتی اور لوگ ڈھونڈ ہی لاتے ہیں۔ پہلے روز نوابزادہ صمد مع چند چیلے کارکنوں کے تشریف لائے۔ دیر تک چائے کا بے تکلف دور چلا اور پرجوش مباحثے ہوئے۔ پھر چند روز بعد ہونے والے جلسے میں شرکت کا وعدہ لے کر رخصت ہو گئے۔

نوابزادہ صمد نہایت جوشیلے اور چھبیلے جوان تھے۔ بیچارے کو مجبوراً یہ غیر انقلابی لفظ اپنے نام کے ساتھ لگانا پڑتا تھا ورنہ اپنے بے تکلف دوستوں کے حلقے میں تو کامریڈ صمد ہی کہلاتے تھے۔ دوسرے کوئی انقلابی شاعر تھے جنھوں نے فرسودہ روش کو چھوڑ کر لیلیٰ مجنوں کے بجائے نرس، ڈاکٹرنی اور اسکول مسٹرس سے ناکام محبتیں کی تھیں اور بجائے گھوڑے اور شمشیر کے ریل اور موٹر کی شان میں قصیدہ خوانی کی تھی۔

تیسرے ایک پروفیسر تھے جن کی تحریریں حکومت نے مخربِ اخلاق قرار دی تھیں۔

وہ نہایت فخریہ بتاتے تھے کہ اُن کے مضامین پڑھ کر لوگ لرز اُٹھتے ہیں۔ عریانی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ عورت پر نظر ڈالتے ہی اُن کے تخیل میں اُس کے کپڑے دھواں بن کر غائب ہو جاتے ہیں اور نگاہیں سات پردوں کو چیر کر آر پار تیر جاتی ہیں۔ شمن کو بھی یہ سن کر جھرجھری آگئی اور اُس کا جی چاہا کاش اُس کے کپڑے ذرا موٹے اور مضبوط تاروں سے بنے ہوئے ہوتے۔

ایک انجینیر تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے بیچارے چھپ کر انقلاب لاتے تھے۔ حدّی گاؤں کی آمدنی سے عاجز تھے۔ جب تک انگلستان میں رہے برابر وہاں کے قومی مظاہروں میں کھدر پہن کر اور جھنڈا لے کر نکلتے رہے۔ خاص طور پر وہ ہندوستان سے کھدر کی شروانی اور چوڑی دار پاجامے گئے تھے جو اُن پر بے طرح سجتا تھا۔ گو جلوس جلسے ہوتے اور اُن کی روح تک سردی کے مارے کنگ ہو جاتی مگر اس دن وہ بدیسی چیتھڑے نہ پہنتے۔ واپسی پر اُن کی لینڈ لیڈی گرم پانی کی بوتلیں اور چائے تیار رکھتی۔ وہ خود بیچاری ان انگریزوں کو گالیاں دیتی تھی جو بیچارے ہندوستانیوں کو خدا سے سوراج کے لیے اتنی تکلیفیں دے رہے تھے۔ اسے ان لڑکوں سے خاص ہمدردی تھی جن کی بدولت اُس کی تین لڑکیاں ماماگیری سے نجات پاکر ہندوستانی رانیاں بن گئی تھیں۔ اُسے کتنا ارمان تھا کہ ان کالے دامادوں کے کالے ملک میں جائے ہاتھیوں پہ سوار ہو کر اژدہوں اور ببر شیروں کا شکار کھیلے، سونے چاندی کی رکابیوں میں پلاؤ اور کباب کھائے اور کوٹھڑیوں میں بھرے ہوئے ہیرے جواہرات اپنے ہاتھوں سے چھوئے۔

جلسے کے دن کامریڈ صمد مع چند چیلوں کے آکر اپنی موٹر میں اُسے لے گئے۔ مجمع خاصہ تھا اور روداد دلچسپ۔ انقلابی عشق کی پُرزور نظمیں پڑھی گئیں۔ ترقی پسند انقلابی شاعر نشے میں دہت ذہانت اور فنکاری کا مجسمہ بنا جھک رہا تھا۔ نظم کا ایک ایک بند شعلہ بن کر لپک رہا تھا۔ زوردار مضامین پڑھے گئے جن میں ظاہر کیا گیا کہ موجودہ ادبی عریانی قدیم عریاں نگاروں کی تحریر کے آگے صفر کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب باپ دادا اتنے دل گُردے کے تھے تو کیا وجہ ہے کہ سپوت پیچھے رہ جائیں! اس ادبی ورثہ کی قدر نہ کرنا حماقت ہے

زیادہ نامعقولیت کا ثبوت ہوتا۔ اگر کوڑھ بھی باپ دادا سے ورثے میں ملے تو کلیجے سے لگا کر رکھنا چاہیے۔

ویسے تو کئی خواتین موجود تھیں مگر ان میں سے ایک قوم پرستی میں بلند مرتبہ رکھتی تھیں اور کئی قصائی ان کی ناک تراشنے کی فکر میں تھے۔ جس پر بجائے خوفزدہ ہونے کے انھیں اور فخر تھا۔ نوابزادہ کی شمعِ محبت کا خاص شعلہ تھیں۔ کچھ سنائی نہ پڑا کہ انھوں نے کیا کہا کیونکہ پورے حال میں کھسر پھسر گونج رہی تھی۔ لوگ ان کے متعلق اڑتی ہوئی افواہوں پر ناقدانہ مباحثہ کرنے میں غرق تھے۔ ان کے بعد دوسری خاتون آئیں مگر یہ کچھ پھیکی سی رہیں بچاری اُس شعلے کے سامنے صورت شکل کے لحاظ سے بھی مٹی کے تیل کی کپی معلوم ہو رہی تھیں۔ اُلجھے ہوئے پریشان بال اور بہکی بہکی نظریں۔ انتہائی چوٹ کھائی اور پٹی سی صورت نہ جانے انھوں نے کیا کہا مگر مواد یقیناً انقلابی تھا۔ نہ وہ ہاں کی طرف جاتی تھیں اور نہ نہیں کی۔ ایک سرے سے انھوں نے ہر چیز کی مخالفت کی۔ یہاں تک کہ خود اپنی مخالفت کی مخالفت کر دی۔ لوگ انہیں جھکی اور بدحواس کہتے تھے۔

جلسے کے بعد انجینیر صاحب اور کامریڈ صمد کی طرف سے پُرتکلف ڈنر ملا۔ گھر واپس پہنچتے پہنچتے مس شمشاد کئی ہونٹوں پر شمن بن گئیں۔ کامریڈ صمد نے تو کئی مرتبہ اسطرح اُس کے کان میں کچھ کہا کہ اُن کے جلتے ہوئے ہونٹ اُس کے کان کی لو سے چھو گئے۔ انقلابی شاعر مع اپنے بدبودار کپڑوں اور عقاب جیسی بھوکی آنکھوں کے اُس کے قریب آتا رہا۔

جلسے کی تھکن نے ہی تھپک تھپک کر سلا دیا مگر قریب ایک بجے اُس کی آنکھ کسی نامعلوم کھٹکے سے خود بخود کھل گئی۔ چوروں سے اُسے ڈر نہیں لگتا تھا مگر اس وقت تو۔۔۔ سایہ کا دلاسے بھی کلیجہ کانپ اُٹھتا۔ ہمت کر کے اُس نے زور سے پکارا: کون! کوئی جواب نہ ملا۔ خاموش لیٹ کر بغور سننے کی کوشش کرنے لگی۔ دماغ پر زور ڈالنے سے جسم بھی تن کر معلق سا ہو گیا۔ ایک ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا جیسے کوئی بھٹکی ہوئی روح شیشے پر سر مار رہی ہو۔

”شمن!“ ہوا سرگوشیاں کرتی اُس کے کان کے پاس رینگی، جیسے کسی کی جانی پہچانی

سی آواز اسے پکار رہی ہو۔ مگر یہ آواز تو اُسے بار بار دھوکے دے چکی تھی۔
"شمن!" اس بار شبہ مٹ گیا۔ واقعی وہ کھڑکی کے اُدھر سے اُسے پکار رہا تھا۔
"کون!"
"میں! ڈرو نہیں، میں ہوں افتخار۔ کھڑکی کھولو۔"
"ایں!" شمن نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی کھولی مگر اُس کا وہم جسمانی صورت میں موجود تھا۔
"آپ؟"
"اندر آسکتا ہوں؟"
"آئیے" وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی۔
"مگر سوچ لو، میرے پیچھے خطرہ ہے۔"
"خطرہ!"
"جلدی بولو... تاکہ میں اور کہیں۔"
"آئیے اندر!" اُس نے جھلا کر کہا اور کھڑکی کے پٹ پھیلا دیے۔
"پھر پچھتاؤ گی!" اُس نے کھڑکی کی چوکھٹ پر رک کر کہا مگر پھر اندر آ گیا۔
"کیا بات ہے؟" شمن نے مضبوطی سے کھڑکی بند کر کے کہا۔
"ذرا سانس لینے دو۔" وہ خاموش کوچ پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ شمن لبادہ اوڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔
"یہ کمبخت بھیڑیے!" اس نے کلیجہ بھینچ کر کہا، "دو قدم نہیں چلنے دیتے۔ بال بال بچا۔"
"کیا ہوا؟"
"وہی، وہی... اور کون اس بری طرح بھگانے کا شوقین ہے۔ زندگی ایک مسلسل دوڑ بن کر رہ گئی ہے۔"
"پولیس؟"

"ایں؟" وہ چونکا مگر پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

"تجسس میں نے آج تک نہیں بتایا... اور فائدہ بھی کیا... تم گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹرس ہو تمہیں..."

"میں ڈرتی نہیں ہوں کسی سے۔ نوکر ہوں غلام نہیں!"

"مگر..."

"رہنے دیجیے۔ یہ بتائیں کچھ کھائیں گے؟" جواب میں افتخار نے اسے ایک بار دیکھا اور خاموشی سے جیب میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ شمن باورچی خانہ ٹٹولنے چلی گئی۔

"جانتی ہو یہ کیا ہو رہا ہے۔" اُس نے جلدی جلدی لقمے چباتے ہوئے کہا، "روس کو کچلنے کی ترکیبیں ہو رہی ہیں۔ یہ ہیس کیوں کودا ہے؟ روس قن لینڈ سے ڈبک گیا نا کمبخت یہ دانت نکلوانے پڑیں گے، بیکار ہو گئے۔ یہ امپریلسٹ مل کر روس کو نگلنا چاہتے ہیں۔ اگر کہیں پانسہ پڑ گیا تو بس!" وہ تخیل میں بھیانک شکلیں دیکھ کر جھرجھریاں لینے لگا۔

"مگر جرمنی... جرمنی اتنا اُلّو نہیں کہ اِن کے گھسے میں آجائے۔" اُس نے جیسے خود کو سمجھایا۔

"مگر ہیس؟ اس کا ہیس کا کیا کریں گے؟" شمن خود اپنے بچوں جیسے سوال پر جھینپ گئی، "یہ سیاست ہے بھی تو عجیب کھیل۔ گھڑی میں بڑی بڑی اہم سرگرمیاں اور گھڑی میں بچوں جیسی شرارتیں!"

"میں جا رہا ہوں... شمن... مجھے یاد رکھنے کی کوشش کرنا۔ اگر بھول بھی جاؤ مجھے نہ بتانا، میں برداشت نہ کرسکوں گا۔ نہ جانے کیوں میرا یقین ہے کہ تمہارے سہارے سے جی رہا ہوں۔ نامرادیوں میں تمہارا ہی خیال سہارا دیتا ہے۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے میں نے تمہاری ہی آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیا ہے... اوہ یہ کیا بک رہا ہوں!" اُس نے نگاہیں زمین پر گڑا دیں۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"کئی سال کے لیے شاہی مہمانداری..."

"مگر کس قصور میں؟"

"اخبار میں پڑھ لینا، وہی پرانا کیس ہے... کانپور کی اسٹرائک کے بعد کا۔ چھوڑو ان ناگوار باتوں کو... میں ان لغویات سے تمہیں پریشان کرنے نہیں آیا بلکہ..." وہ خاموش ہو گیا۔

"جانے سے پہلے مضبوطی اور ہمت مانگنے آیا ہوں... دعا کرنا کہ کہیں بدھیا اپنے ہی میں نہ لیٹ جائے۔" شمن کا گلا گھٹنے لگا۔

"ذرا سی چھالیہ دو۔"

"اچھا تو میں جاؤں؟" مگر وہ کھڑا اپس و پیش میں ہاتھ ملتا رہا۔

"خدا حافظ!" مگر وہ پھر بھی غیر فیصلہ کن انداز میں پریشان کھڑا رہا۔ شمن کا دل بے ترتیبی سے دھڑکتا رہا۔

"اچھا خدا حافظ!" وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف مڑا اور سست ہاتھوں سے پٹ دور کیے۔

"میں جا رہا ہوں... تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ.. ڈاکٹروں نے کہہ دیا ہے اب میرا مرض خطرناک نہیں رہا... اب جرثیم..." وہ بری طرح لڑکھڑا گیا اور ایک دم کھڑکی میں سے غوطہ مار کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ شمن نے ایک جھلک اس کے تمتمائے ہوئے چہرے کی دیکھی۔ وہ آنسو روکنے کے لیے ہونٹ چبا رہا تھا۔ اس کے نتھنے چوڑے ہو گئے تھے اور گردن کی رگیں شدت ضبط سے تنی ہوئی تھیں۔

دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے وہ خاموش کھڑی رہی، پھر پلنگ پر اوندھی گر کر گہری گہری سسکیاں لینے لگی۔

(۴۸)

انقلابی جلسوں کی غیر انقلابی حرکتوں سے وہ جلد ہی عاجز آ گئی۔ دو چار جلسوں کی صدارت بھی کی اور نہایت جوش سے کام میں حصہ لیا لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جاتا تو

اس کا حصّہ بس نام کا تھا۔ عام قاعدہ تھا کہ خواتین کے لیے منتظمین خود ہی تقریریں لکھتے، ریزولیوشن تجویز کرتے اور تمام کاغذات تیار کرتے اور یہ وہاں جا کر کٹھ پتلیوں کی طرح تیائی ہوئی لکیروں پر چلنے کی کوشش کرتیں، وہ بھی ایسے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے کہ عین وقت پر مددگار کو آگر پنسل اور کھویا ہوا اشد ضروری پرچہ مہیا کرنا پڑتا۔ یہ عورت ذات بھی کس قدر غیر ذمہ دار جنس ہے۔ وہ لیکچر دینے کا وعدہ کر کے بالکل بھول جاتی عین وقت پر لوگ اُسے لینے بھاگتے اور یاد آتا کہ جو اسپیچ اِسے تیار کرنے کو دی گئی تھی اس کا سرسری طور پر بھی مطالعہ نہیں کیا۔

”کیا بتاؤں، بالکل بھول گئی“ بڑی سے بڑی غلطی کرنے کے بعد مسکرا کر کہہ دیتی۔ یہ اس کا جنسی حق تھا جس کا استعمال نہ کرنا حماقت تھی۔ کتنا ہی ضروری مرحلہ ہو ان کا رویّہ نہیں بدلے گا۔ بس یہ سمجھیں گی باواجی کا گھر ہے۔ مزے سے بیٹھی ہیں، کھانا دیر میں پھیکا سیٹھا پکے باورچی کا قصور، گھر میلا ہو نوکروں کا قصور، کپڑے گندے ہوں دھوبی کا قصور۔ کسی بات میں بھی تو ان کا اپنا قصور نہیں۔ رنڈی بن جائیں، سماج کا قصور، دھوکہ کھا جائیں، نسوانیت اور بھولپن کا قصور، لٹ جائیں، چوری چلی جائیں، بھگا لی جائیں، لونڈی بنا کر بیچ دی جائیں۔ سب ظالموں کا قصور!

کئی اصحاب نے اس کے نام سے مضامین اور نظمیں لکھ کر چھپوائیں۔ کتابیں چھپوانے پر تیار ہو گئے مگر اِس خشک تحفے کی طرف اُس نے اتنی بھی توجہ نہ دی جتنی چاندی کے بندے پا کر ہوتی۔ نئے زمانے کی نئی الجھنوں نے لوگوں کے پاس چھوڑا ہی کیا ہے سوائے حساس دلوں اور بے چین دماغوں کے۔ پہلے لوگ ساڑھیاں، بندے، جھومر ٹیکہ تحفہ میں دیا کرتے تھے، اب اشعار، مضامین اور افسانے حاضر ہیں۔ دولت سے مطلب! سودا پٹانے کے لیے کچھ تو چاہیے۔ کبھی ان سب پر ترس آجاتا۔ وہ بھی تو انسان تھے، جوان تھے، خواب دیکھنا جانتے تھے۔ قصور یہ تھا کہ بٹوارے کے وقت ان کے حصّے میں احساس زیادہ اور وسعتیں کم پڑی تھیں۔ اگر امیر پیسے کے زور سے دس عورتیں رکھ سکتا ہے تو قلم والا قلم کو کیوں زنگ لگائے۔ قلم بھی تو بے شمشیر کا توام بھائی ہے، وہ کیوں

نہ ملک گیری کرے ؟

چھٹی کا دن تھا اور فرصت تھی۔ ویسے ہیڈ مسٹرس کو کام کرنے کی ضرورت نہیں، اُس میں تھانہ داری کا مادہ ہونا چاہیے۔ اگر وہ چار استانیوں سے گھما پھرا کر آٹھ کا کام لے تو وہ صحیح معنوں میں محکمۂ تعلیم کی بہی خواہ ہے۔ مختلف تصویریاں چپکا کر الّو بنا کر زیادہ سے زیادہ بیگار لینا، وقتِ مقررہ کے بعد بھی کام کرانا اور پھر بھی استانیوں میں انتہائی درجہ کا احساسِ کمتری پیدا کر دینا کہ انھیں اپنے دماغ اور قوتِ تخیلہ پر بھی بھروسہ نہ رہے اور بالکل ہی پس کر رہ جائیں مگر اُف نہ کریں، سارے الزامات ان کے سر تھوپنا اور سرخروئی اپنے لیے رکھ لینا۔ بدانتظامی، جنگلی لڑکیوں اور نالائق استانیوں کے حصے میں، قبرستان جیسی خاموشی اور سرکس کے جانوروں جیسی سدھائی ہوئی طالبات ہیڈ مسٹرس کی محنت اور جانفشانی کا نتیجہ!

چپراسی نے آکر اطلاع دی کہ کوئی عورت ملنا چاہتی ہے۔ کہلوا دیا نہیں مل سکتی۔ ان عورتوں کی آمد بھی کئی قسم کی آفتیں لاتی ہے۔ کہیں دشمن کی جاسوس نہ ہو، نہیں کہ جا کر لگائی بجھائی کر دیں۔ کسی لڑکی کی ماں یا بہن ہوئی تو یا تو فیس معاف کروائے گی یا زبردستی درجہ چڑھانے کو کہے گی۔ نہ جانے یہ جاہل مائیں درجوں کو بانس کی سیڑھیاں کیوں سمجھتی ہیں جنھیں پار کرانا ہیڈ مسٹرس کا کام ہے۔ جہاں سالانہ امتحان شروع ہوئے اور کمزور اور بدشوق لڑکیوں کی ماؤں کو ہیڈ مسٹرس کی محبت چرائی۔ مٹھائیاں چلی آرہی ہیں، تحفے نازل ہو رہے ہیں۔ ہاتھ پیر جوڑے جا رہے ہیں۔ اگر نہیں مانتیں تو دھمکیاں اور گالیاں بھی موجود ہیں۔

چپراسی نے آکر کہا کہ عجیب ٹیڑھے قسم کی عورت ہے، نہیں مانتی۔ ساتھ ساتھ وہ خود ہی آگئی۔ مجبوراً ملنا پڑا۔ بُرقعہ اتار کر گھر کی طرح ہو بیٹھی۔

"آپ مس گپتا ہیں ؟" چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"نہیں!"

"نہیں تو شاید مسز نورانی ہیں؟"

"جی نہیں!" ذرا سختی سے کہا گیا۔

"کامنی دیوی؟"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ میں...."

"تو آپ یقیناً زہرہ ہوں گی... کیوں؟"

"جی... نہیں! مطلب کیا ہے آپ کا؟" جل کر کہا۔

"یا اللہ تو پھر آپ کون ہیں؟"

"آپ کی بلا سے آپ کو کچھ کہنا ہو تو..."

"اری بہنو کہنا تو بہتیرا ہے پر یہ بھی تو معلوم ہو کہ کون سی ہو... چہ... اچھا... آپ... اول۔ رہ... دی... ایسے وہ کیا بھلا سا نام ہے اللہ مارا... چہ... ہاں سنیم... تسنیم... خدا کی مار اس یاد پر۔"

"جی نہیں۔ میں نے کہا نا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی..."

"نہیں جی، ایسی بھی کیا غلط فہمی۔ اس حلقے میں تو... یہی نام ہیں۔ اچھا جانے دو، یہ بتاؤ کوئی سن نہیں رہا ہے۔"

"جی نہیں۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہے جلدی کہیے اور براہ کرم تشریف لے جائیے۔"

"ہاں ہاں گھبراؤ مت۔ تشریف بھی لے جاؤں گی مگر... خیر جو کچھ بھی ہو تمہارا نام خاک پڑے، مجھے کیا، تم اُسے تو جانتی ہو گی۔ افتخار احمد کو۔"

"ایں؟" شمن سمجھ گئی سی۔ آئی۔ ڈی سے پالا پڑا، مگر وہ بچہ نہ تھی۔

"مکُر نا مت، تمہیں قرآن پاک کی قسم، پاک پنجتن کا واسطہ۔ دیکھو بہن خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔ اپنے پیاروں کی قسم!"

"کیا مطلب ہے تمہارا! فوراً چلی جاؤ ورنہ..."

"بیوی مجھے ان گیدڑ بھبکیوں سے تو دھمکاؤ مت۔ تم سے زیادہ زمانہ دیکھا ہے اور بھگتا بھی ہے جو ان جلے نصیبوں میں لکھا تھا۔ پھر کیا فائدہ۔ بلا تو بتاؤ اس نے تمہیں ماں بنایا تھا یا بہن یا معشوقہ!"

"تم دیوانی معلوم ہوتی ہو... جانتی ہو کہ پھر...."

"اندازہ سے تو یہی معلوم پڑتا ہے کہ... کہ... بہن خوبصورت نہیں پر ہاں غنیمت ہو۔"

"تم نہیں جاؤگی؟"

"جاؤں گی کیوں نہیں، پر اپنی کہہ کر اور تمھاری سن کر... تو میرے خیال میں معشوقہ ہی ہوگی... ڈھنگ بھی بتاتے ہیں۔ اللہ رکھے شرم آگئی!" وہ طنز سے مسکرائی۔

"تمہیں ان باتوں سے کیا واسطہ؟"

"کچھ بھی نہیں۔ مجھ اُجڑی ہوئی کو کیا واسطہ ہوتا! بس یہی کہ میں اس بدذات کی بیوی ہوں۔"

"تم... تم!"

"ہاں میں۔ یقین نہ آئے تو لو یہ سرٹیفکیٹ دیکھ لو۔ میں جانتی تھی کہ تم یہی کہوگی جھوٹ۔ تو لو یہ... حسینی بی زوجہ افتخار احمد... قوم سید...."

تم کیا چاہتی ہو؟ آنکھیں جھک گئیں۔

"یوں کہو... ہاں تو بن بیاہی ہو یا ماشاءاللہ..."

"تم اپنی کہو... کیا کہنا ہے۔"

"تو ماشاءاللہ کنواری ہو۔ منہ سے تو یہی لگتا ہے، غیب کا حال اللہ جانے۔ آج کل کنواری بیاہی میں اللہ مارا فرق ہی کیا رہ گیا ہے۔"

"بکواس بند کرکے اپنا مطلب بیان کرو۔"

"تو بہن مطلب یہ کہ تمہیں اس کیڑے دل بھرے کباب میں کیا دکھائی دیا جو ریجھ گئیں۔ برا نہ ماننا اگر منہ سے کوئی بات نکل جائے تو، چودہ برس کی عمر سے تو میں اسے بھگت رہی ہوں، ایک گھڑی بھی سکھ چین کی گزاری ہو تو بارہ اماموں کی مار۔ دیدار نصیب نہ ہو۔ تین بچے ہیں... تیرے میرے گھر میں اتنی عمر گزاری... باپ کے حقے بھرے، بھتیجوں کے گوموت کیے، بھاوجوں کی پھٹکاریں سہیں۔ اللہ نے جیسا کچھ بھی ڈالا

بھگتا۔۔۔ پر اب بہنوٴ میری۔۔۔" شمن کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس کی ہچکیوں نے آئے حواس غائب کر دیے!

"میں ہار گئی"، "پر تم ماشاءاللہ پڑھی لکھیاں اسے بھگت رہی ہو۔ تمہارا اس میں قصور نہیں، وہ ہے ہی ایسا۔ خدا کی پھٹکار اُس پر۔ صورت نہ شکل، اللہ جلنے یہ عورتیں اُس پر کیوں لٹو ہو جاتی ہیں۔ اے اور تو اور بوڑھی بوڑھی ڈھڈو۔ کوئی بیٹا بنا کر کلیجے سے لگائے لیتی ہے، کسی کا بیرن بنا ہوا ہے۔ سنتی ہوں کہیں نکاح بھی کر رہا تھا۔"

"تم یہ کس افتخار کا ذکر کر رہی ہو؟"

"ایسا دیوانہ نہ سمجھو۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ کالج میں پڑھتا تھا تمہارے منگنے۔۔۔ شمشاد ہے نا تمہارا نام۔۔۔ خوب یاد آیا۔ فوٹو بھی ہے اس کے پاس اور۔۔۔۔ تم جھوٹ نہ سمجھو میں پکا ثبوت دے دوں گی۔ پہلے سُن لو۔ یہ جو نواب۔۔ ہیں نا اُن کی بیوی کا بھائی بنا ہوا ہے۔ اور میں ننھی نادان نہیں کہ ان بہنوں اور اماؤں کے چھل بٹے نہ پہچانوں۔ اللہ ماریاں اماں بہنیا کے رشتے کو شرماتی ہیں۔ ایسے کام کرو تو کھلے بندوں کرو جب جانیں۔۔۔"

"خیر۔۔۔ آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"یہ بتایئے آپ اُسے روپیہ دیتی رہی ہیں؟"

"نہیں!"

"جھوٹ نہ بولو۔۔۔ میرے پاس آپ کے خط موجود ہیں جن میں حوالے دیے گئے ہیں۔ یہی نہیں بہن، معاف کرنا، آپ نے اُس کے لیے بیٹھ کر سویٹر بنے ہیں، ہاتھ جلا جلا کر حلوے تیار کیے ہیں۔۔۔ اور۔۔۔"

"میرے خط دکھا سکتی ہو۔۔۔۔"

"مجھے پہچان تو نہیں مگر آپ کے شہر کی مہر ہے شاید۔۔۔" وہ مداری کی طرح تھیلے میں کچھ ڈھونڈنے لگی اور خطوں کے بنڈل نکال کر گود میں رکھ لیے۔

"میں... آپ چھیننے کی کوشش نہ کرنا..." اُس نے بے اعتباری سے ایک طرف مڑ کر کہا اور شمن شرم سے پانی پانی ہو گئی کیونکہ ایک ثانیہ کو اُس کے دل میں یہ خیال ضرور آیا تھا کہ کیوں نہ جھپٹا مار کر ظالم سے اپنی بیوقوفیاں چھین لے اور...

"یہ... نیلے لفافوں میں... آپ خود دیکھ لیجیے۔" شمن نے کپکپاتی انگلیوں سے لفافہ لے لیا۔ کھول کر دیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ حقیقت ننگی ہو کر ناچ رہی تھی!

"خاطر جمع رکھو... میں نے کوئی خط نہیں پڑھا۔ میرے بھیجے میں کہاں اتنا بوتہ کہ چھیلے کے محبت نامے پڑھوں۔ اور ہو شروع شروع میں چرائے بھی، پڑھے بھی، جلائے بھی، پر اب تو سب چیزوں پر خاک ڈال دی۔ اسے لکھنے والیاں نہ تھکیں پر میں تو ہار گئی۔"

"آپ کیا چاہتی ہیں؟" شمن نے بھیگی بلی کی سی میاؤں کی۔

"اری بہنیا میں کیا چاہوں گی۔ تم خود سوچ لو۔" پلنگ پر پالتی مار کر کہا۔

"یہ دیکھو کہ نکھٹو کو تو آنکھ کا تارا بنا کر رکھا ہے اور مجھ دکھیاری کو لوگ گھر میں نہیں گھسنے دیتے۔ 'چلو چلو، ہٹی کٹی بھیک مانگ رہی ہو۔' لو بھئی جیسے ہمیں شوق ہی تو ہے در در ٹھوکریں کھانے کا، لوگوں کے آگے ہاتھ پسارنے کا۔ کبھی ہمارا بھی زمانہ تھا۔ لاکھ کا گھر خاک ہو گیا۔ سُسر کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں، کوڑی کوڑی پھونک دی۔ اور یہ کنگال بیٹا میکے میں ٹھنٹھ خود نکل کھڑا ہوا۔ ویسے بچے دلانے برس کے برس پہنچ جائے۔ ابھی گئے مہینے تمہارے پاس آیا تھا۔ رات گئے میں نے اسٹیشن پر پکڑا اور وہ ویٹنگ روم میں سے ہوا ہو گیا۔ پر میں بھلا چھوڑنے والی تھی پھاٹک کے پاس چھپ گئی۔ جیسے ہی باہر نکلا میں ساتھ چلی کہ پتہ تو لگاؤں اس کے ٹھکانوں کا۔ جب وہ تمہاری کھڑکی میں کودا تو میں سنگ تھی۔ وہ تو میں اسی وقت آ جاتی پر فائدہ کیا تھا۔ دوسرے سنا ہے یار کے ساتھ مل کر عورتیں کام تمام کرنے سے بھی نہیں چوکتیں۔ وہ تو خاک بچاتا مجھے۔ اس کا بس نہیں جو گلا گھونٹ دے خود۔ مگر بہن جب تک میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا، پر اب معلوم ہوا اگر اندازہ غلط نہیں تو شریف گھرانے کی بیٹی

معلوم ہوتی ہو، آنکھوں میں شرم ہے۔" شمن کا جی چاہا کاش وہ اندھی ہوتی اور کان بھی پھوٹے ہوئے ہوتے! "تم کیا جانو اُس کے کتنے سلسلے چلتے ہیں۔ زمانے بھر کی عورتوں نے وظیفے باندھ رکھے ہیں۔ حکومت کو الگ نگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ یہ جو بھوالی گیا تھا یہ بھی کوئی چال تھی۔ میں تو خوش ہوگئی تھی کہ اللہ مارا اب تو مرے گا، بلا سے رانڈ ہو جاؤں تو خیر خیرات کی تو حقدار ہو جاؤں، بچوں کا پیٹ تو پلے۔"

"آپ فرمائیے بھی کچھ..." شمن نے سہمی ہوئی آواز نکالی۔

"یا اللہ اتنا جو فرمایا تو کچھ بھی نہیں۔ ماشاءاللہ اتنے دن باپ کو بھرا، تھوڑا بہت بچوں کا حق بھی سمجھو۔ اگر نہیں تو تمہاری مرضی۔ تم سے مل لی، جی خوش ہو گیا۔ شریف ہو، شرافت کو ہاتھ سے نہ دو گی۔ یہ نہیں کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی بیوی کی طرح لگیں غرّے ڈبے دکھانے جس نے کہا ہوش میں رہ کر بات کرو بیگم کس بھلاوے میں ہو۔ پرائے مرد سے آنکھ لڑاتے شرم نہیں آتی؟ اپنا چھ ہاتھ کا اچھا بھلا چھوڑ کر اس قبر بجو پر جی دے بیٹھیں۔ پھر اُدھر سے اینٹھیں تو بندی بھی ایسی ویسی نہیں۔ صاف کہہ دیا کہ خطوں کا بنڈل جاتا ہے سپرنٹنڈنٹ کے پاس کہ میاں دوسروں کے ٹکڑیاں چڑھاتے پھرتے ہو، گھر میں کیا مزے سے خود اپنی عزت پر ڈاکہ ڈلوا رہے ہو۔ آستین میں سانپ پال رہے ہو۔ بس نکل گئی ساری ہیکڑی، چٹ ہاتھ کے کڑے اُتار کے دینے لگیں۔ میں نے کہا بیوی ایسی کچی گولیاں کسی اور کو کھیلوانا۔ اللو نہیں ہوں۔ ایسا بھی کیا کڑے لیجاؤ جو کل کو خصم سے کہہ کر جیل میں دھروا دو تو کیسی ہو۔ ذرا پانی منگوا دو... خدا کی پھٹکار حلق بھی تو سوکھ گیا۔" شمن نے پانی انڈیل کر برف ڈالی اور پیش کیا۔

"جگ جگ جیو بہن، دکھیاری کی خاطر داری کا اجر ملے گا۔"

"یہ میری بنک کی کتاب ہے، یہ بندے اور چوڑیاں... اس کے علاوہ جو کچھ بھی آپ کو نظر آرہا ہے... آپ کو جو کچھ چاہیے لے جائیے۔" بیرنگ حسین بی بیٹھی

کتاب کے ورق الٹا گئیں۔

"کچھ تم نے جمع ہی نہیں کیا۔"

"جو کچھ بھی ہے یہی ہے۔"

"ہوں" وہ سوچنے لگی، "مگر میں تو کل جارہی ہوں۔"

"آج تو چھٹی کی وجہ سے پوسٹ آفس بند ہے۔" شمن نے سوکھی آواز سے کہا۔

"یہ بندے تو اچھی وضع کے ہیں، بہن لو کان بوچے لگتے ہیں۔ چوڑیاں دلی کی بنی معلوم ہوتی ہیں، کیوں؟"

"ہاں" شمن نے جبراً کہا۔

"اچھی ہیں، قدسیہ کے لیے ایسی ہی بنواؤں گی۔ بن باپ کی بچی ہے، پر دیکھ لینا جو کچھ بھی کمی نہ رہ جائے۔ اُسے تو وہ خدائی خوار بھی چاہو سے ہے۔ پار سال سو روپے دے گیا تھا۔ ویسے کیا جاتا میں نے اینٹھ لیے وہ زندگی اجیرن کی کہ اگلنا ہی پڑے۔ دو سو پر بھی دیلے تھے کہ ادھیڑ کر بچوں کے نباسے، تو میں لے منے اور اسلم کے لیے بنا دیے۔ اتنا سا ادن بچ گیا۔ خدا کی سنوار ان عورتوں پر کیا دریا دلی سے اکس بدنصیب کے لیے بنتی ہیں۔ اُون بھی تو مہنگا ہے۔" شمن خاموش سنتی رہی۔

"اچھا بہن تو میں چلی۔ یہ لو اپنے خط پتر گن لو سنبھال کر۔"

"اور روپیہ؟"

"اب جانے بھی دو روپلے۔ میرے آگے بھی کنواری بیٹی ہے، بیری کی طرح بڑھ رہی ہے۔ بیوی دنیا نہیں دیکھی تم نے، ایسا ہی ہے تو کچھ اُوپر پڑا ہو تو دے دو۔" شمن نے بٹوہ جھاڑ کر ایک سو چالیس روپے گنا دیئے۔

"اللہ تمہارا بھلا کرے۔ تم بھی بیاہ کر ڈالو بنّو، باپ دادا کا نام اچھالنے سے کیا فائدہ! یہ منہ پہ مہاسے نکل رہے ہیں، سرسوں دودھ میں گھس کر لگاؤ، اللہ نے چاہا چٹی کھال نکل آئے گی۔۔۔ تو میں چلی۔"

دروازہ کھلا اور وہ تیز قدم مارتی نکل گئی۔ شمن مٹی کے ڈھیر کی طرح بے جان

بیٹھی خطوں کے لاوارث بنڈل کو تکتی رہی۔ تو یہ تھی اُس کے گلشن محبت کی عمر بھر کی کمائی!

چپراسی نے آکر بتایا کہ جلسے کی کار انتظار کر رہی ہے۔ اسے آج ایک ضروری لکچر دینا تھا۔

"کہہ دو نہیں ہیں!"

اور واقعی اس وقت اس کی حقیقت 'نہیں' سے بھی کم ہو رہی تھی۔

(۳۹)

چونک کر اُس نے دیکھا تو شام کی دھندلی سیاہی کمرے کو مختصر بناتی جا رہی تھی۔ دہشت زدہ ہو کر وہ پیچھے سمٹ گئی۔ یہ اتنی دیر وہ کہاں رہی؟ جب حسین بی اُسے چھوڑ کر گئی تو خاصی دھوپ تھی۔ تو پھر یہ تین ہمارے گھنٹے اُس کے وجود نے کس طبقے میں ڈوب کر گزارے؟ احساسات کے ساتھ اس کا دل بھی سُن ہو گیا تھا۔ نہ ہلی نہ جلی مگر دل دھڑکتا رہا، پھیپھڑے پھولتے پچکتے رہے، خون کا دوران قائم رہا۔ مگر خود؟ نہ سوئی نہ جاگی۔ نہ ہی اتنی دیر کچھ سنا، دیکھا اور سوچا نہ ہی کوئی خواب دیکھا۔ تو پھر کیا کرتی رہی؟

ضبط کے تناؤ سے جملہ حواس معدوم ہو کر کسی نامعلوم گہرائی میں غوطہ مار گئے اور اب وہاں سے آہستہ آہستہ اُبھر رہے تھے۔ دفعتاً ان کی رفتار تیز ہوئی، جیسے سطح کی کوشش بڑھ گئی اور وہ اُوپر کی طرف دوڑنے لگے۔ سڑک پر لالٹینیں جل اٹھیں، تانگے آگے پیچھے دوڑنے لگے۔ دور کہیں ریل کی سیٹی بھی گونجی۔ کنکر کوٹنے کا انجن دن بھر کی جانفشانی کے بعد بھاری قدموں سے ڈیرے کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اس کی پھولی ہوئی سانسیں دھونکنی کی طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کے قصبوں کی طرف جانے والی ٹھسا ٹھس لاریاں ہاتھیوں کی طرح جھومتی چلی جا رہی تھیں۔ نئے نئے سُر اور نغمے کانوں میں لشتم پشتم گھسنے لگے اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ زمین کی سانسوں کو آج پہلی بار سُن رہی ہے۔ اتنی دیر مردہ رہنے کے بعد کانوں کے پردے ان آوازوں سے ناآشنا ہو چکے تھے اور بالکل غیروں کی طرح پراگندہ ہو کر ہر نئی آواز پر چوٹ کھا کر چونک اُٹھتے۔

تو دنیا موجود تھی! ویسی ہی جاندار اور ہٹی کٹی۔ صرف وہ گم ہو گئی تھی۔ اُسے بڑا دکھ ہوا کہ اُس کی غیر موجودگی سے کچھ بھی تو نظام درہم برہم نہ ہوا، مشین کے لکھو کھا پرزوں میں سے اگر ایک ننّھا سا بے حقیقت پیچ تھوڑی دیر کو ڈھیلا ہو کر گر گیا تو سفر رک نہیں گیا۔ کچھ بھی تو نہ ہوا۔ جملہ عناصر کی موجودگی میں صرف اس کی خاطر یہ کاروانِ حیات کیوں سست پڑ جاتا! روز مرّہ کا بھیانک انجن تو اسی طرح سیٹی بجاتا، پٹریاں بدلتا دندناتا رہا۔

وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ امتحان کے لیے دو چار قدم اٹھائے۔ ہاتھ پیر ہلا کر دیکھے، ہر ٹکڑا سالم تھا، پرزے چل رہے تھے، کلیں درست تھیں۔ کھوتے وقت تو پتہ نہ چلا، کھٹ سے بجلی کا بٹن دب گیا ہو گا مگر پاتے وقت وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی؛ کس طرح اس کی بھٹکی ہوئی ہستی جھجکتی، شرماتی واپس لوٹ رہی تھی۔ کسی نے کمرے میں روشنی بھی نہیں کی تھی۔ ادب کی وجہ سے کوئی اس کمرے میں آ بھی نہ سکتا تھا۔ اور جو اسی طرح وہ بالکل ہی کھو جاتی! تو یہ مودّب خادم اُسے ڈھونڈنے بھی آتے، اور شاید ڈھونڈتے بھی تو اتنی دیر سے کہ پانے کا وقت گزر چکا ہوتا۔ یہیں اس بستر پر وہ کھو جاتی۔ کیڑے مکوڑے اپنا حصّہ بٹورنے آ پہنچتے۔

مارے دہشت کے وہ کانپنے لگی۔ جی چاہا اُس گھٹے ہوئے ننّھے سے ڈبّے میں سے بھاگ کر جمِ غفیر سے لپٹ جائے۔ انھیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ لے اور کہے: "مجھے خود میں جذب کر لو، چھپا لو۔ چاروں طرف سے گھیر کر اس ڈراؤنے اکیلے پن کو مار بھگاؤ اور اب مجھے نہ کھونے دینا!" اور پھر شاید ان کی زندگی کے مس سے یہ مردنی چھپٹ جائے گی جو اس پر برسوں کی پڑی خاک کی طرح ذرہ ذرہ گر کر جمع ہو گئی تھی۔

یہ اس کے کمرے میں قبرستان جیسی پرانی اور ٹھنڈی بُو کیسی ہے جیسے برسوں سے بند پڑا ہو۔ چپڑاسی نے آج لوبان بھی تو نہیں جلایا۔ مگر پھر اُسے ایک دم لوبان کی خوشبو سے ڈر لگنے لگا۔ اُس کی مردہ خوشبو سے تو یہ کمرہ بالکل پرانی قبر ہی بن جائے گا۔ وہ کیا کرے؟ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کس کے پاس؟ دیر تک وہ یہی سوچتی رہی کہ اب اپنے اس

ٹوٹے پھوٹے وجود کا کیا کرے، کس طرح بکھرے ہوئے ذرّوں کو سمیٹ کر جوڑ ڈالے!

"ماں... ماں" وہ خاموشی سے پکارنے لگی۔ اس کا جی چاہا چیخ چیخ کر ماں کو پکارے اس ماں کو نہیں جو اس کے باپ کے گھر میں بیٹھی اس کی خواہشات کو تسکین پہنچایا کرتی تھی۔ اور جس نے اُسے جنم دے کر دوسرا بچہ پیٹ میں ڈال لیا تھا پھر اُسے فراموش کر دیا تھا، بلکہ وہ ماں جس کی پیار بھری گرم آغوش میں گول مول ہو کر وہ روح کی اس ٹھٹھرن کو دور کر سکے جس کے نرم و نازک ہاتھ اُس کی تھکی ہوئی کمر کو سہلائیں اور دکھتی ہوئی آنکھوں کو بھینچ کر اُن آنسوؤں کو نکال دیں جو مئی جون کے بادلوں کی طرح اُس کی کنپٹیوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ گرم گرم لُو جیسے تھپیڑے کانوں کے پیچھے سے اُمڈ کر انہیں جھلا رہے تھے پر برسنے نہیں دیتے تھے۔

"ٹھیرو... ٹھیرو... ذرا دیر ٹھیرو" اُس نے خود کو نرمی سے چمکارا۔ "ذرا سی دیر ٹھیرو، سب کچھ گزر جائے گا۔ یہ دھول بھری آندھی بیٹھ جائے گی، طوفان اُتر جائے گا۔ ایک گلاس پانی پی لو... ٹھنڈا ٹھنڈا!"

فرماں بردار بچے کی طرح چل کر اُس نے احتیاط سے تھرماس کھولا، برف کے ٹکڑے ہیروں کی طرح پانی میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔ کھڑکی میں سے آتی ہوئی کمزور روشنی انہیں آبگینوں کی طرح چمکا رہی تھی۔ خود اس کی سانس تھرماس کے خالی حصّے سے ٹکرا کر ہیروں کو چومتی ہوئی واپس اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔ چہرے کے عضلات خود بخود مسکراہٹ میں ڈوب کر ڈھیلے پڑ گئے۔ جان بوجھ کر اُس نے تھرماس سے منہ لگا کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنا شروع کیں۔ ٹھنڈی ہوا کی چادریں سی حلق میں اُتر گئیں۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے ایک چکیلی شفاف ڈلی کو چھوا۔ ارے! ایک ٹھنڈا بوسہ سارے جسم میں بچھو کے زہر کی طرح چڑھ گیا۔ اور ہمّت بڑھی، انگلی بڑھا کر اُس نے ایک ڈلی کو پکڑ لیا جو پھسلی مچھلی کی طرح زور مارنے لگی، مگر جھٹ سے اُس نے ہتھیلی پر ڈال دیا۔ جلد میں سے ہوتی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی گدگدی کہنی تک پھیل گئی۔ شفاف ڈلی آنسوؤں میں تیرنے لگی۔ ہتھیلی کی گرمی سے بے چین ہو کر وہ اِدھر اُدھر مچلنے لگی۔ نہ

جانے کیا خیال آیا کہ اُس نے برسوں کے پیاسے ہونٹ اس پر چپکا دیے۔ اتنی دیر بیکار پڑے رہنے سے زبان بے مزہ ہو گئی تھی سارا منہ کڑوا ہو گیا، جیسے کسی نے کچّی کچّا خون لے کر حلق میں پوت دیا۔ ہاتھ ڈال کر اُس نے بھاگتے ہوئے ٹکڑوں کو مٹھی میں بھینچ لیا اور منہ میں بھر کر چبا ڈالا، یہاں تک کہ اُس کا حلق، زبان اور خوراک کی نالی یخ ہو گئی۔ مگر وہ برفیلے چنے چباتی رہی۔ ڈلیاں ختم کر کے اُس نے گدلا پانی گلاس میں انڈیلا۔ ندیدے شرابی کی طرح وہ ایک ایک جرعہ نچوڑ لینا چاہتی تھی۔ بھر ماس چھوڑ کر اُس نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ذرا اوچھا پڑا اور — گلاس ایک شیریں چھناکے سے اچھل کر زمین پر گرا۔ ٹکڑے بالکل جاندار پرندوں کی طرح پھڑپھڑانے لگے۔

وہ سچ مچ بسور دی جیسے کسی نے ننھے سے بچے کا دودھ لنڈھا دیا۔ اور وہ اس وقت بہت حساس اور ننھی بن گئی تھی بچپن اور ممتا کے سارے جذبات گڈمڈ ہو کر نہ جانے کیا بن گئے تھے۔ غم و غصّے کا جوش سوڈے کی اُبال کی طرح فوراً بجھ گیا۔ ایک بار بے اختیار جی تڑپا کہ گلاس کے بلوریں ٹکڑوں کو بھی ٹھنڈے چنوں کی طرح چبا کر نگل جائے، مگر بُری بات کے اندیشے نے ٹوکا اور وہ چڑتے ہوئے بچّے کی طرح کٹکٹاتی ہوئی دانت پیس کر اُس نے پوری طاقت سے ٹکڑوں میں ٹھوکر مار کر انہیں سارے فرش پر بکھیر دیا۔ چمکیلے ذرّے ہوا میں نیم مردہ چنگاریوں کی طرح چیخ کر تیر گئے۔

بڑا لطف آیا! جیسے کنپٹیوں میں اُڑتے ہوئے بادل ڈھیلے ہو کر اُڑ رہے ہوں۔ اس نے دوسرا گلاس اُٹھایا۔ پہلے روشنی کی طرف کر کے اُس کے اندر جھانکا۔ پردوں کے چاروں طرف قوسِ قزح کی گوٹ، آگے پیچھے دوڑتے ہوئے رنگوں کے ڈورے۔ دور رکھی ہوئی میز کتنی ننھی سی بالشتیوں جیسی لگ رہی تھی۔ پلنگ اور کرسی بھی اور اسے وہ خود بھی تو اتنی ہی ننھی سی ہو گئی، جیسی تو ان چھوٹی چھوٹی کھلونوں جیسی چیزوں پر بستی اور بیٹھتی ہے! اور یہ ساری دنیا اس گلاس میں آ کر بس گئی ہے۔ وہ خربوزے کے بیج برابر کتابیں، بٹن برابر اسٹول اور کپڑوں کی کھونٹی! کیا اچھا ہوتا جو وہ خود بھی ننھی سی گڑیا کی طرح کرسی پر دراز نظر آتی۔ یہ باریک دنیا اس کی رسائی سے کیوں دور تھی اور وہ کس دروازے سے گھسے اندر؟ جل کر اُس نے گلاس چھوڑ دیا۔ الماری کھول کر جلدی سے بنا سٹ

ہلکے آسمانی رنگ کے گلاس اس نے ایک ایک کر کے روپہلی قہقہوں میں غرق کر دیئے۔

تو کیا ہوا، وہ کل اور نیا سیٹ لے آئے گی۔ نیلا پیلا گلابی ہر رنگ کا گلاس اور پھر اُن کے ٹکڑوں کے ساتھ خود بھی قہقہے لگائے گی۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ڈر کر وہ ٹکڑوں کو چھپانے لگی۔

"ستار ماسٹر آئے ہیں!" چپراسی نے کہا۔

"بھگاؤ کمبخت کو!" اس نے کہنا چاہا مگر خیال بدل دیا۔

"آتی ہوں۔" اس نے اپنے کھوئے ہوئے رعب کو ڈھونڈ کر کہا۔

جلدی جلدی ساڑھی کی شکنوں کو ہاتھوں سے دور کیا، چپل پہن کر آئینے کے پاس گئی، روئے ہوئے شریر بچے جیسے چہرے کو جلدی سے پاؤڈر تھوپ کر دھندلا کر دیا، زائد پاؤڈر تولیہ سے پونچھ کر، اس نے بال کنگھی سے اونچے کیے، بائیں آنکھ کے پپوٹے پر سے پاؤڈر رگڑ کر وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی۔

ستار پر جے ونتی کی نئی گت کے توڑے لیتے وقت اس کی نظر ہیرے کے انگوٹھے پر پڑی۔ خون سے ڈر کر اس نے ہاتھ نہیں روکا۔

"ٹھوکر لگاتے وقت مضبوط ٹو کا جوتا پہننا چاہیے۔" اُس نے خون کو قالین پر رگڑ دیا۔

سونے سے پہلے اس نے دونوں دروازے احتیاط سے بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ کھڑکی کا پردہ بھی کھینچ دیا۔ ہر طرف سے مطمئن ہو کر وہ دبے پیر پلنگ کے پاس آئی۔ آہستہ سے بستر گھسیٹ کر زمین پر ڈال دیا۔ چھت کا پنکھا کھول کر چت لیٹ گئی۔ ریڑھ کی ہڈی خاص خموں میں جھکنے کی عادی سیدھے فرش پر لیٹنے لگی۔

"نہیں... نہیں ہر خم مٹا دیا جائے گا۔ اس لہریے کو سیدھا ہونا پڑے گا۔" اس نے حکم دیا اور ایسی گہری نیند میں ڈوب گئی جو برسوں سے صرف آرزو بن کر رہ گئی تھی۔

(۴۰)

کہ بڑی تو عام ہوا دن بہت چڑھ آیا ہے۔ خبروں کا وقت نکل چکا تھا، ریڈیو پر

کوئی دھیمے سروں میں کسی تازہ دم راگ کا الاپ کر رہا تھا۔ اطمینان سے چائے کی پیالی ختم کی اور صبح کا اخبار اٹھا لیا۔

جرمنی نے روس پر حملہ بول دیا۔

وہ جلدی سے تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گئی اور دوبارہ ان موٹے موٹے حرفوں کو پڑھا جو تاریخ کے ماتھے پر خونیں لکیروں کی طرح کھنچ چکے تھے۔ اُسے حسین بی کو دیکھ کر اتنا تعجب نہ ہوا تھا جتنا اس خبر کو پڑھ کر ہوا، مگر نہ جانے وہ کیوں مسکرا دی۔ خبریں اگر نئی صورتیں اختیار کر کے آئیں تو انسان مسکرا ہی پڑتا ہے۔ کل تک روس اور جرمنی گلے میں باہیں ڈالے ایک دوسرے کو چمکار رہے تھے اور آج یہ جو تم پیزار شروع ہو گئی۔ شبہ تو تھا مگر اتنا قریب نہیں۔ ۲۲ جون بھی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ کسی کو معلوم ہی نہیں کہ روس کے علاوہ کسی اور کی سلطنت کو بھی تاراج کر دیا گیا تھا۔ آنے والی پود اس تاریخ کو رٹتے وقت اس سلطنت کی شکست خوردہ رانی کے خواب سے بھی واقف نہ ہو گی مگر پھر بھی یہ دن کسی نہ کسی صورت میں دنیا کے دماغ میں بسا رہے گا اور اس خیال سے اُسے ایک گونہ تسکی ہو گئی۔ جو کچھ بھی کیا ہٹلر نے ٹھیک کیا، ورنہ یادداشت کے لیے اُسے اپنی ڈائری خراب کرنی پڑتی۔ اس حسین خوابوں کی ڈائری میں یہ دھبہ کتنا بھدا معلوم ہوتا!

اب سے اُسے اُٹھنا چاہیے۔ دکانیں کھل گئی ہوں گی۔ جنگ کا یہ نیا رُخ ضرور قیمتوں پر اثر ڈالے گا۔ جاڑے کا سامان بھی اگر خرید لیا جائے تو کیا ہرج ہے۔ ضروری کام کا بہانہ کر کے وہ فوراً اسکول کی لاری میں بازار چل دی۔

آج اُسے ذرا شوخ رنگ پسند آ رہے تھے۔ اس دن نہ جانے کس سے کہا تھا کہ سانولے رنگ پر گدلا سبز رنگ بہت زیب دیتا ہے، کاسنی نفاست کا پتہ دیتا ہے اور سنہرا شاہی کہلاتا ہے۔ بنارسی فیتے آگے چل کر ضرور مہنگے ہو جائیں گے ساٹن بھی چڑھ رہی ہے۔ وہ کوٹ جلد ہی بیکار ہو جائیں گے۔ ہر چیز دگنی خریدنی چاہیے۔ نصف سے زیادہ پونجی کپڑوں میں تبدیل ہو گئی۔ باقی کچھ نئے سینڈل، کٹلری اور چیٹ

ہٹ میں اُڑ گئی۔ اُس نے ایک خاتون کو زرد پیلی روغن ناخنوں پر چڑھائے دیکھا تھا۔ کالے سیاہ ہاتھ راون کی بہن جیسے خونخوار لگ رہے تھے۔ خیر باقی تو چار پانچ رنگ اسے پسند آئے، ٹیٹنی ردّی ہوتی ہے، بلیک میجک کا مقابلہ نہیں کر سکتی، مگر میکس فیکٹر کا پورا سٹ کیا برابر رہے گا! عمر میں پہلی مرتبہ ایک ماہ کے کل خرچ کے برابر روپیہ اس نے انہیں لوازمات میں جھونک دیا۔ سنگھار میں دیسی بدیسی سب چلتا ہے اور کپڑوں میں بھی کون پوچھتا ہے۔ کہہ سکتی ہے کہ پہلے کا خریدا ہوا پڑا ہے۔ ترقی پسند بننے سے پہلے کا ہے۔ جلانا بھی بے وقوفی ہے مجبوراً پہن ہی ڈالا جائے۔

بغیر آستین کے بلاؤز میں کتنے ہی فائدے ہیں۔ کپڑا کم، گرمی کم، اور آرام زیادہ۔ جاڑوں میں بھی کوٹ کے نیچے پہن لو تو کندھے بہت نہیں پھولتے، بازوؤں کی حالت نہیں اور جلد بھی دو رنگی ہے! کہنی تک گری اور جہاں چھپی رہی وہاں ہلکی۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ لوگ سمجھ جائیں گے کہ نیا نیا سیکھا ہے ذرا سے رک کر کیا لیں گے!

وہی کامریڈ صمد کی پانچ سیٹ جس میں ہمیشہ دم گھٹتا تھا آج ضرورت سے زیادہ وسیع معلوم ہوئی۔ ایک طرف کامریڈ اور دوسری طرف شاعرِ انقلاب پھر بھی کافی جگہ تھی۔ اور اسے ذرا بھی اعتراض نہ تھا! جب وہ دونوں بار بار ایک دوسرے کی سگریٹ جلانے یا کسی اور بہانے سے اُسے دونوں طرف بھینچنے لگتے۔ ان کی گرم سانسیں گردن اور بازوؤں کو سینکتیں یا اُن کی بکل پنڈلیاں اُس کی ساری سے ٹکراتیں تو وہ بالکل اجان بن کر باہر دیکھنے لگتی، ایسے کہ اُس کے دونوں رُخ حسین زاویے پیش کر سکیں۔

ساٹن کی صدری میں یہ بڑا عیب ہے کہ آنچل بہت پھسلتا ہے اور انقلابی شاعر کی آنکھیں لٹو کی طرح ناچتی ہیں۔ صمد کی گردن میں بار بار کیا چیز رینگتی ہے کہ جسے ہٹانے کے لیے اُسے اپنی کہنی شمیم کے پہلو میں اڑانا پڑتی ہے۔ اور شاعر کی رانوں میں کھجلی ہوتی ہے تو وہ اپنے جسم سے زیادہ قریب بیٹھنے والے کے جسم کو کھجا ڈالتا ہے۔ آگے جھک کر وہ پروفیسر رحمان سے وقت پوچھنے لگی۔ گو کامریڈ اور شاعر دونوں گھڑیاں باندھے تھے مگر رحمان کے سر پر جا کر نئے قدموں سے دوڑ رہی تھی۔

جلسے میں زور شور کا مباحثہ رہا مگر سب کچھ بوکھلائے سے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسے بُرا کہیں اور کسے اچھا۔ جتنے منہ اتنے بول۔

"بیوقوف ہے، روس کو چاہیئے تھا جرمنی سے مل کر امپیریلزم کا خاتمہ کرتا۔"

"دکھاوے کی ہے۔ لڑائی، اڑا دی ہے دشمنوں نے۔"

"نہیں جی خبر سچی ہے، پیراڈس میں رات بھر گورے خوشی سے ناچتے رہے۔ اپنی بلا دشمن کے سر، سب سے پرانا دشمن ہے۔ اب دیکھو جرمنی کے ساتھ مل کر خود پٹیں گے اسے۔"

"ارے آج تو یہ امن کے ٹھیکے دار دونی چڑھائیں گے۔ برسوں کی مراد بر آئی۔"

"نہیں جی روس کا ساتھ دیں گے، عملاً نہ سہی زبانی ہی سہی اور خود چمگادڑ کی طرح دور کھڑے جیتنے والی پارٹی کا انتظار کریں گے۔"

"آخر میں پٹے ہوئے روس اور جرمنی کو سب مل کر بانٹ کھائیں گے۔"

"فی الحال تو یہ روس کی طرفداری کریں گے اور کرنا بھی چاہیئے۔ روس کی موت انسانیت کی موت ہوگی اور معلوم ہوتا ہے انسانیت کا بڑھاپا آن پہنچا۔"

"زیادہ سے زیادہ دو ماہ لگیں گے روس کو پٹنے میں۔"

ادھر سواستکا لٹو کی طرح گھومتا اپنا دائرہ بڑھاتا رہا ادھر شمشاد نے سٹہ بازی شروع کر دی۔ آج کامریڈ صمد کی موٹر میں کل انجنیئر صاحب کے ساتھ۔ ایک دن شاعر کے شعروں میں رچ کر کسی لو سیدھے سٹوران میں تو دوسرے دن پروفیسر رحمان کی نیم تاریک لائبریری میں! ایک ہفتہ سپرنٹنڈنٹ کے خیمے میں تیتروں کا شکار تو دوسرے ہفتے نہر کے کنارے ننھی سی چھولداری میں کافی کے گھونٹوں کے ساتھ اونچے اونچے قہقہے۔ وہ بڑی ڈرلیک ہو گئی تھی۔ کم خوری سے جسم بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ انگلیاں دراز اور لوچدار ہو گئی تھیں اور پیروں کے جوڑ کا تکسہ ذرا سی دور چلنے سے ٹخنوں میں ٹیسیں اٹھنے لگتیں اور مسلنے سے اتنی گدگدی ہوتی کہ وہ اپنے روغنی ناخنوں سے مسیحا کے ہاتھ کی کھال اتار لیتی۔ کامریڈ صمد ان گہرے نشانوں کو تنہائی میں چومتے تھے۔ انقلابی شاعر نے ان ننھے گڑھوں کو کنوئیں سے تشبیہ دی تھی جہاں اُن کا اداس دل شام

کی تنہائیوں میں ڈوبا اُچھلا کرتا تھا۔ انجینئر صاحب کا خیال تھا کہ یہ نشان، بہت دن بعد جب زندگی اُنہیں ایک دوسرے سے بہت دُور بھگا لے جائے گی تو، صحرا میں گرے ہوئے ڈھانچوں کی طرح کسی شاندار کارواں کی یاد دلائیں گے۔ پروفیسر ادیب تھے اور ان کے ہر جملے سے ادب ٹپکتا تھا۔ وہ انھیں ایک گمراہ روح کے قدموں کے نشانوں سے تعبیر کرتے تھے۔ کہاں کہاں پہنچ چکے تھے یہ اچھوتے چھاپے! نگاہ تخیل بھی تو ان کا پیچھا کرتے کرتے بھٹک جاتی تھی۔ دوران خون بھی اپنی گرمی سے انہیں نہیں پگھلا سکتا۔ یہی ستارے کھروینچے ان کے دل و دماغ پر بھی تو کھنچے ہوئے تھے۔ مرنے کے بعد ان کی ہڈیاں بھی ان داغوں کی گواہی دیں گی۔ وہ ان سب سے بے تکلف تھی۔ وہ اُس کے کمرے میں بغیر اجازت گھس آتے، پھر اُس پریشانی پر جھینپ جاتے۔ اس کے بستر دل پر ہیمنوں کی طرح کلیلیں کرتے۔ مذاق میں اُس کی ساڑھیاں اوڑھتے۔ اس کی چوڑیوں سے جُوا کھیلتے۔ ایک ایک چوڑی دس دس روپیہ کا نوٹ بن کر ایک جیب سے دوسری جیب میں جاتی۔ اُس کے کپڑے ناکوں سے بھینچ کر اس کی مخصوص خوشبو دماغوں میں محفوظ کر لے جاتے تاکہ اس سے بچھڑ جانے کے بعد وہی خوشبو سونگھ کر اُس کی یاد میں بے چین ہو سکیں اور گزرے زمانے کی یاد تازہ ہو جائے۔

اپنی گھنگھریالی پیچیدہ کاکلیں اس نے کتنی ہی تراش کر اُن کے سینے کے تعویذوں کے لیے دے دیں، یہاں تک کہ اُسے بالوں کے لنڈورے ہو جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ جہاں کہیں اُس کی چوڑی ٹوٹ جاتی تبرک کی طرح بانٹ لی جاتی۔ اشعار میں آنے کے لیے شاعر انہیں ہونٹوں پر لپ سٹک کی طرح نچایا کرتے اور گو ہونٹ بے رنگ رہتے دل و دماغ قوس قزح کے رنگوں میں ڈوب جاتے۔ جوڑے کے پھولوں کی آمادہ پنکھڑیاں، میلے رومال اور ایسی ہی ایک غیر شاعرانہ دماغ کو واہیات نظر آنے والی چیزیں کتابوں میں نشانی کے طور پر رکھی جاتیں۔ نہ جانے اُس نے کتنے ہی لال، سفید اور پیلے پھول لوگوں کو اپنا گنوارا تحفہ بنا کر دے دیئے، کتنے ہی سیب اور شربت کے گلاس ساتھ مل کر چار ہونٹوں نے چوسے۔ مگر وہ پھر بھی پیاسی ہی رہی۔

اختر نے اُسے ایک نایاب نسخہ سکھلایا تھا۔ اگر شیر کو سدھانا ہو تو بھوکا رکھو۔ حکومت کرنا ہو تو بھوکا رکھو۔ جو گنتی کے سفید کروڑوں کالوں پر راج کر رہے ہیں یہ سب بھوک کی پالیسی کی بدولت۔ نتھنوں میں خوشبو آئے، رال ٹپک پڑے، زبان باہر نکل آئے مگر کھانا مت دو۔ پیٹ بھر جاتا ہے تو کھانے والا لقموں کا مزہ دوبارہ نہیں یاد رکھتا۔ حلق سے اُترا سو گیا۔ بس ہونٹوں تک بات کرو، حلق سے دور!

وہ اُن سے اوندھے سیدھے کام لینے سے بھی نہ چوکتی۔ رات کو دس گیارہ بجے اُسے یکایک نازیل کے خوشبودار تیل کی ضرورت ہوتی، موجودہ تیل یا بدبو دینے لگتا یا جی سے اُتر جاتا، وہ اسی وقت انہیں موٹر میں دوڑاتی۔ پٹرول کی قلت کے باوجود اگر جوہی کی خوشبو کا ناپسند ہوتا تو واپس کروا کے مولسری کی مہک کا لاتے اور گورنمنٹ سے ضروری کاموں کے نام سے پٹرول لیتے یا پھر کالا بازار چوپٹ کھلا تھا۔ نئے نئے رنگوں کی جارجٹ کی تلاش میں انہیں دلی کلکتے تک ہلکان کر دیتی۔ اس کے علاوہ اُن سے تکیوں کے غلاف بدلواتی، گدے جھٹکواتی، پردے ٹنگواتی، ننھے سے ہیر اپن سے شلواریں کمر بند ڈلواتی اور اُلجھا ہوا اُون سلجھانے کو دے دیتی۔

سر میں تیل سوائے شاعر کے کسی سے نہ ڈلواتی کیونکہ چمپی کرنی بہت مزے کی آتی تھی۔ ساتھ ساتھ کندھے بازو اور کمر بھی بڑی اچھی دبا دیتے تھے۔ وہ انہیں اس معاملے میں چھوٹی موٹی محدود رعائتیں بھی دے دیتی۔ اور کنگھی کرتے میں جب وہ ہر بال کی شان میں فی البدیہہ آزاد نظم کہتے تو وہ حیرت زدہ ہو کر دائیں گال کے تل کے قریب چنگلیا کا روغنی ناخن رکھ کر بیٹھ جاتی۔ اسے آئینے میں بغیر دیکھے اس تل کے پاس ناخن پہنچانے کی مشق ہو گئی تھی، اس صفائی سے کہ چھپ نہ جائے اور یہ حرکت بالکل غیر اداری معلوم ہو۔ اگر وہ کسی سے جل اٹھتی تو شاعر پر اپنے لاڈ کی بارش شروع کر دیتی۔ وہ بے چارا سب سے کمتر سمجھا جاتا تھا لہٰذا اس کو یوں چڑھتا دیکھ کر لوگ ضبط کے دائرے سے پھسل پڑتے، لیکن اگر سنڑ بہت زور سے پڑ جاتا تو وہ لبسورنے والے کو منا لیتی۔

باوجود ان مظالم کے اُس نے ہر ایک کو یہی یقین دلا رکھا تھا کہ وہ انتہائی درجہ

کا بے رحم، سخت دل اور غصہ ور ہے، جب چاہے بچاری کا دل توڑ کر رلا سکتا ہے۔ لہٰذا وہ سب یہی شیخی مارا کرتے تھے کہ جب چاہیں اُسے تڑپا تڑپا کر رلا سکتے ہیں۔ اور یہ تھا بھی ٹھیک۔ ذرا سا کنپٹیوں پر زور ڈالتی اور آنسو چھلک پڑتے۔ سب کا یہی قول تھا کہ اُس کی آنسوؤں میں تیرتی ہوئی آنکھیں بالکل جل پریاں معلوم ہوتی ہیں۔ اور جب روتے روتے اس کا برا حال ہو جاتا تو وہ خود بھی رو پڑتے۔ پھر دو محبت بھرے دلوں کے آنسو ایک ہی رومال میں جذب ہو جاتے!

جو اُصول اُس نے بنا رکھے تھے اگر کسی بے صبرے نے توڑنے کی ہمت کی تو وہ ایک دم باسی ہار کی طرح اُتار کر پھینک دیا گیا۔ اگر چاہتے ہو تو جتنا ملتا ہے کلیجے سے لگاؤ اور صبر کرو، نہیں چاہتے تو ٹھنڈے ٹھنڈے گھر سدھارو۔

کون کہتا ہے کہ بے پیے نشہ نہیں ہوتا۔ بعض ایسے بھی ہیں جو صرف سونگھ کر مست ہو جاتے ہیں، بعض اوروں کو پیتا دیکھ کر جھوم لیتے ہیں، کچھ ایسے ہیں کہ شراب و کباب کے اشعار پڑھ کر ہی مدہوش ہو لیتے ہیں۔ یہی حال جنسی زندگی کا ہے۔ بعض ایسے ہیں جنہیں قصے کہانیوں ہی سے چین پڑ جاتا ہے۔ چند کند ذہنوں کو تصویروں اور فلموں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ اور اچھے بھلے تجربہ کار بھی ان چیزوں کو دیکھ کر نہ جانے کون سی بچی ہوئی ضرورت پوری کرتے ہیں، تو بس یہ لوگ بھی اس قبیل کے تھے جو پانے کی اُمید میں کمنڈل لیے دروازے پر ٹوٹے ہوئے تھے۔ یہ وہ خوب جانتی تھی کہ وہ خواہ انہیں کتنا بھی اُلّو بنائے آج یا پھر کبھی وہ خود اپنے ضمیر سے بھی اپنی بے وقوفیوں کا اعتراف کریں گے۔

مگر ایسے لوگوں کو ٹھکرا دینا بڑی حماقت ہے۔ نا اُمید ہو کر تو وہ فوراً ہی جو کچھ نہ پا سکے تخیل میں پا لیں گے اور وقت آنے پر اصل جیسی نقل کر کے ڈینگیں ماریں گے، ہزارہا باتیں دل سے جوڑ کر لگا دیں گے۔

وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ان کی مجال نہیں جو وہ جُدا ہو کر اُسے بھول سکیں۔ کم از کم اُس کا خیال اُن کے اکیلے پن کو تو دور ہی کر دیا کرے گا۔ اس کا ذکر کر کے وہ بیوی اور دوسری

معشوقاؤں کو حسد کی آگ میں جلا لیا کریں گے۔ جب جی چاہا معشوق پولیس کے ڈنڈے کی طرح بیوی کی چاند پر دے مارا۔ موقع بے موقع کسی کی یاد میں ایک کھولتی ہوئی پھنکار مار کر نیم غنودگی میں ڈوب گئے۔ دکھ بھری رنگین مسکراہٹ کے ساتھ سب کو چھوڑ کر دور رومان کی گود میں اُڑ گئے۔

"آہ کیا ساری پہنتی تھی! اُس رنگین شام کو رگ رگ مہک رہی تھی۔ بالوں میں نہ جانے کیا نشہ اور عطر چھڑک رکھا تھا کہ دل مچلا جاتا تھا۔ کئی بار میں نے چپکے سے جھک کر بالوں میں ناک گڑو دی!" بس کافی ہے، ایک بدبودار اور بدشکل بیوی کو جلا کر بھسم کر دینے کے لیے۔

وہ ان سب پر یہی ظاہر کیے رہتی تھی کہ اور دل سے تو صرف مروت کی وجہ سے ملتی ہے اصل چوٹ تو اُسی نے لگائی ہے۔ اگر ایک سے بے تکلف ہوتی تو چاہتی دوسرا بھی دیکھ لے کہ ایک چولہے پر رکھا تاپتے تو پہلے کی آنچ بیکار نہ جائے، کچھ نہ کچھ وہاں بھی بھنتا رہے۔ یہ بڑا کارگر حربہ تھا اور اس کی فتح کا سب سے بڑا راز! وہ اب اکیلی کہیں نہ جاتی۔ ان 'پناہ گاہوں' کے بغیر اس پر دہشت طاری ہو جاتی۔ بازار بھی جاتی تو انھیں کی موٹروں میں۔ وہ فخریہ پیچھے پیچھے خرید و فروخت کی پوٹلیاں، جوتوں کے بنڈل، بسکٹوں کے ڈبے، تازہ ترکاریوں کی گٹھیاں لاد کر چلتے۔ مہینے کی جنس موٹر میں پہنچا جاتے۔ دھنیا گھنا ہوتا تو دوسرے پھیرے میں بدلوا لاتے۔ یہی نہیں وہ سیکڑوں ایسے کام کرتے جن کا اگر اُن کی بیویاں ذکر بھی کر دیتیں تو مارے شرم کے ڈوب مرنا بہتر سمجھتے۔

شاعر بیچارے کے پاس اپنے شعروں کے سوائے اور رکھا ہی کیا تھا جو اُس کے قدموں پر نچھاور کر دیتا، لہٰذا اُس نے اپنی نئی تصنیف اُس کے نام معنون کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس انوکھے تحفے میں اُسے بڑی دلچسپی نظر آئی اور بڑے سوچ بچار کے بعد اُس نے خود نہایت رسیلے اور چٹپٹے جملے ڈھونڈ کر لگائے:

"اُس کے نام — جس کا نام میں نہیں لے سکتا۔"

"شرارت بھری آنکھوں کے نام"

"اس برق صفت کے نام جس کی نگاہوں کے تازیانے میں برداشت نہ کر سکا"

یا

"اس برق صفت کے نام جس کی نگاہوں کے تازیانوں نے میرے دل پر گہری لکیریں کھینچ دیں۔"

"اُس شعلہ رُخ کے نام جس نے میری زندگی کے تاروں کو اپنے حسن کی مضراب سے لرزا دیا"

"اُس سیماب وش کے نام جس نے میری رگوں میں پارہ بھر دیا"

گو اُسے قطعی یقین تھا کہ وہ نہ ہی برق صفت ہے اور نہ ہی سیماب وش پھر بھی اُسے بڑا لطف آیا، مگر آخری جملے سے نہ جانے کیوں وہ خود ہی چڑ بیٹھی۔ ایسا معلوم ہوا وہ کسی مشہور دواخانے کا لمبا چوڑا اشتہار ہے۔ اُسے شاعر سے خواہ مخواہ کا بیر ہونے لگا۔ وہ ان سب سے اکتا چکی تھی اور سمجھ میں نہ آتا تھا اب اُن سے کس رخ تاک گھسوائے۔ وہ ان سب کو جلد از جلد سوکھے پتوں کی طرح جھاڑ دینا چاہتی تھی، مگر اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ اُسے بھول نہ جائیں۔ پھر یہ ہنٹر کوڑے سب فراموش ہو جائیں گے، یہ گہری لکیریں دھندلی پڑ جائیں گی اور رگوں میں بھرا ہوا پارہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ پھر وہ لوگوں سے اُس کا ذکر بالکل بیسوا کی طرح کریں گے۔ ناکامیاں انہیں گندہ ذہن اور دروغ گو بنا دیں گی۔

پروفیسر سے اُس کی عموماً کٹی چھنتی رہتی تھی۔ وہ بے رحمی کی حد تک صاف گو اور پھکڑ انسان تھا۔ کبھی کبھی تو شمن کو شبہ ہونے لگتا کہ وہ شکار ہے یا خود شکاری بھیس بدلے ہوئے ہے۔ نہ جانے کیوں جب وہ خاموشی سے اُسے گھورتا تو اُس کا جی چاہتا وہ لوہے کی چادر میں لپٹ جائے۔ بارہا اُس نے بھولے سے اُس پر تیر اندازی کی مگر معلوم ہوتا تھا تیروں کی نوکیں کسی چٹان سے ٹکرا کر لوٹ پڑتی تھیں۔ اس پر پروفیسر کی عقابی آنکھوں کی طنزیہ مسکراہٹ! وہ چراغ پا ہو کر پلٹ آتی اور پہلے سے زیادہ

محتاط ہو جاتی۔

مگر اس نے ہار تو نہ مانی، غنیم کی کمزور رگ ٹٹولتی رہی۔ ایک بار پورا اثاثہ داؤں پر لگا دینے کی ٹھان لی۔ جی دھکڑ پکڑ کرتا تھا کہ اگر اس نے اس تھال میں ٹھوکر مار دی تو؟ دو چار چکنی چپڑی باتیں کر کے ایک دن پروفیسر کو ٹٹولا:

"آپ اپنی نئی کتاب کس کے نام معنون کریں گے؟" مگر پروفیسر نے بدک کر دیکھا گویا کھانے سے پہلے سونگھتا ہے۔

"جو بھی امتحان میں پورا اُترے۔"

"کیا فیس داخلہ ہے؟"

"کچھ بھی نہیں اور بہت کچھ۔"

"اُونہہ بھئی آپ لوگوں سے کون جیتے گا۔ بھلا یہ جواب مجذوب کی بڑ ہم کوڑ مغزوں کے کیا سمجھ میں آئے۔"

"پھر وہی بنانے کی۔۔۔"

"توبہ ہے، آپ تو بڑے بے اعتبار ہیں۔" پروفیسر نے ایک گہری سی نگاہ اُس پر ڈالی اور شمن جلدی سے کھسک کر شاعر کے پہلو میں ہو رہی۔ نابابا، یہ سانپ کھیلنے کا نہیں، مگر تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پروفیسر بھی کندھے پہ آن کھڑے ہوئے۔

"کیا بگڑ گئیں۔" انہوں نے اس کے پیر میں چٹکی بھر کر پوچھا۔

"نہیں تو۔"

"پھر اس طنطنہ کا مطلب! کتاب تو واقعی چھپ رہی ہے اور معنون۔۔۔"

"کس کے نام معنون کریں گے، اپنی مری ہوئی ماں کے نام؟" جل کر پوچھا۔

"میری والدہ زندہ ہیں!" پروفیسر بُرا مان گئے۔

"اوہ، معاف کیجیے گا، تو باپ کے نام؟"

"وہ مر چکے!"

"چہ، کیا مصیبت ہے! جسے مردہ سمجھو وہ زندہ اور جسے زندہ سمجھو وہ مر جاتا

ہے۔ تو پھر اپنی بیوی کے نام؟“
”بیوی نصیب ہی نہیں۔“
”ورنہ کرتے ضرور آپ یہ حماقت؟“
”سننے سے پہلے بولنے سے کیا حاصل۔ میں کہتا ہوں بیوی ہی سراسر حماقت ہے، اور اگر ہو تو پھر کتاب کیا انسان عقل و خرد سب ہی اس کے نام سے معنون کر دیتا ہے۔“
”اوہو، شوق سے کیجیے۔ بیوی چھوڑ سانس کے نام کر دیجیے۔“
”بگڑتی کیوں ہو، محبوبہ کے نام کیوں نہ کر دوں۔“
”ہیں!“ اُسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔
”مگر بھئی میں شاعر جیسے چھلے سخت ناپسند کرتا ہوں۔“
”آپ بڑے گودڑ ہیں۔“
”ہو سکتا ہوں مگر بھئی نہ تو میری خشک اور اُجڑی زندگی میں تار اور نہ اُن پر کوئی مضرابیں مارے، معاف کرنا اگر بُرا لگے تو...“ وہ مکاری سے مسکرایا۔
”مجھے کیوں بُرا لگتا۔“ حالانکہ اُسے سخت بُرا لگ رہا تھا اور جی چاہتا تھا اُس کا منہ کھسوٹ ڈالے۔ ”اچھا وہ دوسرا چھلانگ“ اُس کا ڈیڈ یکیشن، وہ تو پسند ہے؟“
”اجی لاحول ولا قوۃ۔ خورشید تاباں فرسودہ اور تازیانے... ہٹ، ط پسندی!“
”جائیے میں آپ سے نہیں بولتی۔ کیا بگاڑا ہے اُس نے آپ ہر وقت بیچارے کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ مانا کہ وہ آپ جیسا مکّار نہیں۔“
”میں مکار ہوں۔“ پروفیسر نے چہک کر کہا۔
”اور کیا، اتنا تو سیدھا ہے۔“
”تم نہیں جانتیں کتنا چلتا ہوا ہے۔ جانتی ہو نواب... کی بیگم صاحبہ کا کتنا منہ چڑھا ہے۔ چار جگہ سے وظیفہ پیٹتا ہے۔“ ایک دھکے کے ساتھ چند گزرے ہوئے واقعات آگے بڑھے مگر شمن نے دونوں ہاتھوں سے انہیں دور جھٹک

دیا۔ شکر خدا کا کہ اُس نے شاعر پر کبھی رحم نہ کھایا تھا۔

"وہ دن یاد ہے جب آپ نے میری سادی چوڑیاں توڑ دی تھیں۔" وہ تیزی سے بات ٹال کر بولی۔

"یاد ہے؟" پروفیسر نے بڑا مان کر کہا گویا ایسے اہم واقعات کو بھول جانا جرم تھا۔

"آپ کو رنج ہوا تھا؟"

"تمہارے آنسو دیکھ کر خود کتنے بہائے تھے۔ وہ سب موتی میرے رومال میں جمع ہیں۔"

"اب تو وہ حل گیا ہوگا؟"

"نہیں، دوسرے پانی میں تو اتنی طاقت نہیں کہ ان موتیوں کو بہا سکے۔"

"خیر تو... سنیے آپ کے نئے مجموعے کو... دیکھیے ایسے لکھیے... آپ کیا معلوم ہو: وہ اُن ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام،، نہیں صرف "ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام" وہ تیار بیٹھی تھی کہ اگر پروفیسر کچھ کہے گا تو فوراً مذاق کی طرف بات چیت پلٹ دے گی مگر نہ جانے آج وہ کس موڈ میں تھا۔

"بڑی تیز ہو تم۔"

"اور خاک پوش پر ٹوٹی ہوئی چوڑیاں بکھری ہوں... کیوں؟"

"اوہو، مصوری میں بھی دخل ہے؟"

"کیوں نہیں۔" اُس نے بات بنتے دیکھ کر پورے زور سے ہلّہ بول دیا۔ "لائیے آپ کی تصویر بنا دوں۔" اُس نے پروفیسر کی کلائی پکڑ کر اُس میں اپنے لمبے ناخن گڑا دیے اور قبل اس کے کہ اُن کا بلبلاتا ہوا ہاتھ اُسے پکڑتا وہ تڑپ کر باہر روش پر نکل آئی۔ جہاں عام لوگوں کے سامنے اُنھیں نہایت تہذیب کے ساتھ اُونچی آواز میں موسم اور سیاست کے متعلق گفتگو کرنی پڑی۔ بیچارے دیر تک پیاسے بیل کی طرح ہانپتے رہے، پھر چل دیے۔

"ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام" چھپ کر آ ہی گئی۔ مگر واقعات نے دوسری ہی

ہے۔ تو پھر اپنی بیوی کے نام۔"

"بیوی نصیب ہی نہیں۔"

"ورنہ کرتے ضرور آپ یہ حماقت؟"

"سننے سے پہلے بولنے سے کیا حاصل۔ میں کہتا ہوں بیوی ہی سراسر حماقت ہے، اور اگر ہو تو پھر کتاب کیا انسان عقل و خرد سب ہی اس کے نام سے معنون کر دیتا ہے۔"

"اونہہ، شوق سے کیجیے۔ بیوی چھوڑ ساس کے نام کر دیجیے۔"

"بگڑتی کیوں ہو، محبوبہ کے نام کیوں نہ کر دوں۔"

"ہٹیے۔" اُسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔

"مگر بھئی میں شاعر جیسے جیلے سخت ناپسند کرتا ہوں۔"

"آپ نرے گودڑ ہیں۔"

"ہو سکتا ہوں مگر بھئی نہ تو میری خشک اور اُجڑی زندگی میں تارہ اور نہ اُن پر کوئی مضرابیں مارے، معاف کرنا اگر بُرا لگے تو۔۔۔" وہ مکاری سے مسکرایا۔

"مجھے کیوں بُرا لگتا۔" حالانکہ اُسے سخت بُرا لگ رہا تھا اور جی چاہتا تھا اُس کا منہ کھسوٹ ڈالے۔ "اچھا وہ دوسرا "چھلانگ" اُس کا ڈیڈیکیشن، وہ تو پسند ہے۔"

"اجی لاحول ولا قوۃ۔ خورشیدِ تاباں فرسودہ اور تازیانے۔۔۔ مخلوط پسندی؟"

"جائیے میں آپ سے نہیں بولتی۔ کیا بگاڑا ہے اُس نے آپ کا۔ آپ ہر وقت بیچارے کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ مانا کہ وہ آپ جیسا مکّار نہیں۔"

"میں مکار ہوں۔" پروفیسر نے چہک کر کہا۔

"اور کیا، اتنا تو سیدھا ہے۔"

"تم نہیں جانتیں کتنا چلتا ہوا ہے۔ جانتی ہو نواب۔۔۔ کی بیگم صاحبہ کا کتنا منہ چڑھا ہے۔ چار جگہ سے وظیفہ پیٹتا ہے۔" ایک دھکے کے ساتھ چند گزرے ہوئے واقعات آگے بڑھے مگر شمن نے دونوں ہاتھوں سے اُنہیں دور جھٹک

دیا۔ شکر خدا کا کہ اُس نے شاعر پر کبھی رحم نہ کھایا تھا۔

"وہ دن یاد ہے، جب آپ نے میری سادی چوڑیاں توڑ دی تھیں۔" وہ تیزی سے بات ٹال کر بولی۔

"یاد ہے؟" پروفیسر نے بڑا مان کر کہا گویا ایسے اہم واقعات کو بھول جانا جرم تھا۔

"آپ کو رنج ہوا تھا؟"

"تمہارے آنسو دیکھ کر خود کتنے بہائے تھے۔ وہ سب موتی میرے رومال میں جمع ہیں۔"

"اب تو دھل گیا ہوگا؟"

"نہیں، دوسرے پانی میں تو اتنی طاقت نہیں کہ ان موتیوں کو بہا سکے۔"

"خیر تو... سنیے آپ کے نئے مجموعے کو... دیکھیے ایسے لکھیے... آپ کیا معلوم ہو: واں ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام، نہیں صرف "ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام"۔ وہ تیار بیٹھی تھی کہ اگر پروفیسر کچھ کہے گا تو فوراً مذاق کی طرف بات چیت پلٹ دے گی مگر نہ جانے آج وہ کس موڈ میں تھا۔

"بڑی تیز ہو تم۔"

"اور خاک پوش پر ٹوٹی ہوئی چوڑیاں بکھری ہوں... کیوں؟"

"او ہو، مصوری میں بھی دخل ہے؟"

"کیوں نہیں۔" اُس نے بات بنتے دیکھ کر پورے زور سے ہلّہ بول دیا۔ "لائیے آپ کی تصویر بنا دوں۔" اُس نے پروفیسر کی کلائی پکڑ کر اُس میں اپنے لمبے ناخن گڑو دیے اور قبل اس کے کہ اُن کا بلبلاتا ہوا ہاتھ اُسے پکڑتا وہ تڑپ کر باہر روش پر نکل آئی۔ جہاں عام لوگوں کے سامنے اُنھیں نہایت تہذیب کے ساتھ اُونچی آواز میں موسم اور سیاست کے متعلق گفتگو کرنی پڑی۔ بیچارے دیر تک پیاسے بیل کی طرح ہانپتے رہے، پھر چل دیے۔

"ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام" چھپ کر آ ہی گئی۔ مگر واقعات نے دوسری ہی

کروٹ لے لی۔ شاعر فوراً اکھٹک گیا۔ کچھ دن سے پروفیسر بڑے بے وقت ضروری باتیں کرنے آنے لگے تھے۔ وہ غریب اور کوئی تحفہ نہ دے سکتا تھا تو رنگیتوں کی مالا ہی اپنی دیوی کے چرنوں پر چڑھا دی تھی مگر سب ہی ایرے غیرے نتھو خیرے رومانی بننے لگے، یہ تو زیادتی ہے۔ بھنّاتا ہوا آیا، تھوڑی دیر تو خاموش ضبط کیے بیٹھی رہی، پھر جل اٹھی:

"نقصان تو نہیں مگر تم کو ہر ایک کو ایسے سر نہ چڑھانا چاہیئے۔ گویا... گویا یہ کچھ نہیں گویا گویا۔ اونہہ، جل گئے آپ کہ باریکیٔ خیال میں وہ آپ سے بہت آگے نکل گئے۔"

"ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام،... اوہ کتنا حسین تخیل!"

"شہ، بالکل نکما اور بے معنی!"

"اونہہ، آپ خود نکمے اور بے معنی، جی!"

"آپ کا یہ حسنِ ظن ہے میرے متعلق... چوٹی کے شعرا میں میرا نام ہے..."

"اونہہ، سب اُلّو ہیں چوٹی کے شاعر..."

"مس شمشاد!"

"ماسٹر شاعر!"

"آپ کو میری ہتک کرنے کا کوئی حق نہیں..."

"اور آپ کو میرا بھیجا چاٹنے کا کوئی حق نہیں۔ دماغ پک گیا آپ کے اوندھے سیدھے شعر سنتے سنتے...."

"میں... میں... آپ...."

"کیا میں... آپ... کچھ نہیں... کوئی بات بھی ہو... اچھی عاشقی پکڑی کہ گز گز بھر لمبی غزلیں سنو... سلام ایسی محبت کو... ہم لنڈورے ہی بھلے!"

"میں آپ کو ادب پرست اور..."

"جی معاف کیجیے میں کچھ ادب پرست نہیں، یونہی آپ کو اُلّو بنانے کے لیے۔

سن لیتی تھی۔ تشریف لے جائیے اور آئندہ گرلز کالج کی چہار دیواری میں قدم رکھنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ شریفوں کی لڑکیاں پڑھتی ہیں کوئی چکلہ نہیں یہ ......"

"اور اب تک..."

"اب تک میری مرضی!"

"میں نے... میں نے خود اپنا گلا گھونٹ لیا..."

"بہت اچھا کیا آپ جائیے، خود اپنے آپ کو دفن بھی کر دیجیے... جائیے..."

"جا رہا ہوں... مگر آپ کو اتنا انحطاط پسند نہیں سمجھتا تھا... مگر...."

"جائیے بھی، اور اس اگر مگر کو میری طرف سے تھوڑے پر ڈال دیجیے گا۔ جائیے اور دنیا والوں سے کہہ دیجیے کہ میں بدمعاش اور آوارہ تھی... اور آپ کی داشتہ رہی... جائیے۔"

شاعر کے جانے کے بعد ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ شکر ہے اس دن اور کوئی ملنے نہ آیا ورنہ وہ تو شمشیر براں بنی بیٹھی تھی۔ ویسے فرصت بھی لوگوں کو نہ تھی۔ کامریڈ صمد کی ریاست میں سپاہیوں کی بھرتی شروع ہو گئی تھی لہٰذا وہ کامریڈی چھوڑ کر نئے سرے سے نوابزادہ بن کر خان بہادری کا پودا سینچنے لگے۔ ادبی اور ترقی پسند جلسے بھی پھیکے پڑ کر درہم برہم ہو چلے تھے۔ دو چار کو جیل میں بھرا اور پالیسی بدل گئی۔ زیادہ تر قومی جنگ کے متعلق "کام" کرنے لگے۔ روس کی جنگ دنیا بھر کی جنگ بن گئی اور اس لیے انسان کی جنگ ہو گئی تھی۔ انجنیئر صاحب بیرونت چوگنی تنخواہ پر سدھار گئے۔ دنیا کچھ سونی ہوتی گئی۔ ہٹلر چھلانگیں مارتا دوڑنے لگا۔ ادھر جاپان کو بھی چھینکیں آنے لگیں۔ مشرقی جزائر میں خنکی بڑھ رہی تھی، الاؤ کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

یہ بات چلی بیٹھی تھی۔ پروفیسر آن پہنچے۔ وہ کچھ حد سے بڑھنے لگے تھے اور اب منڈی شاخ کی طرح ہی رہ گئے تھے۔ یہ شاید چھٹی بار اس کی زلف کے بال یا اور کوئی دوسری نشانی مانگنے آئے تھے۔ اصل میں راز و نیاز کے سب کل پرزے گھس گھسا چکے تھے۔ ایک ہی رومان دس دس بار دہرائے جانے کی وجہ سے سڑ چکا

تھا۔ جیسے چھپا اُٹھے تھے۔ سیاسی گرمی بھی کچھ مردہ ہو چکی تھی۔ بھوک کا سوال تیزی سے اُٹھتا جا رہا تھا۔ فوجی بھرتی اندھے لوٹے لنگڑے کانے سب سمیٹ کر ہڑپ کیے جا رہی تھی۔ جو کل تک کوڑی کوڑی کو محتاج تھے آج وردی پہنے رعب گانٹھتے پھرتے تھے۔ جسے دیکھو لفٹنٹ بنا اکڑ رہا ہے اور جب بھوک کم ہو گئی تو تناؤ بھی ڈھیلا پڑ گیا۔ اور یہ زندگی کی دوڑ بھاگ ہے بھی تو اس پیٹ کے بھاڑ ہی کی خاطر زیادہ سے زیادہ پیٹ بھر دو اور ان پیٹ بھرے ہوئے پیٹوں کو توپ کے آگے دھر دو چلیں بھی نہ کریں گے۔ اس کے باوجود ایک بے غرضی اور لاپروائی چھائی ہوئی، جیسے ... لڑائی نہیں سٹے کا بازار لگا ہوا ہے، جتنا ہو سکے پیسہ گھسیٹ کر جاؤ، موقع ہے، لوگوں کو ضرورت ہے، خریدنے کو پیسہ ہے، کوڑا کرکٹ بھر دو ان کی جیبوں میں ڈیفنس وار فنڈ بھی جمع ہو رہے ہیں، ناچ تماشے کے ذریعہ پیسہ بھی جمع کیا جا رہا ہے، سب کچھ حاضر ہے۔ مگر دل حاضر نہیں۔ کیوں دل لگائیں؟ کس کی خاطر لگائیں؟ اتنی بار جو خون کی ندیاں بہائیں تو اس کا کیا اجر ملا؟ یہاں تو بھوک اور برہنگی ویسی کی ویسی ہی رہی۔ جہالت ایک قدم پیچھے نہ ہٹی، مرض ایک انچ دور نہ ہوئے۔ جرمنی مرے یا روس، جاپان مرے یا فرانس ان ازلی سسکنے والوں کو کسی کے دکھ کا کیا احساس! دکھ سے گھبرانا کیسا؟ یہاں دکھ بھوگ لو تو وہاں جنت ملے گی۔ خیر ویسے جو آقا کا حکم اپنے بس نہیں بھوک کے ڈنڈے کے بس ہی سہی۔

پروفیسر کے لاڈ ضرورت سے زیادہ ہو چکے تھے، ہر چیز سے جی کبھی کا اکتا چکا تھا، سب ٹل گئے تھے، مگر نہ جانے کس آس میں یہ تعینات تھے۔

"نئی کتاب کے لیے کوئی نام تجویز کر دو" ایک دن اٹھلا کر بولے۔

"نام؟ کیا ضرورت ہے نام کی؟ کیا بے نام کے کتاب نہیں چھپ سکتی؟" جلی تو بیٹھی ہی تھی۔

"نام سے میرا مطلب ہے ٹائیٹل!"

"جی اتنی اردو جانتی ہوں، کچھ بھی ہو ایک ہی بات ہوئی۔"

"تمہارا مطلب ہے بے نام۔۔۔"

"ہاں کیا حرج ہے! ایسی گمنام رہنے والی کتاب کا نام رکھنا بیکار ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ لوگ چرائے ہوئے خیالات لفاظی میں ڈبو کر مصنف بننے کی کوشش کریں تو۔۔۔"

"یہ کس کے متعلق کہہ رہی ہو؟ میرے خیالات تجربات پر مبنی ہیں۔"

"ضرور۔۔۔ ذرا بتایئے تو کتنے گاؤں دیکھے ہیں جا کر! لسی پی ہے، اور چنے کا ساگ کھا کر آک کے ڈوڈے سونگھے ہیں؟ کتنی معصوم دیہاتنوں کی عزت لوٹی اور حرام کے بچے پیدا کروائے ہیں؟ سب بکواس! بیٹھے بیٹھے بڑ ہانکنے لگے۔ بڑے آئے قوم کو سدھارنے چلے ہیں، ہنہ۔"

"میں قوم سدھار کا قطعی قائل نہیں۔ میں لیڈر نہیں ہوں۔"

"تو پھر فائدہ کاغذ کالے کرنے سے! سوائے رنڈی کی حمایت کے اور غرض ہی کیا ہے آپ کو، یہ آپ رنڈیوں کے کیوں اس شدت سے طرف دار ہیں؟"

"یہیں۔۔۔"

"آپ وہاں جاتے ہیں تو طبیعت مکدر ہو جاتی ہے اور چاہتے ہیں گورنمنٹ بجائے جنگ سے سر مارنے کے رنڈیوں کے کمرے سجائے، وہاں ٹمٹماتی لالٹین کے بجائے بجلی کے ہنڈے لگائے، رستے تیل کی جگہ پیرس کے لونڈر لنڈھائے۔"

"کیوں نہیں۔۔۔"

"مگر آپ کو اپنا گھر بھول کر رنڈیوں کی بہتری کی کیوں پڑ گئی۔ دنیا میں اور بھی مجبور کے ہیں، سب کو چھوڑ کر بس ان بیچاریوں پر رحم آتا ہے۔"

"کچھ بھی کہو وہ دنیا کے جسم کا ایک حصہ ہیں اور کسی عضو کو سڑتے دیکھ کر میری طبیعت۔۔۔"

"کچھ نہیں، بڑی بیچاریاں! پتہ نہ جانے کتنی اس سے بدتر بیچاریاں گھر در تیز پڑی

سمٹ رہی ہیں۔"

"بھلا ان کے بارے میں کیا لکھ یا جان سکتا ہوں۔ مجھے کیا معلوم پردے کے پیچھے کتنے زندگی خانے قائم ہیں اور کیا ہو رہا ہے۔ دوسرے بھئی نہ ہی مجھے اس گھریلو عورت سے کوئی دلچسپی ....."

"کیوں ہوگی۔ بس آپ کی ساری دلچسپی رنڈی میں جذب ہو گئی۔"

"وہ لیے تک وہ میرے کام کی ہے.... وہ میری ہے..... یہ پردے میں چھپی ہوئی پری یا وہ عورت جسے ہم غلطی سے تعلیم یافتہ کہتے ہیں، ان سے مجھے کیا ملتا ہے؟"

"خیر یہ بھی مانا مگر آپ تو حقیقت نگار بنتے ہیں۔"

"پھر؟ کوئی اعتراض ہے؟"

"جی مجھے اعتراض کا حق تو نہیں مگر پوچھتی ہوں ان رنڈیوں کی تو آپ رگ رگ سے واقف ہیں، کیا مرد ایسے ہی نہیں ہوتے؟ ذرا انہیں بھی تو ڈھونڈ کر سامنے گھسیٹ لایئے۔ یا بس انہیں ہمیشہ ظالم، بے رحم، دغا باز، حرام کے بچے پیدا کرنے والا ہی دکھاتے ہیں۔ بڑے روشن خیال بنتے ہیں مگر آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ عزت اور عصمت صرف عورت ہی کی ہوتی ہے، مرد ان فضولیات سے پاک ہے...."

"ایں؟"

"جی، اور آپ اپنی دانست میں عورت کی حمایت کرتے ہیں، یعنی اُسے یقین دلاتے رہنا کہ وہ چیز جو مرد کے لیے باعث فخر ہے اُس کے لیے گناہ ہے، بس یہی ہے آپ کا انصاف اور ترقی پسندی...."

"ہر بات کو اُلٹے دیتی ہو، سنتی کم ہو۔"

"کیوں کر سنوں، کوئی بات بھی ہو سننے کے لیے۔ کچھ نہیں سب زبان کے چٹخارے کے لیے ہے۔ کیوں صاحب آپ کی عریانی عورت کے سینے تک کیوں رہ جاتی ہے۔"

"ایں؟...." پروفیسر زور سے ہنسے۔

"نہیں، مگر کبھی اپنی عریانی پر بھی تو نظر ڈالیے.... بس بھوکے کتوں کی طرح...."

"آج بڑا مزاج بگڑا ہوا ہے... پانی پی لو، غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"میں بتاؤں کیوں لکھتے ہیں یہ عریاں چیزیں؟"

"میرے منع کرنے سے کیا مان جاؤ گی.... بتاؤ۔"

"سینہ مرکزِ حسن ہے، بس اس سے کھیل کر جی ٹھنڈا کرتے ہیں....."

"اچھا بابا، کیا بات تھی اور کہاں پہنچ گئیں۔ معلوم ہوتا ہے...."

"کیا؟"

"کوئی تازہ چوٹ کھائی ہے؟"

"چوٹ؟ ہنہ، آپ نے کیسے جانا؟"

"تمہاری کھسیانی حرکت اور روٹھی ہوئی باتوں سے ہم کم جی کے قائل ہیں۔ میرے سر کیوں چھوڑ رہی ہو۔ کیا بدی چین کا بدلہ مجھ سے لینے کا ارادہ ہے۔ مجھے تو بہت سنا چکیں۔ کچھ سننے کی بھی ہمت ہے یا صرف ناک کی ڈھال آگے کر دو گی؟"

"میں بزدل نہیں، دوسرے آپ سے تو...."

"تو سنو مجھے تمہارے اوپر رحم آتا ہے۔"

"شکریہ! مگر وجہ اس دریا دلی کی؟"

"رحم بعض وقت بے وجہ بھی آتا ہے...."

"تو مجھے آپ کی عقل پر...."

"ہاں، شاید ہم دونوں قابلِ رحم ہیں۔ تم اپنے آپ کو ڈھونڈنے کی کوشش میں کھو بیٹھی ہو اور میں نے کتابیں پھیلانے کی کوشش میں اپنا بہت سا قیمتی وقت برباد کر دیا۔ ایک بار بازاری عورت کو چھوڑ کر پہلی بار تمہارے شریف عورت کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی تو قدم قدم پہ آنکھوں میں ناک چوٹی گئی۔ وہ بہت دنوں تک ماننے کے بعد پتہ چلا کہ عورت تو دکان نہیں ہوتی ہے اسے سمجھنے کی کوشش نہ کرنا چاہیے ہے۔ وہ سمجھنے کے لیے نہیں استعمال کے لیے ہے۔ ہاں اتنا اندازہ ہے کہ تم معمولی

قسم کی عورت نہیں مگر بڑے رنگین مغالطوں میں مبتلا ہو۔ اپنے آپ کو انتہائی ذہین سمجھتی ہو حالانکہ قطعی نہیں، صرف ضرورت سے زیادہ چرب زبان ہو، بڑی کھچے دار باتیں کرتی ہو۔"

"میں ۔۔۔ اور ۔۔۔"

"اور زیادہ حساس بننے کی کوشش نہ کرو۔ میرے خیال میں جتنے دکھ سہہ کر تم ڈھٹائی سے ہنس سکتی ہو قابلِ داد ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم بہادر اور مضبوط ہو۔ انتہائی بزدل ہو۔ سوئی کے زخم کو بھالا بنا لیتی ہو۔ تم سمجھتی ہو کہ یہ تمہارا رویہ جو ہم سب کے ساتھ رہا ہے۔ یہ طاقت کا ثبوت ہے قطعی نہیں۔ یہ خوف، یہ تمہارا اپنی نسائیت کو چھوئی موئی بنا کر رکھنا یہ تمہاری سب سے بڑی بزدلی ہے۔"

"اپنی بیوقوفیوں کو میری بزدلی بنا رہے ہو۔"

"بیوقوفیاں؟ تم اسے بیوقوفی کہتی ہو۔ تم جیسی دہکتی ہوئی آنچ کے سامنے برف کے ٹکڑے کی طرح صحیح و سالم نکل آنا بزدلی اور بیوقوفی نہیں بلکہ بہادری کی انتہا ہے۔ اور یہ جو ہم نے تمہارے کانچ کے گلاس کی قدر کی ہے اسے جی پر پتھر رکھ کر تو تم سمجھتی ہو ہم تمہیں اونچائی پر ہیں۔ حالانکہ ہم جان بوجھ کر الو بنتے چلے جاتے ہیں۔ ہم جو کچھ تم سے لینے آئے تھے ۔ مل جاتا تھا۔ مگر اور سوال بلیو انگ ٹیولا سے آگے قدم بڑھانے کی خواہش پیدا نہ ہوتی۔ اور کیوں ہوتی؟ کون سی نایاب شے تم ہمیں دے دیتیں جو ہمیں باہر سے سستی نہ ملتی۔ ویسے تم خود جانتی ہو کہ تمہاری کشش اتنی شدید نہیں کہ مثلاً شمد کو خان بہادری کے خبط سے زیادہ تم عزیز نہیں۔ انجینئر تمہیں چھوڑ کر برداشت چلا گیا۔ کیا تم سمجھتی ہو تم اسے روک سکتی تھیں؟ تم جیسی نہ جانے کتنی عورتیں اس پر کتنی تیرہ گیا ہوگا۔ تمہیں وہ رتبہ نہیں حاصل ہو سکتا جو اس کی جاہل اور بے وقوف بیوی کو ہے۔ تم شعلہ ہو مگر ماں کے سینے جیسی پرسکون گرمی تمہارے پاس نہیں۔ تم جلا سکتی ہو، مرہم نہیں لگانا جانتیں۔ توڑ سکتی ہو بنانا نہیں آتا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ سچ بتاؤ تمہارے ماں باپ تمہیں بہت ہی چاہتے ہیں؟"

"ہاروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔۔۔"

"مجھے یقین ہے بالکل نہیں جانتے" پروفیسر نے سختی سے بات کاٹی، "یقیناً تم اُن کی پھوٹی آنکھ کا تارا نہیں۔ جبھی تو ملک میں اتنا خطرہ پھیل رہا ہے، لوگ اپنے پیاروں کو دور لے جا کر چھپا رہے ہیں مگر کسی کو معلوم بھی نہیں کہ تم بھی جاندار ہو، تمہیں بھی حفاظت کی ضرورت ہے۔"

"میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔"

"ہاں ہاں یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ تم اتنی ہوشیار ہو کہ اپنے ساتھ اور چار چھ کو بچالے جاؤ گی۔ ناقدری اور دوسروں کی بے مروّتی کی تم اچھی طرح عادی ہو چکی ہو۔ دنیا نے تمہارے زخم دُکھا دُکھا کر بے حس بنا دیا ہے اسی لیے تمہارا وار زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ضرور شاعر سے تم نے اپنے کسی عاشق کا بدلا لیا ہے جو تمہیں نامراد سسکتا چھوڑ گیا۔"

"بڑے عقل مند معلوم ہوتے ہیں!" جیسے شمن کی زبان سوکھی تھی۔

"چھوڑو میری عقل کو، اور مجھے تمہاری تنہائی پر ترس آتا ہے۔ بالکل اس سڑک کی طرح جس کے سینے پر رات دن راہگیر چلتے ہیں پھر بھی وہ خود اکیلی، خاموش اور بے جان ہے۔ معاف کرنا، میں نے بارہا تمہارے چہرے پر مجمع میں تنہائی کا کرب دیکھا ہے۔ جب تمہیں دکھ ہوتا ہے قہقہے لگاتی ہو، جب خوشی ہوتی ہے تو آنسو بہاتی ہو، ہر چیز کو تم نے دھوکا بنا رکھا ہے۔ خیر دنیا کو دھوکا دینے میں کوئی ہرج نہیں لیکن اپنے آپ کو دھوکا دینا کہاں کی عقلمندی ہے!"

"جی، شاید اپنی نئی کہانی کا پلاٹ بنا رہے ہیں۔"

"میری کہانیوں میں انسان ہیں مردے نہیں۔ میں زندہ یا قدرتی موت مرے ہوؤں پر لکھ سکتا ہوں مگر تمہارے جیسے خودکشی کیے ہوئے غیر انسانی ڈھانچے کے متعلق میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہاں اتنا ضرور مانتا ہوں کہ تم جیسے ہنستے کھیلتے مردے بہت کم دیکھے۔ بُرا نہ ماننا، جو کچھ کہا ہے جذبۂ رحم سے مجبور ہو کر۔ کل جا رہا ہوں، بی بی سی سے

دعوت نامہ آیا ہے۔ کاش میں اس سے قبل تم سے سچ بول سکتا۔"

"تو آپ مانتے ہیں کہ آپ جھوٹے ہیں؟"

"اور کیا! جھوٹے کے سامنے سچّ ہمیشہ ماند پڑ جاتا ہے، اس لیے جھُوٹ ہی چمکایا پر آج جب تم سچ بولنے لگیں تو میرا حجاب بھی ٹوٹ گیا۔ اچھا ہی ہوُا ویسے سچ بات تو یہ ہے کہ۔۔۔"

"کہیے، کہیے۔ آپ لوگوں کی دروغ بافی نے اکتا دیا ہے اور جی چاہتا ہے کسی کے ہونٹوں سے سچ سنوں، کہیے، خواہ وہ سچ میرے منہ پر چوٹا ہی کر ہی لگے۔"

"تو سنو۔۔۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔ میں نے ۔۔۔ معاف کرنا تمہاری توہین ہوتی ہو تو۔۔۔ تم سے کبھی شادی کی درخواست تو نہیں کی، اور نہ ہی ایسے بے اصول پھکڑ انسان سے کوئی لمبا چوڑا معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ کم از کم اپنے ہوش وحواس میں تو تم جیسی غیر مستقل مزاج عورت سے سوائے وقتی دلچسپی کے کوئی گہرا تعلق قائم کرنے کی کوشش کروں گا نہیں۔ شادی تو بڑی چیز ہے، میں تو تمہارے پڑوس میں بھی نہیں رہ سکتا۔ دیکھتی ہو ہماری ایک منٹ نہیں بنتی، ہم ایک دوسرے کو خطرناک حد تک تاڑ چکے ہیں!"

"اچھا تو یہی تھی آپ کی صاف گوئی جس سے مجھے نقصان پہنچنے کا ڈر تھا؟"

"ہاں، مگر نہ تو تمہیں نقصان پہنچا اور نہ ہی دکھ ہوُا۔ میں جانتا ہوں تم احساس کی حدوں سے باہر ہو چکی ہو، تمہاری خودداری کو اتنی ٹھوکریں لگی ہیں کہ وہ ایک بے حیا گیٹیا بن گئی ہے۔ تم سے اتنا چھینا گیا ہے کہ اب تم خود ہی سب کچھ اٹھا کر پھینک دیتی ہو۔"

"کوڑا جمع کرنے سے فائدہ؟"

"میرے بھی تمہاری نظر دل میں پتھّر بن چکے ہیں۔"

"اُن میں سے ایک درخشاں ہیرا تو شاید آپ ہیں۔" شمن نے انتقام بھرا قہقہہ لگایا۔

„میرا ذکر چھوڑو، ہم تم ایک دوسرے کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، مگر تم نے شاعر کو ٹھکرایا، برا کیا۔ معلوم ہے وہ چھ سو روپیہ پر وار پراپیگنڈے کے سلسلے میں نوکر ہو گیا ہے۔" پروفیسر شرارت سے مسکرایا۔

„تو آپ کا خیال ہے چھ سو روپے نے ان کی ساری کثافتوں کو دھو ڈالا ہے۔"

„کثافتیں صرف غربت سے ہوتی ہیں ورنہ تم کیا جانو ان لونڈروں میں لپٹے ہوئے سینوں میں کیا کیا گھناؤنی گندگیاں پوشیدہ ہیں۔ میں تو اتنا کہنا چاہتا تھا کہ جنگ ہمارا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے، ہر چیز مہنگی اور انمول ہوتی جا رہی ہے، اچھا ہے ایک کارندہ پھانس لو، وقت بے وقت کام آئے گا۔ میں تو بیکار انسان ہوں، ویسے میں تو شدت سے طوائفوں کا حامی ہوں۔"

„کبھی اُن کے ہمدرد بن کر۔۔۔"

„ہاں ہمدرد بن کر ہی تو چاہتا ہوں کہ ان کی حالت پیرس کی طوائفوں جیسی ہو جائے۔ جیسے تم تعلیم نسواں کو ضروری سمجھتی ہو میں۔۔۔"

„تو آپ ان کے وجود پر مُصر ہیں!" شمن نے بات کاٹی۔

„میں بیچارا کون مصر ہونے والا! دنیا مصر ہے اور رہے گی۔ انھیں دنیا سے مٹانے کی کوشش کر کے تو دیکھ لیا، مرض مٹا نہیں دب کر پہلے سے زیادہ سڑاندا پھوڑا بن کر سوسائٹی کی جڑ میں چھپ رہا۔ جس کی لپیٹ میں خدا ہا آ چکے ہیں اور آتے رہیں گے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس زخم کو کم سے کم کھول کر مرہم پٹی تو کریں، شاید صاف ہوا سے عفونت کچھ کم ہو جائے۔"

„ایک طرف اشتراکی بنتے ہیں، دوسری طرف طوائفوں کے پیغمبر!"

„اشتراکی دنیا میں ان باتوں کا جھگڑا ہی نہ ہو گا۔ ہر ایک کو حسبِ ضرورت راشن۔۔۔" پروفیسر مسکرایا۔

„غلط، بالکل غلط۔ یہ آپ نے نہ جانے اشتراک کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ خوب، آپ کا خیال ہے وہاں عورتیں مفت دال چاول کی طرح بٹا کریں گی۔ غلط۔ آپ

لوگ بڑے زبردست مغالطے میں ہیں۔ سمجھتے ہیں جیسے جنت میں حوریں ملیں گی ویسے ہی اشتراکی عورتیں بخشنے لگے گا۔ ہُنہ، بس تھیوری پڑھ لی اور اشتراکی بن گئے۔ ایسے اشتراکی، ہندوستانی اشتراکی بیشک ہو سکتے ہیں مگر اصل مقصد اشتراک کا کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کی کس بات کا یقین کیا جائے۔ اتنے بڑے اشتراکی بنتے ہیں اور اتنی زبردست تنخواہ سمیٹے جا رہے ہیں۔"

"یہ میری قابلیت کے دام ہیں۔"

"جب آپ سے زیادہ قابل اور محنتی آپ کی تنخواہ کا پچاسواں حصہ بھی نہیں پاتے آپ نے اس بیہودہ نظام میں شرکت ہی کیوں قبول کی؟"

"مصلحت وقت ہے، دیکھنا کیا ہوتا ہے!"

"کچھ نہیں، بڑے بڑے دعویدار روپوں کی ڈھیریوں میں دب کر گم ہو گئے تو آپ کی کیا حقیقت ہے۔ اپنے کام سے کب فرصت ملے گی جو کچھ سوچیں۔ یاد ہیں وہ دن جب آپ گورنمنٹ افسروں کو گالیاں دیا کرتے تھے، انہیں غلام کہتے تھے اور اسی گورنمنٹ کی نوکری کی شیخی میرے سر پر بگھارنے آئے ہیں۔ بات یہ تھی کہ جب تک آپ کو چالیس روپے کی نوکری ملی آپ غصہ رہے، جونہی یہ قارون کی دولت ملی حکومت کے پیارے بن بیٹھے۔ ہُنہ یہ ہے ہمارے نوجوانوں کی ذہنیت کا خلاصہ۔ یہ ساری ہائے ہائے، یہ کسان پرستی، یہ گاؤں سدھار اپنی نوکری تک رہے۔ اب تو ہر طرف آپ کو شانتی نظر آتی ہے۔ کوئی خون آشام آندھیاں نہیں اٹھاتا، کوئی سرخ بارش نہیں برساتا۔ یہ نئی سرخی اتنی زرد کیوں پڑ گئی! روس کو مار کھاتا دیکھ کر سب کے منہ اتر گئے۔ ابھی روس جیتنے لگے دانت نکال کر ہنسنا شروع کر دیں۔"

"روس نے حماقت کی جو ہٹلر سے اڑ بیٹھا۔ جانے دو سیاست میں ٹانگ اڑانا عورتوں کو نہیں بھاتا۔ مرغی اذان دینے لگے تو ذبح کر دینا ٹھیک ہے۔ ہاں تو میرے خیال میں سارے کام چھوڑ کر تم جیسے معمے حل کرنا چاہییں۔ تم جیسی عورتیں ہی اس پستی کی ذمہ دار ہیں۔ جب پیٹ میں ہی بچہ تمہارے جیسے توڑ پھوڑ اور خودغرضی

کے منصوبے باندھ کر آئے گا تو دنیا میں اس کے علاوہ اور کیا کرے گا۔ مگر تم کیا کرو؟ تمہارا قصور نہیں، قصور بس پگلے نظام کا ہے جہاں تم جیسے بچے پیدا ہونے پر مجبور ہیں۔ بھلا سوچو اس ذہنیت کے ساتھ ہمیں کیا احساس ہو سکتا ہے کہ ہمارا ملک خطرے میں ہے۔ اس سے قبل کہ دوسرے کا تیمہ کریں ہم خود ہی مٹا دینا چاہتے ہیں۔ ہم کیوں اپنے ملک کو ہمیشہ غیروں کے ہاتھ بیچتے آئے؟ اس لیے کہ ہم جانتے ہیں یہ ہمارا نہیں ہمارے مالکوں کا ہے اور ہم بس ازلی خادم ہیں۔ پھر مالکوں کی چیز سے محبت کیسی اور اس کی تباہی پر دکھ کیسا؟ کیوں نہ اسے بہتر داموں اٹھا دیں۔ بھلا فرق ہی کیا ہے اکالے نہیں پیلے، پیلے نہیں سفید۔ کیسے ہی ہوں ہمیں تو آقا سے مطلب ہے۔ ہمارے ملک کی حیثیت ہماری نظروں میں کبھی کبھی ایک بیسوا سے زیادہ نہ رہی۔ خودغرضوں کے ہاتھ ہمیشہ بکتا رہا۔ ماں گائے اور زمین کی جتنی بے قدری یہاں ہے کہیں نہ ہوگی۔ پھر بھی ہم ان کی پوجا کی ڈینگیں مارتے ہیں۔ خیر تو مجھے اعجازِ مسیحائی کا یقین نہیں مگر سوچتا ہوں شاید جڑ کا ایک آدھ تار زندہ رہ گیا ہو اور بارش سے جاگ اٹھے۔۔۔ اور وہ پودا جسے ایندھن سمجھ لیا گیا ہے۔۔۔"

"ایندھن؟"

"ہاں۔۔۔ تم جیسی ہستیاں دنیا کی بھٹی کو گرم رکھنے کے لیے سوائے ایندھن کے اور کس کام آ سکتی ہیں۔ یہی نا کہ مرنے سے پہلے دو چار سو لڑکیوں کو جوڑ لیں گے جوڑ ملانا اور ساڑھی باندھنا سکھا جاؤ گی یہی ہوگی تمہاری قومی خدمت! لیکن شاید الٹی بات پوچھوں۔"

جلدی سے پوچھیے اور۔۔۔۔۔۔"

"تمہیں کبھی کسی نے پیار کیا؟ اوہ جواب دینے کی ضرورت نہیں، تمہارے مقدس ہونٹ تمہاری پارسائی کی گواہی دے رہے ہیں۔ میں سوچتا ہوں تمہارے اوپر تجربہ کیا جائے تو کیسا رہے۔" پروفیسر نے سگریٹ پھینک دیا اور عجیب نظروں سے شمن کو دیکھا اور اس سے قبل کہ وہ کچھ سوچ سکے انہوں نے اس کے

سر کو دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر نرمی سے اُس کے باغی ہونٹوں کو چوم لیا۔
"ہٹیے... بدتمیز... جنگلی....." مگر وہ کیسے دھکا دے رہی تھی! لمبے لمبے قدم رکھتے وہ باہر اپنی سائیکل لے کر سڑک کے موڑ پر غائب ہو گئے۔ "بھیڑو... بھیڑو!" اُس نے اپنے دماغ کے اندر کسی باغی گھوڑے کو ٹاپیں مارتے پا کر چمکارا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا... کوئی بات نہیں... ایسی کوئی بڑی بات نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر اب کیا ہو؟ کیا ہو؟ بگڑے ہوئے رہوار نے لگام میں تڑاتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں... اس وقت جانے دو... سوچنے کی بالکل گنجائش نہیں۔ رگیں بہت زور سے تن رہی ہیں... ذرا دباؤ ڈالا تو چٹاخ سے ٹوٹ جائیں گی... چلو چپکے سے پلنگ پر لیٹ جاؤ... نیند پاس ہی کھڑی ہے، زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا۔

پھر اچھی بچی کی طرح وہ پیر اٹھاتی پلنگ کے پاس پہنچی، سر سنبھال کر تکیے پر رکھا اور آنکھیں پپوٹوں سے ڈھک لیں۔

"آج تو اُس نے کہنا مان لیا اور جو آئندہ نہ مانا تو؟ مشکل ہو جائے گا اس بگڑے ہوئے دماغ کو منانا!" اُس نے سونے سے پہلے فکر مند ہو کر سوچا۔

ہاتھ پیر آرام سے غنودگی میں ڈوب گئے۔ مگر دماغ منہ میں سہمی سہمی ہوئی سسکیاں بھرتا رہا۔ دور، اپنے پیچھے اُس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ لمبی چوڑی سڑک، جس پر معلوم ہوتا تھا کسی اژدہے کے گھسٹنے کے لہریے کھنچے ہوئے ہیں، اُس کے پیچھے دوڑتی چلی آرہی تھی۔ دہشت زدہ ہو کر اُس نے چاہا لوٹ پڑے اور اس بھیانک نشان کو مٹا کر صاف ستھری سیدھی لکیر کھینچ دے۔ مگر یہ خم تو فولاد کے تار کی طرح ضدی ہو چکے تھے، ایک ہی جھٹ میں چٹخ جائیں گے! منہ پھیر کر اُس نے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر دوڑنا شروع کیا اور ناک کی سیدھ میں آنکھیں بند کیے بھاگتی چلی گئی۔

(۴۱)

"یہ اُلٹا، یہ سیدھا!" اس نے لڑکیوں کو کشیدہ کاری سکھاتے وقت کپڑا فرش پر پھیلا کر بغور دیکھا مگر وہ فیصلہ نہ کر سکی! کاش اُسے معلوم ہو جاتا۔ کوئی ایسی طاقت جو کبھی جھوٹ نہیں بولتی، کبھی دھوکا نہیں دیتی اُس کے کان میں آکر بتا دیتی کہ کپڑے کا رُخ کونسا سیدھا ہے۔ اگر غلط رُخ پر کشیدہ بن گیا تو پھر کیا ہوگا؟ جنگ کی امداد کے سلسلے میں جو مینا بازار لگایا جانے والا تھا اس میں یہ چیزیں بیکار ہو جائیں گی۔

ویسے ہی اس کا کام کتنا سُست پڑ گیا تھا! معلوم ہوتا تھا مشین میں موٹے موٹے زنگ لگتا جا رہا ہے، پیچ اڑ گئے ہیں اور ہینڈل نہیں گھومتے۔ لائبریری کی نئی کتابوں پر ابھی نمبر درج نہیں ہو سکے تھے۔ رجسٹر ادھورے پڑے تھے۔ حاضریوں کو جوڑ کر میزان نکالنا، اُس کا کام گھٹتا جاتا تھا اس جمع تفریق سے۔ رسید کی کتابیں بغیر دستخطوں کے جمع ہوتی جا رہی تھیں اور فرنیچر کی سالانہ جانچ نہیں ہوئی تھی۔ کیا ہوگا؟ یہ مشین کیسے گھسیٹی جائے گی؟

اُف! اوپر سے یہ کپڑا! صبح سے کئی بار وہ کام رکوا کر اسی غور میں ڈوب گئی کہ کپڑا سیدھا ہے یا اُلٹا۔ کئی استانیوں نے ایک رُخ کے بارے میں رائے دی اور کسی نے دوسرے رُخ کو سیدھا بتایا، مگر وہ رائے عامہ کے اُوپر اس وقت بھروسہ نہیں کر سکتی۔ عوام کچھ نہیں جانتے، آنکھ بند کر کے ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔

کئی بار اُس نے سب سے چھپ کر بذریعہ قرعہ بھی صحیح رُخ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ چپکے سے دو پرچیاں لکھ کر بٹنوں کے ڈبے میں ڈالیں، ہینڈل ٹٹول لیا۔ اونہہ، اطمینان نہیں ہوا۔ اتنی بار دھوکا کھانے کے بعد اُسے کسی پر یقین نہ آتا تھا۔ کیا پتہ یہ قرعہ بھی جھوٹ بول رہا ہو، اُسے پھنسانے کے لیے کوئی چال چل رہا ہو۔ اور اتنی باریک کشیدہ کاری غلط رُخ پر کڑھ گئی تو کیسے ادھیڑی جائے گی؟ تمام کپڑے کا قیمہ ہو کر سوراخ ہو جائیں گے اور پھر ان گڑھوں کو کیسے پُر کیا جائے گا؟ یہ ننھے ننھے بھالے آنکھوں میں کھٹکیں گے اور اس کی نیندیں تلخ کر دیں گے!

یہ اتنا کچھ کچر کام ہندوستان میں کیوں پسند کیا جاتا ہے؟ یورپ والے کیسے بڑے بڑے پھول کاڑھتے ہیں! دلکش بھی، آسان بھی اور صوفیانہ بھی! لیکن یہاں تو ہر چیز ایک دوسرے سے چپکی ہوئی، ایسے کہ سانس بھی نہ لی جائے۔ ایک جان اور اُس کے ساتھ یہ مینا کاری! ہر چیز الجھی جاتی ہے۔ الجھے ہوئے دماغ سے نکلی ہوئی ساری چیزیں آپس میں گتھ متھ ہوئی جاتی ہیں۔ کوئی انھیں کیسے بکھیرے؟

جوں جوں فروخت کا دن قریب آتا گیا، ان کی پریشانی بڑھتی گئی۔ غارت ہو یہ وار فنڈ اور مینا بازار اکیا ہوگا اس پیسے سے! لڑائی میں جائے گا اور مرہم پٹی کے کام آئے گا۔ ایک طرف زخمی کرنے کے لیے نئے نئے آلے ایجاد ہونگے دوسری طرف ان کا مقابلہ کرنے کے لیے نرسیں دوڑیں گی۔ یہ خوبصورت کشیدہ کاری لاکھوں ٹینکوں اور بموں کی صورت میں انسان کی طرف سے انسان پر برسائی جائے گی۔ جسم پسیں گے، خون کے دھارے بہیں گے ظالم اور مظلوم سب ہی ایک ہی دلدل سے منھ دیئے جائیں گے۔

اور یہ بھولے بھالے سپاہی! جنگ شروع ہوئی اور ان کے دام بڑھے۔ پھر تو سب ہی کچھ ان کا ہے۔ ملک ان کا۔ عالیشان عمارتیں ان کی۔ قوم خطرے میں، ان کے باپ دادا کی ہڈیاں خطرے میں۔ شاندار عمارتیں، یہ مندر اور مسجدیں سب ان کی۔ جب تک سکھ چین رہا انہیں بے موسم کا پھل سمجھ کر کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور آج جنگ کے بھوکے دیو کا منہ بھاڑ کی طرح کھلا ہوا ہے۔ جھونکے جاؤ گھان پر گھان! اس کے بعد: جب کھیل ختم تو پیسہ ہضم۔ توپیں پگھلا کر ریل کی پٹریاں بنا لی جائیں گی، بندوقوں کے فرائے بھرتے موٹر بنائیں گے۔ تھوڑی سی دھات ان کے حصے میں بھی تمغوں کی صورت میں آجائے گی جس سے آنے والے بچوں کے جھنجھنے بنائے جائیں گے۔ جب کٹتے مرتے انسان تھک جائیں گے، ملاپ ہو جائے گا سپاہی اپنا کٹا ہاتھ یا پیر لے کر گھر جا بیٹھے گا اور جب تک منچلے پھر نہ لڑیں وہ کبھی کبھی استعمال ہونے والے ہتھیار کی طرح پڑا زنگ کھایا کرے گا۔

جب لڑائی ختم ہو جائے گی اسکولوں میں چھٹیاں ہوں گی، گارڈن پارٹیاں ہوں گی اور سپاہی؟ اس سپاہی کا کیا ہوگا؟ ایسے تھلا کر چور اُچکے اور ننگے بھوکے فقیر ڈھالے جائیں گے!

کوئی ان سے پوچھو کیوں لڑتے ہو کمبختو! مانا کہ آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور تمہیں کچھ سوجھتا نہیں، ذرا یہ بھی تو سوچو کہ جن ماؤں نے جنم دیا ہے اُن کے جی پر کیا گزرتی ہوگی! خوش قسمت ہیں وہ مائیں جو بانجھ رہیں۔ یہ سب ان مردوں کا کیا دھرا ہے، انہیں یہ بچا ہی جننا پڑتے تو پتہ چلتا کہ کیا بیتتی ہے جی پر!

مینا بازار کی کامیابی کا سہرا باندھنے سے پہلے ہی سر چکرا اُٹھا، طاقت ضبط ہار گئی، توازنِ دماغ ڈگمگانے لگا لہٰذا چھٹی لے کر گھر آرام کرنے کے ارادے سے چل گئی۔ یہ جنگ کے زمانے میں اپنوں کی ضرورت کتنی بے رحمی سے محسوس ہوتی ہے! جی چاہتا ہے کسی بل میں جذب ہو کر چھپ جاؤ۔ اور پھر عمر میں ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھنا چاہیے کہ اپنوں کی محبت کا کیسا مزا ہے، شاید یہاں ہی اُسے وہ سب کچھ مل جائے جس کی تلاش میں اتنا بھٹکی کہ کوئی کوچہ ناآشنا نہ رہا۔

یہ بھائی، بہن! اس نے انہیں بھولنے کی کیوں کوشش کی تھی! ایک ہی شکم میں سب نے تکمیل پائی، ایک ہی گھر میں بڑھے پلے جیسے ایک ہی پیڑ کی بہت سی پتیاں! مگر جب ڈال سے ٹوٹ کر ایک پتی گری تو زمانے کی ہوا اُسے کتنی دور اڑا لے گئی! لڑتے جھگڑتے جب تھک گئے تو اُس نے پھر لپک کر شاخ پکڑ لی۔ عادت نہیں رہی تھی تو اس لیے بڑا زور لگانا پڑا، کندھے کھنچ گئے، مگر واپس ماں کی گود میں کتنا سکون ملا، نیند سی آگئی۔۔!

ہیں؟ ساری دنیا تو اُس کے گھر میں موجود تھی! اسی ایک خاندان میں کچھ ولایتیوں جیسے گورے بھبوکا، کچھ حبشی نژاد، کسی میں منگولی خون کی کڑواہٹ تو کسی میں ایرانیوں جیسا تیکھاپن۔ اور یہ سب چار پانچ عورتوں کی محنت کی کمائی تھی۔ اگر جرمنی کی طرح ہندوستان کو بھی مصفّیٰ خون کی ضرورت محسوس ہو تو خالص دیسی مال کتنا دہ

جائے گا؟ یہی جتنی تل پر سفیدی — یا شاید اتنا بھی نہیں۔ آریوں کا حصہ، ایرانیوں کا حصہ اور پھر افغانی، منگولی اور عربی خون۔ اور پھر یہ جو تازہ تازہ ولایتی خون سامانِ جنگ کے ساتھ ساتھ لال کنڑوں میں بھر بھر کر آ رہا ہے یہ؟ ہندوستانی مٹی ہر بیج کو نگل لیتی ہے۔

ان اوپرے پیلے رشتہ داروں سے اُس نے مذہبی عقیدت کے ساتھ جیٹ کر محبت کرنی شروع کر دی۔ اس نے کبھی بچوں کو چوما نہ تھا اس لیے پہلے پہلے سخت ابکائیاں آئیں اور جی گھبرایا۔ کیا ناک تھوک میں لتھڑے ہوئے نامکمل انسان! ان سے تو سے کتے بدرجہا بہتر۔

اگر خزاں کی ماری پتی دوبارہ پیڑ میں ٹکنے کی ضد کرے تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایکبار پھر سے بہار لوٹ آئے؟ گرا ہوا اُچھل طشتری سے بھاگ کر ڈال میں ٹکنا چاہے تو کیا وہ کامیاب ہو سکتا ہے؟ یہ مرغیاں ہی اگر اپنی ماں کے پوٹے کے نیچے گھسنے کی کوشش کریں تو کیا سما سکتی ہیں؟ ٹلکے ٹلکے اس کے شانے ٹوٹنے لگے۔ جتنی جتنی گرفت مضبوط کی ہاتھ پھسلتے گئے، اور جلد ہی اُسے معلوم ہو گیا کہ پیسہ خرچ کر کے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے: جنسی بھوک مٹائی جا سکتی ہے، پیٹ ناک تک بھر جا سکتا ہے۔ مگر ممتا کسی داموں نہیں ملتی۔ کسی کے بچے کو اپنانے کی کوشش ایسی ہی احمقانہ حرکت ہے جیسے کوا دم میں مور کے پر لگا کر مور بننے کی کوشش کرے۔ کوے ٹھونگیں مارتے ہیں سوانگ، الٹی مور موقع پا کر شامت بلا دیتے ہیں۔ ناجائز بچے کی ماں— پھر ماں تو ہے۔ ورنہ اگر کوئی ببول لگائے تو کیا ہو؟

سب سے پہلے اُس نے بڑے چاؤ سے بڑی بہن کی بچی پر دستِ شفقت پھیرنا شروع کیا۔ ماں بننے کے بعد شاید دکھ جھیلنے کی تمیز بھی خود بخود آ جاتی ہے مگر شمن کو تو اُلٹے ٹلکنے کا مزا آ گیا۔ ٹیں ٹیں بچی دن اور رات روتی۔ جی چاہتا اس جاندار ریڈیو کی ایک بار ہی ایسی کل مروڑے کہ سدا کے لیے چپ ہو جائے۔ گھٹنے لٹا کر بچے کو تھپکنا بھی ایک فن ہے۔ ایسی مشین جیسی رفتار ہو کہ ہر جھٹکا نہ کھائے، صرف جھومتا رہے اور پھر ساتھ ساتھ مناسب تالو کی مدد سے انتہا سے زیادہ عجیب و غریب بے معنی آوازیں

نکال جائیں تاکہ بچے کو بیک وقت انسان مرغی اور چرخے کی گود میں سونے کا مزا آجائے۔ تھوڑی سی سانس منہ میں جمع کرکے لفظ ور رہے، پر چھوڑ دی جائے ایسے کہ ایک پھوار کی صورت میں اُرے، ڈھلتے ہوئے سکوں کی طرح دوڑتے چلے جائیں۔ پھر تالو سے زبان لگا کر انگریزی کے لفظ کیو کو بار بار ایک خاص تناؤ سے نکالا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ بچے کی کنپٹیوں پر تھپکیاں بھی لگائی جائیں۔ اگر یہ تمام حربے بے کار ثابت ہوں تو دو چار آدمیوں کی مدد سے قریب رکھی ہوئی اشیا کو ہلا کر جھنجوڑ کر جتنی بھی آوازیں مہیا ہو سکیں مع اُوپر دی ہوئی ترکیب کے ایک شورِ قیامت کی صورت میں بچے کے دماغ پر نازل کی جائیں۔ اگر تھپکیاں باقاعدہ ہیں، گھٹنے کی رفتار سائنس کے مقرر کردہ اصول کی پیروی کر رہی ہے تو انشاء اللہ بچہ سو جائے گا اور اس طرح سے سویا ہوا بچہ عموماً جاگتے میں بھی دماغی طور پر سوتا رہے گا۔

بچی کو صحیح وسالم واپس کرکے اُسے یک گونہ اطمینان ہوا۔ بھلے کو بچی عارضی تھی اگر خدانخواستہ کہیں خود اس کے وجود سے مستقل طور پر پھوڑے پھنسی یا کانگن کی طرح پھوٹ نکلی ہوتی تو کیا حال ہوتا؟ کچھ تعجب نہیں جو اس ہندوستان میں اس کثرت سے بچے مرتے ہیں۔ خود اس کے دل میں کئی بار خیال آیا کہ اگر چپکے سے وہ بچی کی رضائی اُتار کر کھڑکی کھول دے صبح تک منہ نیلا اور پھر شام تک جھگڑا ختم، چین سے پیر پھیلا کر سوئے۔ خود ان بچوں کی مائیں آنے والے جی کی خبر سنتے ہی پاس پڑوس کی دائیوں سے راز و نیاز شروع کر دیتیں۔ مرض تو نہ جانا الٹی نئی نئی لیتیں نگل جاتیں اور جب وہ ننھا جی جنم لیتا تو بھی ہر ممکن کوشش اسے ختم کرنے کی کرتیں مگر آخر کو ماں ہوتیں نا! مارنا بھی چاہتیں تو نہ مارا جاتا۔ جونہی نزع کی حالت شروع ہوتی ممتا بے قابو کر دیتی، جاتی ہوئی روح واپس گھسیٹ لائی جاتی۔ ساری عمر گھسٹنے کے لیے۔

جب پہلی بچی کی ہیبت ذرا ختم ہوئی تو اس نے پھر ایک بچے کی سرپرستی شروع کی۔ یہ بدقسمتی سے ذرا کم رو تھا، صحت خراب تھی اور گندگی سے خاص اُنس رکھتا

تھا۔ بہت دوادارو کی مگر جملہ امراض اُس کے جسم میں جڑ پکڑ چکے تھے۔ کوئی بھی ایسا مرض ہوگا جو دائمی طور پر اس پر قابض نہ ہو چکا ہو۔ ویسے مرنے ورنے کا کوئی خاص ارادہ نہ تھا۔

مجبوراً منجھو بی کی چینی کی گڑیا جیسی بچی کے نام قرعہ پڑا۔ بڑی تیاریوں سے کپڑے بنے اور اب شمن نے سنجیدگی سے گود لینے کے مسئلے کو سوچا۔ جاتے وقت منجھو بی ایسا روئی جیسے وہ بچی کو زندہ دفن کر چلی۔ ہزاروں نصیحتیں، "مار نا مت۔ تمہارا غصہ بہت تیز ہے!" وہ کہہ گئی۔ اللہ کی شان! یہ وہی منجھو بی تھی جس نے ذرا سی عمر سے اُسے اتنا سے یہ کر پالا تھا۔ یقیناً وہ منجھو بی کی بدذات بچی سے تو ہزار گنا بہتر ہوگی، جبھی تو پل بھی گئی پر اسے تو دو دن پالنا دوبھر ہو گیا۔

اب لی خبر کوّوں اور موروں نے۔ وہ چونچیں دھار رکھ رکھ کر جبائیں کہ مزا آگیا۔ بچی بھی سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گئی، نہ اگلے بنے نہ نگلے۔

"چہ چہ۔ . . اے ہے اتنی سی جان کو ماں۔ بچھڑا لیا۔ . . توبہ"

"اے ہے پرائے بچوں پہ کیا چونچلا؟ ایسا بھی ظلم نہیں چاہیے" جتنی زبانیں اتنی بکواس۔ جلتی اور اس امید میں سر جھکا لیتی کہ شاید لوگ تھک کر چپ ہو جائیں گے۔

وہ طعنے بھی برداشت کر لیتی کیونکہ بچی غضب کی پیاری تھی مگر رات کو ظالم نے وہ ستم ڈھایا کہ جاڑوں کی رات میں اولا برف پانی سے نہلانا پڑا۔ دوسرے دن نمونیہ اور دو چار دن میں بچی ختم۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بچی اُسے شرمندہ کرنے کو شرط لگا کر مر گئی۔ رنج کو شرم اور غصے نے دبا لیا۔ جی چاہا کاش وہ دن واپس لوٹ آتے جب منجھو بی اسے پال رہی تھی۔ کیا کیا ظلم جو تا کرتی تھی۔ اگر اُسے معلوم ہوتا تو منجھو بی کے منہ پر طمانچہ مارنے ہی کو مرجاتی۔ دو دن بعد منجھو روتی پیٹتی کالک ملنے آ پہنچی۔

ایسی ایسی باتیں سننا پڑیں جو کبھی وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ منجھو نے سارا الزام اس پر تھوپ دیا۔ بس نہ تھا جو وہ اُسے قتلِ عمد کے جرم میں گرفتار کرا دیتی۔ شمن کے

بس میں ہوتا تو وہ ایسی ایسی دس بچیاں جن کر ننھو کے منہ پر کھینچ مارتی۔ توبہ! اتنا چھچھورا بنا سمجھتی تھی ننھو کو۔ اس کا دل رکھنے کو روکنے کی بھی کوشش کی۔ بچی کو سارے کے سارے نئے کپڑے خیرات کو دیے اور دھوم دھام سے پھول چالیسواں کیا، گویا بچی نہیں گناہوں کی پوٹ مری تھی جس کی بخشش دشوار تھی۔

اور اس پر طرہ یہ کہ لوگوں نے سمجھاتے وقت صاف کہہ دیا کہ یہی بچی ننھو کو انگلی پکڑ کر سیدھی جنت میں لے جائے گی۔ یہ معصوم بچے جنتی ہی نہیں بلکہ زبردست سفارشی بھی ہوتے ہیں۔ مگر یہ جو کچھ شمن نے پھول چالیسویں پر روپیہ بہایا سب ننھو کے توشہ خانہ میں جمع ہو گیا۔ پھر بھی ننھو کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر روتی رہی۔

ایک سرپھرا اندھی بیج چٹان کے سپاٹ سینے سے چپک کر پھلنے پھولنے کی آس لگا بیٹھا۔ لاکھوں موجیں آئیں کہ بہا لے جائیں مگر چٹانوں سے سر پھوڑ کر لوٹ گئیں۔ پھر ایک دن وہ بیج بھی پتھر بن گیا۔ پروفیسر کا خط آیا: "یہاں لڑکیاں اتنی فیاض ہیں کہ شادی فضول معلوم ہوتی ہے۔ اگر تم بطور مہمان (یاد رہے لفظ مہمان!) آنا چاہو تو مکان کافی وسیع ہے۔"

پتھر بن جانے والا بیج اس ہقوبر کے بے حیا جھاڑ سے بدرجہا غنیمت ہے جو گھن بن کر سوسائٹی کی جڑ کاٹ رہا ہے۔ وہ انسانی بھیڑیا جو کرسیاں توڑنے کا کرایہ ہزار روپیہ وصول کر رہا ہے دوسروں کو کس منہ سے نصیحت کر رہا ہے؟ شمن نے جواب دیا: "مہمان نوازی کا شکریہ۔ اگر ایسا وقت آن پڑا تو دیکھا جائے گا۔"

وقت چھپر پھاڑ کر نہیں آ پڑے گا، تمھیں خود لانا پڑے گا ورنہ یاد رہے یہ وقت آنے میں تو دیر کرتا ہے جانے میں ایسی تیزی دکھاتا ہے کہ سوائے ہاتھ ملنے کے کچھ نہیں رہ جاتا۔ ڈرو اس وقت سے جب تمہیں کہنا پڑے:

حب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی!
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے؟

اس عرصے میں اس نے ایک اور بچے کو اپنانا چاہا مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ انسان

یکسانیت سے کیوں اکتا جاتا ہے۔ جتنی اس نے پرورش کی یہی اندازہ ہوا کہ اس کی حیثیت بالکل اس زمین جیسی تھی جس کی چھاتی پر چڑھ کر ہر ایک اپنا پیٹ بھر لیتا مگر پھر اسے بنجر کہہ کر چھوڑ جاتا۔ یوں تو یہ بچہ بالکل سیدھا سادا تھا مگر باوجود کوششوں کے اس نے اپنی ماں کی آنچل سے جھولنا نہ چھوڑا۔ شیمن سے اپنی خاطر کروا کے وہ سیدھا ماں کے کلیجے سے لگ بیٹھتا۔

"پرایا... پرایا" اس کے کانوں میں بار بار گرم سلاخوں کی طرح گھسنے لگا۔ ایکبار ہی اس نے جھٹکا مار کر ساری بندشوں کو توڑ ڈالا۔ کوئی نہیں اس کا اور اسے ضرورت بھی کس کی ہے؟ وہ خود کیا ناکافی ہے؟

دوسرے دن شام کی گاڑی سے اس بکھرے ہوئے 'خود' کو سمیٹ کر روانہ ہو گئی۔

کہاں؟ وہ کہاں جا رہی ہے؟ یہ اس نے بالکل نہ سوچا۔ اتنی لمبی چوڑی دنیا میں وہ جہاں چاہے جا سکتی ہے۔ اور کیوں نہ جائے۔ مانا کہ کوئی منزل نہیں، یہ اور بھی اچھا ہے۔ کیوں ہو کوئی منزل؟ ان بادلوں کی بھی تو کوئی منزل نہیں، جہاں اور جدھر جی چاہا بغیر پروگرام بنائے چل نکلتے ہیں۔ جہاں جی چاہا برس گئے، جی چاہا تو بھیگے کو بھگو دیا اور جی نہ چاہا تو پیاسوں کو ترساتے نکل گئے۔ ان آندھیوں کا بھی تو کوئی گھر نہیں۔ ادھر کا کوڑا ادھر گھسیٹ لے جانا، سنسان غاروں میں چیخیں مار مار کر ڈھالو چٹانوں پہ سر پھوڑنا، دریا کی چنچل موجوں سے الجھنا اور یوں ہی الجھتے گئے رہنا۔ لطف بھی تو ہے اس خانہ بدوشی میں۔ شاید کبھی کہیں ساحل مل جائے اور یہ بھٹکی ہوئی ناؤ پار لگ جائے۔ جو نہ لگی تو بھی کیا ہے؟ کچھ حرج ہے اسی طرح بہتے چلے جانے میں، نہ پتوار نہ بادبان اور نہ ناخدا کا احسان!

آگرہ!

وہ اتر پڑی۔ نہ جانے کیوں جی چاہا تاج محل کو دیکھے۔ شاید عشق و محبت کی اس عظیم الشان نشانی کو دیکھ کر دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ کیا لوگ تھے، بیوی کی محبت میں کیا کچھ بنا کر چھوڑ گئے۔ کتنا مقدس رشتہ ہے یہ بھی۔ مگر ایسی ہی یادگار کوئی دنیا والوں

کی محبت میں نہیں بنا دیتا۔ جب کہ لاکھوں ہزاروں سڑک کے پتھروں پر سر رکھ کر زندگی گزارتے ہیں، شہنشاہ اور ملکہ کی روحیں کیوں کر چین سے پیر پھیلا کر سنگِ مرمر کے سائبان تلے سو سکتی ہیں؟ باقی عمارت میں چمگادڑیں اور اُلّو بستے ہیں۔ مزے ہیں ان کے۔ ان الوؤں سے تو کوئی ٹیکس بھی نہیں وصول کرتا! بس یہاں تو مردوں اور چمگادڑوں کے ہی ٹھاٹ ہیں۔ اگر سکھ اٹھانا منظور ہو تو ایسے کرم کرو کہ دوسرے جنم میں چمگادڑ یا اُلّو کے رُوپ میں آ ملے۔ یہی مکتی کا بلند ترین درجہ ہے۔

ہمیشہ سنا کرتی تھی کہ چاندنی رات میں تاج سچ مچ اندر کی پیشانی پر جگمگاتا ہوا مکٹ دکھائی پڑتا ہے۔ لیکن دن ہی میں اس نے اس عظیم الشان لاش کو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ شام ہوتے ہی شوقین مزاج کونے کھدروں میں دادِ عشق دینے کو آ موجود ہوئے۔ سستے مال سے آراستہ حوریں، جن کے چہرے سفید پاؤڈر کی افراط سے بھوبل میں دبائی ہوئی شکر قندی کی طرح مٹیالے ہو رہے تھے، اور وہ اس جشنِ عیش میں جنتنوں کا کردار ادا کرنے کے لائق بھی نہ تھیں۔

یہ مُردے کے سینے پر بیٹھ کر جینے میں ان لوگوں کو خاص لطف کیوں آتا ہے؟ کیا کشش ہے ان قبرستانوں میں جو زندگی کی ہر حسین انگڑائی ان کے سر پر توڑنے کو جی چاہتا ہے۔ شاید جذبۂ انتقام کچھ تسکین پا جاتا ہے۔ تم نے اپنی ناموری کے لیے صدیوں کا خون ان عمارتوں کی بنیادوں میں نچوڑ دیا۔۔۔ اور ہم؟ کسی فعل کے کرنے سے نہیں جھجکتے۔ کاش انتقام سیدھے راستے پر چل سکتا اور یوں نہ بھٹکتا۔

الٰہ آباد

اُس کا ادھر بھی جی گھبرا گیا۔ اگر اسے اختیار حاصل ہوتا تو شاید اسے اور زیادہ دلچسپ بنایا جا سکتا تھا۔ نور جہاں کے مقبرے کی غربت سے معصوم سی ننھی تھی۔ اُسے یہ دیکھ کر ہنسی آ گئی کہ وہاں بھی، گدھوں کو ہی سکون نصیب تھا۔

نور جہاں! دل کی گہرائیوں میں ایک عورت کی فتح دوہری عورت ہونے کے ناتے دل میں کچھ کھٹک سی پیدا کر دیتی ہے۔ آخر ایسی کون سی بات تھی جو نور جہاں سلیم کی تقدیر

یوں چھا گئی! اور کون جانے اُسے شیر افگن سے زیادہ عشق تھا یا جہانگیر سے! یا پہلے شیر افگن سے اور پھر جہانگیر سے! اور ہو سکتا ہے ایک ہی وقت میں دونوں سے رہا ہو۔ عورت کے دل میں محبت کی جدا جدا کوٹھڑیاں ہیں۔ کسی میں ممتا کی، کسی میں شوہر کی محبت اور کسی میں عاشق کی!

اور پھر اُس نے خود اپنے دل میں جھانک کر دیکھنا چاہا۔ یا اس کی کوٹھڑیوں میں کیا گھٹا سا ہوا تھا؟ دھند اور بادل کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ کاش وہ ان الجھے ہوئے ڈوروں کو سلجھا کر الگ الگ پلیاں بنا کر رکھ سکتی۔ عاشق، محبوب اور دشمن۔ سب ہی کے چہرے دھندلے ہو چکے تھے۔ پنسل لے کر صرف ضروری نقش گہرے کر دیتی اور باقی وقت کے گھسّوں سے آپ ہی مٹ جاتے۔

دہلی!

اُسے ہر چیز بیمار اور بدنما نظر آئی۔ ٹوٹے مکان بنا جانے والوں کو کوسے نوحہ کر رہے ہیں۔ سڑتی ہوئی مڑھیاں جو کسی کی ملکیت نہیں۔ بھوکے کتے، سڑک کے بدنصیب بیٹے، نہ جانے کس کی فرمانبرداری میں کس کی رکھوالی کر رہے ہیں۔ لمبے چوڑے دیواروں پر چپکے ہوئے گھناؤنے امراض کے علاج جو پکار پکار کر لینے والوں کی مردانگی کی داد دے رہے ہیں۔ مگر اُس کی سوتیلی بہن نئی دہلی؟ صاف، ستھری، اجاڑ، سنسان! معلوم ہوتا ہے جیسے گاڑی یا روحیں بستی ہیں۔ بالکل جدید تاج محل کا نمونہ۔ کبھی بہت اور نئے آقا آئیں گے تو اسے ان کے ابدی مالکوں کو دفن کرنے قبرستان بنائیں گے۔

مگر یہ قطب مینار اتنی بلند مگر کتنی بیکار! یہ اکیلا پاگل سا دروازہ اس کے بنانے میں؟ یہ کیوں بھوت کی طرح ہاتھ پھیلائے کس کے لیے آغوش وا کیے ہوئے ہے؟

کہاں؟ کہاں؟ وہ کہاں جائے؟ اس بھول بھلیاں میں راستہ کیوں نہیں ملتا؟ جی چاہا پردہ پھاڑ کر باہر نکل جائے۔ پُرسکون خلا میں کچھ نہیں ہوگا اور کتنا ہوگا۔ روپیہ ختم ہو چلا تھا۔ واپس جا کر کہیں نوکری تلاش کر لینا مشکل کام نہ تھا۔

مگر کیوں؟ وہ کس سے پوچھے! ایلما اُسے ایک دم یاد آگئی۔ یقیناً اس نے اپنی کیوں کا جواب پا لیا ہوگا۔ وہ اُسے ضرور تسکین پہنچائے گی۔ وہ سیدھی بانکی پور روانہ ہوگئی۔

ایلما کو دیکھ کر اُسے رشک ہوا۔ وہ کتنی سنبھل چکی تھی۔ وہ مسلسل تھکان کے آثار مٹ چکے تھے اور بڑی مستعد اور چست نظر آرہی تھی۔ تھا ہی کیا ایک وہ مرے کو تاپنے کے لیے سوائے تنہا اور نہ گزرنے والی منحوس گھڑیوں کے۔ پھر بھی ایلما خوش تھی۔ اپنے حسابوں وہ لاتعلق سی بیوہ بنی زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ سسرال، میکا، شوہر۔ سب اس ایک جان کے وجود سے ملا اور کھو گیا۔

پروفیسر ناتھن اب بھی اس پر مہربان تھے۔ شام ہوتے ہی آجاتے اور رات گئے تک گپ شپ رہتی۔ کتابوں کے اس کیڑے کو اتنا زندہ دل دیکھ کر وہ متحیر رہ جاتی۔ اس کے ساتھ اور بھی چند پروفیسر آجاتے۔

"ان سے ملو شمن، روبی ٹیلر" ایلما نے اُسے ایک طرف بلا کر کہا اور شمن نے دیکھا وہ ایک چھوٹے سے سر اور سنہری بالوں والے گورے سے ہاتھ ملا رہی ہے۔ اس نے مجبوراً رسمی تعارف کا جواب دیا۔ اُسے ایلما کا یہ طریقہ قطعی پسند نہ آیا۔ ٹیلر کو وہ اس قدر عزت اور عقیدت سے دیکھ رہی تھی گویا کوئی معمولی گورا نہیں بلکہ ان کے گھر میں پدھارے ہیں۔ اُسے ہندوستانیوں سے ازلی نفرت تھی جو ان سفید چمڑی والوں کے ذرا سے منہ لگانے سے پھولے نہیں سماتے۔ اتنا نہیں جانتے کہ یہ لوگ جو ہم سے ملتے ہیں تو صرف اس لیے کہ واپس اپنے ملک جا کر لوگوں کو حیرت زدہ کریں کہ وہ ہم درندوں کے اتنے قریب پہنچ کر مطالعہ کرتے۔ نہ ہی ہم نے انہیں کاٹا اور نہ ہماری سیاہی نے ان کی سفیدی کو گدلا کیا۔ تمہاری تصویریں دکھائیں گے کہ یہ ہیں وہ جنگلی بندر جنھیں ان کی تہذیب کی ہوا لگ کے کپڑے پہننا سیکھ گئے ہیں۔

ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شمن کچھ اُداس سی ہو رہی تھی۔ اس نے کئی بار گفتگو میں دلچسپی لینے کی کوشش کی مگر پھر دل الجھن میں کھو گئی۔ اکتا کر وہ کتابوں کی الماری ٹٹولنے لگی کہ کہیں لوگ اُسے بالکل احمق نہ سمجھیں۔

"ضرور پڑھو... لاجواب ہے۔" اُس نے مڑ کر دیکھا، ٹیلر اس کتاب کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا جو شمن کے ہاتھ میں تھی۔

"شکریہ!" اُس نے بے توجہی سے کتاب رکھ دی اور دوسری اٹھالی۔

"ایک بات..." ٹیلر نے اُس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی، "میں انگریز نہیں آئرش ہوں۔"

سفید رنگ کا یہ آدمی انگریز ہی ہو سکتا ہے۔ اس رنگ کی کچھ ایسی ہیبت بیٹھی ہوئی ہے کہ دوبارہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ دوسرے اُسے آج تک کتوں، گھوڑوں اور سفید انسانوں کی کبھی پہچان نہ ہو سکی۔ سب ہی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ گو بہت سے لوگ دانتوں، کھروں اور چال سے نسل پہچان لیتے ہیں پر نہ جانے کیسے؟

"اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"اوہ میں خوب جانتا ہوں۔" اُس نے شرارت سے اپنی بے پلکوں والی آنکھ ماری کہ بڑی آسانی سے شمن اسے اقدامِ جرم میں پکڑوا سکتی تھی، "تم لوگ سفید چمڑا دیکھ کر ہی بدظن ہو جاتے ہو اور اس میں تمہارا قصور نہیں۔"

"بدقسمتی ہماری!" جل کر شمن پھر کتابوں کی طرف جھک گئی۔

"میرے پاس کچھ تازہ ترین کتابیں ہیں۔ اگر شوق ہے تو..." شمن کو بے اعتباری سے دیکھتا پاکر وہ کچھ کھسیانہ سا ہو گیا، "معاف کرنا اگر کوئی گستاخی ہو گئی ہو۔ کہتے ہیں عورت کو سلام بھی کرو تو گالی سمجھتی ہے... مگر میں سمجھا تھا تم اِلیما کی دوست ہو... شاید تم بھی اُسی کی طرح..."

اتنے میں اِلیما نے چائے کے لیے پکار لیا۔

"ہمارے، تم ٹیلر سے نہیں ملیں شمن....."

"ہم مل چکے!" ٹیلر نے مسخری صورت بنا کر کہا۔

"ارے نہیں... شمن یہ جرنلزم کے بہت شوقین ہیں۔ لڑائی میں شریک ہونے کے

پہلے.... کیا لکھا کرتے تھے ٹیلر؟"

"نمائندے تھے اخباروں کے۔" پروفیسر ناطق بولے۔

"بڑا لائق آدمی ہے اور... ہاں بھئی آج تو سینما نہیں ملے گا پھر۔" ایلما نے بیوقوفوں کی طرح سب کو گڑبڑانا شروع کیا۔

فلم ردی ہی نہیں انتہا سے زیادہ لچر تھا۔ چند گورے جنگلیوں کے بیچ میں داد طلب بہادری، سخاوت اور انسانیت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ ٹیلر چند سیٹیں چھوڑ کر بیٹھا تھا مگر کئی دفعہ جب شمن نے اُس کی طرف دیکھا تو اُسے بھی اپنی طرف دیکھتا پایا اور کئی بار بے ساختہ دونوں کو ہنسی آ گئی۔

"اب بھی میرے اعمال نامے میں لکھ لیا۔" کھیل کے ختم ہونے پر ٹیلر نے ملزم کی صورت بنا کر کہا اور شمن زور سے ہنس دی۔

رات کو ایلما نے ٹیلر کی بے انتہا تعریف کی۔

"تم بھول رہی ہو کہ یہ سفید چمڑی والے کیا ہوتے ہیں۔ یہی دیکھو یہ دنیا کے مارے دھتکارے یہودی، پولش اور نہ جانے کون کون صرف اپنی چمڑی کے بل بوتے پر یہاں آ کر اینٹھنے لگے۔ آج کل تو جسے دیکھو شیر کی کھال اوڑھے شیر بنا پھرتا ہے۔ یہاں تو جو مہمان بن کر آتا ہے آقا بن بیٹھتا ہے۔"

"کچھ اس میں ہمارا بھی قصور ہے۔ ذرا بازار میں جا کر دیکھو ہزاروں فقیر، بھک منگے اور دکاندار 'صاحب'، 'سرکار' کہہ کر دوڑ پڑتے ہیں۔"

"وہ بیچارے کیا جانیں کون ہیں یہ۔ چاہے وہ انہیں کی طرح کنجڑے، جلاہے... ہوں مگر معلوم تو صاحب ہوتے ہیں اور رہتے بھی ٹھاٹ سے ہیں۔ ہم سے تو ہمارے مہمان ہی اچھے۔ ہم خود بھوکوں مر رہے ہیں مگر یہ دیکھو میزبانی میں فرق نہیں آتا۔ جب انہیں تمیز سے رہنا نہیں آتا تو پھر دھکا مار کر نکال دینے کو کیوں جی ڈرتا ہے۔"

"ارے یہ بھی مظلوم ہی ہیں ہٹلر کے مارے"

"ہٹلر کے مظلوم بھی ہمارے ظالم ہیں۔ ذرا سوچو ہمیں ان سے کیا ہمدردی ہو سکتی

ہے! ہم شنکر سے بچ کر کہاں جائیں؟ ہمیں تو کوئی اپنی زمین پر قدم بھی نہ دھرنے دے گا۔ مگر ایلیا اوندھا چلی تھی۔ نہ جانے اس کو کیا ہوتا جا رہا تھا۔ کالج کی وہ جوشیلی ایلیا مر چکی تھی اور اب یہ ہاری ہوئی ایلیا ہر مجبوری کے آگے سر جھکانے لگی تھی۔

صبح اٹھ کر ایلیا نے کہا کہ نوکر کو لے کر شہر سے جنس لے آئے کیونکہ اُسے کچھ حرارت معلوم ہوتی تھی۔ اناج کی قلت نے بُری طرح حیران کر رکھا تھا اور جگہ تو راشننگ ہو گئی تھی مگر اس حصے کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہا تھا۔ روز بروز اناج اپنی مرضی سے مہنگا ہوتا جا رہا تھا۔ گھر میں جتنا پہلے گھی کا خرچ تھا اس سے چوگنا تو صرف گیہوں پر صرف ہو جاتا تھا۔ اور گھی کا تو کیا پوچھنا، کڑوا تیل بھی انمول ہوا جا رہا تھا۔

"ہیلو!" کسی نے پکارا۔ شمن نے مڑ کر دیکھا تو ٹیلر اپنی چندھی آنکھوں میں جاذبیت پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تھک گیا ہوں اس رینگتے ہوئے سست ہندوستان سے۔ سوچا لاؤ کوئی مصیبت ہی مول لوں۔" وہ شرارت سے مسکرایا اور شمن کو بھی ہنسی آگئی۔

"اسے مجھے سخت ناامیدی ہو رہی ہے؟"

"کیوں؟"

"میں سمجھتا تھا گرج کر برس پڑو گی۔ خیر فال اچھی رہی اس لیے دوسری ترکیب چلنا پڑے گی۔"

"وہ کیا؟"

"کہ چلو میرے ساتھ چائے پیو۔"

"مگر میں سامان خریدنے آئی ہوں۔"

"چلو پہلے سامان خرید لیں پھر نوکر کو چلتا کریں گے۔"

ہر دکان پر ٹیلر کو دیکھ کر دکانداروں نے چوگنے دام کر دیے۔ چاروں طرف سے دو دے کر بچی کچی شمن کو اُسے رخصت کرنا پڑا۔

"تم سامنے ہوٹل میں ٹھہرو میں سامان خرید کر آتی ہوں۔"

"کیوں؟" وہ بگڑا۔

"تمہاری موجودگی سے بھاؤ بگڑ جاتے ہیں؟"

"ارے وہ کیسے؟ اچھا اب میں کچھ بولوں گا بھی نہیں۔"

"وہ تم کچھ بھی کرو۔ تم بھی تو شاہی خاندان سے ہو اس لیے۔۔۔"

"میں کیوں ہوتا شاہی خاندان سے۔ ہشت!"

"یہاں والے ہر سفید چمڑی والے کو بادشاہ سلامت کا بھائی بھتیجہ ہی سمجھتے ہیں۔ انکساری ہماری گھٹی میں پڑ گئی ہے اور تم جانتے ہو یہ گھٹی قریب سو سال سے ہمیں کون پلا رہا ہے؟"

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا ٹیلر جا کر ہوٹل کے دروازے پر کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ شمن خوب بھاؤ تاؤ کر کے سامان نہ بیچ سکی تو گاڑی کرایہ کر کے روانہ ہو گئی۔ ٹیلر بالکل اس کے ذہن سے اتر گیا، لیکن جونہی وہ گھر پہنچی اُسے فوراً یاد آیا اور جلدی سے سامان اتروا کر اس نے اسی گاڑی میں واپس جانا مناسب سمجھا۔ جونہی گاڑی موڑ پر پھاٹک میں داخل ہوتی ہوئی دوسری گاڑی سے قریب قریب ہم آغوش ہو گئی گاڑیاں ایک دوسرے کو خوبصورت رشتوں سے نوازنے لگے۔ دیکھنے کے لیے سر باہر نکالا تو ٹیلر کو اترتا دیکھ کر سُن سی رہ گئی۔

"میں بالکل بھول گئی،" اس نے لجاجت سے کہا، "سامان کی گڑبڑ میں۔"

"یہ میری عزت افزائی ہے!" ٹیلر نے طنزیہ ادب سے جھک کر کہا، "مجھے پتہ نہ تھا کہ ایک زندہ انسان سے تمہیں دھنیا اور چاول زیادہ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے تمہارا وقت ضائع کرنے کی کوشش کی مگر میں داد دیتا ہوں کہ تم ناگوار چیزوں کو بڑی خوش اسلوبی سے ٹال دیتی ہو۔" وہ مڑ کر چلا۔

"مگر۔۔۔" شمن کے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور وہ پھر لوٹا۔

"کس گاڑی میں چلو گی؟ اپنی میں یا یہ جو میں لایا ہوں؟" اس نے بالکل ایسے پوچھا جیسے کوئی بات ہوا ہی نہیں ہوئی۔

جب گاڑی کافی دور نکل گئی تو ٹیلر ایک دم ہنسنے لگا۔

"اُف فو ... یہ لڑکیاں"

"تم دل ہی دل میں ہم ہندوستانی لڑکیوں کو جنگلی، غیر مہذب اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہے ہو ... مگر ..."

"مگر ہندوستان پر کیا موقوف ہے، دنیا بھر کی لڑکیاں ایسی ہی وحشی ہوتی ہیں" وہ شرارت سے مسکرایا، "تم سمجھتی ہو گی ہماری لڑکیاں ادھر بلا یا ! ہدد و ڈیریں"

"کم از کم ہندوستانیوں کا تو یہی تجربہ ہے۔ دیکھ لو یہاں تک بندھی چلی آتی ہیں۔"

"غلط، بالکل غلط۔ جو ہندوستانی کہتے ہیں وہ ایسی ویسی لڑکیوں سے ملتے ہوں گے۔ وہاں کی اچھی تعلیم یافتہ لڑکیاں بڑی خشک ہوتی ہیں۔ اور یہ ننگی بھوکی فقیرنیاں کہاں نہیں گرتیں ؟"

"تو وہاں بھی لوگ ننگے بھوکے ہیں ؟" شمن نے بن کر طعنہ دیا۔

"کیوں نہیں۔ تم سمجھتی ہو وہاں سب لارڈ اور بیرن ہی رہتے ہیں۔ تم جو مٹھی بھر انگریز دیکھتی ہو یہ تو ہندوستان کی قسمت سے ایسے نظر آتے ہیں ورنہ جب تک دنیا میں شیطان موجود ہیں لوگ ننگے بھی رہیں گے اور بھوکے بھی۔"

"اس حد تک ؟" گزرتی ہوئی گاڑی میں سے شمن نے مرجھائے ہوئے سڑاندے فقیروں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"نہیں اس حد تک تو نہیں" ٹیلر نے جھرجھری لی، "ہندوستان آنے سے پہلے نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا تھا ..."

"یہی کہ بس نواب راجہ سونے ہیرے سے مرصع ہاتھی ..."

"بالکل یہ تو نہیں پر ہاں خیال تھا اتنے دن کی حکومت میں ان لوگوں نے کچھ تو کیا ہو گا۔ مگر یہاں آنے سے کچھ دن پہلے ہی میں نے ایک آدھ کتاب ہندوستان کے متعلق پڑھی تھی۔ پھر بھی یہ دیکھنے کی اُمید نہ تھی۔"

"اور اب یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد سارا الزام ہمارے ہی سر دھرنا ہے"

"سارا تو نہیں... کچھ ضرور..."

"لیکن یہ بھی سوچا کہ وہ کچھ بھی ہمارے سر منڈھنے کا..."

"... یہ تم لوگوں کی میں نے عجیب خصلت دیکھی ہے کہ تم اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ بے گناہ اور غیر ذمہ دار ظاہر کرنے میں فخر سمجھتے ہو۔ آخر انسان ہو، حیوان تو نہیں۔"

"حیوانوں کے ہاتھوں مجبور تو ہیں۔"

"اور جیسے ہندوستانیوں میں ایسے حیوان نہیں۔"

"ہیں، انھیں کے پٹھو۔"

"تو یہ کہو یہاں کے اور وہاں کے حیوانوں کے جتھے نے ایک دوسرے کی مدد سے ملک کا یہ حال بنا رکھا ہے۔ مگر سچ بتانا، اپنی ذات سے تم نے اب تک اس جتھے کو توڑنے کی کیا کوشش کی ہے، کون سی قربانی کی ہے؟"

"قربانی کرنے والوں کی گت دیکھی تم نے، کیا حال کیا گیا اُن کا!"

اور واقعہ بالکل تازہ تھا۔ ملک کی سب سے بڑی جماعت نے علم بغاوت بلند کیا۔ یہ بغاوتیں ریل کے ڈبوں میں پورے زور و خروش سے رونما ہوئیں! سفید قوم کو کھلا حکم مل گیا کہ بھاگ جاؤ یہاں سے، نہیں مانگتے تم کو ورنہ بسیں جلا ڈالیں گے، ریل کی پٹریاں اکھیڑ دیں گے، یہ تمہارے ہیٹ اور ٹائیاں جلا دیں گے۔ مگر سفید بادشاہت اِس بغاوت کے زکام کو بجائے گولہ بارود کے لاٹھیوں سے ہی راہ راست پر لے آئی۔

چوہے دان کا پٹ کھلا اور بالائی غائب۔ دو چار ہی دن میں اس مری فوج کو حکومت کے ہاتھی نے روند کر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ اہنسا بھی اتنی بے ضرر نہ تھی جتنی یہ بغاوت ثابت ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا چند ناسمجھ بچے مچل گئے تھے کہ ہم تو چاند لیں گے۔ ایسے بچوں کو تو بس دو طرح سے درست کیا جا سکتا ہے: یا تو پنی کا چاند دے دو۔ مگر یہ بچے بڑے ہوشیار ہیں صاف پنی کو پہچان گئے۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ لگاؤ ایک تھپڑ اور کہہ دو جب ابا بازار سے آئیں گے تب چاند ملے گا۔

مگر کون جانے جب ابّا بازار سے آئیں تو تھکے ہوئے ہوں یا ایک مرے سے چاند کی ضرورت ہی نہ سمجھیں۔

"اتنا سلیقہ نہیں انھیں کہ چاند سچ مچ کا دیا جائے۔ پھاڑ پھوڑ کر الگ کریں گے، آپس میں بھائی بھائی جھگڑیں گے، نوچ کھسوٹ کر پھینک دیں گے۔ ہمارے پاس سیف میں رکھا ہے چاند حفاظت سے، جب بڑے ہو جاؤ گے تب ملے گا۔"

مگر کب بڑے ہوں گے؟ یہ تو ابّا ہی جانیں۔ کتنے ہی بڑے ہو جاؤ اطمینان دلاؤ مگر ماں باپ کے دل میں تو وہ کل کے بچے ہی رہیں گے۔ اور پھر جانے ابّا بازار سے لوٹیں گے یا وہیں دھرے رہ جائیں گے! ہٹلر تو کبڈی اڑا رہا ہے، پالے پر پالا مارتا جا رہا ہے، کون جانے چاند بھی وہی مارے جائے!

"ہاں... اور تاریخ ہمیشہ ان کی اس حرکت پر لعنت بھیجے گی" ٹیلر نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر مورخ بھی تو یہ خود ہی ہیں، ہم تو وہی پڑھیں گے جو آج تک پڑھتے آئے ہیں۔ یعنی ان کی عقلمندیاں اور اپنی بے وقوفیاں۔ ہر زمانے میں آنکھ کھول کر انہی کی شان میں قصیدے پڑھنے شروع کیے"

"مگر اس مرتبہ امریکہ جو موجود ہے"

"امریکہ کب موجود نہ تھا؟ مگر وہیں تک جہاں تک ایک ڈالر کے دس بننے کی امید ہے۔ روئی کا ہو یا نہیں جنگ کا سہی۔ اب ان کے گن اور گانے پڑیں گے۔ گرتوں کو سنبھالنا، ہارتوں کو جتانا، کمزوروں کو طاقت بخشنا انہی کا کام ہے۔ اب ہماری پٹتی ہوئی سرکار کے سر پر انھیں نے ہاتھ رکھا۔"

"نہیں ایسا نہ ہوگا۔ ہم بہت سے بہت سے نہ معلوم کن مغالطوں میں مبتلا رہے، اب ہماری بھی آنکھیں کھلتی جا رہی ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ واقعی کچھ ہو ہی جائے گا۔ ہم میں سے گنتی کے چند ہی جو ایسی باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں، ان میں سے نہ جانے کتنے تو واپس جا کر بھول بھال جائیں گے، شاید چند ایسے بھی ہوں جو کچھ یاد رکھیں"

"کہیں کپلنگ کی طرح یاد نہ فرمانے لگیں۔ یہ زمانہ کپلنگ نہیں پیدا کر سکتا۔ تم دیکھنا اس جنگ میں انسانیت نئی روشنی لے کر پیدا ہوگی۔ ارے ہم کہاں نکل آئے؟ گاڑی والے یہ"

باتوں باتوں میں پتہ بھی نہ چلا اور گاڑی کافی دور نکل گئی۔ گاڑی والا بھی کچھ متحیر ان دو مختلف عناصر کو ٹکراتا دیکھ کر کھو سا گیا تھا۔ دونوں نے اتر کر ایک ہوٹل میں چائے پی۔

"ایلیا کے بعد میں دوسری ہندوستانی لڑکی سے ملا ہوں اور مجھے نا امیدی نہیں ہوئی۔ نہ جانے کیوں ہم لوگوں سے اتنا پرہیز کیا جاتا ہے۔"

"اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ تم لوگوں کی لڑکیاں تو ہمارے لڑکوں کو قیمتی سمجھتی ہیں کیونکہ شوہر کی حیثیت سے وہ بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ انہیں وہ اپنے ہی رنگ میں سمو کر بہ آسانی زندگی گزار سکتی ہیں۔"

"تو کیا ہندوستانی لڑکیاں ایسا نہیں کر سکتیں۔ وہ چاہیں تو یوروپین لڑکوں کو ہندوستانی بنا سکتی ہیں۔ ارے اس عورت ذات میں بڑے بڑے معجزے دکھانے کی طاقت پوشیدہ ہے۔ وہ چاہے تو دنیا سے یہ قوم اور نسل کا فتنہ مٹا سکتی ہے۔"

"یہ میں ماننے کے لیے تیار نہیں۔ عام قاعدہ ہے کہ اونچی نسل کو بیٹی دے دیتے ہیں مگر لیتے نہیں تاکہ دھبہ نہ آ جائے۔"

"ہشت... بالکل پرانی باتیں۔ تم سوچتی ہو گی ایسا، میں تو بڑی خوشی سے ہندوستانی لڑکی سے شادی کر سکتا ہوں۔"

"قول سے فعل مشکل ہے۔"

"مگر یقین دلاتا ہوں۔" رات زیادہ ہوتی جا رہی تھی لہٰذا لوٹ آئے دونوں۔ شمن جب پہنچی تو ایلیا دیکھ کر مسکرا اٹھی۔

"بڑی گاڑھی چھن رہی ہے۔۔"

"صاحب لوگ جو ہوئے نا۔ سمجھتے ہیں اس طرح ہماری عزت افزائی ہوتی ہے۔

کہاں ہم خاک کے ذرّے اور کہاں وہ آفتابِ عالم تاب!"

"ڈاہلیا ایسا نہیں۔"

"اجی سب ایک ہی بل کے نکلے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر کیوں گئی تھیں اُس کے ساتھ؟"

"یہ دکھانے کہ ہم اتنے جاہل نہیں جتنا تمہارے بیوپاریوں نے بنا رکھا ہے۔
ایلماجی اکتا گیا، بھئی میرے لیے بھی کوئی کام ڈھونڈ دو۔"

"فوج کے دفتر میں..."

"بھئی یہ فوج دوج سے تو مجھے معاف رکھو۔ مجھے اس دوسروں کی جنگ لڑنے سے کیا دلچسپی؟"

"کیا مطلب ہے؟ کیا چپٹے کو آجانے دو گی!"

"میری بلا سے چپٹے آئیں یا چندھے۔"

"وہ لوٹ مار کریں گے کہ توبہ بھلی۔"

"اور یہ کیا کم لُوٹ رہے ہیں۔ دوسرے لُوٹیں گے انھیں جن کے پاس کچھ ہے، اور جو آپ ہی مر رہے ہوں اُنھیں وہ کیا ماریں گے؟ ان ننگے بھوکے کسانوں کا نہ کسی نے اب تک کچھ بگاڑا اور نہ کوئی بگاڑ سکتا ہے۔ اچھا ہے یہ دولت مند لٹیں تو۔"

"ارے بھائی اپنے دولت مندوں کو خود لوٹو ایک بات بھی ہے، دوسروں سے لٹوانے میں کیا عقلمندی ہے؟"

"خود نہیں طاقت تو دوسروں کی مدد سے سہی۔"

"ارے کہیں بندر نے جلیبیوں میں بٹوارہ کیا ہے جو گھور رہی ہو یہ باہر کی مدد کا نتیجہ! تاریخ گواہ ہے کہ جس کی مدد مانگی وہی ظالم ہو بیٹھا۔ اب تو جب ہی کچھ ہوگا جب ہم خود کریں گے۔

"تم دلّی کے چاول بہت کم لائیں۔" ایلما نے ایک دم سیاست کے میدان سے گھر کی چہار دیواری میں چھلانگ لگائی۔

"ملے ہی نہیں۔"

"لالہ نے تمہیں دکان نہیں بتائی۔ ایک بنیا ہے پروفیسر کا جان پہچان، وہ دے دیتا ہے جتنے بھی مانگو۔ یہ موٹے چاول سے تو گھن آتی ہے۔"

مگر یہ گھن آنے والے چاول بھی بازار سے اُڑ کر نہ جانے کہاں روپوش ہونے لگے۔ کچھ ایسا مرض پھیلا کہ اندر ہی اندر چاول چاٹ گیا۔ گیہوں کو بھی گھن لگ گیا۔ گھن بھی ایسا ویسا نہیں بھینسا گھن!

"ارے اُٹھو نا۔" الیما نے جھنجھوڑ کر جگایا۔ روز تو وہ اسے دن چڑھے تک سونے دیتی تھی۔

"کیوں؟" الیما نے کروٹ بدل لی۔

"ارے وہ تمہارا صاحب بہادر کھڑا ہے۔"

"کون صاحب بہادر؟"

"ارے نیومت، وہی ٹیلر، اٹھو نا۔"

"لعنت، تمہارا ہوگا صاحب؟"

"دیکھنا ہے۔" الیما چھیڑنے کو ہنسی۔

"کیا؟" شمن اُٹھ بیٹھی۔

"کچھ نہیں۔ تو پھر اُٹھتی کیوں نہیں۔"

"چڑیل!" شمن نے تکیہ کھینچ کر مارا۔

پروفیسر کو بھی لے لیا اور چاروں مل کر ٹیلر کی لائی ہوئی ٹیکسی میں روانہ ہو گئے۔ پکنک کا ارادہ تھا۔

"ہم لوگ تو عموماً مقبروں میں پکنک مناتے ہیں۔" شمن نے کہا۔

"یا خدا، یہ کیوں؟" ٹیلر حیرت سے بولا۔

"تاکہ برکت ملتی رہے۔"

"بھئی ہمیں لائبریری میں ضروری کام ہے، تم اور ٹیلر چلے جاؤ۔" پروفیسر اور

ایلیا شاید گھر ہی سے کوئی سازش کر کے آئے تھے۔

"تو میں بھی ساتھ چلوں" پروفیسر کو خاموش اور ایلیا کو بے توجہی سے دوسری طرف دیکھتے پا کر اُس نے جلدی سے بات پلٹی۔ "میں گھر چلی جاؤں گی مجھے ذرا کام بھی ہے۔ کپڑا سے وغیرہ ٹھیک کرنا ہیں۔"

"واقعی؟" جب پروفیسر اور ایلیا چلے گئے تو ٹیلر نے پوچھا

"کیا؟"

"کہ تمہیں گھر جانا ہے اور بہت ضروری کام ہے؟"

"ہاں۔ کیا کچھ اعتراض ہے؟" شمن نے بھی ملتا قیہ جواب دیا۔

"بہت سخت، کیونکہ۔۔۔"

"کیا؟"

"میرے ساتھ کھانا کھاؤ گی"

"ابھی کھانے کا وقت دور ہے"

"کیا عجب جواب ہے!" وہ بُرا مان گیا۔ شمن کو ہنسی آ گئی۔

"ہمارے یہاں ان باتوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ مجھے تمہارے ساتھ گھومتے دیکھ کر لوگ نہ جانے کیا کہیں گے!"

"چھوڑو ان لوگوں کو۔۔۔ اگر تم جیسی لڑکیاں ہی لوگوں سے ڈرتی رہیں گی تو پھر مل چکی آزادی تم لوگوں کو۔"

"گویا اسی طرح گھوم پھر کر تو تم نے آزادی جیتنا ہے۔"

"یقیناً۔۔۔ جتنے ملک ان ولولوں کی ہیبت سے پاک ہیں سب آزاد ہیں۔"

"بے شک تم چاہو تو سب ہی کچھ کہہ سکتے ہو، آزاد ہو نا۔"

"چھوڑو اس آزادی کے جھگڑے کو اور تھوڑی دیر کے لیے میری رنگت، قومیت کو بھول کر میری کوئی بات سننے اور اس کا جواب دینے کی کوشش کرو۔ ذرا کے ذرا اس نفرت کو بھول جاؤ جو ہمارے تمہارے درمیان برسوں سے چل رہی

ہے۔ مورچے پر لڑنے والے سپاہی تک ایک بار سب کچھ بھول کر آپس میں انسانوں کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔ اتنا سوچو ایک پردیسی انسان اپنوں سے دور تمہاری مہمان نوازی کا طلب گار ہے۔"

"کی تو تھی ایک دفعہ تمہارے ہی بھائی بندوں کی مہمانداری... بلیئے بن کر آ گئے اور...."

"چہ چہ... بڑی خراب زبان ہے تمہاری!" وہ خوش مزاجی سے ہنسا۔

"دوسرے حربے بیکار پڑے رہنے سے ساری تیزی اسی دھار رکھنے میں صرف ہو گی۔ وہ مثل سنی ہے: کسی کے ہاتھ چلیں اور کسی کی جیب!"

ہوٹل کے سامنے ٹیکسی ٹھیری۔ کرایہ چھ روپے ہوا تھا مگر ٹیلر نے دس روپے دے دیئے۔ اُس نے جب ریزگاری کے لیے لاچاری سے جیبیں ٹٹولیں تو ٹیلر نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور چلنے لگا۔ ڈرائیور نے جھک کر ایک سلام دیا اور شمن کی غصے سے بھری نظروں کو دیکھ کر صرف مسکرانے پر اکتفا کی۔ گویا کہتا ہے: "آ گئیں بھاجی مارنے کو! ہونہہ کلوٹی۔ روزانہ اتنی میموں کو لاتا ہوں وہ کچھ بھی نہیں سوچتیں!"

"یہی تو ہے وہ چال جس کی بدولت تم لوگ یہاں حکومت کر رہے ہو!" اُس نے ٹیلر سے کہا۔

"یا خدا، کیا ہوا؟"

"یہ تم نے چار روپے بخشش دے کر اُس کی روح تک خرید لی!"

"ارے! مگر میں نے قطعی اس خیال سے روپیہ نہیں دیا۔ بلکہ مجھے معلوم تھا وہ زیادہ سے زیادہ دو روپے نوٹ میں سے واپس کرتا باقی کے لیے کہہ دیتا نہیں ہے۔ اور یہ بھی جانتا ہے کہ میں کہاں نوٹ بھنانے دوڑتا پھروں گا۔ میں نے کہا جہاں دو وہاں چار۔ مصرف ہی کیا ہے ہمارے روپے کا؟ کس کے لیے کماؤں؟"

"عیش اڑانے کے لیے؟ جس کے لیے تم لوگ بنے ہو۔"

"یہی ہوتے ہیں ہمارے عیش۔ کچھ تانگوں پر کچھ موٹر پر اسی طرح روپیہ اُڑ جاتا

ہے۔" اس کے طعنے کی پروا نہ کر کے ٹیلر نے خود سے کہا۔

کھانا کچھ سونا رہا۔ ٹیلر پر احساس اور خاموش سا ہو گیا۔ شمن کو بڑی خوشی ہوئی۔ کمبخت فلرٹ کرنے کی کوشش میں اسے یہاں لایا ہے۔ ہوٹل سے وہ سیدھا اُسے گھر پہنچا گیا۔ ایلما رات گئے۔ جب وہ سو گئی تب آئی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح جب وہ ڈرائنگ روم میں گئی تو دیکھا ٹیلر بیٹھا ایلما کو اپنی البم دکھا رہا ہے۔ معمولی صاحب سلامت ہو گئی۔ جب ایلما دیکھ چکی تو اس نے البم شمن کو پکڑا دی اور خود چائے لانے چل دی۔

معلوم ہوتا تھا البم نہیں کوئی بم ہیں شہر کے شہر دبے ہیں۔

"بم! بم!" اس کے دماغ میں گونجا۔ کتنا لطف آئے یہ کھلونے ذرہ ذرہ ہو کر اڑ جائیں۔ پر ہندوستان کا تو یہ بم بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کچی مٹی کا بیلنہ چیر کر کیا لطف لیا جا سکتا ہے: وہ تو انھیں گرم گرم نوالوں کی طرح نگل جائے گی۔ پر یہ عظیم الشان سر بفلک عمارتیں کیوں نہ لرزیں بموں کے خوف سے؟

"تم ان عمارتوں کے لیے خود لڑ رہے ہو پر ہمیں بھی بارود کی جگہ جھونک رہے ہو۔" اس نے انتہائی زہریلے انداز سے کہا کہ ٹیلر جو پُر شوق نگاہوں سے تصویروں کو دیکھ رہا تھا، کھسیانا ہو گیا اور اس کا منہ اُتر گیا۔

"ایں؟" شمن کو اپنی کم ظرفی پر شرم آ گئی "کتنی عجیب انسان ہو! میں تو تمہیں اپنے کیمرے کی چالاکیاں دکھا رہا ہوں اور تم سیاست کو لے بیٹھیں..." وہ روٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

"سچ کہا تھا میرے ایک ہندوستانی دوست نے کہ اگر مغرب مشرق سے دوستانہ معانقہ کرنا چاہے تو وہ اسے زنا سمجھ کر پرے جھٹک دے گا۔" وہ آہستہ سے مڑ کر بولا۔ "کل سے میں برابر تمہاری جلی کٹی باتوں کو ٹالنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر توبہ ہے۔ کیا تم سب ہندوستانی اسی ذہنیت کے مالک ہو؟ اگر ایسا ہے تو تمہارا مرض لاعلاج ہے۔ ہر بار تم ہاتھ مار کر دوا گرا دیتے ہو اور پھر واویلا مچاتے ہو۔"

"یہ کرلپس کی دوا پلنے سے تو بہتر ہے ہم بیمار ہی رہیں!"

"مگر یہاں کرلپس کہاں ہے۔ تم سے سیاست کون بیوقوف پوچھ رہا ہے۔ نہ سمجھتی ہو کہ تمہیں سیاست سے لگاؤ ہے۔ بات یہ ہے ایسی باتیں کرنی بے موقعہ ہیں۔ سیاست کو تم بالکل نہیں سمجھتیں۔ بس دوسروں پر الزام رکھ دینا کہ خود نہ بچ سکنا، یہ کہاں کا انصاف ہے۔ مانا کہ انگریز تمہیں بھڑکاتے ہیں، آپس میں لڑاتے ہیں، تم تم کیوں اتنے احمق ہو جو لڑ پڑتے ہو، معلوم ہوتا ہے ابھی سو دو سو سال تمہیں اور غلامی کی زنجیریں گھسیٹنا پڑیں گی۔ بیوقوف ہے وہ حکومت جو تمہیں آزاد کر دے، دشمن ہے وہ تمہاری، کیونکہ تم آزاد رہنے کے قابل نہیں۔ اپنی حفاظت کرنا تمہیں نہ آیا ہے نہ کبھی آئے گا۔ تاریخ کے صفحے الٹو اور مجھے دکھاؤ کہ کہاں، کس موقعے پر تم نے اکیلے دشمن کا مقابلہ کیا ہے۔ آج اگر یہ چلے جائیں تو دوسرے آجائیں گے۔ نئے سرے سے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہونا پڑے گا۔"

"ایسا ملا بھی بہت ہے جو چھین لینے کی دھمکی دیتے ہو۔"

"ارے بھئی میرے بس میں ہوتا تو کیا کچھ نہ کچھ دے دیتا۔" ٹیلر نے بات کا رخ بدل کر شرارت سے کہا۔

"بس دیکھ لیا۔ تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ وہ آزادی بھی دیکھی جو امریکہ نے نیگرو کو دے رکھی ہے۔"

"میں بتاؤں ایک ترکیب، تم سیاست میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔ یہ کھیل نہیں کہ سنی سنائی رائے پر یقین کر کے میدان میں کود پڑے۔ سخت مطالعہ کی ضرورت ہے اور میں شرط بدتا ہوں دنیا کی کوئی عورت سنجیدگی سے مطالعہ کر ہی نہیں سکتی۔"

"اور میری رائے میں عورت سے بڑا سیاست دان کوئی نہیں۔ وہ جو گھر پر حکومت کر سکتی ہے ملک پر بھی راج کر سکتی ہے۔ تمہارے خیال میں تمہارے لوازم حرب، جن کی بدولت عورتیں مردوں کی کمائی، شخصیت یہاں تک کہ تخیل تک کو غصب کر لیتی ہیں، کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے؟"

"غلط، بالکل غلط۔ کوئی عورت ہماری کمائی زبردستی نہیں چھین سکتی ہم جیسے جی چاہتا ہے خود خرچ کرتے ہیں۔ رہی شخصیت تو وہ عورت کی عقل سے بالاتر شے ہے۔ ہاں تخیل کی ملکہ وہ ضرور ہے مگر صرف ہماری دماغی عیاشی کے لیے۔"

"بڑے لطیف مغالطے ہیں۔ اچھا ہے آپ لوگ انہیں میں مبتلا ہیں۔ جب ہی تو کمال ہے کہ بیوقوف بنے انسان اور اپنے آپ کو عقلمند سمجھتا رہے۔" سیاست سے ہٹ کر گفتگو نے زندگی کے رومانی دائرے میں قدم رکھ دیا۔

"کہا تو میں نے جہاں تک دل کی حکومت کا پھیلاؤ ہے تمہارا ہی ڈنکا بجتا ہے۔"
ٹیلر نے ایسے واضح طور پر شمن کی طرف اشارہ کیا کہ وہ ہنس پڑی۔

"اور دل کی سلطنت کا پھیلاؤ چادر کی وسعت کو دیکھ کر محدود کیا جاتا ہے یا مشرق مغرب۔۔۔"

"دل کی حکومت سمتوں کی پابند نہیں۔ اس کے لیے مشرق بھی اتنا ہی حسین اور روشن ہے جتنا مغرب!" ٹیلر کی آنکھوں کی شرارت بڑھی اور شمن نے غور کیا کہ اس کی آنکھیں اتنی ننھی نہیں اور بھوؤں کی جگہ بھی خاصے گھنے بال ہیں۔

اتنے میں ایلما چائے لے کر آگئی۔ آج وہ کچھ بے چین سی نظر آرہی تھی۔ اُسے بار بار کسی کے انتظار میں خاموش ہو کر پیروں کی چاپ سنتے دیکھ کر ٹیلر نے چھیڑا۔

"بڑا احمق ہے!" ٹیلر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون؟" ایلما چونک پڑی۔

"پروفیسر!"

ایلما جھینپ گئی۔ شمن نے دیکھا کہ یہ رنگین نسوانی جذبہ اُس کے چہرے کو نرمی اور شیرینی سے منور بنا گیا۔ وہ کرخت اور خشک ایلما گویا موسم بہار کی آمد سے شگفتہ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اُس کی باغیانہ آنکھیں ایک اطمینان بھری امید میں ڈوبی ہوئی پہلے سے زیادہ بڑی اور جاندار معلوم ہوتی تھیں جیسے کسی نے پھونک مار کر ان پر سے برسوں کی پڑی ہوئی گرد جھاڑ دی ہو۔ اتنے میں پروفیسر لمبے لمبے ڈگ

بھرتے آن پہنچے۔ اُن کی زرد پیشانی ڈھلے ہوئے شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔

"ہم لوگ دہلی جا رہے ہیں۔" انہوں نے بچوں کی طرح کہا۔

"مبارک ہو۔" ٹیلر نے جوش سے پروفیسر کا ہاتھ تھپکا۔

"ایں؟" شمن بے وقوفوں کی طرح دیکھتی رہی۔

پھر الیما نے اُسے بتایا کہ آخر کو پروفیسر نے اُسے اس تاریک بل سے کھینچ ہی نکالا جس میں وہ خوفزدہ ہو کر جا چھپی تھی۔ ان کی دوستانہ ہمدردی نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی پریشانیوں کا تھوڑا سا بوجھ اُن کے کاندھوں تک پھیلا دے۔ پروفیسر ابتدائی تعلیم پر ریسرچ کر رہے تھے۔ انہیں ویسے بھی اپنی سکیم کو عمل میں لانے کے لیے ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ ویسے اگر کوئی کہتا کہ ان کی نجی زندگی میں الیما کا وجود کارآمد ثابت ہو سکتا تھا تو یہ بات مشکل سے یقین آتی۔ پروفیسر کچھ عجیب لکھا پڑھا انسان تھا۔ خود وہ اپنے وجود میں کہیں نمایاں نظر نہ آتا تھا۔ شاید وہ ان کتابوں کی دیکھ بھال کے لیے الیما کو مفید سمجھتا ہو جو اُسے اپنے جسم سے زیادہ عزیز تر تھیں۔ یہ الیما کا کہنا تھا۔

"میں عرصے سے تمہاری ضرورت محسوس کرتا ہوں۔" پروفیسر نے صرف اپنی بات کو بار بار دہرایا، "اور یہ ضرورت اسی طرح محسوس ہوتی رہے گی جب تک کہ اسے پورا نہ کیا جائے گا۔"

"میں اُس کے اطمینان اور سکون سے تھوڑا سا حصہ اپنے لیے چرا لوں گی اور وہ مجھے زندہ رکھنے کے لیے کافی ہو گا۔" الیما نے کہا۔

شمن کے جانے کے سوال کو الیما نے ایک سرے سے سنا ہی نہیں۔

"تم چاہتی ہو میں نہ جاؤں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"نہیں بھئی، یہ کیسے کہہ سکتی ہوں... مگر......"

"تو اتنے دن گھر کی دیکھ بھال تمہارے سپرد!" الیما نے بات کاٹ کر کہا۔

"ذرا ماں جی کو دن دن بھر تاش مت کھیلنے دینا، اور آس پاس کے غنڈوں کو جمع

نہ کرنے پائے۔ پچھلی دفعہ میں ایک دن کو گئی، رات کو لوٹی تو جیسے خانہ بنا ہوا تھا گھر۔۔۔" ایلما نے بات کو سلجھا۔

"مگر ایلما آخر مجھے جانا تو ہے ہی۔" وہ ڈری کہ ایلما منزل کا نشان نہ پوچھ بیٹھے۔

"تو پندرہ دن میں گھس نہیں جاؤ گی۔"

"مجھے نوکری کے لیے بھی تو کوشش کرنا ہے۔"

"ہاں ہاں کر لینا۔ ذرا پہلے چل کر سامان تو درست کرا دو۔"

"پروفیسر کہہ رہا تھا کہ۔۔۔" کپڑے رکھتے رکھتے ایلما ایک دم کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیا؟ کہو نا، بن کیوں رہی ہو۔"

"اوہو شرم آ رہی ہے۔"

"ہشت، میری بات تھوڑی ہے۔ وہ تو ٹیلر کو کہہ رہا تھا۔۔" شمن کے کان کھڑے ہوئے۔

"کیا؟"

"کہ۔۔۔ اچھا آدمی ہے ٹیلر۔ ہے نا؟ مجھے تو وہ انگریز لگتا ہی نہیں۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ وہ آئرش ہے۔۔۔ مگر یہ کیسے کہ وہ لگتا نہیں؟"

"اُس کی باتوں سے۔ شمن اگر تم ایسے انگریز دل سے بھی ملیں تو اُن سے نفرت نہ کر سکیں۔"

"ایسے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"ایسے سے میرا مطلب جیسا ٹیلر ہے۔"

"بڑی گدھی ہو۔۔۔"

"اونہہ، بدمست۔ تم خود سمجھتی ہو کہ وہ اور سفید چمڑی والوں سے مختلف ہے۔"

"مختلف ہو سکتا ہے۔ مگر یہ خصوصیت اُن کی جبلت پر اثر نہیں ڈالتی۔ بہت سے سانپ کاٹتے نہیں مگر نکل جاتے ہیں۔ رہے تو پھر بھی سانپ۔"

"اسے تو نگل ہی گیا آخر" ایلما بڑے زور سے ہنسی۔
"پاگل ہو گئی ہو نا۔ ارے چل وہ مجھے کیا نگلے گا"
"میں تو اُسے ضرور نگل گئی۔ پروفیسر کہہ رہا تھا کہ۔۔۔۔"
"لعنت بھیج پروفیسر پر کہ۔۔۔ کہ۔۔۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہتا۔۔۔۔"
"تمہیں جیسے کچھ نہیں معلوم؟ ہُنہ، مجھ سے بنتی ہو۔ ڈرائنگ روم میں وہ کوئی چپکے چپکے تو ڈیل نہیں رہا تھا"
"ارے وہ تو مذاق کر رہا تھا"
"میں اُسے تین سال سے جانتی ہوں۔ وہ ایسے مذاق کرنے کا عادی نہیں۔ عجیب انسان ہے۔ بہرحال اس میں بات ہی کیا ہے۔ وہ تمہیں پسند کرتا ہے تو اس میں گناہ کون سا ہے"
"گناہ کیوں ہوتا۔ سچ بتا نا ایلما کیا تمہیں پسند ہے وہ؟"
"ٹیلر؟ حد سے زیادہ"
"ٹیلر کی خصوصیت سے بات نہیں کر رہی ہوں، دراصل مجھے تو اس سفید چمڑی سے ہی گھن آتی ہے"
"سفید چمڑی میں اگر سُرخ دل ہو تو؟"
"ہوا کرے۔ وہ ہم کالوں کے مذاق سے بہت مختلف ہے"
"وہ اتنا بندر جیسا تو سفید ہے بھی نہیں۔ ہمارے یہاں اُس سے کہیں گورے آدمی ہوتے ہیں مگر اُن سے تمہیں گھن نہیں آتی پھر آخر اس میں کیا بات ہے؟"
"خیالات۔ ہمارے دل نے ان سب یورپ والوں کو بھوت بنا کر نفرت شروع کر دی ہے۔ ذرا بند کر دالو صندوق، کپڑے بہت ٹھنس گئے"
دونوں مل کر صندوق بند کرنے لگیں۔ ایلما بڑے جوش و خروش سے سامان باندھ رہی تھی۔ آزاد چڑیا کی طرح دھیمی آواز میں کوئی ہلکا پھلکا راگ گنگنانے لگتی اور پھر کسی سوچ میں ڈوب جاتی۔ شاید ماضی بار بار اُسے کچوکے دینے کے لیے اُبھر آتا تھا جسے

وہ اپنی قوت ارادی سے دور جھٹک پھینکتی۔

صبح ہی صبح ٹیلر بلڑی کا ٹرک لے کر آن پہنچا۔ مزدوروں کی طرح سامان بھرتا رہا۔ جب چائے پینے بیٹھا تو اُس نے بتایا کہ دو روز بعد وہ بھی روانہ ہونے والا ہے۔ وہ کچھ غمگین تھا لیکن اُس سے زیادہ وہ دیکھ رہا تھا کہ شمن نے بھی یہ بات سنی کہ نہیں۔

"سُنا شمن، ٹیلر بھی جا رہے ہیں" ایلما نے شمن کو ٹالتے دیکھ کر نہایت بھدّے پن سے کہا۔

"اوہو... چہ، بڑا افسوس ہے" شمن نے بڑے تپاک سے کہا۔

"مہربانی ہے اس قدر صدمہ لوگوں کو نہ پہنچاؤ ایلما" ٹیلر نے طعن سے کہا اور شمن بھی تکلف سے مسکرا دی۔

"بھئی دیر نہ ہو جائے" پروفیسر بڑے بڑے چائے کے گھونٹ پینے لگے۔

"اچھا خدا حافظ۔ شاید پھر ہم نہ مل سکیں" ٹیلر نے بڑے تکلف سے کہا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

"منحوس ٹیلر" ایلما نے جل کر کہا۔

"مگر تم پرسوں جا رہے تھے" اس نے مصافحے کے لیے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور بڑی معصومیت سے نمکدانی پیش کر دی۔

"شکریہ..." اُس نے بگڑ کر ہاتھ جیب میں ڈال لیا۔

"ارے میں بھی تم سے نمک مانگا!"

"زخموں پر نمک... خوب خوب... بھئی واہ" پروفیسر نے قہقہہ لگایا۔

"واقعی تم میں کسی نمک کی ضرور کمی ہے۔ بدمذاق ہو ٹیلر" ایلما نے اٹھتے ہوئے اُس کا کندھا ہلا کر کہا۔

ایلما کی گاڑی روانہ ہو گئی تو ٹیلر نہایت خاموش موٹر چلاتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا وہ بڑی تندہی سے اُسے گھر پہنچانا چاہتا ہے مگر موٹر کی رفتار ضرورت سے زیادہ ہلکی تھی۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"پونا" منہ موڑے موڑے جواب دیا۔

"اچھی جگہ ہے؟"

"بہت، جنتِ ارضی" ٹیلر نے جل کر کہا۔

"بہت خوش نصیب ہو"

"شکریہ!"

"کیا پیڑول ختم ہو گیا" شمن نے موٹر کی سستی کو ٹوکا اور ایک دم سے ٹیلر نے اسپیڈ اتنی بڑھا دی کہ معلوم ہوا موٹر الٹ گئی۔

"آخر مطلب کیا ہے؟" شمن نے زبردستی غصے ہونے کی کوشش کی۔

"یہ کہ ہم انسان نہیں۔ پتھر کے ٹکڑے ہیں۔ چند بھیڑیوں کی خود غرضی اور مکاری نے پوری قوم کے منہ پر کالک مل دی اور اس حد تک کہ اب کوئی کوشش اسے نہیں مٹا سکتی۔"

"کچھ تو ان بھیڑیوں نے ایسا دماغی دکھ پہنچایا ہے جس نے اس حد کو پہنچا دیا۔"

"مانتا ہوں... مگر عقل بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے۔" شمن نے بمشکل اسے سمجھایا۔

"تو کیا واقعی تمہارے دل سے میرے لیے نفرت نہیں مٹ سکتی۔" ٹیلر نے بڑی نرمی سے کہا۔

"نفرت تو نہیں ہے مجھے۔" شمن نے جیسے خود کو بتایا۔

"تو پھر تم صرف مجھے جلانا چاہتی ہو" وہ مسکرا دیا، "جی چاہتا ہے اسی بات پر موٹر لڑا دوں کسی پیڑ سے۔" اس نے موٹر کی رفتار دھیمی کر دی۔

"ہمارے دل دکھے ہوئے ہیں۔"

"خصوصاً اس اگست کے واقعے کے بعد سے۔" ٹیلر نے بڑی ہمدردی سے کہا۔

"تم کبھی یہ سوچتے ہو کہ یہ سب فساد کانگریس نے کروائے..."

"ہاں، اور کانگریس قابلِ مبارکباد ہے۔" شمن پھر بے اعتباری سے بھڑکی، "اتنے مجبور اور نہتے گروہ سے اتنا پُرجوش اظہار ایک معجزہ سا معلوم ہوتا ہے۔ لاٹھیاں بھی تو پوری نہیں..."

"تو تمہارے خیال میں یہ بیوقوفی نہ تھی۔"

"آزادی سے محبت رکھنا اگر بیوقوفی ہے تو اُس کے پانے کے لئے جدوجہد کرنا بھی بیوقوفی ہے۔"

"مگر حماقت تو تھی۔ اس طرح اودھم مچا دینے اور بے موت مرنے سے آزادی نہیں ملا کرتی۔" وہ اس سے جواب مانگنا چاہتی تھی۔

"آزادی کی دیوی بھینٹ چاہتی ہے اور اگر اُسے راضی کرنا ہے تو ایسی ایسی لاکھوں قربانیاں کرنی ہوں گی۔ جو کچھ ان سر پھرے جوشیلے بچوں نے کیا وہ واقعی بہت معمولی نظر آتا ہے کیونکہ جو کچھ ہُوا بے ترتیبی سے اور بدانتظامی سے ہُوا۔ اگر یہی قربانی باقاعدہ دی جاتی تو آزادی کے میدان کا تھوڑا بہت حصّہ ضرور ہاتھ آ جاتا۔"

"مگر یہ گاندھی جیسے لیڈر ہمارا ہمیں جنگِ آزادی میں کیا رہنمائی کریں گے؟ اہنسا! مُنہ کہیں اہنسا سے بھی ملک جیتے گئے ہیں۔" وہ خود اپنی مخالفت کرنے لگی۔

"گاندھی نہیں اگر اس وقت چنگیز خاں بھی ہوتا۔ ایسے کہ ہاتھ میں تنکا نہیں، تو وہ کیا کر لیتا؟ دیکھا نہیں تم نے، کچھ نہ کرنے پر تو یہ سزا ملی اور کہیں ہاتھ بھی ہلا دیتے تو صاف انہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا۔"

"مُنہ ہیں بھی کس کام کے یہ لیڈر! کچھ کیا ہے انہوں نے آج تک؟ بلا سے، مر جائیں تو سمجھے لیڈر پیدا ہوں۔"

"لیڈر انڈا پھوڑ کر نہیں نکل آتے۔ اگرچہ تمہارے یہ لیڈر کچھ نہیں کر رہے مگر پھر بھی اُن کی خاموشی ضد عوام کے جی میں ڈھارس بندھائے ہوئے ہے۔ آزادی کی خواہش نہیں مری کو جیل میں جانے سے بہت کچھ عوام پر سے اُن کا بھروسہ اُٹھ گیا۔ بہت سے نااُمید ہو کر منکر ہو گئے، چڑ کر بگڑ بیٹھے مگر پھر بھی ایک زمانہ آ سے

گا جب وہ محسوس کریں گے کہ ہمارے لیڈر فضول نہیں بلکہ مجبور تھے۔"
"تو پھر یہ جیل میں گئے ہی کیوں؟ کیا قوم کی خدمت کی؟" شمن نے بچوں کی طرح پوچھا۔
"بہت بڑی خدمت۔ جو کچھ وہ زبان سے نہ کہہ سکتے تھے ڈرامے کے ذریعے دکھا دیا۔"
"ایں؟" شمن نے بیوقوفوں کی طرح پوچھا۔
"کہ ظالم جب ضد پر آجاتے ہیں تو وہ کیا نہیں کرتے۔ وہ نفرت جو ان کے اس فعل سے اس وقت عوام کے دل میں پیدا ہو گئی ہے اسے کوئی مہربانی، کوئی رعایت دور نہیں کر سکتی۔ اگر اس وقت حکومت تمہارے اوپر یہ مظالم نہ کرتی تو تم اس کے ضرور گن گاتے رہتے اور آزادی کی وہ لگن جو آنے والی پود کے دل کو لگے گی وہ ایک ایسی چیز ہو گی کہ... ارے ہم کدھر نکل آئے؟ ٹھیرو کار موڑنے دو...."
ٹیلر نے اُسے گھر پر اُتار دیا اور شام کو آنے کا وعدہ دے کر چلا گیا۔ ابھی دھوپ کافی تھی جو بربے نے آ کر کہا کہ وہ آ گیا۔
"ارے اتنی جلدی؟" وہ ہلکے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ بخار ہے۔ "بخار ہے کیا؟"
"شاید یہاں ہر وقت بخار کا ہی لطف آتا رہتا ہے۔ چلو جلدی جلدی پکچر دیکھیں گے۔ اور وہ... وہ لگالیتا سُرخ لونڈا" اُس نے ابروؤں کے بیچ میں انگلی رکھ کر کہا۔
"اچھا بندی؟"
"ہاں ہاں!" اُس نے زور زور سے سر کو جھٹکا۔
"کیوں؟"
"اچھی لگتی ہے۔" اس کی سُرخ تھکی ہوئی آنکھیں ہنستے ہنس بالکل غائب ہو گئیں اور دانت چمک اُٹھے۔
بجائے پکچر جانے کے وہ ہوٹل میں بیٹھے کافی پیتے رہے۔ ٹیلر نے بتایا کہ اُس کی

منگیتر جسے چھوڑتے وقت اس کا دل ٹوٹ گیا تھا، اُسے یک لخت بھول گئی۔

”اُس نے میرے خطوں کا جواب بھی دینا بند کر دیا۔“ اُس نے افسردگی سے کہا، ”ہم یہاں میدانِ جنگ میں وطن سے دُور ایک ان کی یاد میں زندگی کی گھڑیاں گزارتے ہیں اور وہ جھوٹ موٹ کو بھی ہمارا دل رکھنے کی کوشش نہیں کرتیں۔“

”کوئی گھڑی، کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جب وہ ہمارے خیالوں سے دور رہتی ہوں مگر۔۔۔ یہ بے وفا، عیش کی متوالیاں ہمیں انسان ہی نہیں سمجھتیں۔“ شمن خاموش سنتی رہی۔

”تمہیں اب بھی اس لڑکی سے محبت ہے؟“ اُس نے نرمی سے پوچھا۔

”محبت یک طرفہ نہیں ہوتی، یوں تو مجھے لفظ لڑکی سے ہی شدید محبت ہے۔“ وہ پھر شرارت سے مسکرایا، ”گزشتہ چند سالوں نے اور بھی کمزور بنا دیا ہے۔۔۔۔۔۔“

گھنٹوں بکواس کر کے جی ذرا ہلکا ہو گیا۔ پھر وہ اپنے بچپن اور اپنی ماں کی باتیں بتاتا رہا۔ اُسے اپنی ماں سے بڑی محبت تھی اور بہن کو بار بار تیل ملائی مٹھائی بھیجنے میں لطف آتا تھا۔ وہ بہت شریر مگر پیاری تھی۔ ہزار دل لڑکے لگا رکھے تھے اور ٹیلر کو بڈھا سمجھتی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ کا جینیئس تھا۔

دوسرے دن ٹیلر اتنی صبح آیا کہ شمن کو اُسے گھنٹہ بھر بٹھائے رکھنا پڑا۔ نہا دھو کر جب وہ باہر نکلی تو وہ لان پر چائے کی کشتی کے قریب لیٹا ہوا تھا۔

”میں خدا حافظ کہنے آیا ہوں۔ کل صبح جا رہا ہوں۔“

”خدا حافظ!“ شمن نے جواب دیا۔

”اوہ۔۔۔ بس تمہیں اتنا ہی کہنا ہے۔“ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا، ”یہ بھی پوچھنے کی تکلیف گوارا نہیں کہ کہاں جا رہا ہوں۔ ویسے نہیں تو رسماً ہی سہی۔“

”مجھے رسم و راہ بڑھانے کی ضرورت۔۔۔؟“

”ہوں ٹھیک کہتی ہو۔“ وہ گھاس پر ماتھا ٹیک کر، اُداسی سے بولا۔

”رات کو سائیکل پر چلیں۔“

"رات کو؟ کبھی مجھے رات سے ڈر لگتا ہے۔" اُسے بُرا مانتے دیکھ کر جلدی سے بولی، "اگر تمہیں شام کو فرصت ہو تو چلو گھوم آئیں۔"

"سنو، باورچی سے کوئی مزے دار کھانا منگواؤ، گرمی نے زبان بھی تو سُن کر دی ہے۔"

"مرچیں کھاؤ گے؟"

"ہاں۔" اُس نے سر ہلایا اور زور سے آنکھیں ہتھیلیوں سے بھینچنے لگا۔

"کیا سوئے نہیں رات بھر؟"

"نہیں۔" وہ رو بھڑک کر بولا، "نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ میں مانتا ہوں کہ تم مجھے پسند ہو لیکن... میں اسے محبت نہیں بلکہ کوئی سخت بے رحم اور تکلیف دہ مرض کہوں گا۔"

"معلوم ہوتا ہے لو لگ گئی۔" شمن بات ٹالنے کو زور سے ہنسی۔

"کیا ایسی کوئی بیماری ہے ہندوستان میں، جس میں شدید ترین محبت وبالِ جان بن جائے؟"

"ہاں، لو کی طرح یہاں عشق کی لو بھی چلتی ہے۔ مگر آج کل نہیں۔ وہ برسات کے دنوں میں جب کالی گھٹائیں گھر کر آتی ہیں، کوئلیں کوکتی ہیں اور پپیہے شور مچاتے ہیں۔"

"تو پھر مجھے خزاں کا کوئی مرض لگ گیا ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے۔ کافی خطرناک مرض ہے۔ تم بھوتوں میں یقین کرتے ہو؟"

"میں؟ ہشت! تم بھی نہیں کرتیں مگر یہاں بہت سی ایسی جگہیں ہیں جہاں صرف بھوت رہتے ہیں۔ تم نے مرگھٹ دیکھا ہے؟ وہاں کھوئے ہوئے انسانوں کی روحیں صدیوں سے بھٹک رہی ہیں۔ ہڈیوں کے ڈھیر رات کو جاگ اُٹھتے ہیں اور ہر گزرنے جانے والے کے سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔"

"کسی کا روپ بھر کر، مثلاً تمہارے روپ میں!"

"ہاں۔" دونوں ہنس پڑے۔

"اگر میں تم سے شادی کے لیے کہوں تو؟"

"تو؟ تو... ارے تم نے جو ابھی مرچوں دار کھانا منگوانے کو کہا تھا... منگواؤں؟"
اُس نے چاہا مذاق اُڑائے۔

"میں سوچتا ہوں ہم اور تم مل کر انسانیت کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" اُس نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

"مگر اس کے لیے شادی ضروری ہے؟" اُسے سنجیدہ ہونا پڑا۔

"ایں، ہمیں نہیں معلوم، مگر نہ جانے کیوں میرا خیال ہے کہ ویسے ہم دونوں ساتھ نہیں رہ سکتے۔ تمہیں مجھ سے محبت نہیں، کیوں؟"

"جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ۔ میں ہندوستانی ہوں اور یہاں کے موسم کی عادی ہوں، مجھے لو بھی نہیں لگی۔"

"بکومت، تم محبت نہیں کر سکتیں کیونکہ میں سفید ہوں۔"

"ہمارے ملک میں تم سے بھی زیادہ سفید انسان ہیں، ہم اُن سے بھی محبت کرتے ہیں اور شادی بھی۔"

"تو اگر مجھ سے شادی کر لو تو بعد میں محبت کر سکو گی، میرا مطلب ہے اگر کوشش کرو تو؟"

"مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرنا نہیں آتی۔"

"تم میں اتنی ہمت ہے کہ مجھ سے شادی کر لو؟"

"کہہ نہیں سکتی۔"

اتنے میں باورچی پھلکیاں اور چٹنی لیکر آ گیا۔ ٹیلر نے ڈھیر ڈھیر سی چٹنی لگا کر تیزی سے کھانا شروع کیں۔ مارے مرچوں کے ناک آنکھ سے پانی بہ نکلا اور منہ کچے گوشت کی طرح لال بھبوکا ہو گیا۔

"تمہارے سوال کا جواب مل گیا؟"

"ایں؟" وہ بچوں کی طرح ناک پونچھ کر بولا۔

"یہ مرچیں کیا کہتی ہیں؟"

"کہتی ہیں... کہ تم... تم بیوقوف ہو شمّن شم" اُس نے پہلی دفعہ اُس کا نام لیا، وہ

بھی لگا کر۔

"اتنا بڑا جوا کھیلتے ڈرتی ہو؟" اس نے طعن سے پوچھا۔

"جوا!" شمن کا دل نامعلوم مسرّت سے چونکا، "زندگی کا لطف اونچے اونچے داؤں لگانے میں ہے۔" اس نے جیسے خواب میں دہرایا۔

"ہمّت ہے اتنی۔" وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"ہمّت تو کچھ ایسی مہنگی چیز نہیں مگر تم یہ سٹّہ کیوں لگا رہے ہو؟"

"میرے لیے یہ سٹّہ نہیں۔ مجھے ہندوستان سے لگاؤ ہے تمھیں زخمی دیکھ کر میرا دل دکھ رہا ہے۔ مجھے وہ دنیا کا ایک عضو نظر آرہا ہے۔ اُسی دنیا کا ایک ٹکڑا جو میری ہے۔"

"زندگی کی طرف سے تمہارا رویّہ بھی صرف شاعرانہ ہے۔ تم جانتے ہو یہ سٹّہ ہے مگر اس کے نتیجے کا خوف ابھی سے تمہارے خون کی حرکت تیز کیے دے رہا ہے۔ اس خوف میں بڑی لذّت ہے، مگر تمہیں اس لذّت کا چسکا کہاں سے پڑا؟" شمن نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ دور الٰہ آباد کے کیمپ میں جو اس نے خونی وعدہ کیا تھا۔ اس کی لذّت اب تک اس کے دماغ میں محفوظ تھی۔

"تم میری فکر نہ کرو۔"

"میں نہ کروں گی تم خود ہی کرلوگے، تم پچھتاؤگے۔"

"میں؟"

"ہاں... ذرا ابھی یہاں سے جا کر تم اپنی ہر بات کو یاد کرکے شرمندہ ہوگے۔ یہ نشہ زیادہ دیر قائم نہیں رہے گا۔"

"کیسا نشہ؟"

"خود فریبی کا نشہ، کہ یہ تم عجیب و غریب بات کرنے جا رہے ہو۔ میں ہندوستانی تم..."

"چپ رہو۔ میں تمہارے اور اپنے درمیان کسی دنیا کو نہیں لانا چاہتا۔ ایک

خیال ہے اور وہ یہ کہ میں اور تم قریب تر ہو جائیں۔ میری ماں بڑی اچھی ہیں، وہ بہت خوش ہوں گی۔" وہ ایک دم چہک کر بولا، "ہم ساتھ ساتھ سارے یورپ کا سفر کریں گے… اوہ… کتنا لطف آئے گا۔ یہ کمبخت لڑائی ختم ہو جائے گی، میں پھر سے اپنی پڑھائی شروع کر دوں گا۔ تم بھی وہاں کوئی ڈگری لے لینا۔ پھر ہم دونوں ہندوستان آ کر…"

"ارے بڑے تیز ہوا باز ہو، دم بھر کی سیر کر کے لوٹ بھی آئے۔"

شمن زور سے ہنسی اور ٹیلر بھی کھلکھلا اٹھا۔

"چلو ذرا باہر چلیں نا،" اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹا۔ وہ ننھے بچوں کی طرح وہ قہقہے لگاتے دیوانوں جیسی باتیں کرتے دور تک نکل گئے۔

"تم ہاں کہہ دو اور ہم اپنی جنت میں… " دور سے ایک لاری گزری اور دھول کے جھکڑ اس کے ہنستے ہوئے حلق کو گھونٹ گئے۔ بات ادھوری چھوڑ کر وہ شمن کے کندھے کا سہارا لے کر کھانسنے لگا۔ مسافر اس عجیب و غریب جوڑے کو آنکھوں میں جذب کرنے کے لیے لاری میں سے لٹک لٹک کر جھانکنے لگے۔

"دیکھا تم نے؟" شمن نے تلخی سے کہا۔

"میں ان کتوں کی پروا نہیں کر سکتا، میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔" وہ بھی جھلا کر بولا۔

کمرے میں پہنچی تو وہ سارے قہقہے جو تھوڑی دیر قبل شگوفوں کی طرح دل میں پھوٹ رہے تھے یک لخت مرجھا گئے، جیسے کسی نے بٹن دبا کر بجلی غائب کر دی۔ وہ خاموش پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ بار بار اس کے شانے میں کوئی چیز چبھتی جیسے کوئی رگ چڑھ گئی ہو۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"انتہا!" اس نے سہم کر جواب دیا۔

"کوئی راستہ؟"

"ناممکن۔ خضر بھی بھٹک رہے ہیں۔"

"علاج؟"

"کوئی نہیں!"

"دعا؟"

"بیکار!"

جلدی سے اس نے اٹیچی میں دو ساڑیاں ڈالیں۔ کوئی تو گاڑی جا رہی ہو گی کہیں، دنیا کے کسی کونے میں، بس یہاں سے دور۔ سامان پھر آتا رہے گا۔ ویسے ہے ہی کیا سامان خانہ بدوشوں کا؟

"کیا حماقت ہے؟ ایسا بھی کیا خوف؟ ہشت! کیا آگ لگ جائے گی وہ تمہیں؟ کہہ دو صاف صاف دن اور رات کبھی ساتھ نہیں رہ سکتے۔"

اُس نے اٹیچی دور پھینکی، دیر تک الماری کی کتابیں درست کرتی رہی۔ پھر لیٹ کر سو گئی۔ جب آنکھ کھلی تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ بیرے نے آکر کہا ٹیلر آیا ہے، جلدی سے ساڑھی لپیٹ کر باہر آگئی۔

"کیا ہے رونی؟"

"ادھر... ادھر آجاؤ..." وہ سہما ہوا اور پریشان تھا۔ چہرہ بہت لمبا اور زرد ہو رہا تھا۔ بار بار سگریٹ جھاڑنے کے بہانے وہ ہاتھوں کی لرزش کو چھپا رہا تھا۔ برآمدے سے نکل کر دونوں گھاس پر پہنچ گئے۔

"میں... میں سوچتا ہوں میں نے ابھی کسی سے ذکر نہیں کیا۔"

"کیا بات ہے؟"

"یہی... یہی..." وہ بُری طرح گھبرا گیا۔

"رونی گھبرانے کی کیا بات ہے۔ میں بچہ نہیں اور نہ ہی تم ننھے ہو۔ ہم یہ شادی کیوں کر رہے تھے؟ صرف اس لیے کہ ہم دونوں مل کر بہت کچھ دنیا میں کر سکتے ہیں۔ اس میں محبت کو دخل نہیں۔"

"تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہو سکتی۔"

"میں ... میں آج تک محبت کو نہیں سمجھ سکی اور اب تو میں نے اس فضول مسئلے پر غور کرنا بھی چھوڑ دیا" اُس نے آہستہ سے کہا۔ ٹیلر غور سے اُس کا منہ تکتا رہا۔

"میں تمہیں محبت کرنا سکھا دوں گا" اُس نے شمن کا ہاتھ ہمدردی سے دبایا۔

"سکھا دو گے؟" وہ زور سے ہنسی۔ اُس کی آواز میں تلخی اور خوف کے ملے جلے ساز بج اُٹھے۔ "محبت سکھائی نہیں جاتی، یہ ایک احساس ہے جو پیدا ہوتا ہے، پروان چڑھتا ہے اور ... اوہ چھوڑو اس قصے کو ... تو دیکھو کوئی ایسی حماقت کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔"

"حماقت کیوں کہتی ہو۔"

"یاد ہے وہ لاری ——— جو ہمارے پاس سے گزری تو لوگ ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے جیسے ہم بندر ہوں مگر انسان بننے کی جرأت کر رہے ہوں۔"

"مگر میں تو ان کی پروا نہیں کرتا" وہ دانت پیس کر چیخا۔

"تو تم غلطی کرتے ہو، قدرت سے جنگ کرتے ہو۔"

"مگر یہ ایسی ان ہونی بات تو نہیں۔ ہزاروں سفید لڑکیاں ہندوستان میں مسرت کی زندگی گزار چکی ہیں اور گزار رہی ہیں، کیا وجہ کہ میں اور تم خوش نہ رہیں۔"

"لڑکیوں اور لڑکوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک بار ایک عورت اپنا سب کچھ چھوڑ کر ایک مرد کے ساتھ ہو جاتی ہے تو خواہ اُسے کتنا ہی نیچے اُترنا پڑے وہ وہیں اپنا گھر بنا بیٹھتی ہے مگر مرد؟ مرد بڑا نازک مزاج ہوتا ہے۔ ذرا سی بات پر چڑ کر چل جاتا ہے۔"

"مگر ..."

"ہم تم ملے ... زندگی کے تجربات میں عظیم الشان ... اضافہ ہو گیا۔ سنو تم کل ہی واپس لوٹ جاؤ۔ ارے ہاں، میں نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہاں جا رہے ہو۔"

"واپس لوٹنا ..."

"صبح گاڑی جاتی ہے، میں تمہیں خدا حافظ کہنے پہنچ جاؤں گی۔ دیکھو۔ دیکھو ہماری

دوستی ختم نہ ہو گی" اُس نے ٹیلر کو سر سے پکڑ کر گہری سانس بھرتے دیکھ کر سہارا دیا۔
"ہماری دوستی بڑی کارآمد ثابت ہوگی۔ مجھے ہی نہیں پورے ہندوستان کو تم جیسے دوست مل جائیں تو بھاگ کھل جائیں۔"

"تو تم صبح آؤ گی؟ اسٹیشن پر" شب بخیر کہنے سے پہلے اُس نے التجا کی۔

"ضرور۔"

سمجھا بجھا کر واپس لوٹی تو معلوم ہوا سر پر لدا ہوا بھاری بوجھ پھینک آئی ہے۔ تلسی داس جی ایک بار رسّی کے دھوکے میں سانپ کو پکڑ کر بیوی کے مکان پر پہنچ گئے تھے۔ یہ دنیا میں ایسے بھی جذبے موجود ہیں جو ہمیں اس حد تک اندھا بنا سکتے ہیں۔

ہلکی پھلکی غبارے کی طرح مگن وہ پلنگ پر جا پڑی۔ جیسے کسی نے بال و پر کے جھگڑے سے آزاد کر دیا مگر نیند نہ آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ غبارے کی ڈوری ہاتھ سے ٹوٹ کر رہ گئی اور وہ دور خلا میں اڑتا چلا۔ کدھر؟ کہاں؟ ہوا بھی تو نہیں چل رہی کہ کوئی رخ کا اندازہ لگا سکے۔

ایک دم نہ جانے کدھر سے بادل اُٹھے۔ نہ گرجے نہ چمکے بس برس ہی پڑے۔ نہ جانے کب کے گھٹے ہوئے پرنالے بہہ نکلے۔ تکیے میں منہ گھونٹ کر وہ ہچکیوں بلبلاتی ہوئی آنسوؤں کو جذب کرتی رہی۔ اُسے نہیں یاد تھا وہ کب روئی تھی، اور آج جیسے پہلی بار ضبط کا چٹیل بند ایک ننھی سی چوٹ سے پھٹ پڑا۔ اُس کا رواں رواں بلک بلک کر سسکیاں بھرنے لگا۔ تنہا بے دم غنودگی نے سر پر ہاتھ پھیرا اور آنکھیں گیلی آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔

صبح اُس کی آنکھ بجائے سات کے آٹھ بجے کھلی۔ ایک اطمینان بخش دھکے سے اُسے یاد آیا کہ ٹیلر جا رہا ہوگا۔ ریل کا جن اُسے ہر لمحہ اس سے دور تر گھسیٹے لیے جا رہا ہے اور فاصلہ دم بدم بڑھ رہا ہے اور کچھ ہی دن میں یہ اتنا لامتناہی ہو جائے گا کہ پھر نہ سمٹے گا۔

رات کو مچل جانے والی بچی کو ملامت کرتی وہ اُٹھی۔ نیم گرم پانی سے غسل کیا۔ تھکے ہوئے کندھے بھینچ کر اُس نے رہی سہی سستی کو بھی جھٹک دیا۔ بڑی تیز بھوک لگ رہی تھی۔ رات وہ کھانا بھی تو بھول گئی۔ باورچی نے نہ جانے کیا رکھا تھا اور پتہ نہیں

اُس نے کیا جواب دیا تھا۔ تو یہ کہیں بیرے نے اس کی سسکیاں نہ سن لی ہوں۔ ناشتے کے بعد وہ دیر تک بیٹھی ٹوکری میں سے چلغوزے اور بسکٹ کے ٹکڑے چن چن کر کھاتی رہی۔ اسی ٹوکری میں سے کل اُس نے اور ٹیلر نے لان پر بیٹھ کر ناشتہ کیا تھا۔ کتنا لاپروا تھا ٹیلر! کالر تنگ تھا تو اوپر کا بٹن نکال کر اُس نے چینوں کی پڑیا میں گرا دیا تھا۔ نیچے کا حصہ کدھر گیا۔ دو انگلیوں کے سرے سے بٹن کو پکڑے وہ پھراتی رہی اور پھر اُسے اپنے بٹوے کی ننھی سی جیب میں ڈال دیا۔

آج وہ کیا کرے جو یہ لمبا چوڑا دن کٹے؟ معلوم ہوتا تھا ہندوستان کی زمین ہی ختم ہو گئی۔ اور ہے بھی کیا اس کھنڈر میں؟ تو پھر کیا کیا جائے؟ خیر اس وقت تو بازار کا ایک چکر بُرا نہ رہے گا۔

کمرے میں تالا لگاتے ہوئے اُس کے ہاتھ سے کنجی چھوٹ پڑی! ٹیلر کا بھوت مع اپنی تمام مردانگی کے دیوار سے سہارا لیے کھڑا تھا۔

"تم جھوٹ بول گئیں اسٹیشن پر نہیں آئیں؟" اُس نے روٹھتے ہوئے انداز میں غصہ آ کر کہا۔

"میں؟ تو اس لیے تم نہیں گئے؟"

اُس نے نیم مردہ مسکراہٹ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"مگر..."

"لعنت ہے اس اگر اور مگر پر!" وہ زور سے بھونکا۔

کمرے میں اطمینان سے بیٹھ کر ٹیلر نے بتایا کہ وہ صبح چھ بجے سے اسٹیشن پہنچ گیا تھا۔ شمن کا جی دکھ گیا۔

"ہائے ہائے، مع تمام اسباب کے؟"

"نہیں" وہ شرارت سے مسکرایا اور شمن کے بگڑنے پر زور سے چلایا، "مجھے معلوم تھا تم ہندوستانی بڑے دھوکے باز ہوتے ہو اور تم ضرور دھوکہ دو گی اس لیے سامان لا کر رکھ جاتا..." وہ زور سے ہنسا۔

"دیکھو رونی۔"

"چپ رہو۔ کچھ نہیں دکھتا میں۔ تم عورت نہیں پتھر ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہیں اتنا چاہتا ہوں پھر بھی... پھر بھی تم مجھے لکچر دیے جا رہی ہو۔ بس ہو چکی تمہاری نصیحت۔ اور ہاں، تمہیں یہ بھی بتانے آیا ہوں کہ اب میں پونا واپس قطعی نہیں جاؤں گا۔"

"تو میں جا رہی ہوں شام کو۔"

"چلو... کے بجے کی گاڑی سے" وہ مسرت سے لپکا۔

"چلو سے کیا مطلب گویا آپ بھی... دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے۔"

"دماغ سلامت ہوتا تو کہنا ہی کیا تھا۔ کچھ کھانے کو منگاؤ۔"

"کھانے کے کمرے میں چلو۔"

"نہیں ہم تو یہیں کھائیں گے۔" اُس نے بستر پر لیٹ کر کہا۔

"ٹیکسی یا پھر وہ تکل والا پروگرام۔ سائیکل؟" اُس نے ناشتہ ختم کر کے کہا۔

"تمہارا سر۔"

"میرا سر بہت دکھ رہا ہے۔" ٹیلر نے آہستہ سے اپنا تھکا ہوا سر اس کے گھٹنے پر ٹکا دیا۔

"نیند کم آئی۔"

"آئی ہی نہیں بالکل۔" اُس نے سر بالکل گود میں سرکا دیا۔

"اسپرو لاؤں۔" اُس نے آہستہ سے اُس کے بھورے رنگ کے بالوں کو چھوا۔

"تین اور تین چھ اور تین نو گولیاں کھائیں۔" ٹیلر نے معصومیت سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

دن آنکھیں میچے چپ چاپ گزرتے چلے گئے۔ ایلما نے بہت ملامت کی کہ اُس کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی، رجسٹری کا دفتر کوئی نامعلوم جگہ تو نہ تھی۔

گیارہ بجے جب وہ سول میرج کے دفتر سے نکلے تو سڑکیں کافی بھری ہوئی تھیں۔ ٹیلر بار بار مسکرا رہا تھا مگر وہ وحشیانہ مسرت جو دفتر کی میز پر سے سر اٹھاتے وقت

بجلی کی طرح اُس کی آنکھوں میں کوندی تھی اب معدوم ہو چکی تھی۔ اُس کا اندازِ گفتگو نہایت نرم، دربارانہ تھا اور چہرے پر شاندار فتح کے احساس کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شمن کچھ ششدر سی، کچھ پراگندہ تیز تیز باتیں کر کے اُن اجنبی آوازوں کو نہ سننے کی کوشش کر رہی تھی جو اس کے کانوں میں ہتھوڑے کی چوٹ بن کر پڑ رہی تھی۔

"غلط، سب غلط۔ آگ اور پانی کبھی بغلگیر نہیں ہو سکتے" کوئی بار بار سرگوشیاں کر کے یاد دلا رہا تھا۔

شمیم کے چیڑ کے درختوں کے درمیان چھپے ہوئے چھوٹے سے بنگلے میں شمن نے نیا ہنر کا بی شب کا لباس پہنا تو ایسا معلوم ہوا کسی نے اُسے برف کے تودے میں دفن کر دیا۔ باہر کے کمرے میں ٹیلر بیٹھا دیر تک ضروری خط لکھتا رہا اور وہ صندوق میں سے کپڑے نکال کر جمانے لگی۔

زور زور سے کلیاں کرنے اور منہ دھونے کی آوازوں نے اُسے بتایا کہ ٹیلر غسلخانے میں ہے۔ باہر خشک ہوائیں سوکھی چادروں کی طرح پھڑپھڑا رہی تھیں۔ نامعلوم خوف و ہراس فضا میں تیر رہا تھا۔ خاموشی موت کی طرح اداس تھی۔ معلوم ہوتا تھا کائنات کسی بھیانک سانحے سے ڈر کر ایک دم چپ چاپ رہ گئی ہے۔ دو بلیاں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی کھڑکی سے باہر کود گئیں۔ خزاں رسیدہ پتیاں مردہ چڑیوں کی طرح پیڑوں سے ٹپک رہی تھیں۔

"کھڑکی بند کر دو۔" اس نے لجاجت سے ٹیلر سے کہا۔ بڑبڑا کر نہ جانے وہ کیا بولا اور چٹخنی لگا دی۔ جب وہ مڑا تو شمن نے دیکھا وہ بہت پسینے پسینے تھا مگر اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا، جیسے کاغذ کا ٹکڑا جو بارش میں پڑے پڑے دھل کر بے رنگ ہو گیا ہو۔

(۴۲)

وہ جاگ پڑی مگر آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑی رہی۔ دور کہیں بہت سے

گھنگروؤں کی جھنکار ہوا کو جاندار بنائے ہوئے تھی۔ یہ گھنگرو چڑیاں بجا رہی تھیں۔ لیے تال سُر چیں چیں بھی ملا کر بھیرویں کا الاپ معلوم ہو رہی تھی۔ سب ہی سُر کومل تھے۔ نیم خوابیدہ احساسات کو جمع کرنے کے لیے اُس نے جاگنے کی کوشش کی۔ جسم کو آہستہ سے سمیٹا، اور پھر پھیلا دیا۔ پپوٹے کھولنے چاہے مگر نہ کھلے، جیسے سورج اُس کی آنکھوں میں گھور رہا ہو۔ ایک دم اُسے کچھ یاد آیا۔ دماغ میں سوئی سی چبھی اور وہ بھالا بن گئی۔ آنکھیں بزدل چڑیوں کی طرح بچتی بچتی کھل گئیں۔ کمرہ خالی تھا!

وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہاں تھا ہی کیا؟ رات جہاں ٹیلر کے کوٹ ٹانگے تھے وہاں صرف ایک ملگجی سی سُرخ ٹائی لٹکی ہوئی پھانسی لگے ملزم کی طرح جھول رہی تھی۔ جوتوں کی قطاریں جو اُس نے اپنے ہاتھ سے سیدھی کی تھیں غائب۔ صرف ایک میلا موزہ کونے میں پڑا منہ چڑا رہا تھا۔

خاموش اور مفلوج وہ اس میلے موزے کو گھورتی رہی جو بڑھتے بڑھتے ایک ٹبانے پہاڑ کی طرح پھول گیا۔ ہوا کے خاموش جھونکے سے ٹائی گوشت کے لوتھڑے کی طرح پھسل کر زمین پر آ رہی۔ جلدی جلدی اُس نے سر میں گھستے ہوئے مرچوں بھرے دھوئیں کو دونوں ہاتھوں سے پرے ہٹایا اور بیچ کمرے میں کھڑی ہو گئی۔

"گیا! وہ گیا!" در و دیوار قہقہے مار کر چیخ اُٹھے۔

"تو پھر؟ اب؟ اب کیا ہو؟" اُس نے لجاجت سے جواب مانگا۔

"وہ گیا! تم بھی جاؤ۔ کوڑی بھی تو نہیں تمہارے پاس۔ ابھی مالک مکان جب سنے گا کہ تم رہ گئیں اور وہ گیا تو وہ تمہیں کوئی بیسوا سمجھے گا جنہیں یہ سفید چمڑی والے آئے دن چند سکوں کے عوض لاتے ہیں۔ دھکے مار کر نکال دے گا۔"

"تو پھر؟ اب کیا کرنا چاہیے؟"

"بھاگو! جتنی طاقت تمہارے پیروں میں ہے وہ سب ایک بار لگا دو اور بھاگو۔ وہاں باغ کے کونے میں جو باؤلی ہے، وہی جس میں کل آتے وقت تم دونوں نے جھانکا تھا کہ دیکھیں یہ دن رات کا ملاپ کیسا نظر آتا ہے پانی کے آئینے میں؟ تم بڑی کائر دل

اور مکڑیوں کی غارت گری دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی تھیں۔ بدبو تو ہے اُس میں اور ان جانے کیڑے مکوڑے بھی، مگر راستہ بڑا سیدھا ہے۔ اس ٹوٹی ہوئی کمر کے لیے اس سے سیدھا راستہ نہیں۔"

سر پکڑ کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ وہ ایک دن کی بیاہی دلہن مگر نہ اُبٹنے کی مہک نہ مہندی کا رنگ۔ ایک چوڑی بھی تو نہیں کلائی میں۔ اس کا سہما ہوا دماغ اور جھجکا۔ یہ بیاہ ہے یا زندگی؟ لڑکھڑاتی ہوئی وہ باہر بھاگی۔ برآمدے میں بہت سے ہاتھوں نے اُسے لپک لیا۔ بہت سے نہیں صرف دو ہی تو تھے۔ مگر کتنے سکون بخش و محافظ! اور ٹیکہ کا پھول کتنا سُرخ اور تازہ دم ہو رہا تھا۔

"تم اُٹھ آئیں..." اُسے سیڑھیوں کے پاس کھڑا کر کے وہ برآمدے کے نیچے کود گیا۔ "میں نے کہا تمہیں کیوں جگاؤں۔" اُس نے نیچے سے اس کی کمر دونوں ہاتھوں سے تھام لی۔ "تمہیں ایک چیز... ہیں؟"

"رونی!" اس نے طوفان کے نیچے سے نکل کر لمبی سانس کھینچی۔

"کیا ہوا؟" اُس نے نرمی سے نیچے اتار کر اُسے ایسے دیکھا گویا وہ کوئی چینی کا کھلونا ہے جس کے ٹوٹ جانے کا خدشہ ہو۔

"کچھ نہیں..." وہ آنسو پی کر ہنسنے لگی۔ ڈری ہوئی دھڑکن سے بھری ہوئی مصنوعی ہنسی۔

"رونی... تمہارے جوتے اور کپڑے کہاں گئے؟" چائے پیتے وقت اُس نے رُک رُک کر پوچھا۔

"جوتے؟ کپڑے؟ کیا کرو گی؟ ابھی میں تمہیں اس جھگڑے میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ لو۔" اس نے بہت سا مکھن لگا کر توس دیا۔

"یونہی پوچھا تھا۔"

"کیا بات ہے شمن؟" اُس نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"کچھ نہیں!... میں اُٹھی... تو تمہاری سب چیزیں غائب تھیں..."

"تو؟" ٹیلر اور سنجیدہ ہو گیا، "تم سمجھیں...."

"تو ہیں سمجھی... میں کہ چور لے گئے" اس نے بچوں کی طرح بہانہ بنایا۔

"جھوٹ... مجھ سے جھوٹ مت بولو" ٹیلر کا منہ اُتر گیا، "میں سمجھتا ہوں"

"خاک سمجھتے ہو"

"اگر یہ حال رہا تمہاری بے اعتباری کا... تو...."

"ہشت... بہت عقلمند بنتے ہو..."

"ہاں، تم سمجھیں میں چلا گیا تمہیں چھوڑ کر"

"بہت سمجھے۔ اتنی سمجھ ہوتی تو شادی کیوں کرتے۔ سچ بتاؤ کہاں گئے کپڑے؟ واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔" اُس نے ایسے بات پلٹی کہ ٹیلر سیدھا ہو گیا۔

"میرا برش کرنے کو لے گیا ہے۔ دیکھو ممی میں نے شادی اپنے لیے کی ہے نہ کہ ان کمبخت جوتوں کے لیے۔ صبح صبح میری تو بات کبھی نہ پوچھی اور جوتوں پر نثار ہوئی جا رہی ہے۔"

"اچھا کہیں چلو گے گھومنے؟"

"نہیں، بس یہیں تمہارے پاس۔" وہ اُس سے لگ کر گھاس پر لیٹ گیا۔

پورا مہینہ چٹکیوں میں سوتے جاگتے، ہنستے بولتے گزر گیا۔ دن بھر اُجڑے ہوئے باغ کے سنسان کونوں میں سر سے سر جوڑ کر کیٹس اور بائرن کے اشعار اور عمر خیام کی رباعیاں پڑھی جاتیں۔ ٹیلر کی آواز بہت نرم اور بھاری تھی۔ جیسی آواز میں محبت بھرے نغمے اور پھڑکتی ہوئی نظمیں سنایا کرتا۔

وہ کیا سوچا کرتی تھی اور کیا نکلا۔ اس کا خیال تھا کہ انگریز عام طور پر گندہ دہن رہتے ہیں۔ دانتوں کی صفائی کے لیے ہزاروں دوائیں ایجاد کرنے کے بعد بھی اُس کی نظر سے کوئی چمکیلے سفید دانتوں والا انگریز نہ گزرا۔ ان کے سیاہی مائل زرد دانت دیکھ کر ہمیشہ رونگٹے کھڑے ہونے لگتے۔ ٹیلر کے دانت سفید نہ تھے مگر بالکل ہموار اور بیماری سے پاک تھے۔

"سب سے پہلی چیز جس نے مجھے تمہاری طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا تمہارے

نیلگوں سفید دانت تھے" وہ شمن سے کہتا۔ دانتوں کا رنگ بدلنا ممکن نہ تھا مگر وہ ضرورت سے زیادہ اُن کی صفائی میں منہمک رہتا۔ اخروٹ کی چھال چبا کر وہ شمن کے دانتوں سے مقابلہ کرنے لگتا اور شکست کھا کر بچوں کی طرح بگڑ اُٹھتا اور اُداس ہو کر کہتا:

"میں یہ دانت اکھڑوا کر دوسرے لگوا دُوں گا۔"

"تم ہندوستانی نہ جانے کس مٹی سے بنائے گئے ہو کہ ہم لوگ دواؤں سے بھی اس کی نقل نہیں اتار سکتے۔" وہ اُس کے سانولے رنگ کو دیکھ کر کہتا، "اس رنگ میں کتنی کشش ہے، آنکھیں جھپکنے لگتی ہیں۔" وہ نیم باز آنکھیں بنا لیتا۔ اُسے پاؤڈر اور رنگ سے بہت نفرت تھی۔

"اس سے جلد کی حساس ملائمیت چھپ جاتی ہے۔"

"میں تو خوشبو کے لیے لگاتی ہوں۔"

"اوہ۔۔۔ خوشبو! اس جلد کی خوشبو سے بھی نشہ آور کوئی خوشبو ہے! اگر ایسا ہے تو اسے تیز کرنے کے لیے شراب چھڑک لو۔"

جی چاہتا ہے۔ زندگی کی لمبان لامتناہی ہو جائے۔ یہی چیڑ کے لمبے درخت ہوں، اخروٹ کی چھاؤں ہو اور ٹیلر شیلی کی نظموں میں الجھ کر کھوئے رہیں۔ زندگی اتنی نرم و نازک بھی ہو سکتی ہے۔ اُسے معلوم نہ تھا۔ بے معنی قہقہے، گہری نیندیں، بڑھی ہوئی بھوک۔ اور کیا چاہیے تھا۔

ٹیلر روز بروز بدلتا جا رہا تھا۔ شمن سمجھتی تھی کہ اس اجڈ گنوار کو ہندوستانی رنگ میں رنگنا قطعی ناممکن نہ سہی مگر دشوار ضرور ہے مگر وہ تو خود بڑی تیزی سے ہندوستان کی آب و ہوا، خوراک اور طرزِ رہائش کی طرف کھنچتا جا رہا تھا۔ یہ مرد بھی کتنے سہل ہوتے ہیں، جو زندگی انہیں دینا چاہو دیدو۔ اس معاملے میں نہ اُن کا ملکی اختلاف آڑے آتا ہے نہ قومی۔ جس آغوش میں گئے آنکھیں بند کر کے سر ڈال دیا۔ اب جو چاہو کرو۔ دن رات ایک ہی لباس پہنے سستی کا اشتہار بنا پڑا رہتا۔ شیلو کرنا ہوں

جاتا۔ وہ تو داڑھی چھوڑ دیتا مگر شمن نے شدت سے مخالفت کی لہٰذا مجبوراً شیو کر لیا
پانی سے گھبراہٹ ہوتی، خوب مرچوں دار سالن کھا کر تین چار گھنٹے دوپہر کو سوتا۔
بڑی مشکل سے شام کو اٹھتا۔ باہر جانے کے لیے ہزاروں بہانے بنانے لگتا اور جب شمن
زبردستی گھسیٹ لے جاتی تو وہ بالکل سنسان اور غیر دلچسپ راہوں میں گم ہو کر
وہاں قدرت کی رعنائیوں کی تعریف کرنے بیٹھ جاتا۔ اس نے چپکے سے دو ہفتے کی
چھٹی اور منگا لی۔ شمن نے پوچھا تو ہانپنے کانپنے لگا: اس کی چھٹی واجب ہے۔

وحشت زدہ ہو کر شمن نے دیکھا کہ وہ ایک پیچیدہ معمہ بنتا جا رہا ہے۔ زیادہ تر
اذگفتار رہتا ہے مگر کچھ نہیں جانتا ہے خوف زدہ ہو جاتا ہے اور پھر جلد ہی اس مدہوش
کن تاریکی میں ڈوبنے کی کوشش کرتا ہے۔ رات گئے تک خاموش بیٹھا پیتا رہتا۔
اگر شمن کچھ بات بھی کرتی تو ہوں ہاں کر کے ٹال دیتا۔ لمبی لمبی جمائیاں لیکر آنکھیں
بند کر لیتا۔

"میں یوگ کا عمل سیکھ رہا ہوں۔" وہ مذاق کرتا۔

"یوگ کا عمل؟"

"ہاں، نروان حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ ہے"

"دماغ خراب ہوا ہے؟" وہ بگڑ جاتی۔

"یہ دنیا فانی ہے۔" مذاق حد سے گزر جاتا اور وہ روٹھ جاتی تو بچوں جیسی حرکتیں
کر کے بہلاتا، بیوقوف ناموں سے پکارتا جس پر وہ اور برا مانتی اور اٹھ کر باہر چلی جاتی۔
جب تنہا گھوم پھر کر آتی تو اسے کرسی پر اسی طرح سویا پاتی۔

اس کی توجہ اور محبت بھی عجیب تر ہو گئی۔ شدت میں تصنع کی ملاوٹ معلوم
ہوتی۔ وہ جتنا خاموش رہتا اتنا ہی پُرجوش اظہارِ محبت ہوتا۔ معلوم ہوتا تھا
کسی چیز کو دور جھٹک کر وہ جما کھڑا رہنا چاہتا ہے۔ ایک نامعلوم سا خوف اور
اکتاہٹ اسے نڈھال کر دیتی اور وہ جھلاہٹ بھری محبت شمن کو خار بن کر کھٹکنے لگتی۔
ایک دن بڑی زبردستی سے وہ اسے آبادی کی طرف گھسیٹ لے گئی۔ تھوڑی

دیر کو اُس کی نیند دور ہو گئی۔ بالکل پرانے ٹیلر کی طرح کافی دیر کر قہقہے لگاتا رہا مگر جونہی ہنسی ختم ہوئی ایک عجیب قسم کی جھجک اس کی حرکات میں معلوم ہوئی جیسے وہ رسیاں تڑاکر بھاگ جانا چاہتا ہو، روشنی سے آنکھیں چندھائی جاتی ہوں۔ تھوڑی دیر میں وجہ معلوم ہو گئی۔ لوگ چپ چاپ بیٹھے ان انوکھے جوڑے کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔ بیرا اپنا فرض بھول ان کے قریب کسی بہانے سے کھڑا رہ جاتا۔ کاؤنٹر پر ریز گاری لیتے ہوئے گاہک کا حساب کتاب گڑبڑ نظر آتا اور دو چار پرچی سوکھی ماری میمیں تو کھلم کھلا ناراض بیٹھی تھیں۔

"نہ جانے یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں" اس نے زبردستی مسکرا کر کہا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟"

"یہی کہ ... نہ جانے میں کون ہوں .... اور تم ... اوہ ... سوچنے دو ... آؤ" وہ شمن کے چہرے پر رنگ آتا دیکھ کر ٹالنے لگا۔

"واپس چلو!" شمن نے درشتی سے کہا۔

"کیوں؟ ارے واہ!"

"میں کہتی ہوں واپس چلو۔"

"مگر...." وہ کچھ جھینپا ہوا سا اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا۔ راستے بھر خاموشی رہی۔

"ہم ان سے ڈرتے ہیں، کیا ان کا دیا کھاتے ہیں" وہ مارے غصے کے لرزنے لگا، "سالے، کمینے!" وہ بُری بُری گالیاں بکنے لگا۔ آخر لوگ اتنے کوتاہ نظر کیوں ہیں؟ آخر انسان ہے تو ایک ہی بیج کا پھل، کیا چھوٹا کیا بڑا، کیا کالا کیا سفید۔ مگر کون سمجھاتا۔ کاش وہ اس شادی کے پیچھے چھپا ہوا شاندار مقصد موٹے موٹے حروف میں لکھ کر اپنی پشت پر ٹانک لیتے تاکہ یہ کوڑھ مغزیوں متحیر آنکھوں سے تو نہ گھورتے یہ بے رحم آنکھیں جو معلوم ہوتا ہے پیٹھ میں سوراخ کر کے دل میں گھسی جاتی ہیں۔

"ان کا کوئی قصور نہیں، عجائبات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔" شمن کا دل بیٹھنے لگا۔

"مگر ان کا کیا مطلب؟ یہ کیوں مجھ سے جلتے ہیں۔ میں سب جانتا ہوں ان دانتوں کی سفیدی تو۔ دل کی سیاہی تو کوئی دیکھے۔"

"وہ مجھے کیوں بازاری عورت سمجھتے ہیں؟"

"میں... میں گولی مار دوں گا ان حرامزادوں کے... جیسے ان کی سفید پتلیاں تو بس دیدیاں ہیں۔" شمن نے اس کے دل کی بات کہہ دی اس لیے اُس کا غصہ انتہا سے زیادہ بڑھ گیا۔ پھر وہ شمن سے لڑ پڑا گویا وہی ان سب کو بھڑکا آئی تھی۔

"تم جھجکتی کیوں ہو؟" وہ چیخا۔

"میں کہاں جھجکتی ہوں۔"

"اور کیا تم گھبرا کر انھیں اور شیر بنا دیتی ہو۔" اپنا الزام وہ شمن پر تھوپنا چاہتا تھا۔ "مگر میں ان کمینی حرکتوں کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتا۔ اگر یہ لوگ مجھے ذلیل سمجھیں گے تو میں خود ان کے منہ پر تھوک دوں گا۔" اس نے اس زور سے چنگھاڑ کر کہا کہ ہر لفظ اس کی ذہنی کوفت کا آئینہ دار بن گیا۔ گو وہ منہ سے بکتا رہا مگر اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دل میں مانتا ہے کہ ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں۔ شمن کو سہما ہوا دیکھ کر جی دکھ گیا اور وہ اُسے سمجھانے لگا۔

اس ذہنی کوفت کو اُس نے شراب اور زبردستی کی محبت میں ڈبونا شروع کیا، مگر اس طرح وہ اکیلا اور اداس ہو جاتا۔ شمن اس کے رویہ سے عاجز آجاتی۔ اکتا دینے والا عشق مصنوعی اور فضول معلوم ہوتا۔ اپنے ہوش و حواس میں ہوتے ہوئے وہ اس مدہوش شخص کے پاس کیونکر پہنچ سکتی۔

"پونا کب چلو گے؟" اُس نے ایک دم نرمی سے پوچھا۔

"نہیں" اس نے اپنے پوشیدہ خوف کو اور چھپانا چاہا، "تمہیں چھوڑ کر میں کیسے کام کر سکوں گا۔"

"مجھے چھوڑنے کو کون کہتا ہے؟" شمن نے جبر بہ ذلت برداشت کر کے کہا۔

"ہیں؟ ہاں... مگر وہاں ڈیوٹی پر مجھ سے نہ جایا جائے گا۔"

"پھر کیا ارادہ ہے؟ اسی طرح مٹ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے کیا؟"

"اگر تمہاری آغوش میں مٹ بھی جاؤں تو...."

"بکواس مت کرو رونی... تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔"

"دھوکا.. کون کمبخت دھوکا دے رہا ہے؟ ہُنہ!" وہ مجرمانہ انداز میں نظر بچا کر کہنے لگا۔

"تم مجھے ہی نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دے رہے ہو۔ تم.... پچھتا رہے ہو۔"

"غلط... غلط... یہ سراسر بہتان ہے!" اس کی تیزی اور جھلاہٹ نے بات کو اور پختہ اور یقینی بنا دیا۔

"میں تمہاری ہر بات سہہ سکتی ہوں مگر رونی یہ جھوٹ مجھ میں برداشت کرنے کی طاقت نہیں۔ اگر تم صاف کہہ دیتے کہ تم مجھے ساتھ لے جانے میں ذلت محسوس کرتے ہو تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔"

"میں — میں تمہارے بغیر کبھی نہیں جاؤں گا یہ بات طے ہے اور یہ کیسے کہتی ہو کہ مجھے تمہیں ساتھ لے جاتے ذلت محسوس ہوگی۔"

"اس میں تمہارا قصور نہیں۔ اس چیتکبرے جوڑے کو دیکھ کر جب لوگ مسکرا اٹھتے ہیں، آنکھ بچا کر اشارے کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ تم...."

"تو پھر تو تم بھی جھوٹ بولتی ہوگی گو ظاہر تو یہ کرتی ہو کہ نہ تو تم نے کچھ دیکھا اور نہ سمجھا۔"

"یہ... یہ میں اس لیے کرتی ہوں کہ... میں..." وہ کچھ نہ بتا سکی۔

"تم مجھے دھوکا دینا چاہتی ہو۔ تم خوب سمجھتی ہو کہ میرے ہم وطن مجھے تنفر سے بھری ہمدردی کے ساتھ دیکھتے ہیں گویا تم ایک بیماری ہو جو میری حماقت سے میرے سر منڈھ دی گئی اور تمہارے بھائی بند سمجھتے ہیں کہ تمہارے پہلو میں ایک انسان نہیں ان کی ساری قوم کی شخصیت پر ایک موٹی سی گالی ہے۔"

"لوگ مجھے کمینہ سمجھتے ہیں..."

"شمن... مگر تم مجھ سے کیوں لڑ رہی ہو۔ گویا اس میں میرا کوئی قصور ہے ۔ تم جانتی ہو میں تمہارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"ہوں، یہ جو تم پستی کی طرف گرتے جا رہے ہو یہ بھی صرف میری خاطر۔ تم نیچے اُتر کر میرے برابر ہونا چاہتے ہو۔ تم مجھے اتنا ذلیل سمجھتے ہو کہ میرے برابر آنے سکے لیے تمہیں اُٹھنے کی نہیں بلکہ گرنے کی ضرورت ہے۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔"

"نہیں یہ میرا وہم نہیں، میں دیکھ رہی ہوں تم اس دوری اور فرق کو مٹانے کے لیے خود مٹے جا رہے ہو۔"

"تمہاری محبت کی خاطر۔ سوچو تو اگر تمہیں چاہتا نہیں تو پھر..."

"مگر یہ محبت کیسی جو تمہیں میٹ رہی ہے۔ میں سمجھتی ہوں یہ کیا ہے۔ تمہیں محبت ہو یا نہ ہو مگر اتنا یقین ہے کہ مجھے اُٹھا کر اپنے برابر کرنے کی کوشش بے کار ہے۔ تم سفید انسانوں کی دنیا اتنی بلند ہے کہ میرے سیاہ وجود کو اس مقدس درجے تک بیجا کر اپنی اور اپنی قوم کی توہین نہیں کر سکتے لہٰذا خود اپنی حماقت کے حضور میں اپنی ہی قربانی دے رہے ہو۔"

"تمہارے وہم سیدھی بات کو بھی بھوت بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ ذہنیت..."

"ہندوستانی ہے، کہہ دو۔" لہجے میں انتہائی تلخی پیدا کر کے کہا۔

"چہ چہ، اتنا احساسِ کمتری! تم ہندوستانیت کو توہین سمجھتی ہو۔ یقین مانو شمن میں نے جو کچھ کیا انجان ہوتے ہوئے کیا۔"

"لیکن یہی کیا کم تھا کہ کیا۔" آخر قدرت کو اُس کے ہر شعبۂ زندگی سے خواہ مخواہ کا بیر کیوں ہو گیا تھا؟ تلخیاں بڑھتیں پھر دب جاتیں مگر ہر جگہ کا ایک داغ چھوڑ جاتا۔ محبت اور انسانیت ہر وقت میدان میں ڈٹے نہیں رہ سکتے۔ ویسے دونوں کا جی بھی اکتا گیا تھا۔ محبت لیچڑ معلوم ہونے لگی تھی۔ ایک دوسرے کے وجود سے گھبراہٹ

ہونے لگی۔ ہنی مون ہی میں ایک دوسرے کی جدائی کے سپنے ترسانے لگے اور یہ چھوٹے موٹے جھگڑے اُس نفرت کو بڑھانے لگے جو دونوں کے لاشعور میں حلول ہو چکی تھی مگر وقتی طور پر دبی ہوئی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا کہ دونوں اپنی بھول پر حیرت زدہ ہیں۔ پچھتانے میں خودداری کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہے لہٰذا سکونِ قلب کا یہ نسخہ بھی ٹھکرایا ہوا ہے۔ یقیناً ٹیلر پر تو کسی قسم کا کوئی سوداوی مرض قابو کیے ہوئے تھا ورنہ وہ اس قدر آسانی سے یہ ڈرامانہ کھیل جاتا۔ اُوپر سے مرچوں اور شراب نے دھار رکھ دی۔ جھنجھلا کر وہ احساسِ شکست سے بچنا چاہتا۔

بہت ضبط کرتے مگر ذرا سی ٹھیس سے پکا پھوڑا پھوٹ نکلتا اور دونوں کو اپنی خوبیاں اور دوسرے کے عیب نظر آنے لگتے۔ وہی طعنے جو انہیں لوگوں کی آنکھوں میں نظر آتے تھے الفاظ کی مدد سے ایک دوسرے پر تھُپنے لگے۔ شکل و صورت کی وہی خوبیاں جو کبھی دیوانہ بنا گئی تھیں آنکھ میں شہتیر بن کر کھٹکنے لگیں۔ ٹیلر کے بال بے جان اور بد رنگ نظر آتے، آنکھیں غائب معلوم ہوتیں اور جلد کچے گوشت جیسی لگتی۔ اُدھر ٹیلر کو اُس کے سیاہ بال اور آنکھیں ڈراؤنی معلوم ہونے لگیں۔

خدا خدا کر کے ہنی مون کا مصیبت بھرا زمانہ ختم ہوا اور مجبوراً پونا روانہ ہونا پڑا۔ ٹیلر کا خوف تازہ ہو گیا گویا وہ نہایت پُرخطر اور اجنبی محاذ پر جا رہا ہے۔ شمن ایسا محسوس کرتی اور سارا غصہ اور نفرت لاوے کی طرح سینے میں جمع کر لیتی جو غول بیابانی کی طرح دل و دماغ میں ہلچل مچائے رکھتا۔

اسٹیشن پر ایک دوسرے سے رشتہ داری ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، اور کمپارٹمنٹ میں بھی اگر کوئی غور سے دیکھتا تو دونوں کو انسانیت سے زیادہ قریب رشتے میں منسلک تصوّر نہ کرتا۔ وہ ایک دوسرے سے بے توجہی اپنی تنہائی ظاہر کرنے میں کوشاں تھے۔ کوئی دیکھتا ہوتا جب بھی حساس بنے غصے ہونے کو تیار رہتے۔ آوازوں پر کان لگائے رہتے کہ کہیں انہی کے ہی متعلق تو کانا پھوسی نہیں ہو رہی ہے۔

غیروں کی طرح ڈائننگ کار میں کھانا کھایا۔ بل ادا کرتے وقت ٹیلر کے کان سُرخ ہو گئے اور شمن نے بیرے کی ناقدانہ نظروں کا بڑی مشکل سے مقابلہ کیا۔ دو بے جوڑ انسان اپنے جوڑ کے بے تکے پن کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔

کبھی بھولے سے وہ بے تکلفی سے کوئی دلچسپ بات ایک دوسرے سے کہتے تو ذرا ڈر کر اردگرد دیکھنے لگتے کہ لوگوں کی حیرت کا کیا حال ہے۔ اس بہادری اور جوشش سے قائم کیے ہوئے جائز رشتے کو گناہ کی طرح چھپانا پڑ رہا تھا۔ جب ٹیلر کا سر سوتے میں تکیے سے ڈھلک کر مڑ گیا تو شمن کی ہمت نہ پڑی کہ اس بچپن سر کو سیدھا کر دے، گو اُسے خوف تھا کہ کہیں بیچارے کی گردن نہ رہ جائے۔ وہ معمولی سا خیال جو برسوں کے پرانے میاں بیوی میں تھی تھوڑا بہت رہ جاتا ہے، یعنی ایک دوسرے کی تکلیف سے بے چین ہو جاتا، اس کے اظہار کا حق بھی چھن چکا تھا اور وہ ابھی دولہن دولہا تھے۔ سامنے ایک ادھیڑ عمر کا جوڑا بیٹھا کھلے بندوں ننھے بچوں جیسے اخلاص برت رہا تھا۔ اگر ابھی اس کی جگہ سفید قوم کی لڑکی ہوتی نو عمر یا زادا اپنے بیاہ ہوئے میاں کو چٹا چٹ چومنے کا حق رکھتی تھی، بلکہ فخریہ کہتی کہ "لو دیکھو میرے روپہلی حسن کی طاقتیں، کہاں کہاں کے جانور پھانس کر لاتی ہیں" اور وہ سیاہ آدمی بھی اس روپہلی بارش سے کھل کر فخریہ کہتا کہ "دیکھو تم ہم کو کالا سمجھتے ہو مگر یاد نہیں کہ کرشن جی بھی تو کالے تھے اور گوپیاں اُن کی متوالی تھیں!"... مگر وہ حقیر تھی۔

اور اس کا جی چاہا سب کے منہ پر تھوک دے اور اسی وقت سب کے سامنے جھک کر ٹیلر کے دکھتے ہوئے سر کو آرام سے رکھ دے، اُس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے شربتی بالوں کی ریشمی نرمی کو انگلیوں میں خوب ہوتا محسوس کر لے، اس کی پلک کا جو ایک بال ٹوٹ کر ہونٹے پر چپک گیا ہے، جیسے سونے کا باریک سا تار، وہ اسے انگلی سے ہٹا دیتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ کہیں آنکھ کھلے تو اندر نہ جا پڑے۔ ویسے ہی کیا کم کوئلے پڑ چکے ہیں، جو اُس نے غسلخانے میں آنکھیں مسل مسل کر نکالے۔ کتنا اس کا جی چاہا کہ ساڑھی کا پلّو تہہ کر کے منہ کی بھاپ سے گرمی پہنچائے مگر اُسے یہ تجویز ٹیلر کے سامنے پیش کرنے کی ہمت نہ پڑی،

کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ وہ اس ذلّت کو برداشت کرنے سے پہلے مرجانا بہتر سمجھے گا۔

اور یہ وہی ٹیلر تھا جو ضدی بچّے کی طرح روز آن کھڑا ہوتا تھا۔ دھن کے پکّے بھکاری کی طرح اُس نے دروازے پر دھرنا دے کر حاصل کیا تھا اور پھر اپنے کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا تھا۔ یہ وہی انسان تھا جو اُس کے گھٹنے پر سر ٹکا کر تیل ملوانے کے لیے مصر ہوتا تھا۔ پیر ڈل کی جرابوں سے کشتی لڑا کر جب پھانسیں لگا لیتا تو شملے کی خنک شاموں کو بجلی کے سامنے وہ سوئی سے اُنہیں نکالا کرتی اور اس وقت وہ ضرورت سے زیادہ شریر بن جاتا، ہر پھانس کرایہ وصول کر کے نکلواتا اور دوسرے دن جان بوجھ کر نئی پھانسیں لگا لیتا۔ لیکن اگر اس وقت سب کے سامنے وہ اس کا سر چھو بھی دیتی تو وہ مارے ذلّت کے مر ہی جاتا۔ اور وہ خود؟ اُسے اپنے آپ پر کچھ کم رحم نہ آتا۔

وہ پہلے سوچا کرتی تھی کہ بھلا کیا جانیں یہ انگریز کہ عشق و محبت کیا چیز ہے۔ بوالہوس کے بندے نہ شرم نہ حیا بھلا رومان کیا سلامت رہتا ہوگا ان میں؟ کتنی سخت، کھردری اور مطلبی محبت ہوگی لیکن رونی بالکل مختلف تھا۔ وہ ہر ہندوستانی اور غیر ہندوستانی مذاق کو سمجھ جاتا اور اس میں وہ ساری حماقتیں موجود تھیں جنہیں وہ بچپن سے عشق و محبت سے وابستہ سمجھتی تھی۔ وہ بدمذاق نہ تھا۔ گھنٹوں ایک دوسرے کے بچپن کے قصّے سن کر ہنستے دنیا کے دو مختلف ٹکڑوں پر بسنے والے ایک ہی جیسا بچپن اور جوانی گزار چکے تھے۔ وہی چھوٹی چھوٹی شرارتیں اور سزائیں، معصوم دلچسپیاں اور ایک ہی جیسے کھیل۔

اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ پھر دور دور ہو جاتے اور ایک دوسرے کے سائے سے بھاگتے۔ تھوڑی دیر میں کمپارٹمنٹ خالی ہو گیا تو بجائے قریب آنے کے وہ ایک دوسرے کو بزدل اور بے اصولا ثابت کرنے لگ گئے اور وہ نرم گرم جذبات جو تھوڑی دیر قبل شمن کے دل میں جنم لے رہے تھے کمھلا کر ختم ہو گئے۔

پونا پہنچ کر زندگی سلجھنے کے بجائے اور الجھ کر بوجھل ہو گئی۔ سب سے پہلے تو نوکروں کی حیرت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ پاس پڑوس کی متعجب آنکھوں کے تیر سہنے کے لیے گینڈے کی زرہ بکتر پہننا پڑی۔ جو آتا ٹوہ لینے آتا۔ اور کچھ نہیں تو بیکار کے سودا بیچنے

والے ہی جان بوجھ کر ناک لگاتے سونگھتے چلے آتے۔ ٹیلر کے دور دراز کے ملنے والے اُنکے دوست اور دوستوں کے دوست آنکھیں پھاڑے مبارکباد دینے دوڑے آتے۔ ان کی آمد اور تلخیاں بڑھاتی۔ وہ لوگ بڑے مہذب طریقوں سے اس عجیب و غریب سانحے کا ذکر اوّل سے آخر تک سننا چاہتے۔ ان کے چہرے تجسّس سے پریشان ہو جاتے اور عقلیں پراگندہ! یہ ہُوا تو کیسے ہُوا؟

جتنے منہ اتنی باتیں؛ پرانے گھاگ انگریزوں کا خیال تھا کہ وہ کوئی آوارہ عورت تھی۔ نو وارد اسے کسی ریاست کی مہارانی سمجھتے۔ چند ایسے بھی تھے جو کچھ فیصلہ نہ کر سکتے مگر دونوں کو خالی الذہن ضرور سمجھتے۔ انتہا ہو گئی کہ ٹیلر کے افسر نے اس قصّہ کو بلا کر اس واقعہ کو سیاسی نقطۂ نگاہ سے معیوب حماقت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس نے آقاؤں کی قدیم روایتوں کو ٹھیس لگانے کی ترکیب کی تھی۔ جوابدہی کرتے کرتے ٹیلر تھک ہی نہیں گیا بلکہ خود اپنے اُوپر جو اعتماد تھا کھو بیٹھا۔ یہ بات یہیں تک نہ رہی بلکہ ڈاک کے پروں پر اُڑتی ہوئی امریکہ میں ٹیلر کی بیوہ ماں تک پہنچ گئی۔ وہ کم عقل اور کم ظرف تھی مگر پھر بھی مفصّل خط مانگا تھا۔ ٹیلر اس پر بھی چراغ پا ہو گیا۔

"مگر اس میں ایسی کیا بُرا ماننے کی بات ہے،" اُس نے بڑھیا کی حمایت کی۔

"کچھ نہیں۔ تم اس کی حمایت صرف میری ضد میں کر رہی ہو۔ میں اُسے منہ بھی نہ دکھاؤں گا اگر وہ مجھے اب تک بچّہ سمجھے ہوئے ہے تو یہ اُس کی بھول ہے" ٹیلر کا غصّہ ناک پر دھرا رہنے لگا تھا۔ وہ اب بالکل جاگ اُٹھا تھا اور شراب بھی نشہ نہ لا سکتی تھی۔ وہ عموماً ہر جلسے اور پارٹی سے جان چراتا۔ یا تو اُسے کوئی مرض آن دباتا یا مجبوراً شمن کو ایک آدھ بہانہ تلاش کرنا پڑتا۔ دنیا کو چھوڑ کر وہ ایک دوسرے سے اور بھی اُکتاتے گئے۔ زیادہ وقت ایک دوسرے کو طعنے دینے اور اپنے حال پر رحم کھانے میں صرف ہوتا۔ دونوں اس مصیبت کا الزام اپنے اُوپر سے اُٹھا کر دوسرے کے سر منڈھنا چاہتے تھے۔ بہت جلد زندگی خوفناک حد تک بار بن کر رہ گئی۔ اگر وہ ہمّت کر کے کسی کے یہاں چلے بھی جاتے تو گھما پھرا کر اُن کے بے تکے عشق کا ذکر نکل آتا۔

" ایک بار ہمارے ایک رشتے کے چچا نے ایک ریڈ انڈین سے شادی کر لی تھی۔ بڑی ماڈرن تھی اور نیک بھی۔ ہمیں اپنی زبان کے گیت اور خوفناک جنگلوں کے قصے سنایا کرتی تھی۔" وہ بڑے جوش سے کہتے۔

"ہندوستان سے دوستی بڑھانے کا یہی طریقہ ہے کہ کالے اور گورے کا امتیاز مٹا دیا جائے۔" وہ بڑے فراخدل بن کر کہتے۔ مگر ان کی یہ سخاوت دونوں کو اور بھی دکھ پہنچاتی۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ اس کے اصلی معنی یہ ہوئے کہ مشرق اور مغرب کو ملانے کی کوشش اتنی ہی مشکل اور بیہودہ ہے جتنی سیاہ کو سفید بنانے کی آرزو۔

ہر ملاقات کے بعد نئی ملاقات کا خیال بھیانک بن کر جان خشک کرنے لگا۔ کئی دن تک دلوں پر مردنی چھائی رہی جو آپس کی تلخیوں کی شکل میں پھوٹ نکلتی۔ الگ الگ دوستوں کا حلقہ بنایا تاکہ ایک دوسرے کی موجودگی جو سوال دلوں میں پیدا کرتی ہے اس کی گنجائش ہی نہ رہے۔ مگر لوگوں سے نجات کہاں تھی۔ لاکھ یقین دلانے کہ سب حماقت محبت کے زبردست ہاتھوں سے مجبور ہو کر کی گئی، اب بھی بہت خوش ہیں اور قطعی نہیں پچھتاتے، ہر مخالفت کو تیار ہیں، مگر اس طرح مستعدی سے تیار ہونا ہی صاف ظاہر کرتا تھا کہ انھوں نے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کشمکش میں خود کو ڈال دیا ہے۔

اور ادھر جاپانی پٹاخوں نے بری طرح فضا کو مکدر کر رکھا تھا۔ بم تو خیر جہاں گر رہے تھے مگر جو انسان اُن سے بچنے کے لیے بھاگ رہے تھے اُن کی حالت قابلِ رحم تھی۔ جیسے کھٹمل سن کر جو اس بھیڑ بن جاروں طرف بھاگنا شروع کر دیتی ہیں اور بجائے محفوظ ہونے کے خود خطرہ بن جاتی ہیں۔ یہ گھبرائے ہوئے کم عقل جانور ایک شہر سے بھاگ کر دوسرے شہر میں پناہ لینے دوڑ پڑے۔ اونے پونے سامان بیچ کر ریلوں پر حملہ کر دیا۔ بمبئی کے لوگ کلکتہ اور کلکتہ کے بمبئی۔ اس کوٹھی کے وہاں۔ اس کوٹھی میں بدل کر یہ سمجھ لیا کہ اب گھن نہیں لگ سکتا۔ حادثوں سے جتنی جانیں گئیں اتنی شاید سال بھر کی لگاتار بمباری سے بھی نہ جاتیں۔ غضب اندھیرا سڑکوں ہی پر نہیں عقلوں پر بھی چھا گیا۔ مگر یہ کیا ہوا؟ یہ ڈھال پر سے اترتے اُترتے روڑے پر سے پیر پھسل گیا؟ برف کے

بے جان سفید موت نے چاروں طرف سے ہاتھ پھیلا کر ہٹلر کی بڑھتی ہوئی جرأت کو آغوش میں بھینچ لیا، ہڈیاں تک جما کر رکھ دیں۔ موجیں اُمڈ اُمڈ کر چڑھتی ہیں اور سفید چٹانوں سے سر پھوڑ کر لوٹ آتی ہیں۔ اُوپر سے برف کے بھٹوں کی دیدہ دلیریاں الاماں۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک دم لوٹ پڑے، جیسے چالاک کبڈی باز اپنے پالے میں دُور تک دوڑا لائے۔ پھر جو ڈٹ پایا ہے تو جیمن ملا کہ ہی چھوڑا۔ تمام دنیا کی ٹوٹتی ہوئی ہمتیں بندھ گئیں۔ ہارتے اور پیچھے بھاگتے ہوئے بھی سنبھل کر ڈٹ گئے۔ سرخ ستارہ خون میں لت پت مگر سانس لیے ہوئے نکل آیا۔ وہ دو مہینوں میں ختم ہونے والا مریض سنبھالا لیکر چاق و چوبند ہو گیا۔

”ہم جانتے تھے آخر میں فتح ہماری ہی ہوگی۔“ بلّو نے خمار رکھ کر غرور سے کہا۔

”تمہاری؟ یعنی یہ فتح تمہاری رہی، اور وہ شکستیں جن کا مزہ شاید اب تک وہاں پر ہوگا، وہ کس کے حصّے میں لگا دیں؟“ شمن نے چڑھ کر کہا۔

”ایں؟ ہار اور جیت تو ہُوا ہی کرتی ہے۔۔۔۔“

”اچھا تو کبھی ہار بھی ہوئی ہے؟ منہ سے تو یہی کہتے رہے کہ جیت رہے ہیں۔ وہ بہادری سے پیچھے ہٹنا کچھ تم ہی لوگوں کی صنعت ہے۔ تم میں تو کیا دم تھا کہ ہٹلر جیسے جن سے لڑتے۔ یہ ہندوستانی بھیڑیں اُس دیوتا کے کلیجے کی آگ کیا بجھا سکتیں۔“

”تم پالیٹکس نہیں سمجھتیں۔۔ اتحادی۔۔۔“

”جب تک ہارنے کا خوف ہے اتحادی بنے ہوئے ہو۔ اُدھر سارا اتحاد چولہے میں ڈال کر حصّے لینے دوڑ پڑو گے اور پھر نہ دیکھو گے بھائی نہ بھتیجا بس سرکارِ عالیہ رہ جائیں گے اور اُن کے چیلے چانٹے۔“

”اجی ایسا نہ ہوگا۔“

”اجی خصلتیں بھی کہیں بدلی ہیں۔ جرمنی ختم ہوئے پھر روس کی باری رکھی ہے۔ آج روس کے گن گائے جا رہے ہیں کل تک اُسے انسانیت کا دشمن کہتے تھے۔ آج چائنا کی محبت میں فدا گلے میں پیار سے ہاتھ ڈالے کھڑے ہیں کل تک یہی چینی چور ظالم، وحشی

اور بدمعاش تھے۔ سوائے ڈاکوؤں کے مکار چیلے کے کبھی کوئی دوسرا عہدہ نہ ملا، آج ہی چینی اتحادیوں کی فہرست میں گنے جا رہے ہیں۔ جاپان کے مظالم کا غل مچا رکھا ہے اور اپنے فعل انسانیت کی حفاظت بنا کر پیش کیے جاتے ہیں، مگر یاد رکھو ظلم کی ایک انتہا ہوتی ہے جہاں پہنچ کر ظالم خود اپنے ہاتھ سے اپنا گلا گھونٹ لیتا ہے۔"

"ٹھیک ہے ظلم تو ہوتے ہیں لیکن میرے خیال میں ان ہی میں فائدہ ہے۔ غور سے دیکھو تو باوجود مظالم کے ہندوستان بہت ترقی یافتہ ہو گیا ہے اور ہوتا جا رہا ہے۔"

"یہ جو چند کروڑ انسان انگریزی بولنے لگے ہیں اسی کو تم ترقی کہتے ہو گے۔ کاش اسی طرح تمہیں ہٹلر جرمنی سکھا کر مہذب انسان بنا سکتا۔"

"اسے ذاتی لڑائی کیوں بنا رہی ہو؟" ٹیلر چڑ گیا۔

"کیونکہ یہ ہماری ذات سے وابستہ ہے۔"

"سکون چاہتے ہیں تو ہمیں بہت کچھ برداشت کرنا ہوگا۔"

"میں سب کچھ برداشت کر لوں گی مگر اپنے ملک کو ان سفید چمڑی والوں کی ایڑی تلے مسلتا دیکھ کر ضرور میرے دل سے خون ٹپکے گا، میرا دل روئے گا، آنکھیں روئیں گی اور روح ہمیشہ روتی رہے گی۔ یہ نہ سمجھو یہ بھوبل ٹھنڈی پڑ گئی ہے تو چنگاریاں بھی بجھ گئیں۔ کبھی تو زمانے کی ہوا رخ بدل کر چلے گی پھر انتقام..."

"مگر تم بے تو رہی ہو۔ اپنی ساری قوم کا دبا ہوا جذبۂ انتقام تم میرے ہی سر پر ختم کر دو گی۔" گھریلو جھگڑا تلخ تر ہوتا گیا۔

"اور تم؟ میری قوم کو دماغی، مالی اور جسمانی طور پر ملنے کے بعد اب اس کی روح پر حملہ کر رہے ہو۔ خیر اب تک تو اقتصادی اور سیاسی دنیا کے مالک تھے اب مجھ جیسی بدنصیب عورتوں نے اپنی آخری دولت بھی تمہاری جوتیوں میں ڈال دی۔"

"مگر میں کونسا خوش ہوں؟ مجھے بھی تو خوب انعام ملا۔ میری قوم میرے منہ پر تھوکتی ہے، تمہارے وجود کی سزا مجھے ان کی پھٹکار کی صورت میں بھگتنی پڑ رہی ہے۔ سڑے ہوئے انگلی کے پورے کی طرح انہوں نے مجھے کاٹ کر جسم سے دور پھینک دیا ہے۔"

"اور... اور مجھے؟ زندگی بھی اتنی کمینی نہیں سمجھی جاتی جتنی میں اپنی قوم کی نظروں میں گر گئی ہوں۔ میں نے اُن کے پُرغرور سر کو تمہاری ٹھوکروں میں ڈال دیا۔ وہ میری پرچھائیں بھی اپنی شریف عورتوں کے اوپر پڑنا گوارا نہ کریں گے۔"

"مگر اس میں میرا کیا قصور ہے۔ تم بچہ تو نہیں تھیں۔ تمہارے کمبخت ملک کی غلیظ آب و ہوا اور خود تمہاری سیاہ کشش نے میرے دماغ کو مفلوج کر دیا۔ میں نے بہت برداشت کیا لیکن اب وہ وقت آگیا ہے کہ مجھ سے ضبط نہیں ہوتا۔ لیکن کوئی علاج بھی تو نظر نہیں آتا۔ میں اس راہ پر گم ہو گیا ہوں جو مجھے لوٹنے بھی نہیں دیتی۔"

"یہ الفاظ تمہارے منہ سے نکل رہے ہیں؟ تم۔ جو میری جوتی پر ناک رگڑا کرتے تھے۔ میں نے تمہاری چاپلوسیوں کو سچ سمجھ لیا، تم پر بھروسہ کیا، ایک بار تمہارے برف کے تودے جیسے وجود میں انسانیت کو پانے کی کوشش کی اور اسی حماقت کی سزا بھگت رہی ہوں۔ مگر معلوم ہو گیا کہ تم لوگ انسان ہو ہی نہیں سکتے۔ لاکھ خول چڑھا لو حقیقت تم بھیڑیوں کا راز فاش کر کے رہے گی۔ خونخوار درندے، اچھوتے اور فریبی کہیں کے۔"

"خاموش، بدتمیز!"

"ہنہ بدتمیز! چور کو چور اور حیوان کو حیوان کہنا بدتمیزی نہیں۔ راست گوئی ہے تم جیسے لٹیرے..."

"میں کہتا ہوں خیریت اسی میں ہے کہ چپ رہو۔" رونی کی زبان ہار گئی اور غصّے سے آنکھیں دہک اٹھیں۔ اس کی شکل گھناؤنی ہو گئی۔

"اوہو، تم سمجھتے ہو کہ تمہارے بھونکنے سے میں ڈر جاؤں گی۔ چاہے کچھ ہو میں تمہارے فریب کا جال ضرور کس لوں گی۔ اس طرح دھوکا دے کر..." شعلے کی طرح بھڑکا ہوا چہرہ اور بھی سیاہ پڑ گیا۔ پوری طاقت سے چوڑا چکلا ہاتھ کنپٹی اور رخسار کو لپیٹتا ہوا شمن کو زمین پر گرا گیا۔

ٹیلر کا تیتا لرزتا باہر چلا گیا۔ شمن نے ایک آہ بھی نہ بھری۔ وہ بڑی احتیاط سے سنبھل کر کرسی کا سہارا لیکر بیٹھ گئی۔

وہ کیا کرے؟ اب کیا کرے؟

"نہ چھیڑو، اتنا مت سوچو۔ ذرا چھیڑو، تم نے۔۔ گناہ کیا ہے تو خمیازہ بھگتنے سے اتنی مت ڈرو۔ بھو ہر کا پیڑ لے سپنچ کر انگور توڑنے کی امید نہ کرو، چھیڑو۔" سر پکڑے وہ کئی گھنٹے روتی رہی۔ ٹیلر رات گئے نشے میں دھت تھا۔ اس کے بڑھکھڑاتے ہوئے قدموں کی چاپ سن کر ہی وہ کانپ اٹھی اور جلدی سے کنڈی لگا کر پلنگ پر گر گئی۔ ٹیلر تو پلنگ پر گرتے ہی سو گیا مگر وہ آنکھیں پھاڑے صبح تک کھڑکی سے کالی بھیانک رات کو گھورتی رہی۔ سوچتے سوچتے کنپٹیاں سُن ہو گئیں، دماغ دکھ گیا۔ پر وہ کیا سوچ رہی تھی؟ سوائے شدید غم کے کوئی دوسرا احساس زندہ بھی تو نہیں رہا تھا۔ جسم تھک کر پکا پھوڑا ہو گیا۔ کاش کسی غیبی جراح کا مشاق ہاتھ اس ٹیکن کو ٹھنڈا کر سکتا۔

صبح اُس نے چائے کی پیالی بستر پر پڑے پڑے حلق سے نیچے اُتار لی۔ ٹیلر کے جانے کے بعد وہ اُٹھی۔ آج وہ بہت خوش وضع کپڑے پہن کر گیا تھا۔ جانے سے پہلے اُس نے سیٹی بھی بجائی تھی جس کی ہر تان سے مسرت ٹپک رہی تھی۔ دوپہر کو اُس نے فون سے لنچ کو منع کر دیا اور سیدھا ریس کورس چلا گیا۔ وہاں سے خوب ہار کر اور پی کر رات گئے لوٹا۔ بیرے کو مارتے مارتے چھوڑا۔ یہ ایک نئی ادا تھی۔ اُس کا رویہ نوکروں سے عام سفید لوگوں سے بہت مختلف رہا تھا۔ وہ اُن سے بہت نرمی سے بولتا اور عموماً مذاق کیا کرتا تھا۔ آج وہ ٹیڑھی میڑھی عین مین انگریزی اُردو میں احکامات صادر کر رہا تھا۔

دو دن اسی طرح آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ اگر بھورے سے سامنا ہو جاتا تو نفرت سے منہ موڑ کر دور ہٹ جاتے۔ ٹیلر بظاہر بڑا بہادر بن رہا تھا مگر شمن کو یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ وہ بھول بھول کر سر تھام کر پریشانی میں ڈوب جاتا، بار بار چیزیں پٹخ دیتا۔ اور نوکروں پہ جھلاتا۔ وہ دکھی تھی تو ٹیلر بھی کچھ تو بھگت رہا تھا!

شمن کھوئی ہوئی سی بیٹھی تھی، جیسے وہ کسی مضبوط پل پر دوڑتے دوڑتے ایک دم ٹھٹک گئی۔ آگے تختے اکھڑے ہوئے تھے اور نیچے لاانتہا گہرائیاں اور بے رحم چٹانیں۔ شب بیداری سے اُس کی آنکھوں کے گرد بھورے حلقے پڑ گئے تھے، کپڑے میلے ہو گئے تھے مگر وہ بے خبر نہ جانے کیا سوچنے کی کوشش کیے جا رہی تھی۔ جو کچھ اُس نے کیا تھا اُس کی سزا وہ تنہا بھگتنا

چاہتی تھی۔ ویسے اُس نے اپنی کسی سہیلی کو اس بابے وقوفی کی خبر بھی نہ دی تھی۔ ہمدردی وصول کرتے کرتے اکتا گئی تھی اور خطوں میں بھی اس کی موجودگی نہیں چاہتی تھی۔ اُس کے گھر والوں کو بیشک خبر مل گئی تھی مگر وہ بھی سناٹے میں خاموش ہو گئے تھے۔

"جب تم ہی اتنی مضبوط ہو تو ہم کون ؟" اُن کے رویے سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔ ایک طرح وہ لوگ اس کی طرف سے عرصہ ہوا قطعاً ناامید ہو چکے تھے اور کوئی بھی خبر انہیں متحیر نہ کر سکتی تھی۔ اگر انہیں اس انجام کی خبر ملتی تو بھی شاید کچھ زیادہ متاثر نہ ہو سکتے۔ گویا وہ پہلے ہی سے اس انجام کی پرچھائیاں دیکھ چکے ہوں۔

روپے کی اُس نے کبھی پروا نہ کی اور آج اُسے معلوم ہوا کہ اگر پاس روپیہ ہی ہوتا تو زندگی اتنی گھٹی ہوئی نہ نظر آتی۔ گو اُسے نوکری آسانی سے مل سکتی تھی: کوئی معمولی سی پڑھانے کی نوکری۔ دنیا سے دور بوسیدہ کتابیں، بدشوق لڑکیاں اور لامتناہی اکیلاپن۔ وہ اس آخری ہیولے سے بہت ہی خائف ہو چکی تھی مگر اس دم گھٹنے والی حالت میں گرتے ہوئے لرزہ چڑھتا تھا۔ لیکن اب کیا ہوگا ؟ سوچتے سوچتے سر کی رگیں سوج گئیں مگر کوئی دھندلی سی شعاع بھی روشنی کی نہ ملی۔

"شم... شم..." رونی کی آواز گھبراہٹ اور خوشی سے لرز رہی تھی۔

"کہاں ہو شم ڈیر..." وہ گیلری میں بے تحاشا دوڑ رہا تھا۔ "شم !" اُس نے دروازے ہی سے اُسے چیخ کر پکارا۔ "یہ... یہ دیکھو... ممی... پیاری ممی کا خط۔" جلدی سے وہ آکر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ شمن نے چڑ کر پیر سمیٹ لیے۔

"یہ دیکھو... ذرا دیکھو کیا لکھا ہے: 'میں اپنی پیاری بیٹی کے لیے اپنے بیاہ کا بروچ اور لاکٹ بھیج رہی ہوں۔ اصلی ہیروں کا ہے۔ میرے باپ کو ہیروں سے عشق تھا۔ اچھا سنو: 'میں خود اپنے ہاتھوں سے اگر پہناتی تو...' اوہ ممی....." وہ شمن کی گود میں سر رکھ کر قہقہوں میں ملے ہوئے آنسو بہانے لگا۔

"ممی میرا ہے میرا... شم"

اور پھر نہ جانے کیسے ملاپ ہو گیا۔ ٹوٹے ہوئے پل کے تختے جڑ گئے اور ایک بار پھر

زندگی کی گاڑی دندنانے لگی۔ ٹیلر نے اپنے آپ کو خوب گالیاں دیں اور کوسا، سارا الزام اپنے سر لے لیا، بالکل ننھا سا روفی بن گیا اور سوائے ممی اور تھینک یو کے اس کے منہ سے دوسری بات، نہ نکلتی تھی۔ رات کو دونوں نے لارل اور ہارڈی کا ایک ہنسا ہنسا کر بھرا ہوا فلم دیکھ کر بچوں کی طرح تالیاں بجائیں۔ باوجود سختی سے منع کر لینے کے وہ بے دھڑک اُسے سب کے سامنے چومے جا رہا تھا۔ لوگوں کی تحیر سے پھٹی ہوئی نگاہوں کا جواب وہ گستاخ قہقہوں سے دے رہا تھا۔ آج دُنیا میں بس تین انسان تھے، دو یہ بگڑے دل اور ایک محبت کرنے والی ماں جو ہزاروں کوس دور امریکہ میں بیٹھی انہیں اپنی آغوش میں لیے جھوم رہی تھی۔ شاید اُسے معلوم بھی نہ ہو گا کہ اُس نے غریب الوطن بیٹے اور غیر قوم کی بیٹی کو اپنے کتنے قریب کھینچ لیا تھا۔ دونوں کے دل سفید بالوں والی معصوم صورت بڑھیا کے خیال سے ناچ رہے تھے۔ وہ اب دنیا میں اکیلے نہیں تھے ایک تیسری جان اُن کی زندگی میں آگئی تھی۔ آج ان کا بھی ایک رازدار پیدا ہو گیا تھا جس نے نصیحت کو بھول کر رنگ اور قومیت پر لکچر دیے بغیر انھیں پیار بھری مبارک باد دی تھی۔ اُس کی بہو ایک عورت تھی جسے اُس کے چہیتے بیٹے نے چنا تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے کچھ بھی تو نہ سوچا۔ اور ضرورت بھی کب تھی کچھ سوچ بچار کرنے کی! آج تک اس بیٹے نے کون سی غلطی کی۔ ہمیشہ اُس کی رائے پر عمل کیا اور کامیاب جوان بن کر انسانیت کے لیے ہتیلی پر جان رکھ کر وطن سے دور پڑا ہوا تھا۔ وہ عورت جس نے اس انجان غریب الوطن سے پیار کیا ہو گا، ضرور قابلِ محبت ہو گی، خواہ کتنی ہی کالی ہو مجھ کی ضرور گوری ہو گی۔ بس وہ اسی لیے اپنے خاندانی زیور اس کے سپرد کر رہی تھی!

"نہ جانے روفی نے اُسے کیا لکھا ہو گا۔ آخر ماں ہے بیٹے کی ضد سے مجبور ہو گئی۔ اور یہ سوچ کر اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ بدگمانی نے سر اُٹھایا، تو یہ ماں بھی بیٹے کی طرح مکار تھی! اُف یہ سفید چمڑی!

مگر جب روفی خراٹے لینے لگا تو سرہانے کا دھیما لیمپ جلا کر اُس نے خط دوبارہ پڑھا۔ ایکبار، دوبار۔ اور آنسو نہ روک سکی۔ دور بچھڑی ہوئی ماں کا آنسوؤں میں بھیگا ہوا خط: دنیا کے کسی جھگڑے کا اس میں ذکر نہ تھا۔ نہ اس خون آشام جنگ کا نہ قومی خدمت

کا۔ نہ آفتوں سے ڈرایا تھا نہ کہیں ہمت دلائی تھی۔ جیسے دنیا میں اور تیسری چیز کا وجود نہیں، ایک ماں ہے اور اُس کا اکلوتا بیٹا۔ ہاں ایک چیز اور، وہ ان کی کبھی نہ مٹنے والی محبت، ایک دوسرے پر بےپناہ اعتماد۔ اس کی نئی بہو جب ہر سطر میں لاکھوں پیار اور دعائیں بھیجی تھیں۔ بغیر دیکھے بھالے وہ محبت کا بیش قیمت خزانہ اس پر لٹا بیٹھی تھی۔ کتنا فراخ تھا اس ماں کا دل جیسے شمن اپنے پردیسی دولہا سے ملی بھی نہ تھی مگر جو بڑھیا جسے بیٹی تھی بالکل اپنی معلوم ہو رہی تھی، بلکہ اپنوں سے بھی زیادہ۔

وہ پارسل بھی دوسرے دن آگیا۔ اگر شمن نہ روکتی تو وہ پولیس کے دفتر میں ہی چیر پھاڑ کر کے دل ڈالتا۔ اُس میں ماں کی ایک تصویر بھی تھی۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ایک کرسی پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ نظریں اُوپر کیے اپنے دونوں بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے کی ایک ایک شکن میں ماتا کا خزانہ پوشیدہ تھا۔ وہ چھلکتی ہوئی آنکھیں ہجر کی داستان بھی بولتی تھیں۔ وہ کسی اونچے خاندان کی عورت نہ تھی۔ بیوگی کے بعد اس نے اپنی ساری توجہ اپنے بچے کی پرورش کی طرف مبذول کر دی تھی۔ اس کے گٹھے جسم اور ابھری ہوئی چہرے کی ہڈیوں سے سخت محنتی ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ اُس کی عمر کلرکی اور ٹائپ کرتے بیتی تھی اور اب آخری عمر میں علاوہ اور چھوٹی موٹی جنگ کی بخشی ہوئی فکروں کے بیٹے کی جدائی بھی جان کو آزار بن کر لگ گئی تھی۔ آخر کیوں بھیج دیا اس نے اپنے اکلوتے کو جنگ کی بھٹی میں جھونک جانے کے لیے؟ کیا بڑھیا کو اس بیٹے سے بھی کوئی چیز زیادہ پیاری تھی جس کی خاطر وہ ساری عمر کی کمائی کا داؤں لگا بیٹھی تھی؟

ایک بڑا سا آنسو خط پر ٹپکا اور کاغذ کانپ اٹھا۔ دور دراز پڑی ہوئی دو اجنبی عورتیں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئیں۔ روتی سوتی میں نیند سے تھکی ہوئی کروٹیں سے دبا تھا اس کے ہونٹ لرزاں تھے اور آنکھوں کے کونے بھیگے ہوئے تھے۔

تو ان برف کے تودوں میں بھی محبت چھپی ہوئی ہے! ان کے سینوں میں بھی دل ہیں اور وہ ان کے سینے میں ہیں۔ ہم تو ابھی تک یہی سوچتی تھیں کہ یہ ایثار اور قربانی صرف مشرقی عورت کا ورثہ ہے۔ یہ مغربی موم کی پتلیاں کیا جانیں محبت کیا چیز ہوتی ہے، خصوصاً اولاد کی محبت۔

سنا ہے بڑی بدمعاش ہوتی ہیں۔ بوڑھی ہو جاتی ہیں پر ہوس نہیں جاتی۔ جانور ہوتی ہیں؛ کسی ملک کسی قوم کا ہو گلے میں لعنت کا طوق بن کر چمٹ گئیں۔ اوّل تو بچے پیدا ہی نہیں ہونے دیتیں، اور اگر بدقسمت رہ جیں آن ہی ٹپکیں تو کتوں سے بدتر گت بناتی ہیں۔

مگر شمن نے یہ سب کچھ کہاں سے دیکھ لیا! نہ ہی وہ کبھی ان کے ملک میں گئی اور نہ ہی ہندوستان میں آئے ہوئے باشندے ملک اور قوم کے صحیح نمائندے کہلائے جانے کے حقدار ہیں۔ تو پھر کس نے بتائیں یہ ساری باتیں، یہی باتیں فولادی دیواریں بنی انسانوں کے بیچ میں اڑی ہوئی ہیں۔ کیا کوئی آنچ انھیں پگھلا سکتی ہے! کیا یہ لاکھوں کروڑوں سفید اور کالے انسانوں کا خون انہیں گھلا سکتا ہے!

ساس! ساس کے نام پر اسے ہنسی آگئی بچپن سے اس نے مرکھنی ساسوں کے قصے سن رکھے تھے۔ ہر سڑی گلی چیز کو اس کی ساس کا سر یا کلیجہ بتایا جاتا تھا۔ مگر اسے خواب میں بھی کبھی شبہ نہ ہوا تھا کہ اسے ایسی بھولی گڑیا جیسی ساس ملے گی۔ کاش اس کا سسر بھی زندہ ہوتا ڈکنس کے ناولوں جیسا: گردن ہلتی، منہ میں پائپ دبائے، باغبانی میں دھت بڈھا!

کون کہتا ہے وہ کھو گئی! سامنے لمبی سیدھی اور روشن سڑک کہکشاں کی طرح جگمگا رہی ہے۔ ایک دو، نہیں تین کھلونوں جیسے ننھے منے انسان آگے قدم بڑھاتے چلے جا رہے ہیں: رونی وہ خود اور ماں!

صبح خط دوبارہ پڑھا گیا۔ ساتھ ساتھ ہزاروں لمبے چوڑے قصے یاد آگئے۔ ٹیلر نے چھٹی منانے کی رائے دی مگر شمن کے اصرار پر بادل ناخواستہ جبراً دفتر گیا۔ جاتے وقت ٹیلر نے تاکید کر دی کہ قلم اور بہت سا کاغذ خط لکھنے کے لیے تیار رہے، آتے ہی لکھائی شروع ہو جائے گی۔ دوپہر کے کھانے پر شامی کبابوں اور دہی کی خاص فرمائش کی۔ یہ مرد روٹھ جاتے ہیں تو کھانے سے پہلے روٹھتے ہیں۔

شام کو خط لکھا گیا۔ دو لفظ لکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پیاری ماں... نہیں۔ کاغذ پھینک دیا۔ بہت پیاری ماں، سب سے پیاری! اب؟ آگے کیا لکھے؟ جیسے آگے کچھ کہنا ہی نہ ہو، ان تین لفظوں میں دنیا سما گئی۔ کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد خط لکھا

گی۔ ٹیلر نے کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا۔ نصف سے زیادہ خط شمن کے بارے میں تھا۔ جیسے بادل چھٹ گئے۔ اب باہر جانے آنے میں کوئی خطرہ نہیں۔ ماں چھتری پھیلا کر کھڑی ہو گئی، بوند نہیں پڑ سکتی۔ زندگی مزے سے ہچکولے کھاتی گذرنے لگی، جیسے ربڑ ٹائر گاڑی کنکریلی سڑک پر ٹھمکتی چلی جا رہی ہو۔ شکر رنجیاں آتیں اور گذر جاتیں۔ ہر جھٹکے پر دور ہو جاتے مگر پھر سر ٹکرا جاتے، دل مل جاتے۔ قہقہوں میں آنسو سوکھ جائیں تو کبھی آنسوؤں میں ہنسی ڈوب جائے۔ دنیا بھی عجائبات کی عادی ہو جاتی ہے خصوصاً جبکہ ڈھٹائی پر اتر آئیں۔ اب سڑک پر گردن موڑ کر بھی کوئی نہیں دیکھتا اور اگر دیکھتا ہے تو انہیں نہیں دکھائی دیتا۔ جلسوں پارٹیوں میں بھی جاتے اور کوئی متحیر نہ ہوتا۔ لوگوں کو ایک بار مشرق اور مغرب کے مل جانے کا گمان ہونے لگا۔ ان کی شادی ضرب المثل بن گئی حوالے دیے جانے لگے۔

گھر سے بار بار تقاضا ہو رہا تھا کہ آجاؤ چاہے دو چار ہی دن کو آؤ، اور اس کا بھی جی چاہ رہا تھا۔ اتنی دوری پر بھی خون کی کشش مجبور کیے دیتی تھی۔ ارادہ بھی کیا مگر پھر ایسی دہشت ہوئی کہ نیند اڑ گئی۔ یہاں کے لوگ تو عادی ہو چکے تھے پر یہ اپنے پہاڑ کیسے کھودے جائیں گے اور پھر ان چٹانوں کو ہموار کرنے کے لیے جس ماتھا پھوڑی کی ضرورت تھی وہ کس سے جھیلی جائے گی! بڑی بوڑھیوں کے طعنے کیسے سنے جائیں گے، سب کی سب ٹیلر کی ماں نہیں بن سکتیں۔ بہن بھائی، چھوٹے بچے بچیاں کیا کہیں گے! انہیں کون سمجھائے گا۔ چڑیا گھر ہی چلے جاتے ہیں تو جانور بلبلا اٹھتے ہیں۔ بھلا یہ خوگیر کی بھرتی کیا نہ ڈنڈ مچائے گی۔ تو وہ نہیں جا سکتی۔

وقت بدل جانے سے زیادہ فرصت بھی کم معلوم ہونے لگی۔ ادھر جنگ کی آگ لگی ادھر وقت کی رفتار میں بھی کوک بھر دی گئی۔ ہر وقت یہی معلوم ہوتا گھنٹے، منٹ، سیکنڈ ہاتھوں سے پھسلے جا رہے ہیں۔ سپلائی کی نگرانی کے ساتھ ساتھ آئے ہوئے مال کی بھی دیکھ بھال کرنا پڑتی۔ اس کے علاوہ جب ایک ٹوکری میں دو برتن رکھے ہوں تو آبائی حق کے بل بوتے پر ٹکراتے ہیں، سینما ہی ایسی چیز رہ گئی تھی جہاں بغیر ایک دوسرے

سے اکتائے ہوئے وقت کاٹا جا سکتا تھا۔ شمن بیکاری سے اور بھی اکتا گئی۔ آنکھ کھول کر پڑھنا اور پڑھانا، کچھ نہ کچھ زندگی کا مصرف رہا اور اب یہ حال کہ دن گزر جاتا تو رات دوبھر ہو جاتی۔ ٹیلر تو تھکا ماندہ آکر مزے سے سو جاتا اور وہ پڑی جاگا کرتی۔ دن کو لازمی طور پر نیند آجاتی اور یہ لمبی لمبی راتیں اور تھکا دینے والی تنہائی اُس کا دماغ ہلا ڈالتیں۔ ٹیلر کا وجود تو نہ کے برابر ہوتا۔ دن کو وہ کام میں رہتا اور رات کو نیند میں۔ اور شمن اس کی دنیا سے نکل ہوئی باوجود ساتھ رہنے کے تنہا ہی رہتی، وہ جیسے وہ اُس کی بیوی نہیں پڑوسن ہے جس سے بوقتِ ضرورت بات کر لی ورنہ نہیں۔

مگر سینما میں بھی چخ ہو جاتی۔ "گریٹ ڈکٹیٹر" پر کچھ ذاتی جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ بزدلی اور چھچھورا پن ہے۔ مذاق تو ہر ایک کا بنایا جا سکتا ہے۔" ٹیلر جو بغیر سوچے سمجھے ہنس رہا تھا اس فلسفے پر چڑ گیا۔

"ارے مائین کیف پڑھو تو تمہیں معلوم ہو کہ یہ نازی کیا ہیں، شیطان ہیں پورے۔" اُس نے بڑے وثوق سے کہا۔

"کچھ زیادہ فرق تو نہیں نازیوں میں اور ان کے بھائی بندوں میں۔ شیطان نئے نئے روپ بھر کر جنم لیتا ہے۔"

"مگر اتنا کوئی نہیں۔"

"ہُنہ۔ بھلا تم کیوں کہو گے؟ اُن کے چیلے جو ٹھہرے، شاہی پاسبان جو ہوئے۔"

"ہم... میں... ہم لوگ برطانوی راج کی حفاظت میں ہرگز نہیں لڑ رہے ہیں۔"

"کہہ دو انسانیت کی حفاظت میں لڑ رہے ہو۔ ہنہ، چوٹی بلی جلیبیوں کی رکھوالی کرنے چلی ہے۔ تو سوچ ہے تو پورے ہو گئے اب حج باقی رہ گیا ہے۔ کیا کہتے ہیں؟"

"لیکن اس مرتبہ انصاف ہو گا۔"

"کیوں نہیں۔ لٹیرے ہی انصاف نہ کریں گے تو پھر اور کون کرے گا۔"

"مگر کبھی میں تو لٹیرا نہیں، میرے ملک نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"تم لیڈروں کا ساتھ دوگے تو ضرور لیڈرے کہلاؤگے۔ بڑے انسانیت کے ٹھیکے دار بنے ہو، ذرا ہندوستانیوں کو بھی انسان سمجھ کر دیکھو۔"

"کون کہتا ہے ہم ہندوستانیوں کو انسان نہیں سمجھتے۔"

"تو پھر ان چالیس کروڑ انسانوں کو نازیوں کی چکی میں پستا دیکھ کر تمہارے کان پر جوں کیوں نہیں رینگتی؟ فرانس کو تم بچانے دوڑے، پولینڈ کی موت پر چھاتی کوٹ کوٹ کر رو دیئے، برطانیہ کے ہاتھ سے دو تین سونے کی چڑیاں جاپانیوں نے چھین لیں تو کلیجے مسل گئے مگر یہ کیسی انسانیت ہے، بس تمہیں سفید چمڑی ہی میں نظر آتی ہے۔"

"کیوں، ہم چین کے لیے بھی لڑ رہے ہیں۔"

"جیسا لڑ رہے ہو وہ خوب معلوم ہے۔ روس کی بھی تو مدد کر رہے ہو۔ وہ دوسرا محاذ کیسے قائم ہو رہا ہے۔ پر نہ جانے کیا بات ہے کہ کنجی ہی نہیں ملتی۔ ہم جانتے ہیں یہ دوسرا محاذ کب کھلے گا، جب جرمنی پسنے لگے گا اور روس تھک جائے گا۔"

"تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اب سینما بھی تمہارے ساتھ دیکھنا حماقت ہے۔"

طے ہوا کہ فلم بینی بند۔ مگر یہ عہد زیادہ دن قائم نہ رہا اور فرمائش ٹیلر ہی کی طرف سے شروع ہوئی۔ یہ طے پایا کہ اگر ایک انگریزی فلم دیکھا جائے تو دوسرا ہندوستانی۔ بالکل کھرا سودا۔ یہ نہیں کہ وہاں سے تو دنیا بھر کا کوڑا سمیٹ کر ہندوستانیوں کے سر منڈھا جائے اور یہاں کی ایک تصویر بھی نہ دیکھی جائے۔ خیر حکومت کے آگے بس نہیں تو گھر میں تو چلے گا اپنا قانون ٹیلر راضی ہو گیا۔ وہ آسان ہندوستانی بخوبی سمجھ لیتا تھا۔

مگر دو ایک اسٹنٹ پکچر تو جھیل گیا پھر تو یہ حال ہو گیا کہ دو ریلیں دیکھیں اور خفقان اٹھا۔ "یہی فلم تو پچھلے ہفتہ دیکھا تھا۔" وہ ضد کرتا۔

"کیسے ہو سکتا ہے؟ اسی ہفتے تو بن کر آیا ہے؟" شمن لڑتی۔

"نہیں جی یہی تھا۔ وہ چُغد سا عاشق، کیا میں اسے پہچانتا نہیں۔ جنگلوں میں گاتا پھر رہا تھا۔ پھر وہ چپٹی سی ہیروئن گر پڑی تھی تو۔۔ چلو چلو یہ تو وہی ہے، کوئی دوسرا انگریزی فلم دیکھیں۔"

اب شمن کا پارہ چڑھ جاتا۔ یوں تو ہر فلم میں یہی ہوتا ہے۔ ہیرو جنگل ہی میں گاتا ہے۔ ہیروئن گرتی ہے تو اُسے اُٹھانا ہی پڑتا ہے۔ مگر ٹیلر تو اُسے جان بوجھ کر جلانا چاہتا تھا۔ جو فلم اچھا بھی ہوتا تو وہ پورے وقت سوتا رہتا اور شمن جلی بھُنی مُنہ پھلائے بیٹھی منہ سے دیکھا کرتی اور جان بوجھ کر انگریزی کے اچھے فلم میں عاجز بن جاتی۔ غرض کوئی بھی فلم ہو دونوں کا مزہ کرکرا رہتا۔

"یہ تمہارے یہاں ہر کیریکٹر گاتا ہے یا روتا ہے۔"

"اور تمہارے یہاں سوائے ٹھی ٹھی کے اور کیا ہوتا ہے۔" وہ بحث کرتی۔

"یہ کرنا چاہیے کہ امریکن فلموں کی نقل اتاریں۔"

"ہنہ، بڑے امریکن فلم۔ گندے، غلیظ، سوائے ننگے پن کے اور ہے بھی کیا۔" گو اسے معلوم تھا کہ عام طور پر جو ہندوستانی فلم ذرا بہتر ہوتے ہیں اُن میں یہی چالاکی استعمال کی جاتی ہے، مگر وہ بنتی رہی۔

"لاجواب ہوتے ہیں۔ تمہارے فلموں میں تو کچھ ہوتا ہی نہیں۔"

"یہ تمہاری سمجھ کا قصور ہے نہ کہ فلموں کا۔ تم ہم لوگوں کی زندگی کا فلسفہ ہی نہیں سمجھتے۔ تم لوگ تو بس جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کو فلم دیکھتے ہو۔"

"اوّل تو ہمارے جذبات ایسے گوبر نہیں کہ ٹھیس لگی اور بھک سے اڑ گئے، دوسرے اس میں مضائقہ ہی کیا ہے۔"

چُلبلیاں اور بڑھتیں، بحثیں عام موضوع سے ہٹ کر گھر کی چار دیواری میں آن جمتیں، نجی باتیں پھوٹ نکلتیں اور ایک سرے سے سینما سے بائیکاٹ کرنا پڑتا۔ مگر ریڈیو ہی جان کو روگ کی طرح لگ گیا۔ ان دونوں کو تو بس کسی بہانے کی تلاش رہتی۔ ٹیلر ہندوستانی گانا سنتے ہی پاگل ہونے لگتا۔ اس کی ضد میں شمن نے پکّے راگ سیکھنے کے لیے ماسٹر رکھ لیا۔ وقت بھی کٹ جاتا اور جنگ کا مواد بھی مہیا ہو جاتا۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر استادوں کے راگ سنتی، ہر تان پر جھوم اُٹھتی، ہر گٹکری پر لرز جاتی اور الکاروں میں کھو جاتی۔ مگر جونہی ٹیلر آتا وہ کھٹ سے لندن جا پہنچتا۔

"یہ ہے اصل نغمہ!" وہ جھوم کر کہتا۔

"ہنہ، جیسے پٹا ہوا کتا رو رہا ہے۔" وہ جل کر کہتی۔

"جبھی تو کہتا ہوں سمجھنا سیکھو، کان پیدا کرو۔"

"تم ہندوستانی گانا سمجھنے لگو تو یہ کان میں کانوں سے بھی نہیں۔"

"ہندوستانی گانا کسی عقل والے دماغ میں تو سما نہیں سکتا۔"

اس پر بات بڑھ جاتی۔

"تم میرے ملک کی ہر چیز کو حقیر سمجھ کر مجھ سے دور کرنا چاہتے ہو۔"

"میرے ساتھ تو تمہیں میرے ہی رنگ میں رنگنا پڑے گا۔"

"کوئی ضروری نہیں کہ جب میں تمہیں اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش نہیں کرتی تو تم میرے اوپر جبر کرو۔"

"تم جانتی ہو کہ تمہارا رنگ پھیکا ہے۔ تمہارے مرد زیادہ عقلمند ہیں۔ وہ یورپین لڑکی سے شادی کر کے کس قدر مہذب ہو جاتے ہیں۔ کھانا پینا، رہنا سہنا، بول چال سب میں سلیقہ آجاتا ہے۔"

"ہنہ خوب۔ یہ ایک اور امپیریل ازم کو پھیلانے کی چال ہے کہ اپنی ایکیاں انڈو دانوں کو پھانسنے کے لیے لگا دی ہیں۔ اسی طرح انگریزیت کا پرچار ہو جاتا ہے۔ ان کا لباس پہن، ان کی زبان منہ میں لے کر، ان کی عورتوں کی آغوش میں بھلا ان کے خلاف چوں کرنے کی سکت رہ جاتی ہے۔ بیچ ادھر میں معلق ہو جاتے ہیں۔ ان کی اولادیں یا تو اپنے دو غلے پن کے بل بوتے پر ہمیشہ جل لیتی ہیں یا آنے جانے والے ٹامیوں کی جوتیاں چاٹتی پھرتی ہیں۔ ایک طریقہ بھکوڑی ہے میٹھے کا۔ یوں جذب کر کے بھی تو فنا کیا جا سکتا ہے۔"

"تو بھئی تم ہی مجھے اپنے نظام میں جذب کر لو۔ گو کیچڑ میں رہنے کی عادت ذرا مشکل سے پڑے گی۔"

"مگر۔۔۔"

"مگر اصل بات یہ ہے کہ۔۔۔ خیر جانے دو۔"

"کہو، میں کوئی بچہ نہیں ہوں تم چڑاؤ اور رو دوں۔"

"یہ کہ یورپین طرزِ رہائش بہت بلند ہے اور تمہیں یقین ہے کہ وہ جذب ہونے کے لائق ہے اس لیے تم جان بوجھ کر بجائے اوپر اٹھنے کے نیچے کیسے گھسیٹ سکتی ہو۔ تم لوگ دل سے یورپین معاشرت کے مداح ہو۔"

"ہر طرح کے تمہیں مغالطے ہیں۔"

جھلک جھلک ہوتی مگر شمن دل میں ضرور نادم ہوتی۔ یہ کیا بات تھی کہ وہ یورپ کی اتنی بڑی مخالف ہوتے ہوئے بھی لاعلمی طور پر اسی ڈھنگ میں رنگتی جا رہی تھی۔ وہ میز پر چھری کانٹوں سے کھانا کھاتی، بیڈ پر سوتی اور چھوٹے چھوٹے قواعد پر عمل بھی کرتی۔ یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ اس ندامت نے ضد کو اور بھی بڑھا دیا۔ وہ جان بوجھ کر اصول توڑتی۔ معمولی بیماری کے بہانے سے کھانا بستر کے پاس منگوا لیتی۔ بجائے نائٹ سوٹ کے اس نے غرارہ اور کرتا پہننا شروع کیا مگر ٹیڈی نے محسوس بھی نہ کیا۔ اسے غرارہ بے انتہا پسند آیا، بالکل اسکرٹ معلوم ہوتا تھا۔

تو گویا جس چیز میں اسے اپنی معاشرت کی جھلک نظر آتی تھی وہ اچھی اور قابلِ پسند تھی! اتنا روشن خیال ہونے ہوتے بھی وہ لاعلمی طور پر کس قدر کوتاہ بیں تھا۔ جہاں تک ہوش و حواس کا ذکر تھا وہ وسیع نظر تھا مگر یہ لاشعور کی پاسبانی اس کی طاقت سے باہر تھی۔ یہ صدیوں کی جمی ہوئی کائی آسانی سے نہیں کھرچی جا سکتی تھی۔ یہ حال ہے ان روشن خیالوں کا تو کوتاہ نظر والوں کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ کتنا بھی چاہیں احساسِ برتری دماغ سے نہیں نکل سکتا۔ انسانیت ہمہ گیر برابری کو مانتی ہے۔ دماغ میں جو چور بیٹھا ہے وہ کبھی کبھی جھانک کر دیکھتا ہے۔ پانچ انگلیاں یکساں نہیں۔ انہیں کھینچ تان کر یا کاٹ چھانٹ سے برابر نہ کیجیے ورنہ ہاتھ بے وضع اور بھونڈا ہو جائے گا۔ دنیا کی شوبھا انہی اونچ نیچ سے قائم ہے۔ اس معاملے میں روشن خیالی خام خیالی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی؟

اور گھر میں ایک عجیب کشمکش شروع ہو گئی، جیسے گاما اور زبسکو جٹے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی طرف کھینچتا ہے یہ اپنی طرف۔ کبھی یہ داؤں لگا کر جیت کرنے لگتی ہے تو وہ پلٹا مار جاتا

ہے۔ ساتھ ساتھ ذہنی رسہ کشی بھی بڑھتی گئی۔ کیسے پار لگے گی یہ دو انجنوں کی کشتی جس میں دونوں انجن مخالف سمت کو دوڑ رہے ہیں؟ کبھی دو انچ مشرق کی طرف بہتی ہے تو کبھی دو انچ مغرب کی سمت۔ نتیجہ وہی انجماد، گھٹن اور کوفت۔ اوپر سے طوفان تُلا کھڑا ہے جو جیسے منہ پھاڑ پھاڑ کر دوڑ رہی ہیں اور ناخدا نے جنم ہی نہیں لیا۔

زندگی سے تھکی ہاری ٹہلتی ہوئی وہ دور نکل گئی۔ آج ہی ٹیلر سے جنگ ہوئی تھی۔ زخم تازہ تازہ تھے۔ پارک میں وہ بنچ پر ذرا دیر کو ستانا چاہا۔ مگر جیسے سانپ نے چٹک لیا۔ یہ بنچ! آخر بنچ کیوں، چبوترہ کیوں نہیں۔ یہ سارے نوٹس، سارے اعلانات، یہ انگریزی ہی میں کیوں؟ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ذرہ ذرہ باغیوں کی دست درازیوں سے کچلا ہوا میلے کچیلے قلیوں کی وضع کے پتلون، بھدی نراکیں، ٹوٹے ہوئے پائے والی کرسیاں اور کھرچی ہوئی میزیں۔ ان درندوں کے خونی پنجوں کے نشان چپے چپے پر کھدے ہوئے ہیں۔ کیسے بھریں گے یہ گھاؤ؟

اس کا جی چاہا بنچ کو ایک ٹھوکر لگائے اور زمین پر لوٹ لگا دے۔ یہ ٹیبل اور کے چھٹے۔ کاش کوئی غیبی ہاتھ ان گندگیوں کو چن کر ملک سے دور سمندر میں پھونک دے، اور اس کے ساتھ ساتھ ان سفید بدن کے ہاتھوں کو بھی دھو ڈالتا جو سیاہی اور گرمی سے تپ کر کوڑھ کے زخم بن گئے ہیں، جن کی عفونت نے انسانیت کا دم گھونٹ رکھا ہے۔

"او ہو، السلام علیکم۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں!" کسی جانی پہچانی سی آواز نے پہلو سے پکارا اور وہ چونک پڑی۔

"ارے... تم... آپ" وہ حیرت زدہ ہو کر پروفیسر کے بگڑے ہوئے حلیے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ پہلے تو ایسے کی سازش معلوم ہوئی۔ کہاں وہ نک سک سے درست چھیل چھبیلے پروفیسر اور کہاں یہ ڈھیلے ڈھالے کھدر میں غرق بد وضع شاعر نما لیکن انتہائی غیر شاعرانہ انسان۔

"مگر آپ تو چلے گئے تھے؟"

"ہاں اور آ بھی گیا۔ تو اس میں اس قدر حیرت کی کیا بات ہے؟ تم تو ایسے جھجکیں

جیسے میں کوئی مردہ ہوں جو کفن پھاڑ کر آن کھڑا ہوا۔"

"کچھ نہیں، اصل میں یوں ایکا ایکی ملنے کی امید تو نہ تھی۔ مگر یہ۔۔۔"

"کہو کہو۔۔۔" وہ خوش مزاجی سے مسکرایا۔

"کچھ نہیں، جانے بھی دیجیے۔ اتنے دن بعد ملے ہیں اور پھر وہی جنگ شروع کر دی۔ کہیے خیریت تو رہی"

"پوچھو مت، خود دیکھنے کی کوشش کرو۔"

"بس اب دیکھیے مجھے الزام نہ دیجیے گا۔ آپ ہی چھیڑ رہے ہیں، کوئی بات منہ سے نکل گئی، تو تنتنا اٹھیں گے۔"

"آزماؤ تو ایک بار۔ اب وہ نازک مزاجیاں نہ رہیں۔" پروفیسر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"معلوم ہوتا ہے کسی سے عشق ہو گیا۔"

"ایسا ویسا عشق! شدید قسم کا۔"

"مبارک ہو۔ مگر یہ ہوا کیسے؟"

"عشق ہونے میں بھی کیا کوئی ہل بل لگتے ہیں؟"

"مگر معاف کیجیے گا یہ ڈھونگ تو کچھ قوم پرستوں کا سا رچایا ہے۔" اس نے سر سے پیر تک نگاہ دوڑا کر دیکھا۔

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" پروفیسر چپکے سے بولا۔

"مگر یہ بات کیا ہوئی اکم از کم آپ سے تو یہ امید نہ تھی۔"

"کیا امید۔۔۔ یہ ڈھونگ رچانے کی۔۔۔؟"

"جی۔۔۔ یہ لباس، یہ کاکلیں۔۔۔ اور یہ نٹکا۔۔۔ کمال کر دیا آپ نے تو۔ تب تو آپ کمیونسٹ بھی ہو گئے ہوں گے۔"

"لازمی طور پر۔" پروفیسر اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"وہ نیرہ سو کی نوکری؟"

"وہ چھن گئی۔"

"وجہ؟ آپ تو۔۔۔"

"سخت نالائق نکلا۔ جبھی تو یہ روپ دھار لیا۔" پروفیسر کی آواز میں طنز کی تلخی نہ چھپ سکی۔ شمن نے بے اعتباری سے پروفیسر کو گھورا۔ یہ وہ کیا پینترے چل رہا تھا۔ اُسے اس شخص پر بھروسہ نہ تھا۔ دم بھر میں اُلّو بنا دیتا اور پتہ بھی نہ چلتا۔ پر آج تو وہ خود بھلا بھگت بنا بیٹھا تھا۔

"کچھ آپ بیتی بھی تو سنائیے۔ ہاں بھئی شادی کی مبارک باد تو۔ بتانا بھول ہی گیا۔"

"جی ہاں آخر کو ایک بار زندہ پھانسی تو لی۔ تنگی کا زمانہ ہے، ہر چیز مہنگی ہو رہی ہے۔"

"میرا ہی جوتا میرے ہی سر۔ لیکن مجھے تم سے یہی امید تھی، بُرا نہ مان جانا۔ دراصل شادی بیاہ کے معاملے میں میری رائے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ مگر کہیں تم نے شادی صرف اس لیے تو نہیں کر ڈالی کہ تمہیں ذرا عجیب و غریب بننے کا شوق ہے۔ سنو، سنو، بیچ میں نہ بولو۔ اگر اس وجہ سے کی ہوتی تو تم خوش اور اس قدر مطمئن نہ نظر آتیں۔"

"میں خوش نظر آتی ہوں؟" وہ کھوکھلی آواز میں ہنسی۔

"کم از کم صورت اور صحت تو یہی کہتی ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔ یہ بتاؤ کچھ کرتی بھی ہو یا کام چھوڑ دیا۔"

"بہت دن ہوئے چھوڑ دیا۔ آپ کیا کر رہے ہیں؟ اوہ بھولی۔۔۔ آپ تو کام کر رہے ہوں گے۔" پروفیسر مسکرایا اور کوئی جواب نہ دیا۔

"اب تو آپ سرکاری کمیونسٹ ہیں، اب تو راج ہونگے۔"

"کیوں نہیں۔"

"قومی جنگ کا بھی کام جاری ہوگا۔"

"بڑی تیزی سے۔"

"بھئی مزے ہیں آپ لوگوں کے۔ ایک ہمارے وہ کمیونسٹ تھے جو چوہوں کی طرح

بلوں میں چھپتے پھرتے تھے، پاگل کتوں کی طرح دوڑائے جاتے تھے، ایک آپ ہیں کہ..."
"مزے سے وائسرائے کے ساتھ ڈنر اڑا رہے ہیں... موٹریں... گھوڑا گاڑی۔ کمی کیا ہے ہم لوگوں کو۔" شمن نے پھر طنز کی کڑواہٹ پر منہ بنایا مگر پروفیسر کی مکار ڈھلتی ہوئی آنکھوں اور بے معنی مسکراہٹ نے گویا برطلا کر رکھ دیا۔

"اچھا تو وہ آپ کی محبوبہ کون ہیں؟"

"ہے ایک بنگال کی حسینہ۔"

"بنگال کی؟"

"ہاں۔ تمہیں نہیں معلوم۔ ارے بنگال ہی میں تو میرا تقرر ہوا تھا۔ بس وہیں ایک کافرہ کے تیرِ نظر کا گھائل..." شمن گھبرا کر دور ہٹ گئی۔ پروفیسر کی آنکھیں بھیانک طور پر سکڑ گئیں۔ اُن میں عجیب نامعلوم سا خوف چھا گیا، جیسے وہ کسی ڈراؤنے خواب کو نیم بیداری میں دہرا رہا ہو۔ اُس کا جسم پہلے سے نصف بھی نہیں رہا تھا۔ چہرے پر عمر کے آثار اچانک برس پڑے تھے اس لیے مسخ ہو گیا تھا۔ بال کتنے سفید ہو گئے تھے، جیسے وہ بن چکی جھاڑ کر چلا آ رہا ہو۔ وہ چکرا گئی۔

"سردی بڑھ گئی ہے۔ گھر چلیں گے یا دیر ہونے کا ڈر ہے؟" اُس نے بنچ پر سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

"چلوں؟" پروفیسر نے جاگ کر جواب دیا۔

"ہاں، کیوں نہیں۔ ٹیلر تو شاید دیر سے آئے۔"

"تلی تہ پہاڑ دے کالا آدمی دیکھ کر!"

"مگر تم تو سرکاری کالے ہو۔"

"پھٹ... کیوں؟" وہ خوش مذاقی سے ہنسا۔

گھر پہنچے تو وہ دیر تک گھوم پھر کر مکان دیکھتا رہا۔ کھانے پر اُس نے ہوس کے زدہ ہو کر ایک دم نوالے نگلنا شروع کیے، مگر پھر ٹھٹک گیا، جیسے ایک دم ابکائی نے گلا دبوچ لیا ہو، اور پھر نگلنا شروع کر دیا۔

"ذرا ہاضمہ بگڑ گیا ہے مرغن کھانے کھاتے کھاتے۔" وہ پھر بے معنی طور پر مسکرایا۔

کھانا کھاتے ہی وہ روانہ ہو گیا، جیسے کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہو۔

"پھر آؤں گا۔ اب تو گھر دیکھ لیا ہے۔ فرنی خوب تھی۔" وہ الٹی سیدھی باتیں کرتا رہا۔

اس کے جانے کے بعد شمن چپ چاپ اداس بیٹھی رہی۔ "روس بڑھتا جا رہا ہے۔" وہ قطعی متاثر نہ ہوئی۔ سب ڈھونگ۔ بنگالی بھگت کہیں کے۔ انسانیت کے ٹھیکے بن کر چلے ہیں حمایتی۔ کہیں یہ ہی انسانیت کو بھی نہ ہڑپ کر جائیں۔

"رعب جمانے آیا ہو گا میرے اوپر۔ وہ کوئی اور ہوں گی جو ان ہتھکنڈوں پر ریجھ جاتی ہوں گی۔ غبن وبن کیا ہو گا کمبخت نے جو نکالا گیا تو اپنی سیاہی کا پردہ ڈھانکنے کو لال جھنڈے کی آڑ میں آن دبکا۔ کچھ ایسی حوریں تو ہوتی بھی نہیں بنگال میں۔ سوائے آنکھوں کے اور ہوتا ہی کیا ہے! مگر یہ دو ٹکے کے شاعر انہی پر مرتے ہیں۔ لیکن بنگال میں تو قحط پڑ رہا ہے!

اور یہ کون سی نئی بات ہے۔ قحط پڑے یا ہریالی ہو، بیوہ کی مانگ تو ویسے ہی اجڑی رہتی ہے۔ روتی تھکا ہارا چڑچڑاتا ہوا آیا اور سو گیا۔ اور کوئی دن ہوتا تو وہ کوئی بات نکال کر اس بنگال کے قحط کا ہتھوڑا سا بدلا تو اس کا خون جلا کر لیتی، مگر پروفیسر نے جیسے اس کی روح تک کچل دیا ہو۔

جلی بھنی بیٹھی تھی کہ بیرے نے پروفیسر کے آنے کی اطلاع دی۔ جی چاہا کہہ دے دھکے مار کر نکال دو، مگر پھر سوچا دو چار چٹکیاں تو کمبخت کی ڈھیٹ ہڈیوں میں لی ہی جائیں، چنانچہ بلا لیا۔

پروفیسر کو دیکھ کر وہ پھر چونکی۔ یا خدا! یہ دنیا ہے یا مداری کا تھیلا۔ مرغی کا انڈا لو کبوتر کا بچہ نکال دیا۔

"میرے بالوں کو دیکھ رہی ہو، بہت کاٹ دیے کمبخت نائی نے۔ میں نے کہا بھیا ذرا اچھے کاٹ دینا، اس نے گدی کھرچ ڈالی۔" اس نے گردن سہلا کر کہا اور شمن کے منہ پر طمانچہ سا لگا۔ گویا کہتا ہے تم سمجھتی تھیں مجھے ڈھول تاشوں کی ضرورت ہے،

ویسے مجھ میں کچھ دم خم نہیں۔ یہ لو میں نے یہ ہتھیار بھی پھینک دیے۔ اب آجاؤ میدان میں۔"

"میں تمہارے پاس ایک غرض سے آیا ہوں۔ تنہائی سے اکتا جاتی ہو گی۔" شمن کے کان تمتما گئے اور وہ بھی سمجھ گیا اس لیے جلدی سے بولا: "اتنی حساس نہ بنو۔ ذرا غور سے سنو۔ مذاق کو چھوڑو۔ ہاں پہلے میری اس دن کی بکواس کو معاف کر دو، میں مذاق کر رہا تھا، مگر معلوم ہوا تم بڑی بدمذاق ہو گئی ہو۔ وہ تمہاری قیافہ شناسی کیا ہوئی یا صرف بنا کرتی تھیں؟ دو لفظوں میں میری داستان سن لو یقین نہ آئے تو کوئی پروا نہیں۔ ہمارے تعلقات ان باتوں پر نہیں بگڑنا چاہییں۔ میں کلکتے بھیجا گیا تھا۔ وہاں کیا کچھ دیکھا اور کیسے دیکھا یہ نہ پوچھو اور نہ ہی کوئی بیان کر سکتا ہے۔ بھوتوں میں یقین تو نہیں کرتا مگر کوئی آسیب جو چمٹ گیا اور مجھے استعفیٰ دے کر بھاگنا پڑا۔ آمدم بر سر مطلب ہمارے یہاں کچھ کلرکوں کی کمی آگئی ہے۔ بہت معمولی کام ہے۔ ہفتے میں دو تین روز کام دیکھنا۔ دفتر کا کام نہیں۔ وہ تو ہم نے انتظام کر لیا ہے، بلکہ... اگر تم تیار ہو تو خیر ورنہ..."

"کیا کام ہے؟"

"جی تو چاہتا ہے کہہ دوں..." وہ شرارت سے مسکرا دیا۔

"کہیے۔ کہیے نا۔"

"رہنے دو، کہنے سننے کے لیے تو بہت وقت پڑا ہے۔ سنو! کام یہ ہے کہ ہم نے چند سنٹر مقرر کیے ہیں جہاں ہمارے آدمی جا کر اناج بٹنے وقت انتظام کرتے ہیں۔"

"کیسا اناج؟" لیکن وہ جھینپ گئی۔ اسے وہ لمبی لمبی قطاریں بھیڑوں کی طرح ایک دوسرے کو ٹکریں مارتی ہوئی اناج کی دوکان کے سامنے کھڑی یاد آگئیں۔

"ایسا مشکل کام نہیں۔ بس عورتوں کو ایک قطار میں سیدھا رکھنا اور یہ دیکھنا کہ منتظمین خواہ مخواہ تنگ تو نہیں کرتے۔ اناج کے سنٹر کم ہیں اس لیے بھیڑ ناقابل بیان ہوتی ہے۔ سنبھال سکو گی؟"

"سنبھالنے کو کیا ہوا مگر..."

"کیا تم اپنی اس فکر کو دو چار مہینے کے لیے سنبھال کر نہیں رکھ سکتیں۔ میں کوئی بھاگ نہیں جاؤں گا۔ جانتا ہوں تمہارے دل میں ہزاروں لاکھوں سوال کھلبلی مچا رہے ہیں مگر یہ وقت ان سوالوں کو حل کرنے کا نہیں۔"

"بے سمجھے بوجھے کوئی کام . . ."

"نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمہارا غلط خیال ہے۔ اوّل تو ذرا سا مطالعہ کرو، ذرا خبروں میں دلچسپی لو تو خود بخود سارے جواب مل جائیں گے۔ اور ویسے اگر میں تم سے بحث کرنے بیٹھا تو خوب جانتا ہوں کہ ہار جاؤں گا۔"

"تو آپ کھوکھلی بنیادوں کے برتے پہ بحث کریں گے۔ بنیادیں کھوکھلی تو نظام بھی کھوکھلا۔"

"وہ دیکھو میں ہار گیا۔ کہتا ہوں تم سے کمیونسٹوں کا کام نہیں خدا ترسی سمجھ کر کر دو۔ اگر جی چاہے تو، ورنہ زبردستی نہیں۔"

پروفیسر نے ہتھیار ڈال کر جو ستیہ گرہ کی پالیسی پکڑ لی اس پر شمن جھنجلائی تو بہت مگر سمجھ میں نہ آیا کہ کیسے قائل کرے۔ غنیمت بحث پر ہی تیار نہیں ورنہ وہ فلسفوں میں پرخچے اڑ جائیں۔

"کیا ہے ذرا مشغلہ ہی ہاتھ آ جائے گا۔ جواب دو تا کہ پھر کوئی دوسرا راستہ نکالوں۔"

"میں آؤں گی۔"

"تو میں کل ہی تمہارے پاس ہفتے بھر کا پروگرام بھیج دوں گا۔"

اور دوسرے دن وہ آٹھ بجے روانہ ہو گئی۔ ابھی اناج بانٹنے میں دو گھنٹے باقی تھے مگر ہجوم کا یہ حال تھا جیسے کسی بڑے دیوتا کے درشن کا جماؤ لگا ہوا ہے۔ نوچ، کھسوٹ، دھکم دھکا۔ بس نہیں جو ایک دوسرے کو نگل جائیں۔ جونہی مندر کے پٹ کھلے خلقت طوفان کے ریلے کی طرح ٹوٹ پڑی۔ "ہٹو ہٹو . . . پیچھے ہٹو۔" پولیس نے کوڑا گھما کر جاتریوں کو پیچھے دھکیلنا چاہا۔ مگر توبہ کیجیے۔ ان دیوانوں کی کشش اگر یوں کوڑوں سے کمزور کیا جا سکتا تو پھر مشکل ہی کیا تھی۔ یہ پھڑکتے ہوئے جسم کے خود اپنے ہاتھوں سے جسم

کی کھال اُدھیڑ لیتے۔ بدن دیکھو تو ایسا سوکھا جیسے گھسے ہوئے کپڑے میں کھچیوں کا ڈھیر لپیٹ دیا ہو مگر بھوس دلن پہلوانوں جیسی۔ چاول کا دانہ دیکھتے ہی جسم میں بھوت جاگ اُٹھتے ہیں۔ وہی کھچیاں جو پیٹ کھلنے سے پہلے ٹھٹھرے سے بھی زیادہ بے جان ہو رہی تھیں، بجلی کی سی سرعت سے جی اٹھتی ہیں۔ اور پھر زبانیں تو خدا کی پناہ! تیل نہیں مہتاب تو اس تیزی سے چلتی ہیں۔ اگر دو چار چھینٹے نواب چھو جاتے تو نہ جانے کہاں پہنچتیں۔ اور پھر یہ زبانیں عورتوں کی قطار میں چل رہی تھیں۔

بڑی مشکلوں سے ان بے کل کیڑوں کو قطار میں کھڑا کرنے کی کوشش جاری تھی۔ اگلے حصے کا انتظام شمن کے ہاتھ آیا۔ گو یہاں قدرے سکون تھا کیونکہ اناج قریب تھا مگر پچھلے حصے میں باوجود تین چار لڑکیوں کی جدوجہد کے اودھم برپا تھی۔ ڈیڑھ دو فرلانگ لمبی لکیر بالکل زہریلے سانپ کی طرح دم پٹخ پٹخ کر تلملا رہی تھی۔

یہ عورتیں تھیں یا بھوکی کتیاں! صنفِ نازک اس طرح بدحواسی سے اچھل کود مچائے تو جی برا ہو ہی جائے گا۔ شمن نے کئی بار انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر شاید وہ زبان بھی نہ سمجھتی تھیں اور نہ جانے کیا کیا کچھ جنگلی زبان میں چیخ پڑیں۔ دھوپ تیز تھی، معلوم ہوتا تھا سورج سے گیلی گیلی بھوبل برس رہی ہے، کوئی پگھلی ہوئی راکھ جسم پر لوٹ رہا ہے۔ اور پھر ان گنوارنوں کی کھٹی کھٹی سڑاند۔ سر بھنا گیا۔

سب سے اگلی عورت سخت لڑاکا مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ نہ جانے دکاندار سے کیا چخ پخ لگا رکھی تھی اور کھسکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ کبھی بربڑاتی تھی، کبھی سر ہاتھ سے کوٹنے لگتی تھی۔ جمعدار جی کا ہنٹر گھوما اور وہ روتی بسورتی گھسیٹ کر دور پھینکی گئی۔ کچھ اناج کی برائی کر رہی تھی۔ بازار میں دو سیر کا تھا تو یہاں ساڑھے تین سیر، پھر بھی ہائے ہائے بند نہ ہوتی تھی۔ لیکن سب سے پہلی عورت کا مرض متعدی معلوم ہوتا تھا کیونکہ جو آگے بڑھی اڑ کے رہ گئی اور دو چار کو ہنٹروں سے ہٹانے کے بعد قطار میں بازر لیہ لا سکی خبر دوڑ گئی کہ مال گھٹتا ہوا ہے۔

اتنے میں اس نے دیکھا پروفیسر بھیڑ میں کہنیاں چلاتا تیرتا چلا آ رہا ہے۔ ایک بار

اُس نے شمن کو دیکھا مگر آگے بڑھ گیا۔ آگے پہنچ کر اُس نے ہاتھ چلا چلا کر دوکاندار سے بالکل ایسے لڑنا شروع کیا جیسے وہ عالم فاضل پروفیسر نہیں بلکہ قطار والیوں کا کوئی بھائی بند ہے۔ زبان بھی تو وہ کوئی نئی بول رہا تھا جس میں گجراتی، مرہٹی، اردو اور انگریزی الجھی ہوئی تھی۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ اناج ملنا بند ہو گیا۔ سانپ نے پیچ و تاب کھانے شروع کیے اور کنڈلی مار کر ایکبارہی دکان میں گھسنے کی کوشش کی۔ ڈھیل شمن کے محاذ پر ہوئی۔ وہ پروفیسر کی طرف متوجہ ہوئی اور ملیدہ ہو گیا۔ باڑ بکھر گئی۔ آہیں اور سسکیاں چاروں طرف پھیل گئیں۔ بھوکے ہاتھ پھر ایک دوسرے کی لٹیاں نوچنے لگے، زبانیں پھر پھڑپھڑانے لگیں۔

پچھلے حصہ کا انتظام کرنے والے آگے دوڑے۔ پروفیسر بھی دکاندار سے نپٹ کر مورچے پر آگیا۔

"ابھی ملے گا اناج۔ یہ بوریاں غلطی سے آگئی تھیں۔ تھوڑا صبر کرو بہنو"

اس نے چیخ چیخ کر آگے پیچھے لپکنا شروع کیا مگر معلوم ہوتا تھا صبر بھی جنگ کے ساتھ کھیل کھیلا کر خاک ہو گیا تھا۔ آہیں چیخیں بن گئیں۔ نہ جانے کیا ہوتا، مگر معلوم ہوا کہ اناج آگیا اور پھر لنگر جاری ہو گیا۔

ٹیکسی میں بٹھاتے وقت پروفیسر نے شرمندہ ہو کر اس کی نفیس جارجٹ کی ساڑی کو دیکھا جو قریب کی موری میں ڈوب کر مرے ہوئے چوہے کی طرح لٹک رہی تھی۔

"آج تو تم تماشہ دیکھنے آئی تھیں مگر مجھے یقین ہے بدھ کے دن جب آؤ گی تو اصل لطف آئے گا۔ آؤ گی نا۔ دو دن آرام کر لو۔"

"کوشش کروں گی" اس نے اپنے دکھتے ہوئے کندھے تکیے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔ ساڑی کا لتھڑا ہوا کونا پنڈلی پر رینگا اور اُسے پھریری آگئی۔

(۴۴)

کام غیر دلچسپ تھا اور تکلیف دہ بھی۔ لیکن اتنا تو ہو گیا کہ مقررہ شام کی تھکی ہوئی

خاموشی ٹوٹ گئی۔ ٹیلر بڑی دلچسپی سے ان معرکوں کا حال سنتا۔ آئے دن نیا ڈراما دیکھنے میں آتا۔ انسانوں کی ایسی ایسی فاش کمزوریاں دیکھ کر کبھی تو جی جل اٹھتا۔ آخر ہندوستانیوں کو ترتیب سے کیوں اس قدر نفرت ہے؟ ہر کام میں بس گودڑ بھر جاتا ہے۔

"انہیں سدھانا مشکل ہے" ٹیلر نے سب کچھ سن کر کہا۔

"جاہل ہیں نا بیچارے" شمن رسانیت سے بولی۔

"ہاں اور دوسرے کچھ یہی ان کی خصلت میں"

"بھوک کے آگے کیا یاد رہے" شمن نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔

"مگر اناج تو برابر مل رہا ہے۔ دراصل یہ لوگ ہوتے ہی بے اصول ہیں"

"خاک مل رہا ہے اناج۔ سارا پھپھوند لگا ہوا چاول اور گھنا ہوا گیہوں"

"مگر ہم نے پنجاب سے تازہ گیہوں منگوایا ہے"

"منگوایا ہوگا مگر ملتا تو نہیں۔ وہ تازہ گیہوں تو کیا کھاتوں میں جب سڑ جائے گا تب نکالا جائے گا"

"یہ تو بڑی مصیبت ہے"

"اور کیا۔ پھر سرکار سنتی بھی تو نہیں"

"سرکار کیا کر سکتی ہے جب ڈاکو تاک میں لگے ہوئے ہوں"

"یہ ڈاکو بھی سرکار کے ہی پٹھو ہیں۔ ہر سال انسان کشی کے سلسلے میں خطابات ملتے ہیں ان کو"

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو گویا میں ہی سرکار ہوں"

"سرکار کے حمایتی تو ہو"

"یوں تو تم بھی سرکار کی حمایتی بن گئیں۔ راشن اسکیم میں کام کرتی ہو جو سرکاری ہے" شمن ذرا اس جرح سے لاجواب رہ گئی۔

"تو اس میں عیب ہی کیا ہے" ٹیلر تصحیح کے انداز میں بولا، "تم بالکل بچوں کی سی باتیں کرتی ہو"

"میں ہر کاری ہتھکنڈے سے دور ہی رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے اداس ہو کر کہا۔ ٹیلر آج اسے منانے پر تُلا ہوا تھا۔

"صبر کرو، وہ وقت بھی آ جائے گا۔"

"کون سا وقت؟"

"جب تم ان ہتھکنڈوں سے آزاد ہو سکو گی۔ نہ جانے تم لوگ اس قدر کم ہمت کیوں ہو۔ ذرا سی بات پر نا امید ہو جاتے ہو۔ ہمارے ملک کی تاریخ پڑھ کر بھی تم نے کوئی سبق نہ حاصل کیا۔ یہ احساسِ شکست کب دور ہوگا تمہارے دلوں سے!"

"شکست کھا کر بھی محسوس نہ کریں۔ یہ اچھا ظلم ہے۔"

"شکست کھا کر اگر دوگنے جوش سے آگے بڑھو تو احساس خود بخود زائل ہو جائے گا۔ اگر صرف رونے سے کام چل جایا کرتا تو شاید کبھی کا قصہ ختم ہو جاتا۔ ہندوستان میں کتنی آنکھیں ہیں جو دن رات خشک۔ آنسو نہیں بہاتیں۔" آج ٹیلر میں کھویا ہوا انسان واپس لوٹ رہا تھا۔ گھر کے جھگڑوں نے انہیں کس قدر حیوان بنا دیا تھا! دونوں طرف مورچہ بندی شروع ہو گئی تھی اور اس آپس کی جنگ نے دنیا بھر میں بھڑکتی ہوئی آنچ کو ماند بنا رکھا تھا؛ اپنے گھر و بچوں کے آگے انسانیت کے کلیجہ میں رِستا ہوا گھاؤ نظر انداز کر دیا تھا۔

وہ پانی پینے کے بہانے سے اٹھی۔ لوٹ کر اس نے جیسے بالکل انجان پنے میں ٹیلر کے سنہرے بالوں میں انگلیاں ڈبو دیں۔ کتنا نرم گرم احساس تھا۔ گلے میں اٹکی ہوئی گرہ دکھنے لگی۔

"رونی!" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی اور نہ ہی ٹیلر نے کہنے دیا۔

"ممی کا خط۔" ٹیلر نے اسے جاگتا پا کر ڈاک اٹھا کر دے دی۔ "ذرا دیکھنا بڑی بی نے کیا کیا لکھ مارا ہے۔ سمجھتی ہیں میں اب تک وہی دو فٹ اونچا رونی ہوں جسے پورے وقت نگرانی کی ضرورت ہے۔"

رونی چلا گیا تو وہ لیٹی خط پڑھتی رہی۔ ماں نے لکھا کہ کیا کیا کھانے ٹیلر کو پسند ہیں اور

کن چیزوں سے نفرت ہے۔ وہ رومال بہت کھوتا ہے۔ اور یہ عیب ایک بیوی کے لیے وبالِ جان ہے۔ اس کے موزے بھی بہت پھٹتے ہیں۔ اگر روز رات کو سونے سے قبل گرم پانی سے پیر دھلا کر ٹیلکم پاؤڈر چھڑک دیا جائے تو . . .''

ہارا ہوا دماغ نیند میں لپٹا دھانوں کے ہرے بھرے خواب دیکھتا رہا۔ سانولی سلونی مٹی کے گداز سینے پر دھانوں کے ننھے ننھے سنہرے دانے گھنگھروؤں کی طرح ٹپکے۔ کنجوس مٹی کب تک ضد کیے منہ موڑے رہتی۔ آن کی آن میں سورج کی نوکیلی کرنوں نے انھیں گدگدا کر زندگی کی رمق پیدا کر دی۔ روپہلا پانی چھل چھل ناچتا ان میں جذب ہو گیا۔ دیکھیے ہرے بھرے دھان شرابیوں کی طرح جھومنے لگے۔

اب کشمکش ڈھیلی پڑ جائے گی۔ نیا دھان آ گیا! پھٹی پھٹی آنکھیں شکم سیری کی نیند میں نشیلی ہو جائیں گی۔ نیا دھان آ گیا! اب سسکتے ہوئے بنگال کے حلق میں بھی امرت ٹپکے گا۔ نیا دھان آ گیا! اب قحط ختم! خالی مٹھیوں میں یہ نیا دھان سونے کے ٹکڑے بن جائیں گے۔ خالی ڈھنڈار خزانہ بھی دولت سے مالا مال ہو جائے گا۔ کروٹ لیتے میں اس کی گردن ڈھلک کر ٹیلر کے سینے پر ٹک گئی۔

آنکھ کھلی تو ٹیلر کی ناچتی ہوئی سیٹی کان میں گونجی۔ وہ آئینے پر جھکا ہوا سیفٹی ریزر سے گال کھرچ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سچے نیلم کے ٹکڑوں کی طرح جگمگا رہی تھیں اور شمن کو وہ کانچ کی نیلی گولیاں یاد آ گئیں جنھیں بچپن میں اس نے کدن کے ساتھ مل کر کیاریوں میں بو دیا تھا۔ وہ ایک دم مسکرا پڑی۔

شمن کو زور سے ہنسی آ گئی۔ یہ مائیں اتنی بیوقوف کیوں ہوتی ہیں۔ سب کی سب ایک ہی جیسی۔ لیکن ٹھیک بھی کہتی ہیں۔ کتنے دن ہو گئے شمن نے ٹیلر کے کپڑوں کی مرمت نہیں کی۔ بٹن ٹوٹ گئے ہیں، کالر گھس گئے ہیں، موزوں کی پچاس جوڑیاں ہوں گی مگر سب کی ایڑیاں اور پنجے غائب۔ دیر تک بیٹھی وہ کپڑوں سے کھیلتی رہی۔

چاہتی تھی کہ کسی طرح کام سے گلو خلاصی ہو جائے۔ پروفیسر سے ہی جھڑپ ہو جائے

کہ اسی بہانے مصیبت سے جان چھوٹے۔ اب اُسے بڑی تھکن ہو جاتی تھی اور موسم بھی ناگوار ہوتا جا رہا تھا۔ ہفتے میں دو کے بجائے تین دفعہ جانا پڑتا کیونکہ ملیریے کی وجہ سے مددگاروں میں اور کمی آگئی تھی۔ اور کام بھی کیا گویا بندر رسد ڈھانے پڑ رہے ہیں۔ اسکول میں ہمیشہ وہ اعلیٰ جماعتوں کو پڑھایا کرتی تھی۔ بدتمیز چھوکرے بچے اُسے کبھی نہ بھگتنے پڑے۔ لیکن ان عورتوں کو قطار میں کھڑا رہنا سکھانے سے تو بکریوں کو پڑھانا آسان تھا۔ کھوپڑیاں ہی نہ تھیں۔ بس ساری قوتیں سمٹ کر دھان کے دانے سمیٹنے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ خیر دو چار دن کی بات ہوتی تو کچھ نہ تھا، مگر یہاں تو مہینوں کا سلسلہ تھا۔

بے وقت کے مہمان سب ہی کو کھلتے ہیں۔ مگر پروفیسر کو آتا دیکھ کر تو جی ہی لوٹ گیا۔ کمبخت بھوکا تو آیا ہی ہوگا۔ چائے پر دو وقت کے کھانے کا انتظام کرے گا۔ بہ جبر خوش آمدید کہنا پڑا۔

"نہیں چائے پینے کی فرصت نہیں شیلا رہ گئی تھی، اُسے بھی آج ایک سو چار بخار چڑھ آیا۔ عورتوں کا معاملہ ہے، ورنہ ویسے تو کام چل رہا ہے۔"

وہ کچھ مجبوراً اور شرمندہ سا ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "ایک تم مسلمان ہو جو اس کام میں دلچسپی لے رہی ہو۔ سنا ہے پردہ چھوڑ دیا ہے مسلمانوں نے بھی، مگر شاید صرف جلسوں پارٹیوں کے لیے چھوڑا ہے۔"

"مگر جب لڑکیاں موجود ہیں تو پھر ہندو مسلم کا سوال کیوں اٹھاتے ہیں؟"

"یونہیں، کوتاہ نظر ہوں۔ اُس گروہ سے تعلق رکھتے ہوئے کبھی کبھی خیال آجاتا ہے کہ... خیر تو تم آؤ گی؟"

"کیا خیال آجاتا ہے؟ کیا اب راشننگ میں بھی پاکستان قائم کرنے کا ارادہ ہے؟" اُس نے سوئی چبھو ہی دی۔

"پھر بحث!"

"بات نہ ٹالیے۔ یہ آپ کے کون سے لینن یا اسٹالین نے بتایا ہے کہ حصے بخرے کر دیے گئے تو ساری بلائیں دور ہو جائیں گی۔"

"مگر۔۔۔"

"ہندو مسلم فساد نہیں ہوتے تو تم لوگوں نے یہ چال چلی۔"

"تم سمجھتی ہو کہ پاکستان دے دیا تو ہندو مسلم فساد ہوں گے۔ میری بات بھی تو سنو۔ کون دے رہا ہے پاکستان؟ ہے کس کے پاس کچھ دینے کو؟"

"آپ ہی لوگ بر آڑے ہیں۔"

"جی ہاں۔ ہماری جیب میں رکھا ہوا ہے پاکستان کہ مانگے کوئی اور ہم دے دیں۔"

"مگر آپ ان کے مطالبے تو مانتے ہیں۔"

"ماننے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر انسانوں کا ایک گروہ کسی خاص قسم کی حکومت پسند کرتا ہے تو ہمیں کیا حق کہ انکار کریں؟ ہمیں اُن کے بہت سے مطالبات سے اختلاف ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ سرے سے پاکستان کا مطالبہ ہی ماننے سے انکار کر دیں۔ ہم فیصلہ کرنے والے کون؟"

"مگر مذہبی ڈھونگ رچا کر۔۔۔"

"کہہ تو دیا اختلاف ضرور ہیں۔ اُن کا فیصلہ ہو جائے گا۔ ابھی تو صرف پاکستان کا مسئلہ درپیش ہے۔"

"اور اگر سکھستان، عیسائیستان اور بدھستان کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا؟"

"تو اُس پر بھی غور کیا جائے گا۔ کسی مسئلہ پر خواہ وہ کیسا ہی فضول ہو غور نہ کرنا۔"

"مگر مقصد کیا ہے اس طرح کی تضیعِ اوقات سے؟"

"مقصد صرف ایک ہے۔ اتحاد۔"

"ہُنہ، کس قدر گھسا ہوا لفظ ہے۔ کانوں کو بھی تو متاثر نہیں کرتا۔"

"ہاں گھسا تو بہت گیا ہے مگر تراشا نہیں گیا۔ ابھی شیشے کا دھندلا سا ٹکڑا ہے، مگر میں نے کہا نوکہ ہیر کر لیا لحث۔"

"یہ خوب ہے۔ آپ تو دلائل سے گھبراتے ہیں۔ انسان کی قوتِ متخیلہ کو مفلوج کیے دیتے ہیں۔"

"اب میں کیسے ہر منکر کو دلائل سے قائل کرتا پھروں۔ تم ہی سوچو اگر دو چار بھی تم جیسے ضدی پلّے پڑ جائیں تو اپنی زندگی تو ان ہی کو قائل کرتے کرتے ہی گزر جائے۔ خیر یہ بھی کر لیتے، مگر ذرا دیکھو تو کیسی افراتفری پڑ رہی ہے۔ جو بنگال میں ہو گیا کیا چاہتی ہو یہاں بھی ہو جانے دیں؟ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہ ہوتی تو بھلا اپنا قیمتی وقت یوں برباد کرتا۔ خیر، اگر تمہیں فرصت نہیں تو۔۔۔"

"چائے تو پیجیے۔ زیادہ دیر نہ لگے گی۔" اُس نے چائے بناتے ہوئے کہا۔

"اب دیکھو اگر مجھے اتحاد منظور نہ ہوتا تو تمہیں خوشامدیں کروانے کی ہمت نہ ہوتی۔" چائے کے گھونٹ لیکر پروفیسر مسکرایا، "کسی قیمت پر بھی ہم ملاپ کرا کر رہیں گے۔ گو ایسا کرنا آسان نہیں۔ دونوں ہی طرف سے جوتے پڑ رہے ہیں مگر تم دیکھنا ہماری ڈھٹائی کو۔" وہ زور سے ہنسا۔

"اچھا اب چلیے۔۔۔ تو ذرا جلدی آنا صبح۔۔۔" بغیر کچھ کھائے پیے وہ تیز قدم اُٹھاتا باہر نکل گیا۔

شمن نے دیکھا کہ اُس کے بال پھر گُدّی پر شاعروں کی طرح بڑھ آئے تھے اور کپڑے میلے تھے۔

شمن کو ڈانس پارٹیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور ٹیلر بھی یہی کہتا تھا۔ تبھی نہیں دل سے یا مجبوراً وہ عموماً گُنز اجاتا۔ مگر یہ پارٹی افسروں کی طرف سے تھی اور اسے کامیاب بنانے کی ذمہ داری بھی انہیں پر تھی۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے شمن کو بخار بھی آگیا اور اس کا جھگڑا تو یوں حل ہو گیا۔ پچھلے کچھ دنوں سے صحت ویسے ہی خواہ مخواہ گرتی جا رہی تھی، اوپر سے یہ بخار اور پھر ٹیلر کی لاپروا مصروفیت۔ پروفیسر بھی غرض سے آتا تھا۔ جب سے بخار آیا وہ رسم پوری کرنے کو ایک دو منٹ کے لیے آتا اور بھاگ جاتا۔ شاید دوسری لڑکیاں بھی رو بہ صحت ہو رہی تھیں اور شمن کی اتنی ضرورت نہ رہی تھی!

چڑی ہوئی بیٹھی تھی۔ آگے ہی دو طشتریاں اور ایک پیالی پھینک چکی تھی کہ ٹیلر چاق چوبند ٹائی اتارتا نور زور سے پیر پٹختا آن پہنچا۔

"او ہو، بڑے ترمال اُڑا رہی ہو۔" اُس نے مسکرا کر کہا اور شمن کا جی چاہا کشتی اُس کی تھوتھنی پر کھینچ مارے۔ صبح سے ایک نوالہ حلق سے نہیں اُترا اور یہ سمجھ رہا ہے وہ دن بھر چرا ہی کرتی ہے۔

"ممی کا خط پڑھا؟ پاگل ہو گئی ہیں۔" وہ شرمائے ہوئے انداز سے مسکرایا، "بیکار کی چیں چیں نہ جانے ان عورتوں کو کیا اچھی لگتی ہے۔ ہشت، فضول۔" مگر شمن نے خط نہیں اٹھایا، خاموش چائے میں چمچہ چلاتی رہی۔ نہ جانے کیا بک رہا ہے۔

"بیکار کا جنجال جی گھبراتا ہے میرا بچوں سے۔"

"ہنہ، ایک حماقت ہوگئی اب دوسری۔۔"

"ایں؟" وہ کچھ کھسیا کر چونکا۔

"اور کیا! جو ہم نے بویا ہے ہم ہی بھگتیں اور بے گناہوں کے ماتھے پر سیاہ دھبہ کیوں تھوپ جائیں؟"

"ممی۔۔۔ اُن کی خواہش ہے۔۔۔" کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ شدتِ احساس سے کان سُرخ ہوگئے۔

"ممی بچہ تو نہیں جو سمجھ نہ جائیں۔ وہ خود خلاف ہوں گی۔"

"کون ممی؟ ارے توبہ کرو۔ دیوانی ہیں وہ بچوں کی۔ تمام اِدھر اُدھر کے بچوں کو چمٹائے رکھتی ہیں۔"

"تو اب بھی اِدھر اُدھر کے بچے موجود ہیں، شوق سے چمٹائیں۔"

"ہوں" وہ چپ ہوگیا۔

"آدھا تیتر آدھا بٹیر ہنہ" اُس نے انتہائی مکاری سے کہا اور خون پھر ٹیلر کے کانوں کی طرف دوڑا۔

"ہم نے سخت غلطی کی" ٹیلر بجھی ہوئی آواز میں بولا۔

"حد سے زیادہ بڑی حماقت۔"

"کیسے بھگتی جائے گی یہ دوزخ۔"

"کیا ضرورت ہے کہ بھگتی ہی جائے۔ اگر زہر کھا لیا جائے تو قے کیوں نہ کر دی جائے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ کہ دو زندگیوں کو قبر میں جھونکنے سے بہتر ہے تم اپنا منہ اُدھر کرو ہم اپنا منہ ادھر کر لیں۔"

"کسی ہندوستانی سے کہتیں تو وہ مزہ چکھا دیتا اس وقت" ٹیلر نے دانت پیس کر کہا۔

"شاید"

"اور پھر تمہیں اعتراض بھی نہ ہوتا"

"شاید"

"کس قدر بے حیا ہو تم" اس کے منہ میں جھاگ آگئی "ذبح کر ڈالنا چاہیے اس قسم کی حیوان عورتوں کو۔ اُف! مجھے تم سے کتنی نفرت ہے۔"

"ہُنہ۔ اور جیسے میں تمہارے عشق میں دیوانی ہو رہی ہوں۔"

"تم۔۔۔ تم بیسوا سے بھی بدتر کسی خبیث طبقے سے ہو۔۔ کاش ایک بار کوئی تمہارا گلا گھونٹ کر مجھے آزاد کر دے"

"اور تمہیں کیوں نہ مسل ڈالے! جو جونک بن کر سارے ملک کا خون چوس رہے ہو۔ ذرا اپنی ماں بہنوں کو تو دیکھو۔۔۔ ہنہ۔۔۔ بدمعاش زمانے بھر کی۔"

"چپ کمبخت۔ گلاب کے پھولوں کو چھوڑ کر میں نے تم سے ناطہ جوڑا۔۔۔۔"

"اور تم۔۔ بڑے حسن کے پتلے ہو۔ کوڑھ جیسی رنگت، سڑے ہوئے دانت، بندر کہیں کے۔"

"تو پھر کسی بھیل چمار سے جا لپٹو۔ ایسی ہی با جیا ہو تو نکل جاؤ یہاں سے۔"

"بھیل چمار تم سے لاکھ درجے بہتر ہے ٹامی کہیں کے۔" وہ اٹھ کر جانے لگی۔

مذاق مذاق میں شمن بتا چکی تھی کہ ٹامی ہم ہندوستانی اس سفید ناجائز اولاد کو کہتے ہیں جو فوج میں بھرتی کر کے توپوں کے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ ٹیلر اس کے منہ سے اتنی نیچی گالی سن کر کانپ اٹھا۔ تھوڑی دیر وہ ساکت و بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کی رنگت سفید پڑ گئی جیسے کسی نے پچکاری سے خون کھینچ لیا ہو۔ شمن نے جلدی سے کمرے میں جا کر دروازے بند کر لیے۔ وہ چیخ چیخ کر گالیاں بکتا رہا۔ شمن نے اسے کبھی اتنا غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل پاگل معلوم ہوتا تھا جیسے ضبط کی لگام تڑا کر غصہ دماغ پر پھٹ پڑا ہو۔ شمن پیر لٹکائے پلنگ پر بیٹھی تھر تھر کانپا کی۔ اتنی بات بڑھ گئی، نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔

رات بھر ٹیلر کے پیروں کی چاپ سنائی دیتی رہی۔ وہ زخمی چیتے کی طرح تیز تیز قدموں سے چلتا رہا۔ بار بار الماری کھول کر کچھ انڈیلنے کی آواز آتی مگر وہ بھی جلدی خاموش ہو گئی کیونکہ ایک بوتل آنے جانے والوں کے لیے رکھی تھی۔ عادتاً ٹیلر نہیں پیتا تھا۔

اور پھر سسکیوں کی آواز آئی، جیسے کوئی دم گھونٹ کر رونا ضبط کر رہا ہو۔ شمن کا جی ہل گیا۔ وہ رو رہا تھا ٹیلر۔ ہٹا کٹا، قد آور، جوان مرد ایک عورت کے مارے ہوئے ڈنکوں پر سسکیاں بھر رہا تھا۔ اسکا جی چاہا جا کر۔۔۔ مگر وہ لرز اٹھی۔ وہ نیلی نیلی کانچ کی گولیوں جیسی آنکھیں، وہ تمتمایا ہوا چہرہ!

دوسرے دن صبح ہی اٹھ کر نوکر نے بتایا کہ وہ اچانک سامان تیار کروا کر دہلی روانہ ہو گیا۔ کوئی ٹرنک کال بھی کی تھی۔ شمن کا بخار بھی نہ اترا اور کمزوری حد سے زیادہ بڑھ گئی۔

پورا ہفتہ گزر گیا اور ٹیلر کا نہ ہی کوئی خط آیا نہ خیر خبر۔ اس نے ادھر ادھر ٹیلی فون کر کے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی مگر پتہ نہ چل سکا۔ وہ کسی اہم کام کے سلسلے میں گیا ہو گا جس میں شاید رازداری کا جھگڑا شامل ہو۔

دو ہفتے! اور ٹیلر کا نام و نشان نہیں۔ صرف سرکاری طور پر اس کی تنخواہ تو شمن کو مل گئی۔

ذرا سی چنگاری کو پنکھی جھل جھل کر اس نے کتنا بڑا شعلہ بنا دیا کہ دم بھر میں سب کچھ بھک سے اڑ گیا۔ بس ٹیلر ایک بار واپس آ جائے۔ پھر یہ پھر یہ تاریخ کبھی نہ دہرائی جائے گی۔ وہ آ جائے پھر تو۔۔۔ بن جائیگا، سب کچھ بن جائیگا۔ کھنڈر اتنے بوسیدہ نہیں ہو گئے کہ مرمت نہ ہو سکے۔

وہ زیادہ نہیں بس ایک بار۔۔۔ آخری بار۔۔۔ آخری موقع! وہ نہ جانے کس سے اور کیا مانگتی رہی۔

دن گزرتے گئے۔ وہ کام پر بھی چلی جاتی مگر جی کھویا سا رہتا۔ اُس نے ٹیلر کے سارے کپڑے نکلوا کر دھوپ دی۔ کمر ذری باقی تھی اس لیے دور بیٹھی ہدایات دیتی رہی۔ برش خود کیا اور گولیاں ڈال کر بند کر دیے۔ دن میں کئی بار احساسِ تنہائی خوف بن کر چھایا اور وہ خاموش آنسو بہایا کی۔

اور دن گزر رہے! اُس کا کوئی نہیں دنیا میں۔ وہ سب کو کھو چکی۔ ایک ایک کر کے سارے دھڑے زہریلے دانتوں سے کتر ڈالے۔ مگر امید کا آخری تار سلامت تھا گو بار بار لرزتا کہ اب ٹوٹا اور اب ٹوٹا۔

اُس کی نیند بالکل اچاٹ ہو گئی تھی۔ سارا انتظام ہی درہم برہم ہو گیا تھا۔ رات بھر یہی معلوم ہوتا ...وہ ملگیا راستہ! ٹیلر کی موٹر آکر رکی.....وہ اُترا... اب زینے پر چڑھ رہا ہے۔ سیڑھیاں طے کر چکا۔ اب دروازے پر آرہا ہے مگر نہیں، سارا حساب گڑبڑ معلوم ہونے لگتا۔ نہیں بھلا اتنی جلدی موٹر سے کیسے اترا ہو گا! منہ سے کہنا اور بات ہے فعل کے سرزد ہونے میں تو وقت لگتا ہے... وہ کھٹ سے اُس نے موٹر کا دروازہ بند کیا... اب... چلا... سیڑھیوں پر چڑھا... صاف جوتوں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔

مگر یہ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ ختم نہ ہو سکتی۔ دس بارہ سیڑھیاں ہزار چاپوں میں بھی طے نہ ہو پاتیں... اور پھر اسے معلوم ہوتا جیسے وہ پیر کی چاپ سمجھی تھی وہ نل کی بوندیں ٹب میں گر رہی تھیں ٹپ ٹپ... متواتر یہ بوندیں انسانی قدموں کی طرح چلتی معلوم ہوتیں۔ جھنجھلا کر وہ اٹھتی اور نل کو خوب مروڑ کر بند کر دیتی تاکہ گلا گھٹ جائے کمبخت کا۔

دماغی خلجان بڑھتا گیا۔ کھانے کی اکیلی میز پر ایک نوالہ بھی اُس کے حلق سے نہ اترتا۔ زبان پھیکی لگ گئی تھی۔ ہر چیز کڑوی، بدمزہ، لساندی اور پچپلاندی معلوم ہوتی۔ تھک گئی تھی وہ ان کھانوں سے، میز کرسی سے، نرم نرم صوفوں سے۔ جی چاہتا ایک بار ہی سب کچھ دور جھٹک کر کھڑی ہو جائے آخر تھا کیا ان الجھنوں میں؟ اس پھیکی کسیلی زندگی سے تو یقیناً موت زیادہ چٹپٹی ہوگی۔

شامی کباب کا چھوٹا سا ٹکڑا منہ میں سڑاندی غلاظت کا پہاڑ بن کر پھیل گیا۔ بیرے کی نظروں سے ابکائی بچاتی ہوئی وہ جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ یہ کباب ٹیلر کو کس قدر پسند تھے۔ بند کھڑے دو کھے نگل جاتا تھا لیکن اب یہ نہ پکیں گے جب تک ٹیلر نہ آجائے۔ ورنہ یونہی گلے میں ابکائی بن کر اٹکتے رہیں گے۔

یہ ذرا سی بات اتنی لمبی کیوں ہو گئی؟ کتنی بار تو اسے ادھورا چھوڑ دیا گیا مگر پھر بھی قسمت میں اس کی تکمیل یوں لکھی تھی۔ مانا کہ وہ ایک دوسرے سے اکتا جاتے تھے مگر یہ کون سی نئی بات ہے! اور لوگ بھی تو لڑتے بھڑتے ہیں۔ مگر یوں زندگی کی روانی ٹھوکر کھا کر منہ کے بل نہیں گر پڑتی۔ اب کے ٹیلر آجائے تو، تو۔ کتنا ارمان بھرا خواب تھا! مگر وہ اس سے معافی مانگ لے گی۔ گو معافی تو کجا اگر وہ

صرف ایک معمولی سے اشارت سے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی تو ٹیلر لیشہ خطی ہو جاتا۔ اتنا عقیل تھا پر جہاں آنسوؤں کی چمک دیکھی اور عقل کی آنکھیں چندھیا گئیں، پھر اُنکی معافیاں حصے میں آتیں۔

اور کیا حرج ہے جو ماں کی بھی بات مان لی جائے! یہ وہی تو ماں تھی جس نے دور بیٹھے بیٹھے جیسے بٹن دبا کر دو مختلف طاقتوں کو کھینچکر ملا دیا تھا۔ تُف ہے اس کی اوقات پر کہ وہ اس کی ننھی سی آرزو نہ پوری کرسکی۔ خیر وقت اتنی دور نہیں بھاگا ہے، اب بھی تلافی کی جاسکتی ہے۔

لیکن! ایک بھیانک لیکن نے اُس کے جمع ہوتے ہوئے خیالات کو بکھیرنا شروع کیا۔ سرکاری طور پر اُسے معلوم ہُوا کہ ٹیلر ابھی پندرہ بیس دن نہ آسکے گا۔ جی کڑا کر کے چاہا اُسے خط لکھے، مگر کمبخت قلم بڑا مجبور سالا ہے، اس کے پاس وہ طاقتیں کہاں جو ایک روٹھے کو منانے کیلئے استعمال کرنا پڑتی ہیں۔

پروفیسر کا فون آیا کہ فوراً آؤ۔ جی تو نہ اُٹھتا تھا مگر کرنے کو کچھ نہ تھا۔ بیکار دن اونگھتے گزارنا قیامت سے کم نہ تھا۔ راشننگ کے دفتر پر چھوٹی چھوٹی بہا بجانت چھڑی نظر آتی تھی۔ چند بے پر کی خبروں نے اُڑ کر بھوکوں کے پیٹوں کی آگ اور بھڑکا دی تھی، بنگال کی بھوک ہیبت بن کر سہما رہی تھی۔ لوگ اناج پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ رحم سا جذبہ بھی منسوخ ہو چکا تھا۔ انسانیت کو اتنا نیچا دیکھ کر جی جھنجلا اُٹھتا۔ آخر اتنی کانٹوں بھری زندگی اتنی پیاری کیوں لگتی ہے؟ آخر دوسرے ملکوں میں بھی تو بھوک ہے پر اتنی اندھی اور بے حیا نہیں۔ اگر ذرا صبر سے مر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔

دھوپ تیز ہونے لگی۔ مرجھائے ہوئے زرد چہرے تیل جیسے چپچپے پسینے سے دمک اُٹھے، جیسے لاشوں پر برقی روشنی پھیل گئی۔ آنکھیں زیادہ خشک اور بے رونق ہو گئیں۔ تھکی ہوئی ٹانگیں ہڈیوں تپش کے بوجھ سے لرزنے لگیں۔ مجمع ہنڈیا کی طرح کھد بدا اٹھا۔ تعفن کے بھبکے شمن کے بھیجے کو گھونسنے لگے۔ دو بڑی بسیں سخت کراہتی، شور پر تماشے باجے کا سماں باندھتی گزر گئیں۔ پوں پوں ہزاروں موٹریں شمن کے کانوں میں گھسنے لگیں۔ لڑکھڑا کر اس نے پان والے کی دکان کا سہارا لیا۔

چونا؟ سادہ؟ دیسی؟ بائی... بھنیلی سپاری؟ پان والے نے جلدی جلدی کتھے چونے کی کلھیوں کو بجایا۔ پھر پلک جھپکتے تاش کی گڈیوں کی طرح بکھرے سمٹے ہوا میں لہرائے... پیر کے نیچے پتھریلی پانی کی پیکوں سے لتھڑی ہوئی زمین کتاب کے ورق کی طرح پھڑپھڑا کر منہ پر آن چپکی اور کہیں آگ بجھانے کا انجن ٹن ٹن کرتا خاموشی میں ڈوب گیا۔

جب اُسکی آنکھ کھلی تو اُسنے اپنے آپ کو ایک نئے کمرے میں پایا۔ گھومتا ہُوا دماغ ٹھیرا تو معلوم ہُوا کہ وہ اسپتال میں ہے۔ پاس ہی پروفیسر جھکا ہُوا برف توڑ رہا تھا۔ وہ تین اور نا واقف چہرے موجود تھے۔

"ایسی حالت میں باہر نہیں نکلنا چاہیے" ڈاکٹر نے ربڑ کی نلکیوں والا آلہ تہ کرتے ہوئے کہا۔
"حالت؟ کیسی حالت؟" مگر شاید یہ ڈاکٹر اپنی کہنے میں جو مزہ پاتے ہیں وہ مریض کی سننے میں نہیں پاتے۔ ڈاکٹر نے لمبی چوڑی فہرست احتیاطوں اور دواؤں کی سنا دی۔ دوائیں۔ طاقت کی دوائیں! اوہ! مارے حیرت کے وہ اُٹھ بیٹھی۔ وہ بچہ تو نہیں تھی مگر پریشانیوں میں وہ کتنا کچھ بھول ہوئی تھی اس عظیم الشان انکشاف نے جیسے بھاگتے بھاگتے اُسے ایک دم پکڑ لیا۔ پروفیسر کچھ خجل، کچھ مجرم سا کھڑا تھا۔ وہ اُٹھی تو لپک کر سہارا دینے دوڑا گویا وہ نازک سا کانچ کا گلاس ہے اور پھونک مارنے سے ٹوٹ جائے گی۔
وہ کھسیا کر تیز تیز چلتی باہر ٹیکسی میں آن بیٹھی۔
موٹر کی تیز ہوا نے اُسے جگا دیا۔ چونک کر اُس نے پھریری لی اور ایک دم اس کا دماغ بھی موٹر کے ساتھ بھاگنے لگا۔ جی چاہا زور زور سے ہنسے یا پھر زور زور سے روئے مگر وہ ڈرائیور کی وجہ سے جھینپ گئی۔
"جلدی... جلدی" اُس نے ڈرائیور کو ٹوکا۔ بس نہ تھا جو وہ اپنے دل کی تیز دھڑکن موٹر کی طاقت میں شامل کر دیتی۔ آج اُسکا جسم ایکدم ہلکا ہو کر اُڑ جانے پر تلا ہوا تھا۔ بار بار آنکھوں میں بے معنی آنسو چھلکے آ رہے تھے۔ سامنے آئینے میں اُسکی شکل کتنی مردہ اور اجڑی ہوئی نظر آئی، مگر کچھ پروا نہیں حسن اور بدصورتی بیکار ہو کر اس نئی چمک کے سامنے ماند پڑ چکے تھے۔ بدصورت تھی تب بھی... تب بھی اُس کا دل ایک دم کتنا حسین ہو رہا تھا۔ وہاں صرف ایک منجمد سا خیال تھا "روفی... روفی ٹیلر... کہاں ہو تم۔ مجھ سے معافی مانگو... بے رحم کہیں کے!" اُس کا گلا گھُٹ گیا۔
وہ ڈانٹ بتائے گی روفی کو۔ آنے دو تو ذرا۔ اپنی "بدنصیبی" کا سارا الزام اس پر تھوپ دیگی۔ اور پھر روتی! اُسے اتنا ہوش کب رہے گا کہ بُرا مان سکے۔ جنگلی کہیں کا! خود غرض وحشی! چلا گیا اتنے دن کیلیے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ آج کل پیٹنٹ دوائیں کہاں ملتی ہیں۔ کیلشیم انجکشن لانا جوئے شیر لانے سے کم نہ ہوگا۔ اور اس وقت یہ لاپروائی... مگر پھر اُسے روفی پہ پیار آ گیا۔ اتنی دور ہو کر وہ کہیں بالکل ہی قریب تھا۔
اور ماں! بیچاری بے وقوف پیاری سی ماں نے لکھا تھا: "تم لوگ گھبرانا نہیں۔ اُونی سامان میں سب خود تیار کر لوں گی۔" ہونہہ۔ ولایتی بڑی بی مارے ارمانوں کے مری جا رہی ہیں سمجھتی ہیں جیسے ان میں تو ہے ہی بہت سلیقہ پالنے کا۔ لاڈ میں بگاڑ کر ناس مار دیں گی۔ روفی سے بھی بدتر، ضدی اور منہ چڑھا بنا دیں گی۔ اور پھر بڑی بی میں دم کہاں ہوگا۔ جو رات برات ہوا لگ جلائے! اُٹھتی ہیں آئیں گی۔ مگر یہ بدنصیب جنگ۔ ابھی دم ہے جبھی تو چلنے کی فرصت ملے جب ہی تو۔ نہ جانے کمبختوں کو کیا مل رہا ہے ایک دوسرے کا خون بہانے میں۔ وہ سوچتی رہی۔ اس خون میں لتھڑی

ہوئی دنیا کا خیال کر کے جی دہل گیا۔ کاش یہ جنگ جلد ختم ہو جاتی۔ خدا کسی کو اس قیامت کے دنوں میں جنم نہ دے۔ کون بچا ہوا ہے؟ اور کب تک؟ نہ جانے کس وقت آگ برسنے لگے۔ پریشان ہو کر وہ اپنے لمبے چوڑے کنبے کو بچانے کی فکر میں پڑ گئی۔

ارے... اور کوئی احتیاط نہیں کرتا۔ روشنیاں دھڑا دھڑ جلنے لگی ہیں شیشوں پر سے کالے کاغذ لگ گئے۔ نہ خانہ قبر بنا پڑا ہے۔ مانا کہ خطرہ قریب نہیں مگر چیل جھپٹا مارنے سے پہلے نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔

اور اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی دم میں بمباری ہونے والی ہے۔ اسٹور میں بھی تو کچھ نہیں۔ رونی کے پائپ کو تمباکو نہ ملا تو وہ سر کھا جائے گا۔ پاگل آدمی بچرا!

اور جو وہ رونی کو کچھ نہ بتائے تو؟ مزہ آجائے۔ ایک دم مارے حیرت کے پاگل ہی تو ہو جائے گا۔ اور جو ابھی سے معلوم ہو گیا تو جینا دو بھر کر دیگا، جان کھالے گا: "یہ نہ کرو، وہ نہ کرو" اُسے ایکدم ہنسی آگئی۔ کیسی اترائی ہوئی باتیں سوچنے لگی تھی وہ۔ بھلا آج کل بم کہاں؟

مگر احاطے میں داخل ہو کر واقعی اس پر بم پھٹ پڑا۔ ملٹری کی بھوری گاڑی برساتی میں کھڑی تھی۔ بے قابو ہو کر وہ بھاگی۔
"رونی... رونی" ہانپتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ ساڑھی پیر میں لپٹی اور وہ تھم کر رُک گئی۔
"رونی!" اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ دور دھکیل کر کھولا۔ "رونی!"
"گڈ ایوننگ میڈم!" ایک کلف لگے ہوئے فوجی نے اسلام کیا۔
"رونی!" اس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔

"مسٹر ٹیلر بذریعہ ہوائی جہاز محاذ پر روانہ ہو گئے، یہ خط" اُس نے ادب سے خط بڑھایا اور جلدی سے سلام جھاڑتا ہوا لوٹ گیا۔

ہاتھ میں خط لیے وہ بھٹکی ہوئی سوچنے کی کوشش کرنے لگی۔ ہوا میں ہوائی جہازوں کے ہزاروں لاکھوں پر ببر شیروں کی طرح غرائے۔ چیختے چنگھاڑتے بم لاکھوں کی تعداد میں برس پڑے۔ جنگلی گرج کانوں کو سن کر گئی۔

"رونی... رونی" اُسکی بھٹکی ہوئی روح کراہتی ہوئی موہوم سے واہمے کے تعاقب میں ڈوب گئی۔ رونی سارے اختیارات سونپ کر جنگی محاذ پر روانہ ہو گیا تھا۔ وہ آزاد تھی! جسم سے نکلی ہوئی روح کی طرح آزاد! لاوارث اور کھوئی ہوئی۔

"تم نہیں گئے رونی... رونی یہ نہیں ہو سکتا۔ ظالم اب تم کہیں نہیں بھاگ کر جا سکتے" اُس نے بڑے وثوق سے پکارا، گویا وہ اُسے قید کر چکی ہو۔ "سنو رونی..." مگر وہ کسی کو نہ سنا سکی اور

گھنگھور گھٹائیں زور شور سے گھر گھر کر منڈلائیں۔

"ٹھیرو ٹھیرو..." اُس نے منہ زور طوفان کو لجاجت سے چمکارا۔ "سب ٹھیک ہو جائیگا۔ ٹھیرو، اتنا زور نہ لگاؤ ورنہ یہ تنی ہوئی ڈوریاں چٹخ جائیں گی۔" "تم گئے رونی!" اس نے گھٹتے ہوئے کلیجے کو زور لگا کر پکارا مگر آہ بھی نہ نکلی اور پھر ایکدم نئی جان نے اُس کی پکار سُن لی۔ زندگی کی بیل پھریری لہروں کی طرح تھرائی ہوئی اُس کے جسم میں تیر گئی۔ ڈوبتی ہوئی طاقتیں تاریکیوں سے اُبھرنے لگیں۔ تنی ہوئی رگیں آپ ہی آپ لچک کر ڈھیلی پڑ گئیں!

آنکھوں کی وحشت آنسوؤں سے دھل کر بہہ نکلی۔ سسکیاں ہنسی کے فوارے بن گئیں اور بیماری کا بھیانک احساس دور جھٹک کر وہ بوسیدہ ملبے کے ڈھیر کے نیچے سے رینگ آئی... اکیلی! امریکہ میں بیٹھی ہوئی اُونی کپڑے بننے کی شوقین ماں، ہوائی اژدہوں کے پروں پر موت کے دہانے کی طرف اڑتا رونی، وہ خود... اور... اس کے اپنے وجود سے اسقدر قریب ایک نئی جان! اتنی لمبی چوڑی برادری میں وہ اکیلی کہاں ہے؟ مانا کہ بہت دور ہیں وہ ایک دوسرے سے، ہزاروں میل کا سفر حائل ہے مگر اس وقت اُسے ایسا معلوم ہُوا جیسے اُس کی ساری دُنیا سمٹ کر خود اُس کی ہستی میں سما گئی۔ آج اس بیکسی کی تنہائی میں بھی کتنی چہل پہل تھی۔ اس بے سروری میں بھی کتنی سلجھی ہوئی سجاوٹ تھی! آج وہ کتنی نڈر مگر خوش تھی! اس سے قبل اُس نے اپنے آپکو اتنا کمزور، اتنا بہادر، اتنا پریشان، مگر اتنا مطمئن کبھی نہ محسوس کیا تھا اور دنیا کتنی حسین ہو گئی! زندگی کتنی عزیز!

اور رونی؟

اُس کا جی ہل گیا۔ خالی ہاتھ، اکیلا رونی! اُس کی مفلسی پر اُسے ترس آ گیا۔ جیسے کسی رئیس اعظم کو اپنے محل کی کھڑکی سے کسی قلاش فقیر کو ناداری کی سردی میں ٹھٹھرتا دیکھ کر رحم آنے لگے!

"ٹھگ کہیں کی!" اس نے نئی دولت سے مالا مال ہستی کو طعنہ دیا، "ایک ہرجائی لٹیرے کو بھی لوٹ لیا!"

نشیلے قدم اٹھاتی، جیسے اُس کے ٹخنوں پر لرزتی گھنگھروؤں کے گچھے آن بندھے ہوں، وہ پلنگ کی طرف مڑی اور نہایت احتیاط سے اپنا تھکا ہُوا سر تکیے پر ٹکا دیا!

مئی ۴۴ء

افسانے	زندگی کے موڑ پر	کرشن چندر	۱/۵۰
	تین غنڈے	کرشن چندر	۱/۷۵
	ٹوٹے ہوئے تارے	کرشن چندر	۲/-
	نمرود کی خدائی	سعادت حسن منٹو	۲/-
	لذتِ سنگ	سعادت حسن منٹو	۱/۷۵
	سڑک کے کنارے	سعادت حسن منٹو	۲/۲۵
	گرہن	راجندر سنگھ بیدی	۲/۲۵
	دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	۲/۲۵
	کوکھ جلی	راجندر سنگھ بیدی	۲/۵۰
	لمبی لڑکی	راجندر سنگھ بیدی	۲/-
	لاجونتی	راجندر سنگھ بیدی	۲/-
	اپنے دکھ مجھے دے دو	راجندر سنگھ بیدی	۳/-
	جدید ہندی افسانے (ترجمہ و انتخاب)	اشفاق انور	۳/-
	رفیقِ تنہائی	علی عباس حسینی	۲/۷۵
	ہائے اللہ	ہاجرہ مسرور	۱/۷۵
	سناٹا	احمد ندیم قاسمی	۳/-
	منزل منزل	اے حمید	۳/-
	خلا نوردوں کے افسانے	محمد سلیم الرحمٰن	۲/۵۰
ناول	اداس نسلیں	عبداللہ حسین	۱۲/-
	ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	۲/۵۰
	لندن کی ایک رات	سجاد ظہیر	۱/۷۵
	دھوپ اور شگوفے	اے حمید	۳/-
	غدار	کرشن چندر	۱/۵۰
	کپتان کا گڈا	ڈی - ایچ - لارنس	۱/۷۵
تنقید	معیار	ممتاز شیریں	۳/۵۰
ڈرامے	آؤ	سعادت حسن منٹو	۱/۷۵
	شکنتلا	کالی داس	۲/-
	شیطان	عصمت چغتائی	۲/۵۰
طنز و مزاح	سرِ راہے	مسعود مفتی	۲/۵۰
خطوط	مکتوباتِ اکبر	اکبر الہ آبادی	۱/۵۰
	زیرِ لب	صفیہ اختر	۴/-